

The Drinched Book

text fiy book

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222934

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. *191 Mr. D* Accession No. *A 4932* .

Author *J. G. L.*

Title

This book should be returned on or before the date
last marked below.

بزم ہمایوں

یکم جنوری ۱۹۲۲ء تھی جب ہمایوں پیدا ہوا۔ آج ۹۳ء کا آغاز ہے۔ بقول دہلی والوں کے اہم جہ جہو آٹھ دن کی پیدائش کیا جانے دنیا کو دنیا والوں کو۔ آٹھ سال کے بچے میں فنی طاقت ہوتی ہے اتنی اس میں ہوگی آٹھ سال کے بچے میں جو قابلیت ہو سکتی ہے بس کچھ اتنی ہی اس میں ہوگی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ یہ بڑے بوڑھوں کو غفل کی باتیں سکھائے۔ خدا کرے اس میں صرف اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ یہ اپنے سے بڑوں کی عزت کرے اور اپنے سے چھوٹوں سے محبت اور دونوں کے عمل و طرز عمل سے ان کی وہی واکتباخی خوبیوں کے اعذر کرنے میں اس طرح مصروف رہے جیسے کوئی نئی دو شیر جن جن کے چھوٹ چسنے میں محو ہو!

میر ہمایوں نے جو ایک سال کے بعد اپنی مصروف فراغت کے خول کے اندر سے نہ باہر نکالا تو کیا دیکھتا سنتا ہے کہ ادب کی دنیا ہے اور اس میں ایک طوفانِ عظیم، علم کی محفل ہے اور اس میں ایک دستِ مروغل، قول تو ہمایوں کا تھا کہ ”دو روزمانہ حال“ کی چل گیا، لیکن یہ چال چل اور گئے اور ہمایوں رادہ میں بیٹھا کا بیٹھا۔ سوچا کہ حضرت تم خوابیدہ نہ سہی لیکن اب توجہ دینا اور تیرین کا زمانہ ہے ہر وقت راک نئے کام کے سرانجام دینے کا عہد ہے نہ کہ اک جھوٹے بچے گذشتہ ایثار کے صوفی پر آرام کرنے کا۔ تمہارا قول تو ضرور وہی دوڑ دھواں لہجہ والا رہا لیکن عمل اس پر صرف اتنا کہ دوسروں کا منہ تو ضرور بند رہا لیکن اپنے دل میں اک کاوش کا باب کھل گیا دوسروں کی ظاہر انگین تو ضرور ہو گئی لیکن اپنی باطنی تحریک ہونی تھی نہ ہونی بچہ یہ ہے کہ اردو کی ”ادبیت“، ”نگار کی“ ”نفاذیت“ ”معارف“ کی ”علیت“ ”نیرنگ خیال“ کی ”تصویریت“ ”عالمگیر کی“ ”غزلیت“ ”محزون“ ”لی“ ”روزیت“ ”دادنی دنیا“ کی ”ارزائیت“ ”کامیابی“ کی ”اشتہاریت“ اور ”جامعہ“ کی ”متانت“ سے ابھی ہمایوں کو بہت کچھ سیکھنا ہے ورنہ ہمایوں کا ارادہ ہے کہ وہ ان بڑے چھوٹے بھائیوں سے جو کچھ بھی ضروری ہے سیکھے اور سیکھتا ہے لیکن ہمایوں ”جہاں تیغ کا رضا کار ہو میں اپنے مخصوص انداز کا علم بردار بھی رہنا چاہتا ہوں یعنی ”اخلاقیات“ جو خواہ خاص ہمایوں کا مطمح نظر نہ ہو لیکن جہاں ہمایوں کا خاص مطمح نظر ضرور ہے اور ہے گا + اب حقیقت یہ ہے کہ آج کل اخلاق کے معنی اس قدر وسیع ہوتے جا رہے ہیں کہ اخلاق کی تربیت میں صرف صحیح ضبط اور صحیح نیکی نہیں بلکہ صحیح حسن و محبت اور صحیح علم و آزادی سب کی کم و بیش ضرورت ہے مذکور اخلاق نرمی خشک مزاجی سے وابستہ نہیں بلکہ آج اس میں وہ چیز بھی شامل ہوئی جا رہی ہے جسے کل تک تہذیب دہنی کہتے تھے + وعظ و پند کی گفتار اخلاقی طور پر اتنی سودمند نہیں ہوتی جتنی شاید ایسے فطری حسن کی ایک جھلک جو بالذات

اب تو یہ حالت ہے کہ سال کے بعد ہمایوں کے دو مہینوں میں بزم ہمایوں منعقد ہوتی ہے اور مدیر جیسا کہ اُس کا اس نفع بھی ارادہ ہو دو ہی دو لفظوں میں دس بیس ارکان کا مختصر سا شکریہ ادا کر کے پھر اپنی بے نیاز خلوت میں سال بھر کا چلکے کاٹنے کے لئے غائب ہو جاتا ہے، ہمارے اک قابل رکھنے پُر اثر شاید بجا شکایت کی ہے کہ اکثر اُردو رسالے تو اپنے مضمون نویسیوں پر نوٹ بلکہ نوٹ درنوٹ لکھتے ہیں اُن پر "شذراتی"، "ملاحظاتی" اور کیسے کیسے اُردو تعریفاتی "پھول بساتے ہیں لیکن غنچہ دہن ہمایوں سال میں ایک نفع بھی اپنا منہ کھولتا ہے تو اظہارِ تشکر میں محض نعل سے کام لیتا ہے، اس کے جواب میں گزارش ہو کہ مدیر ہمایوں کی رائے میں ہر مضمون کی آج پور تعریف کے پُل باندھنا اُس آج پور سے محض گذر جانے کا ایک بیان ہے یہ درست ہے کہ ہمارے بد بخت ملک میں اور ایک حد تک کج کل کی ساری کاروباری دنیا میں اعتبار اکثر اشتہار کے مُم ہوتا ہے اور عزت کے معنی محض شہرت ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اسی ملک اور اسی دنیا میں بھی ہر اعتبار و عزت کے اُردو زیادہ سنجیدہ و متین رستوں کے مسافر ہیں یہی ہیں جن کے ساتھ خدا کرے ہم سب ہمیشہ ہم سفر ہوں گے بھی اپنے تمام اہل قلم حضرات کی خدمت میں یہ معذرت خلوص دل سے پیش کی جاتی ہے کہ اُن کی مساعی اور احسانات کا حق تو یوں ہو کہ حق ادا نہ ہوا اور یہ حق رسمی لفظوں میں یا چند جملوں میں کیسے ادا ہو۔ ان میں سے بعض صاحبوں کے متعلق اگر فی مضمون نگار کئی کئی صفحے کا مضمون لکھا جائے تو پھر کہیں جا کر اُن کی نصایف کی خصوصیات پر کچھ روشنی پڑے اور پھر کہیں جا کر اُن کی محنتوں کی کچھ تھوڑی سی داو ملے لیکن دراصل نہ اُن کی محنت مدیر ہمایوں کے شکریے کے لئے صرف کی جاتی ہے نہ اُن کی قابلیت اُس کے چند تعریفی جملوں کے لئے ظہور میں آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان جو اہر پاروں کی جگہ ناظرین ہمایوں کے دل میں ہے!

گذشتہ سال جس طرح میاں عبدالعزیز نے فلک پیمائی پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے تاریخ نور الہی محمد عمر صاحب نے ڈراما بگیم آغا جید حسن نے دہلوی دزمرو حامد علی خاں وحید احمد خاں نے تنقید سر لاج الدین احمد نظامی اور میاں عطار الرحمن نے افسانہ خواجہ غلام السیدین اور مر محمد خاں شہاب نے سیرتِ اخلاق سید حسن صاحب بنی اور عبدالرحمن صاحب اعجاز نے علم و فن کے شعبوں میں جو کچھ پیش کیا اُسے ناظرین ہمایوں بھول نہیں سکتے اسی طرح شعر و نظم میں جوش کی فطرت نگار، آزاد انصاری کی زبردست اخلاقی تعلیم حامد علی خاں کا فلسفیانہ تعقُّل اثر صہبائی کا لاجواب رباعیانہ فلسفہ اور مراد اکبر ذوقی و شرماعابد و حشت اور ج۔ ب صاحبہ کے شہریں نغموں کو سامعین ہمایوں کبھی فراموش نہیں کر سکتے!

ادا کرنے سے اگر شکریہ ادا ہو سکے تو ان سب کا شکریہ سو بار ہمایوں اور اہل ہمایوں کی طرف سے!

جہاں نما

ہم ہندیوں کے لئے جو یوں پڑانے ہوں لیکن جو ابھی اس نئی دنیا میں نئے بچے ہی ہیں یہ دنیا کیا ہے؟ — محض اک جزائی نقشہ جسے زمانے کے سیاست دان اُستاد نے ہماری پردہ دار چار دیواری کے اندر لٹکا رکھا ہے اور جس کی ملکی و قومی اور خشک تر رنگینیوں سے ہماری بچپن کی فطرت کھیلتی رہتی ہے! اس نقشے پر ایک خنیں نرنگی جس کے دھبے جا بجا پائے جاتے ہیں اور جس کی طرف اکثر ہمارے اُستاد کی چھڑی میں متوجہ کرتی رہتی ہے لیکن ہم بزدل جن میں کچھ دلیری سی آتی باقی ہے اب کچھ دنوں سے اپنی نظر کو اوڑنگوں کی طرف، بلکہ اپنی بے رنگی کی طرف بھی پھیرے جاتے ہیں! یہ اُستاد کون ہے؟ —؟

انگلستان! — خنیں نرنگی رنگ والا سب "حق" پرستوں کا مجازی خدائے مالدار!

اس کے بعد ہم کسے دیکھتے ہیں اور کیا دیکھتے ہیں؟ —؟

امریکہ! — سبھی نئی نوئی ترقیوں کا اجارہ دار

جرمنی! — اپنے پڑنے غم و غصہ کو نئے تعمیری کاموں میں تحلیل کرنے والا، غیر نام و صاحب اشار

فرانس! — عیش پسند، حسن پرست، علم دوست، فن آرا، پرکار

اطالیہ! — خود نما رہبر کا مغرور رکاب دار

جاپان! — مشرق کا خود دار پہرہ دار

روس! — انسانی معاشرت کی تپتی ہوئی سفید و سیاہ دیک میں اپنا سخت درخت چیمپیر نے والا ہر دوروں مسکینوں کا ظالم و دگار

چین! — اپنے ہزاروں کچھڑوں کو سمبٹ لپیٹ سکے والا قدیمی تجربہ کار

ترکی! — تہذیب جدید کے لئے سب پرستی بھلی روایات کو دور سے مغربی سلام کہنے والا نیم مشرقی فوجدار

مصر! — اپنی ہی ایک نرنگی اپنی ساری آبرو ڈبو کر اب اس سے باہر کو دسکنے کے لئے بے قرار پر بے اختیار

ایران! — خاموش و پراطمینان و بُردبار

افغانستان! — حیران و پُر ہیجان و بے اعتبار

عراق! — گرفتار بیدار و بیزار

فلسطین! — انگریزی یہودیت کا لشکار

ہسپانیہ! — محض سُست رفتار

ہنگری! — اقلیتوں کی اقلیم ننگ و تار

اور ب سے نیچے اور ب سے نیچے اسی کی آخری تختی میں جس میں ہر اور ٹائے کی حکومت ہے؛

ہندوستان! ——— وحدت کو کثرت سے پس پا کرنے والا نوجوان پرستار

آؤ بھیکیں کہ ۱۹۲۹ء میں دنیا کے ان ملکوں میں کیا ہوا۔

انگلستان کو وہ نہیں سمجھتے جو کہتے ہیں کہ انگلستان کا دن ہو چکا جس ملک نے ہندوستان کے موتی اور جواہر اپنے قبضے میں کر رکھے ہیں وہ پورا زمانہ شناس جو وہ وقت پر بالڈون سے بے بال و پٹ شخص کے بے سود ہوجانے پر ریزے سے میکڈالڈ سا پرہو آؤمی سپدا کر دیتا ہے اور ہاتھ سے جاتی دنیا کو اپنے ہاتھ کے کرتب سے پھر اپنا بنا لیتا ہے، گذشتہ مزدوروں کے جانے کے بعد جب قدامت پسندوں نے پھر اپنا بوسیدہ اصول بجا نا شروع کیا تو دنیا کے عقلمندوں نے سرگوشیاں کیں کہ دیکھا انگلستان ہی پرانی لغویت کی پوٹ مگر نہیں انگلستان نے ان کے عقل کے ترازو کو ہل ثابت کیا، یاد مزدور حکومت پھرائی اور اس شان کے ساتھ کہ گویا وہ ایک "تعلیمی" حکومت تھی مگر اس نے سب کثیر دل کے منصوبے مٹی میں مٹی کیے تھے اس کیورپ میں مسئلہ تباہی و ان جنگ امریکہ میں مسئلہ عرب و مقابلہ مصر میں مسئلہ آزادی اور ہندوستان میں مسئلہ سول راج کو اس لیری اور سچائی سے حل کرنے کی ٹھانی کہ دوست دشمن سب نے ایک زبان ہو کر احسن و مرجہا کہہ دیا۔ روس کے افغانی کی طرف اس ماری سے پھینکا گیا۔ ٹھکانا اس کی بے روزگاری کی گتھی کو سلجھانے کے لئے اپنی تدبیر کا ناخن کام میں لگایا کہ زیادہ نہ ہو لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو جائے۔

امریکہ کو ابھی آئین اقوام سے بے نیاز اور بالا بالا رہتا ہے لیکن یہی وہ ملک ہے جہاں صلح و ترقی کی تازہ ترین ایجادیں ہوتی ہیں۔ یہیں معاہدہ کیلگ تجویز ہو کر نچتہ ہوا۔ انگریزی وزیر اعظم جبرئیل مصالحت کا پیغام لئے ہوئے ہیں آیا اور یہاں سے خوش گیا۔ مادی خوشحالی کی چال ہے کہ اس وقت اس ملک میں ایک کروڑ نے لاکھ ٹیلیفون ہیں اور ہر تیسرے گھر میں لاسکی کا آلہ ہزاروں میل کی خبریں اور آوازیں صبح و شام بتاتا رہتا ہے، یورپ کے نظریے باز کا نپ ہے ہیں کہ امریکیت کا اثر دامن کھو لے یورپ کی تہذیب پھینک دیا جائے وہ کہتے ہیں امریکیت کے معنی "ماخصیت" زندگی کی "مقداریت" "مشینیت" اور محض "معیاریت" ہیں اپنی سیاسی یکسانیت اور حاشی فوقیت کی وجہ سے امریکہ یورپ چھایا جا رہا ہے اور اس امریکی جانور کے بچے بچا جادو دنیا میں اپنا سر نکال رہے ہیں — خیر اور کچھ نہ ہو پھر بھی بچے اک دل بہلا دلا ضرور ہوتے ہیں۔

جرمنی سے انگریزی فوجی نکل آئی اور فرانسیسی اور چھ ماہ میں گھروٹ آئیں گے جرمنی آزاد ہو رہا ہے، وہاں کی شبانی تحریک میل وقت ۲۱ سال تک کی عمر کے ۴۴ فی صدی جرمن شریک ہیں جن میں سے اکثر شراب تبا کو سے پرستار کرتے ہیں اور سادگی جبر کا شعار زندگی ہو گیا ہے، جرمنی نے اپنے اعلیٰ درجے کے قیدیوں کو سال میں ۴۴ روز رخصت کی اجازت دی ہے وہ کبھی کسی بیرونی آجریں کا کام کر سکتے ہیں اور قیدیوں کے انتظام میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے، گذشتہ جنگ کی یہ مغلوب قوم گئے سال اپنے فاتح انگلستان پر ساری کسرتی کھیلوں میں غالب رہی ایسی قسم اپنی گئی گزشتہ کامیوں تک تک لڑنے اور کس لئے کہ دنیا کے مستقبل میں اس کا حصہ بھی ہو گا اور وہ اک خاصہ حصہ ہو گا!

فرانس کو کوئی بیرونی کام نہ تھا سو وہ اپنی اندرونی حکومتیں بدلنے میں کچھ نہ کچھ مصروف رہا!

اطالیہ ابھی بدستور اپنے خدائے قمار کا پیروکار ہو رہا ہے آج کل جو نیکی ہے وہ بھی زبردستی کی ہم پالہ وہم نوالہ ہے مسولینی حکم دے گا گاندھی ابھی اپنے عقلمندانہ فکر کی آندھی مپا کئے ہوئے ہے اور اس عنونت سے کئی عفوئیں صاف ہوتی رہتی ہیں!

روس کے بڑے بڑے پڑنے دشمن بھی اسٹان گئے ہیں کہ وہ آج کل دنیا جہاں کا سب سے بڑا معاشرتی تجربہ گاہ ہے۔ وہ حیرت انگیز ملک

جہاں اس وقت ۴۹ مختلف زبانیں ۸۲ اجدگانہ قومیں اور ۴۸ بڑی ریاستیں مل جاتی رہی ہیں۔ وہاں اداو باہمی کی انہنوں کے اس وقت تین کروڑ پچاس لاکھ ارکان ہیں اور دس بارہ سال کے عرصے میں ان پہلے کی نسبت دگنے زیادہ مرد اور لڑکی زیادہ عورتیں تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں + پھر کون کہہ سکتا ہے کہ روس جہنمی ہے ؟

چین میں کومن ٹانگ 'جماعت نے اپنے سردار اعظم چیانگ کے شک کی 'قومی ٹانگ' سے سوئے موئے چین کو بیدار کر دیا ہے اور وہاں دھڑا دھڑا ترقی کا کام ہو رہا ہے۔ سرٹکیس پل جہاز بجلی ہو ابازی ہے اور امریکی اور جرمن استاد ہیں۔ مگر کچھ کناے آگاہ ہے۔ اب دیکھئے کیا ہو !

ترکی ترقی کا ہم رکاب ہے، جہاں اپنا فائدہ ہے وہاں دشمن کا بھی بلا سے ہوا کرے لیکن جہاں اپنا نقصان ہو وہاں پر لے دوستوں کی دوستی بلائے طاق۔ ملکی صنعتوں پر زور ہے رسم الخط بدل گیا اور خلافت کا کھڑا اب فقط ہندی مولویوں کی ڈاڑھی کا آوارہ سافر ہے اور اس کا تنہا کام ساردا اکیٹ کی مخالفت ہے اور بس حق مغفرت کے عجب ایمان دار ہیں !

مصر کے لئے اس کے تو تیغ اور عربی اور کامل اور زرا غلول نے جو خاک و خون کی ندی بہائی تھی مزدور حکومت کے ہاتھوں اس کی آبیاری سے اس کا لالہ صحرا خوب رنگین و شگفتہ ہونے والا ہے !

ایران نے جہنمی اور سوڈین سے محاذ بے کئے اور خاموشی سے راضی ہو رہا ہے۔

افغانستان کی جمالت امان اللہ کی جلد باز عقل سے زیادہ نادرا لوجہ و نکلی۔ اب خدا نادر خاں کو اس کے پیچھے سے پچائے رکھے !

عراق - یکے کے کچھ دنوں خاموش ہے !

فلسطین میں ۶ لاکھ عربوں کا پلہ ہلکا ہے کیونکہ اس کے مقابل میں ۶ لاکھ یہودیوں کے ہاتھ میں لارڈ بالفور کے دست مبارک کا ایک مسودہ محفوظ ہے جس کا ایک ایک حرف لےنے کا ساختہ اور خون سے پرداختہ ہے۔ لے اہل کتاب عربوں کے غتاب سے بچنا !

ہسپانیہ میں ایک نئے جمہور کش آئین کا آئینہ پیش نظر ہے +

منچوریا نے ہندوستان کی سواراجی حکومت کا رستہ آسان کرنے کے لئے حکم دے دیا کہ وہاں کے پانچویں صدی یہودیوں کو

دارس میں پانچویں صدی سے زیادہ تعلیم نہ دی جائے !

ہندوستان جو کبھی کنج امن و ایمان تھا آج ایک جگہ شک و ہیجان ہے اور کیوں نہ ہو وہ جس کے ہاں گاندھی سہموتی اور جواہر سے لال اور ٹیگور سے اقبال جگمگ جگمگ کریں وہ کب تک سکون کو جو موت کی تاریکی ہے دل میں جگمگ رہے وہ اسے کیوں علم و عمل سے جو زندگی کی روح ہے روشن و پرنور نہ کرے۔ آرام ہو چکا اطمینان ہو چکا۔ اب کام ہو گا کام، بے چینی ہوگی بے چینی اور کیونکر نہ ہو جب مزدور حکومت کا دل ہماری حالت دیکھ کر سوچ جائے تو کیا ہمارا اپنا دل ہی ایسا ہے کہ گدا زوگدا زتر نہ ہو ناجائز۔ ہاں ساتھ ہی ضرورت معروفت میں سوچ بچار کی ہے خواہش میں صبر کی اور کام میں استقلال کی۔ اگر آہستگی موت تھی تو جلدی بھی جہنم کو لے جاسکتی ہے سو خبردار ۱۹۳۰ء سائنس والی ہڑتال سے شروع ہوا پھر اس نے گاندھی اور واسٹھ کے گولڈا کرانہیں ٹیل کے ہاں چائے پلائی پھر جواہر لال کو کانگریس کا صدر منتخب کیا جس پر انگلستان کی دُور اندیش حکومت نے ہمیں نوآبادیوں کی یہی حکومت

دینے کی جھلکی دکھائی پھر ٹلکمیٹی کو ہندوستان کے مفروضہ اتحاد سے ڈرا کر ریاستی اور برطانوی ہند کی دوئی کا شاخسانہ کھڑا کر دیا۔ پھر مزدور کشش کے پاؤں میں چکر ڈال دیا۔ اُدھر چند راداس نے بھوک ہڑتالیوں کا قومی دل سردار بن کر عدم کی راہ لی اور اُدھر اسمبلی میں ہم چھینکنے والوں نے عدالت میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کر کے چار دانگ عالم میں تملکہ مچا دینے کی ٹھان لی یعنی یا مردہ بولے نہ اور یا کفن بھی پھاڑے۔ اچھا بھئی کفن کوئی منگی شے نہیں تم گئے تو پھر بھی شاید مغت ہی مانچٹرسے مل جائے! ہندوستان میں اب قطعی بیداری کا زمانہ آ گیا ہے۔ اس ملک نے اب سمجھ لیا ہے کہ نرے کا مذہبی کے چرنے اور قدیم ہند کے سے ٹوٹنے ٹوٹنے سے موجودہ دنیا میں ترقی کی صورت نہیں۔ اپنی میثیت کو بھی قائم رکھو لیکن دوسروں سے بھی سیکھو جو کچھ سیکھنے کے قابل ہے۔ نئی ہندی تہذیب مجموعہ ہو گا نئے پرانے علوم و فنون کا، عطر و گلاب وید اور قرآن اور انجیل اور گرنہ اور زندہ اوستا کے پھولوں کا اور سست رفتار بھائیو اور نیز رو دو ستوا یاد رکھو کہ سیاست کے طوفانی سمندر میں تماراری کشتی کے لئے ضرورت ہے نہ صرف اُن کے بازوؤں کی جو چٹو چلانے والے ہیں بلکہ اُن کے ہاتھوں کی بھی جو تپو ارتھانے والے ہیں! اور خدا تر سوا اور رسم پرستو! اگر تم خدا کے بندے ہو، وطن کے خادم ہو تو اپنے اعتقادات کو صیقل کرو اپنے بوسیدہ رسم و رواج کو جلا کر بھسم کرو و تاریک لوں میں علم کی روشنی پھیلاؤ اور مست عیش پسندوں کے رگ پیسے میں کام کی سجدیاں ڈرا دو۔ اس کے بعد صبر کرو اور انتظار کرو قومیں اور طبیعتیں کہیں بنتے بنتے بنتی ہیں!

نقلی دنیا کے ملکوں میں تو یہ کچھ ہوا اب آؤ دیکھیں کہ اصلی دنیا کے لوگوں میں کیا ہو رہا ہے؟

انسانیت اور اُس کی تحریکات! یہ ہے دنیا کا حقیقی نقشہ!

اس وقت دنیا میں تین بڑی تحریکیں عمل میں آرہی ہیں۔ علوم و فنون کی تحریک، آزادیوں کی تحریک، وسعت و معاونت کی تحریک اور تینوں تحریکیں زندگی کے ہر شعبے میں بیک وقت اثر انداز معلوم ہوتی ہیں۔
یہ علوم کے کرشمے ہیں کہ ہوا باز گھنٹے میں ۳۵۵ میل چل سکتا ہے اور نیو یارک سے فرانس کو تنک کے ۲۸۲۲ میل ۲۹ گھنٹوں میں اور انگلستان سے ہندوستان تنک کی ۳۰۴ میل کی مسافت بلا توقف ۲۰ گھنٹوں میں طے ہوتی ہے۔ یہ اُن لوگوں کے کارنامے ہیں جن کے ہاں ایک مسٹر پبلر کمیرج یونیورسٹی میں کیمیا وغیرہ کی ترقی کے لئے اپنی جیب سے دو لاکھ پونڈ کا عطیہ پیش کر سکتا ہے اور برطانوی حکومت قوم کے لئے تین تصویریں تقریباً ڈھائی لاکھ میں خرید کر خوش ہوتی ہے اور فرانسیسی اکادمی کے ارکان ”غیر فانی“ پکائے جاتے ہیں!

یہ آزادیوں کے کرشمے ہیں کہ اس وقت برطانوی دارالعوام میں ۱۴ عورتیں ارکان ہیں اور اُن میں سے ایک عمدہ وزارت پر تنک۔ جنوبی افریقہ کے قطعی کالے لوگوں کی قومی کانگریس اور افریقی حقوق کی لیگ اپنے مطالبات پیش کرتی ہیں۔
دول متحدہ امریکہ میں اب ”جیشی تاریخ“ پڑھائی جاتی ہے اور وہاں کی یونیورسٹیوں سے ہر سال دس ہزار جیشی تعلیم پا کر نکلتے ہیں اور مغرب امریکیوں کی سفید کانگریس میں ایک جیشی رکن بھی ہے! چین میں عورتیں تعلیم اور طب اور سیاست کے

عکلوں میں حصہ لے رہی ہیں اور یہ کیا ہندوستان میں شریف ہندو عورتیں ہزاروں کی تعداد میں خوشنما لباس پہنے بیسیوں مفید کام کرنے کو نکل رہی ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے چند مسلمان خاتونیں بھی اپنی بھولی بھٹکی قوم کی تیج و پکار کے باوجود کچھ نیم پردے میں کچھ پردے سے باہر نہ صرف خدا کی دی ہوئی ہوا اور روشنی سے حظ اٹھاتی ہیں بلکہ گاہے گاہے انسانیت کے لئے اپنی ننھی سی ناچیز خدمات بھی پیش کر رہی ہیں!

یہ وسعت و معاونت کے کرشمے ہیں کہ انجمن اقوام ابھی قائم ہے اور کچھ کام کر رہی ہے۔ ڈاکٹر برنارڈ رو کے تیم فائے میں سے جو دنیا کا سب سے بڑا کتبہ کہلاتا ہے ایک لاکھ سے زائد بچے مفید شہری بن کر نکلے ہیں اور اُس کے دروازے ہمیشہ ہر بچے کے لئے کھلے ہیں۔ لندن میں سکاٹ لوگوں کا پچاس ہزار کا مجمع منعقد ہوتا ہے جس میں ۲۴ ملکوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے دوستی کے تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح گانڈا لڑکیوں کی مل کر کام کرنے کی انجمنیں اپنا کام کرتی ہیں۔ لندن کا لارڈ میر مصیبت زدہ کان کنوں کی امداد کے لئے جو فنڈ کھولتا ہے اُس میں پونے نو لاکھ پونڈ جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لندن کی خیراتی انجمنوں کی فہرست اٹھا کر دیکھئے کہ رعشہ زدوں کی انجمن اور غرب اندھوں کے خبر لینے والوں کی انجمن اور بچوں کو والدین کے مظالم سے بچانے والی انجمن اور پھر سپاہیوں کی اور جہازرانوں کی اور خدا اُن پر کیوں رحم نہ کرے اور رحم و تعلیم و مشورت کی سینکڑوں امدادی انجمنیں کہ جن کا بیان بھی ہم کچھ نہ کرنے والوں کے لئے سوا بان روح ہے!

اس کے بعد کون کہے گا کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا ترقی پر نہیں؟ کہا جاتا ہے کہ اس وقت دنیا میں تین کروڑ مسلح آدمی موجود ہیں پھر صلح و آشتی کا ذکر لا حاصل ہے! بے شک یہ تین کروڑ تیر تغلکی تو بچی ہیں اور ضرور ہیں بلکہ ان کے ساتھ ارب ڈیڑھ ارب جاہل و اجہل اور لوگ بھی ہیں۔ لیکن یہی تیر تو ہیں یہی جہل و تقصیب تو ہیں جن کے اندر سے، خود انہیں کے قلع قمع کرنے کے لئے ان کے نامناسب جوش و خروش کو مناسب ہمت و شجاعت میں بدلنے کے لئے کیلنگ اور ہوورا اور میکڈالڈ اور مصطفیٰ کمال اور ٹیگورا اور گاندھی پیدا ہوئے! یہ کشمکش ہمیشہ سے جاری تھی اور ہے اور ہے گی اور خدا اگر سے زیادہ ہی زیادہ ہو۔ ہاں یہ ہو کہ جہاں یہ لڑائیاں ہاتھ پاؤں کی تھیں، خاک و خون کی تھیں، جسم و جان کی تھیں وہاں یہ لڑائیاں محض دل و دماغ کی ہوں، روح و اصول کی ہوں۔ جہاں یہ جھگڑے ملکیت کے تھے وہاں محض یہ اختلافات محبت و معاونت کے ہوں جس سے ہر ایک فرد چند قدم اور سب انسان مل جل کر ہزاروں کو س میدان زندگی میں بڑھیں اور بڑھتے چلے جائیں!!

ب

۹ وطن کاراک

اے ہندو! پڑا نے نام و نشان والو اے مُسلمو! دلیرو! اے آن بان والو
سکھو! خدا پرستو! تیر و کمان والو عیسائیو! جوانو! اے عز و شان والو

بن جاؤ بھائی بھائی ہندوستان والو!

صد حیف ہے تم اب تک غفلت میں سو رہے ہو جو وقت کام کا ہے وہ وقت کھو رہے ہو
کیوں آبرو کو اپنی آپی ڈبو رہے ہو اپنی ہی کھیتوں میں کیوں چھوٹ بول رہے ہو؟

اک قمر ہے لڑائی ہندوستان والو!

اے ہندو! کہاں ہے دریا دلی تمہاری؟ اے مُسلمو! کہاں ہے حق آگہی تمہاری؟
کیا ہو گئی ہے سکھو! اب جان ہی تمہاری؟ عیسائیو! محبت کیا مٹ گئی تمہاری؟

ہوتی ہے جگ ہنسائی ہندوستان والو!

چھوڑو نیند اپنی اٹھو جو دم میں دم ہے منزل بہت کٹھن ہے دوڑو کہ وقت کم ہے
غفلت تمہاری کیا ہے اپنے پر اک ستم ہے عشرت تمہاری کیا ہے وجہ ہزار غم ہے

ہے کاہلی بُرائی ہندوستان والو!

جکڑے ہوئے ہو جن سوان بندشوں کو توڑو تم قید میں ہو اپنی اٹھو یہ قید چھوڑو
رشتے جو مدتوں سے ٹوٹے ہیں اُن کو جوڑو کھانا الگ ہو جن میں اُن برتنوں کو توڑو

دل کی کرو صفائی ہندوستان والو!

وہ دن گئے تمہارا جگ میں تھا بول بالا وہ دن گئے کہ تم سے دنیا میں تھا اُجالا
اب ایسی آفتوں سے آکر پڑا ہے پالا بکھری ہے دانہ دانہ ہو کر تمہاری مال
صدیوں کی وہ کمائی ہندوستان والو!

اٹھو سمیٹو اٹھ کر بکھرے ہوئے یہ دانے اک بار پھر دکھا دو دنیا کو وہ زمانے
دنیا میں جبے یکتا ہندوستان کے سیانے جنت بنا دیا تھا جب ہند کو خدا نے
جب سبھے بھائی بھائی ہندوستان والو!

ہوتا نہیں ہی کیا کچھ دنیا میں محنتوں سے ممکن نہ ہو جو، وہ بھی ممکن ہی مہنتوں سے
پالو سرتوں کو اپنی مشقتوں سے اپنا بنا لو سب کو اپنی محبتوں سے

خدمت میں ہی بھلائی ہندوستان والو!
دیکھو تمہاری حالت کیا کچھ دکھا رہی ہے سیکھو تمہاری فطرت کیا کچھ سکھا رہی ہے
جاگو تمہاری قیمت تم کو جگا رہی ہے دوڑو خدا کی قدرت تم کو بلا رہی ہے
ہے جوش پر خدائی ہندوستان والو!

کام آئے گی نہ ہرگز دشمن کی اب شرارت ہوگی نصیب سب کو اب دوست کی زیارت
علم و عمل کی دولت پائے گا اپنا بھارت چمکے گی اپنی قسمت سن لو مری بشارت
اب تم ہو اور رہائی ہندوستان والو!

ب

گول میز کا تفرس

کیا کہیں اس ہمہ گیر سیاست کے بے پناہ نئے کوجب کہ بمصادیق ہر چیز کہ در کان نمک فٹ نمک شہر چیز اگر سیاسی نہیں تو نیم سیاسی ضرور ہے۔ اگر اُسے سیاسیات سے براہ راست واسطہ نہیں تو کم از کم اُس کے طور طریقوں میں سیاسیانہ انداز ضرور ہو سیاست کیا ہے؟ اک و سرنام سبے چینی اور ناشکری کا ایک بہانہ لڑنے جھگڑنے کے لئے، زندہ رہنے کی ایک ترکیب، بس یہی ہے سیاست۔ اب غور سے دیکھئے کہ علم و ادب میں بھی جن میں بمقابلہ سیاست کی گرج بخشی کے قابلیت کی سرودھری ہونی چاہئے تھی آج کل کیا کچھ ہو رہا ہے؟ مناظرہ اور مباحثہ تک کا مقابلہ تو خیر یہاں جائز تھا بلکہ ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ اب کاروباری مہارت علمی و ادبی مہارت اور مصوراتہ مخالفت بھی خدا کے فضل سے شامل حال ہو گئی ہے۔ یہ کیا ہے سیاست کا اثر علم و ادب پر۔ اس کی وجہ مختصر یہ کہ چونکہ ہم ادیبوں کے لئے سیاسی مصل میں ادب کے تعظیم و تکریم نہیں چھوڑ دی جاتیں علم و ادب سے ہماری قابلیت کے آگے سر نہیں جھکا دیتے جاتے اس لئے ہم چرلغ پا ہو کر اپنی اک یوں کئے کو ادبی لیکن کام کرنے کو اک ڈیڑھ اینٹ کی الگ سیاسی انجمن کھڑی کر دیتے ہیں اور اُس میں تازہ ترین سیاسی و تمدنی طریقے و خوب لڑتے جھگڑتے ہیں اخیر خدا کا شکر ہے لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں مگر کچھ کام تو کرتے ہیں۔ خدا بچائے ہمیں ایسے امن و امان سے، ایسے روشن سکون و اطمینان سے جو خون کو رگوں میں اور نٹنوں کو دل میں بچھ کر دے!

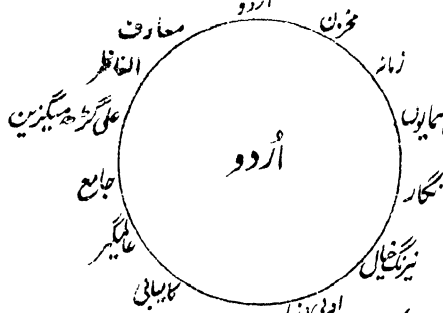
میں انہیں خیالوں میں غرق نہیں نہیں فقط ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ کسی نے گویا اسلکی کے ذریعے سے مجھے کسی فلک نما کوہستان میں پہنچا دیا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عدلے جبار کا نہیں یہ تو وہی مولانا محمد حسین آزاد والا دشوار گزار پہاڑ ہے جس کے اوپر سے بجائے نیرنگ خیال والی شنوائی کے ڈھولک اور طبلے کی سی آواز سنائی دے رہی ہے اور جس کی چوٹی پر بجائے ایک بقائے دوام کے غالباً صرف ایک شہرت عام کا (مگر) دربار خاص منتقد ہونے کو ہے + ایک ہلکی سی پکار میں ہمایوں کا نام بھی سنا گیا سو داخل ہو کر کیا دیکھتا ہوں کہ بجائے حضرت آزاد والے وسیع و شاندار ایوان کے اک تنگ و مختصر لیکن روشن و ہوادار کمرے میں ایک گول میز لگی ہے جس پر لکھا ہے ہندوستان اس کے گرد کوئی ایک درجن منجھلوں کا اجتماع ہے اور ہر ایک کے گلے میں ایک ایک گویا سیاسی ٹکٹ جس سے شاید ان کا حسب نسب معلوم ہو سکتا ہے ٹکٹ رہا ہے اور وہ یوں بیٹھے ہیں:

صدر دہلی نمائندہ کامیابی! دساری پرانی نظامیات کی طرف سے بھی کوسبے نیا
حیدرآباد صدر اردو!

باہر کے دروازے پر کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ! اور آوازیں دروازہ کھولو! ناظرین سامعین بن جاتے ہیں! بعض صدر کی طرف حیرت استعجاب سے دیکھتے ہیں!

صدر۔ فی الحال دروازہ کا غلانی پردہ چھوڑ دیا جائے لیکن اگر مسلسل کھٹ کھٹ کے ساتھ اور نعرے بھی مستقل طور پر سنائی دیں تو مستقل مزاج کو اس توہی مجلس میں آنے کی اجازت دی جائے گی (بعض حاضرین ہانک بھونچڑھاتے ہیں) حضرات ایاد رکھئے یہ ایک جمہوری مجلس ہے۔ آپ میں سے کوئی صاحب بلکہ سب کے سب میرے سمیت بھی کسی کو باہر کھڑا رہنے پر مجبور نہیں کر سکتے ناظرین کی طرف سے تجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں آپ سب صاحبوں کو مطلع کر دوں کہ اس گول میز میں مستقل میز ہونے کی قابلیت موجود ہے۔ (اس "استیصال" پر سامعین میں قیل وقال ہونے لگتی ہے!) +

لہذا آج کے اجلاس کے بعد میں غور کروں گا کہ اور کسے اندر آنے کی اجازت دی جائے۔ ممکن ہے ہماری کوتاہی سے بعض ایسے اصحاب باہر رہ گئے ہوں جن میں ہونا برابر واکے چکنے پکنے پات ہونے کی صلاحیت ہے۔ میں اس امر پر بھی غور کروں گا کہ اندر آنے کی اجازت نہیں، کا تختہ باہر کے دروازے سے ہٹا لیا جائے اور ہم لوگ ایک عام ملکی لسانی کانفرنس منعقد کریں جس میں اردو کی طرف سے ہندی پسند دوستوں کو بھی دعوت دی جائے! اور نعرے تحسین و علامت چلیں یہ جیسی! اتنے میں میں دیکھ رہا تھا کہ اب میز کی صورت یہ ہے:



اور ان میں کچھ ذرا پرانی مگر زیادہ تر نئی وضع کے لوگ ہیں بعض ہیں کہ عام سے پہنے ہیں اور ریش دار بھی ہیں لیکن اس ریش کے اندر ہی اتنی صفا چٹ زبانیں سمجھنے بولنے کے مدعی ہیں کہ پتلون کوٹ والے تک شرمندہ ہوں! پھر جو صدر کی تقریر سے بے اعتنا ہو کر میں نے اپنے ہم میزوں کی وضع قطع کی طرف توجہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ

کوئی ہندوستان بھر کا نقشہ پہلو سے لٹکائے ہوئے ہو اور اس کے ایک کونے میں کچھ لکھا ہے جس میں صرف "صحیفہ" پڑھا گیا کسی کے عامہ معرفت کے بیچ و تاب میں ادھر بیچ فلسفہ ہے اور ادھر تاب مذہب! کسی کا اس قول پڑل ہے کہ خیر زمانہ باتوں سانہ تو بازمانہ مبارز

کوئی صرف اپنی نظر سے خوش گذرے "میں مست ہو کر" مبعثر اندھا ہوں "سے کسی کے خیال میں گم ہے کسی کی کوئی سنے نہ سنے گم وہ خواہ مخواہ واعظ بن کر زبان حال ہی سے یوں سرگرم تقریر ہے کہ "دو روزانہ چال قیامت کی چل گیا" کوئی اپنے چھپے میگزین سے "علیگی" کاغذ کی طالب علمانہ گولیاں برسا رہا ہے۔ کسی کے نقش و نگار میں ریاستِ تخریر اور جوابِ استفسار کا بھاری بھر کم فوار ہے۔ کوئی معنوی حیثیت سے تقریباً جامع معلوم ہوتا ہے اگرچہ صوری نقطہ نظر سے مانع نہیں! کسی کی ساری حکمت اسی میں صرف ہو رہی ہے کہ وہ اپنی انتہائی نیچنگیوں اور سالانہ فتنی دعوے داریوں سے ہر کم و کم کو حیران و مبہوت کر کے اپنے قابو میں کر لے!

کوئی جن کامیابی کے پر لگائے کاروباری بین سودا کی چوٹیوں اور ادب کی چوٹیوں سے علم کے آسمان تک پہنچ جانے کے لئے کوشاں ہو کسی نے نیزنگی کے مقابل میں عالمگیری کو اپنا طمع نظر نہ لیا ہے۔ کوئی ہندوستان سے گذر کر زمین کے دونوں کُرسے ایک اس کان سے دوسرا اس کان سے لٹکا رہا ہے کہ وہ دنیا کے ذریعے سے ادب کی ادب کے فیض سے دنیا کی خدمت خلوص و فادہ و حرج عبادت کے ساتھ کرے کاتاج اپنے اور زبان و ملک کے سر پر رکھنے کا متناہی ہے! اور ان کوئی "اور کسی" کا صدر وہ ہے جسے اپنی "اردویت" کا دعویٰ نہیں لیکن جس کا خاموش و گویا اعلیٰ اُسے خود بخود اس انجمن ادب کا صدر بنائے ہوئے ہے اور یہ صدارت ہی اک ایسی شے ہے جس کا سب کو کم از کم دل میں متفقہ اعتراف ضرور ہے! میں اس ناک جھٹاک میں مصروف تھا اور ان صورتوں پر دوبارہ بارہ بارہ نظر ڈالنے کا آرزو مند تھا کہ پھر باہر سے کھٹ کھٹ کھٹ کی آوازیں آئی شروع ہوئیں یہ کہ سالانہ نمبر عید نمبر لقرعہ نمبر افسانہ نمبر مستانہ نمبر بہار نمبر بے شمار نمبر!

حاضرین میں اک کھلبلی سی پر لگی۔ صدر نے پہلے تو اس بے سنگم شور و غل کی طرف ایک تہہ بے توجہی برقی لیکن جب دیکھا کہ اس سے کام نہیں چلتا تو "خاموش خاموش" کا پُرزور جملہ کہا لیکن پھر بھی بعض بولا کئے اور بعض تو اور زیادہ زور سے چیخنے چلانے لگے یہاں تک کہ ان فصحا میں سے خزن نیزنگ خیال عالمگیر ادبی دنیا اور اخیر میں ہمایوں بھی یہ کہہ کر اٹھ بیٹھے اور اٹھ کے دروازے کی طرف لپکے کہ اردو ہمیں عزیز ہے لیکن اپنے سالانہ سچے کچھ کم عزیز نہیں ہیں! اور جب باقی ماندوں نے کچھ تشویش و اضطراب ظاہر کیا تو باہر سے صرف اتنی آواز سنائی دی کہ پھر ملیں گے اگر خدا الایا! — گھر پہنچ کر ہمایوں جی ہی جی میں کہتا ہے اے میرے خدا! اب تو ہی ہم سب کے دلوں کو ملائیو!

اقبال منزل کی نشست گاہ میں داخل ہونے پر نگاہِ حسن تلاش کے لئے دو مقناطیس ہیں۔ دائیں طرف ایک نقطہ ہے جس میں خوشنویسِ ازل کا نام یعنی

اللہ

بڑی شان سے ہویدا ہے اور بائیں طرف ایک تصویر ہے

یعنی یہ ←

اللہ کی بندی

ان دو کو نہ دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ انہیں دیکھ کر دوبارہ نہ دیکھنا قطعی ناممکن ہے۔ اس بتِ ہندی کی ادنیٰ انخوت یہ ہے کہ انسان اللہ سے منہ موڑے تو پھر اسے دیکھے۔

یہ تو یہ نہیں کہ یکسی کی تصویر ہے یا محض مصوٰر کی ذہنیت میں صنفرِ نازک کا خیالی معراجِ کمال ہے مگر دنیا دیکھنے والوں کا دل یہ ضرور کتنا ہوگا ع

بہشت را چہ می کنم بتا بہشت من توئی

آکاش کے جوگی کی سُرگ اُس کے اپنے دل میں ہے مگر اس تصویر سے اتنا وہ ضرور کہے گا۔

”کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوگی یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا مصوٰر سی پیچھے رہ گیا ہو! تو جوگی اور ضرور اپنی اس تصویر سے بڑھ چڑھ کر ہوگی۔ لے سرخ زیا! اس تصویر میں تیری صرف ایک جھلک ہے۔ ہاتھ، ملاں، بالاکھ میں اور وہ دو میٹھے پڑوسی یعنی تیرے ہونٹ بس بلا ہی جاتے ہیں، تم باذنی کہنے کو ہیں مگو کمال تو خود کو کمال تم سے خود کو ناز کا یا اختصار؟ اس میں تیری خوشبو کدیں تیری لنگو کمال؟ مسوٰر نے دما سا کچھ دکھلا کر کیا کیا نہیں چھپایا؟ کس قدر تجھے دکھا کھا ہے؟ مگر مصوٰر سچا تھا۔ ورنہ جو بجائے تیرے لباس کی نذر نہ دلفریبیوں کے خود تیری گلکاری کی شریعت کی داد دیتا، جو تیرے رنگ کی رونق کو، تیرے روپ کے فروغ کو یوں نہایت کرتا تو تو لے برقِ مسوٰر خدا جانے کہاں کہاں گرتی؟ لے ناز آفریں! تیرا حسن بچائے خود ایک خدائی پیغام ہے مگر اس کی ترجمانی کا وقت نہیں ع خراب بادِ لعل تو ہوشیار اندک کاراگ کوں شروع کرے اور اُس کے سننے والے کتنے ہیں؟ مگر باں یقین رکھ کہ تو جہاں کہیں بھی ہو دنیا تیری غزل خواں ہے۔ لے اب لے پری رخسارِ حافظ! ہمایوں میں یہ سفر تجھے مبارک ہو مگر اپنی سرخ تلک والی ہنوں کی طرف ایک پیغام پہنچی جا۔ انہیں کہہ دے کہ گنگا والے تو مرنے کے بعد اپنی چلی رکھ گنگا میں ڈبو تے ہیں مگر اللہ والے جیتے جی اپنی آبرو گنگا میں بہا چکے ہیں، اب ان سے غصہ کد مفضل ہے۔ انہیں کہہ دے کہ برسوں تو خود دیکھ چکی ہے کہ ان کی آنکھیں اس شرم سے جھکی رہتی ہیں کہ ان کے دلوں کی امنگ کہ ہندوستان کی سیوا کریں پوری نہ ہوئی۔ کہہ دے کہ تیرا سرا ہیں کہ چھوٹ مٹانے آئے تھے مگر خود اچھوت بن کر رہ گئے اور ان کی انتہائی ندامت یہ ہے کہ جو کام انہوں نے شروع کیا وہ پورا اب کسی اور سے ہوگا۔ یہ سب کچھ کہنا اور پھر اپنی ہنوں سے پوچھنا کہ اپنوں کو غیر کب تک بناتی رہیں گی۔“

آکاش کا جوگی

یہ لیکر کاتیرا تھا ہے۔ نیرا ناز وہ ہے۔ دائیں بائیں مغال جس طرف سے دیکھو، کمرے کے جس حصہ سے دیکھو پروم شد غالب کے ہاں شکر کی مصداق ہے۔ دل سے تیری نگاہ جگمگ اتر گئی۔ دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

جڑائے ہمت

کسی جوانمرد کا مقصد بڑی بڑی طرح اُس سے پیش آیا
وہ ٹھٹھا یا کہ اُس کو بالکل تباہ و برباد کر کے چھوڑا
اگر قسمت نے دشمنی کی مگر وہ خاطر میں بھی نہ لایا
اگرچہ بے حال ہو چکا تھا مگر وہ شاکِ ہوانہ بے دل
ہزار صدے اٹھائے لیکن فرجِ جیس پر شکن نہ آئی

بڑی طرح اور حد سے بڑھ کر بڑی طرح اُس سے پیش آیا
وہ تھوڑا دھاک یا کہ اُس کو بالکل تباہ و برباد کر کے چھوڑا
اگرچہ طالع نے زک پہ زک کی مگر وہ خاطر میں بھی نہ لایا
اگرچہ پامال ہو چکا تھا مگر وہ شاکِ ہوانہ بے دل
ہزار آزار پائے لیکن فرجِ جیس پر شکن نہ آئی

مگر جب اس پر بھی حسبِ سابق نصیب کو گرم جوڑ دیکھا
تو وہ جوانمرد سراٹھا کر یہ چند الفاظ لب پہ لایا
بلا سبب ٹھٹھانے والے انسانے اچھی طرح سنالے
مگر تجھے او کمینہ پرور خبر بھی ہے کس سے چھپر کی ہے
نہ مانہ بھراس کو جانتا ہے کہ میں اپا ج نہ پست ہمت
سما کی رفعت سے تاسک میں کسی سودب کر نہیں رہا ہوں
ہراس بالکل فضول جب تک دفاع بے دوا کی سکتے ہیں
خدا نے چاہا تو وہ عوض لوں کہ خود را دل اُسے سرتا
جو ٹھان لوں آسمان کی بھی ستم کا پیشہ چھڑا کے دم لوں
یہ کہہ کے مردانہ دار فوراً و غاکے میدان میں در آیا
و غاکے میدان میں در آکر عمل کی تیغ دودم سنبھالی

اُسی طرح اپنے ناموافق نصیب کو گرم جوڑ دیکھا
نڈر نظر سے نظر ملا کر یہ چند الفاظ لب پہ لایا
بلا سبب تھوڑے تھانے والے انسانے اچھی طرح سنالے
جفا کے عادی ستم کے خوگر! خبر بھی ہے کس سے چھپر کی ہے
یقین ہے تو بھی مانتا ہے کہ میں اپا ج نہ پست ہمت
تمام عالم میں آج تک میں کسی سودب کر نہیں رہا ہوں
مجھے خبر ہے کہ مجھ میں اب تک طویل تاب مقاومت ہے
خدا نے چاہا تو وہ زک میں دوں کہ عاجز آ آ کے صلح چاہے
تری حقیقت ہی کیا، اے بھی غلامِ خدمت بنا کے دم لوں
بگڑ کے دیوانہ وار فوراً و غاکے میدان میں در آیا
و غاکے میدان میں در آکر عمل کی تیغ دودم سنبھالی

عمل میں بے شکست سہہ کر عمل کی رفتار تیز کر دی
عمل میں ناکامیاب ہ کر عمل کی رفتار تیز کر دی

یہ رنگ دیکھا تو خود مقدر گزارش عفو لے کے پکا
ادھر سے دنیائے کامرانی نثار ہونے کی خاطر آئی
ادھر سے سچی سرت آئی سکون جاوید ساتھ لے کر
ادھر سے اقبال کی نہایت ہدیہ داد لے کے پہنچی
یہ طاقتیں مل ملا کے اُسکو مدد کا مزدہ سنلے دڑیا
تمام غیبی اعانتوں کے هجوم نے اُس کو آن گھیرا
اور اُس کے ہمراہ لطف اور سفارش عفو لے کے لپکا
ادھر سے توفیق آسمانی نثار ہونے کی خاطر آئی
ادھر سے غیبی حمایت آئی خدا کی تائید ساتھ لے کر
ادھر سے اللہ کی عنایت پیام امداد لے کے پہنچی
مدد کا حق دار پا کے اُس کو مدد کا مزدہ سنلے دڑیا
تمام عالم کی طاقتوں کے هجوم نے اُس کو آن گھیرا

یہ بھیڑ دیکھی تو اُس نے ٹوکا فضول یہ جماع کیوں ہے
احاطہ کار میں نہ آنا صریح بے جا مداخلت ہے
کسی کا یوں ہرج کار کرنا کہاں ولہے کہیں نہیں ہے
ہجوم بے جا سے فائدہ کیا۔ ادھر ہٹو۔ اپنی ادھر چرو
فضول حرکت سے کیا نتیجہ فضول یہ اجتماع کیوں ہے
خیال اہل عمل بٹانا صریح بے جا مداخلت ہے
یہ کار جبر اختیار کرنا کہاں ولہے کہیں نہیں ہے
یہاں نہ میلانہ کچھ تباہی بڑھو بڑھو اپنی۔ اہ پکڑو

یہ سن کے وہ سب نے بے بولیں معاف کرنا، معاف کرنا، معاف کرنا
تکدر طبع تو بجا ہے، مگر ہمارا تو عذر سننے
زمانے کے اتنے ظلم سہنا، یہ کام انسان کا نہیں ہے
یقین ہے ایسی کڑی مصیبت پہاڑ کو پاش پاش کرنے
بصد بجا جت نہ بانیں کھولیں، معاف کرنا، معاف کرنا
ملا بھی غصہ بھی روا ہے مگر ہمارا تو عذر سننے
اور اُس پر اس طرح زندہ رہنا، یہ کام انسان کا نہیں ہے
ضعیف انسان کی کیا حقیقت پہاڑ کو پاش پاش کرنے

ہمیں فقط اس قدر بتا دو کہ "تم میں یہ بل کہاں ہے؟"
یہ غیر منطوق جوش بہت یہ عزم فتح کہاں ہے؟
حکیم آزاد انصاری

الذبیان

الذبیان میں حاضر ہوں۔

کیا کہا کہ اب تک کہاں تھا؟ الذبیان یہ نہ پوچھئے۔ کیا ارشاد ہوا کہ ضرور کہوں؟ الذبیان کیوں مجھ سے کھلو اتنے ہو؟ کوئی مولوی غصے میں آگیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔ میں ہیں یہ کیا ہوا؟ الذبیان تم تو خفا ہو گئے، میری تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ کیا کہا کہ مولوی کا لفظ سننا ناگوار ہے؟ مولویوں سے تنگ آ گئے ہو؟ مگر الذبیان انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اب تمہاری خاطر یہ لوگ چھوڑے تو نہیں جاسکتے! کیا کہا کہ کیوں؟ الذبیان تمہاری جانے بلا۔ نہ غمناکے کسی سے تعلقات، نہ باپ دادا کے وقت سے مراعات، تم اپنی بے نیازی میں مخمور ہماری کٹھن زندگی کو کیا سمجھو؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بدتر سے بدتر مسلمان بھی ایسا نا اہل ہو جائے کہ لحاظ، وضع بالائے طاق اور قوم سے غدار ہے؟ کیا کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے؟ الذبیان بڑی بھاری مشکل ہے۔ الذبیان تم اپنی تنہائی میں کیتھا کنبہ برادری، میل جول، شادی بیاہ، جلسوں اور جنازوں کا کیا اندازہ کر سکتے ہو؟ الذبیان سچ تو یہ ہے کہ خدا ہونا آسان ہے انسان بننا مشکل ہے۔ بازو جب ٹوٹے تو گلے سے بندھتا ہے۔ اب تو مار دیا چھوڑو! ان مولویوں سے ہمیں محبت نباہنی ہی پڑے گی۔ کیا کہا کہ کوئی اور بات کروں؟ اچھا الذبیان تھینک یو کہ تم نے اصرار نہیں کیا کہ بتاؤں کہ اب تک کہاں تھا اور ماں الذبیان عقل کی باتیں، نیکی کی باتیں تو جو لوگ تم سے روزانہ ملتے ہیں وہ ضرور سناتے ہی ہو گئے مجھ سے باتیں سننی ہیں تو میری لغویات سنو! کیا کہا کہ ہاں ضرور سنو گے؟ اچھا الذبیان! میں بھی کوئی بات چھپائے نہ رکھوں گا۔ الذبیان مسکراتے کیوں ہو؟ کیا یہ مطلب ہے کہ میں جھوٹ بولوں گا؟ کیا کہا کہ وقت ضائع نہ کروں اپنی داستان شروع کروں؟ اچھا الذبیان سنئے! مجھ پر تو یہ تمہارا احسان کیا کم ہے کہ تم نے محض میری خوشی کے لئے کتنے لاکھوں جھوٹ بولنے والے انسان بنائے اور پھر انہیں کیا کیا رتبہ دیا؟ نہیں الذبیان ناول نویس نہیں! وہ بچائے تو پھر کچھ سچ بولتے ہیں میرا اشارہ شاعری کے اُن شاہنشاہوں کی طرف ہے جنہوں نے کہیں نروان کا قلعہ آراستہ کیا، کہیں نناخ کی ندی جاری کی، کہیں یزدان اور اہرن کو ایک دوسرے سے بھڑوا دیا اور الذبیان یہ جھوٹ ہیں کس قدر پیائے؟ اور الذبیان وہ بھی تم نے بنائے جو تمہارے نام پر ہر وقت سائنس اور مذہب کا غنا کرتے۔ کو تیار ہیں۔ محض میری تفریح کے لئے؟ الذبیان کس قدر تم نے سوچا ہو گا؟ پہلے مجھے پڑھایا لکھا مارا۔

شوق دیا اور سوچنے کے قابل بنایا۔ اور پھر سمجھ کے کہ میرا مطالعہ بے لطف ہے گا تم نے مجھ سے ہزاروں سال پہلے ہا وہ لوگ بھی بنا دیئے جن کی باتوں پر سنتے سنتے انسان لوٹ جائے۔ امد میاں کیا کہا کہ غنیمت ہے کہ کسی بات سے تو کوئی انسان تم سے خوش ہے؟ امد میاں۔ میں تو ضرور خوش ہوں! کیا کہا کہ اور زیادہ خوش رہوں؟ اچھا امد میاں یہ بھی کوشش کروں گا مگر سچ تو یہ ہے کہ اور لوگوں کی طرح مجھے خوشی کی طمع نہیں۔ امد میاں بات یہ ہے کہ خالی خوشی سے تو وقت نہیں کٹتا اور انسان خوشی کو مضمک کس چیز سے کرے؟ اچھے امد میاں یہ بات تو بتا دو! امد میاں بس یہ بات کچھ نہیں کہ مطلب جب آتا ہے تو تم خاموش ہو جاتے ہو۔ کچھ تو ہوں ہاں کرو۔ اچھا امد میاں! خوشی کو مضمک کرنے کی معجون نہیں بتاتے تو ایک بات اور بتا دو یعنی یہ کہ کونسا پوڈر ملوں کہ تم مجھے خوبصورت سمجھو! سجدے والا ابٹنا تو بہت پانا ہو گیا۔ امد میاں! شرارت سے بھی تو چہرہ چمک اٹھتا ہے شرارت کا غارہ مل لوں؟ امد میاں! تم تو پھر چپ ہو گئے! کیا کہا کہ کوئی اور بات کروں؟ اچھا امد میاں کوئی اور بات کروں گا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ تہناری کا نفیڈ نشل (Confidential) باتیں ہیں کہ انسان خوبصورت کیسے ہو اور خوشی کی غذا کو کس چورن سے مضمک کرے؟ ہاں امد میاں خوب یاد آیا۔ ایک دن میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو بڑا بھلا کہہ رہا تھا کہ مجھے خیال ہوا کہ تم نے روک دیا کہ فضول وقت مت ضائع کرو یہ کھیل بڑے آدمیوں کا ہے۔ یاد ہے امد میاں، اُس دن بہت کوشش کی کہ اپنی روح کو بھی بدل ڈالوں، تم سے نئی اچلی سی روح مانگ لوں مگر یہ بات حاصل نہ ہوئی۔ امد میاں یہ کیا بات ہے کہ گمراہوں کے لئے تم نے نبی بھیجے۔ لاکھوں اوروں کی اصلاح ہو گئی میری نہ ہوئی؟ کچھ نہیں بتاتے؟ کیا کہا کہ یہ باتیں تھوڑوں اپنی کجی کے قصبے سناؤں؟ اچھا امد میاں میری کجی بخشی کے قصبے سن لو۔ ایک دفعہ میں دھموی سی باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک یہ کہ زیادہ نیک ہونا بڑا بھاری گناہ ہے۔ ٹھیک ہے نا امد میاں؟ یہ کیا بات ہے امد میاں کہ تم مشورہ نہیں دیتے؟ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ زیادہ نیک ہونا گناہ کبیرہ ہے اور مثال یہ دے رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکے کی دو بہنیں ہیں جو باجوہ حسین اور فہیم ہونے کے نیکی کی معصیت میں گرفتار ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اس لڑکے کی آنکھوں میں ان دو کا نمونہ کچھ ایسا سما گیا ہے کہ شاید اب تمام عمر وہ مختلف لڑکیوں کو رومی کی ٹوکری میں پھینکتا ہے۔ یہ ہے ان دو لڑکیوں کی نیکی کی برائی اور میں اپنے سامعین پر یہ واضح کر رہا تھا کہ کسی شخص کا حق نہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر نیک ہو کیونکہ غیر معمولی نیکی دنیا کے محدود در اس المال پر ایک مذہب و مضمک کا غصب ہے، مگر میرے سامعین کے دل ختم اللہ علیٰ قلوبہم والے دل تھے! ایک نے میری بات نہ مانی۔ امد میاں کیا کہا کہ تم نے کسی کے دل پر مہر نہیں لگائی؟ اچھا امد میاں! یوں ہی ہو گا! انہوں نے خود لگالی ہو گی! ہاں امد میاں دوسری سیدھی سی بات جو لوگوں کو فہم سمجھانا چاہتا تھا

وہ یہ تھی کہ نیکی کو بدی میں بدلتے رہنا حقیقی مذہب ہے۔ ادمیاں کیا کہا کہ میں مضمون چور ہوں اور یہ خیال کسی اور کا ہے؟ ادمیاں خفیف لکھڑا ہیں ایک اور شخص کا ہے ورنہ آج تک زبان سے وہ بات نہیں نکلی جو خود اپنی نہ ہو۔ ہاں ادمیاں اس شخص نے کہا تھا کہ ترقی یہ ہے کہ نیکی کو بدی بناتے رہو۔ میرا خیال ترقی کا نہیں! سوسائٹی چاہے ترقی نہ بھی کرے مذہب کی محتاج ہے۔ میں ایک اُل قانونِ فطرت بیان کرتا ہوں وہ شخص ایک عارضی کیفیت ارتقا کا نقاش تھا۔ ادمیاں جب چھپک کا ٹیکا نہ تھا اور نالیاں صاف رکھنے کی سجاویز نے علی جامہ نہ پہنتا تھا تو یہ نیکی تھی کہ ہر قسم کی دبا کو تیراقتور لپٹنے لگنا ہوں کی سزا سمجھ کر تسلیم و حمد سے قبول کیا جائے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس نیکی کو بدی میں بدل دیا جائے یعنی جو شخص دبا کے معاملہ میں کہے ”اسد کی مرضی“ اُسے کافر قرار دیا جائے اور جو شخص ٹیکے اور صفائی میں مدد نہ دے اُسے بدترین گنہگار قرار دیا جائے یعنی ادمیاں پیش نظر ترقی نہ ہو بلکہ ہمارے خوشی یعنی یہ کہا جائے کہ اب ہمارا حکم ہے کہ دبا کو گناہ سے یا قہر سے کوئی واسطہ نہیں یعنی ہمارے نام سے یہ کہا جائے کہ جو صاف نہ رہیں گے، صاف ہمایوں میں نہ رہیں گے، صاف شہر اور صفا ملکوں میں نہ رہیں گے وہ مریں گے۔ بھی بُری طرح اور مرکز اٹھیں گے بھی بُری طرح۔ یہی ادمیاں ہمارا حکم ہے نا؟ ہاں تو ادمیاں لوگوں کو میں یہ سمجھا رہا تھا کہ اپنی پرانی غلیظ ٹیکوں کا منہ دھو ڈالو اور انہیں سوٹ بوٹ پہنا کر ایسی طرح بدل دو کہ گناہ کی طرح دلفریب اور دلکش ہوں۔ یہ ہے میرا خیال ادمیاں! نہ اُس خشک سفر کا خیال کہ ترقی یہ ہے کہ نیکی کو گناہ بناتے رہو! میں تو چاہتا ہوں کہ پرانے گناہوں کی کشش کے عطر سے دنیا کو معطر کروں ورنہ اگلے زمانے کی نیکیاں اگلے زمانے کے گناہ میرے کس کام؟ جب کوئی بھوکا نہنگا ہی نہ ہوگا تو خیرات خود بخود ایک فضول حرکت بن جائے گی۔ جب ہر سچے سن بلوغ سے پہلے ہی دس بیس دفعہ دنیا کے گرد چکر لگائے گا تو ج کے سفر میں کیا صعوبت باقی رہ جائے گی اور بدو بچائے کس کا حایوں کو پتھر ماریں گے؟ میرا نقطہ خیال ادمیاں بہت بلند ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی نیکی صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ سچے حاصل کر کے بھی محض ازراہِ محبت اپنے آپ کو تیرا بندہ سمجھنا یعنی جب تک تو حاصل نہ ہو نیکی کا نام لینا بھی فضول ہے۔ وہ ذرائع جن سے تو حاصل ہوتا ہے اور جنہیں غلط انعام میں نیکی بیان کیا جاتا ہے بدلتے ہیں اور بدلتے رہتے چاہئیں۔ جو آج ٹھیک ہے وہ اسی صورت میں ٹھیک ہے کہ کل وہ غلط ثابت ہو اور انسان کی قسمت ہے کہ وہ جھوٹ پر پہلے۔ خیر یہ بات میں لوگوں کو سمجھا رہا تھا کسی نے کہا دہریہ ہے! کسی نے کہا بالہ ہے! ادمیاں اس لفظ پر تو تم بہت ہنسے! اچھا ادمیاں اب میں لوگوں سے کہوں گا کہ مجھے یہی کہیں کیونکہ اس سے تم خوش ہو مگر ادمیاں انسانہ تم لے لو کہ یہ بات اُن کی سمجھ میں آجائے اسی وقت ایک صوفی

کننے لگے کہ لوگو اس شخص پر کلام پلٹ پڑا ہے اسے کچھ نہ کہو، لوگوں نے اس صوفی کا پیچھا لے ڈالا کہ ”بڑا آیا ہے وہاں سے خدا رسیدہ۔ ایسے کافر کی حمایت کرتا ہے!“ اندمیاں بڑا لطف آیا۔ اُس دن تیرا ایک نقلی دوست یعنی وہ صوفی ایک تیرے اصلی دشمن کہوں کہ دوست اندمیاں؟ کیا کہا کہ نادان دوست کہہ دوں؟ اچھا یوں ہی سہی نادان دوست کے کام آگیا۔ اندمیاں اس غریب صوفی کو معاف کر دے اور اسے تصوف کی ذلت سے بچا کر معرفت کی دردی پہنکے! کیا کہا کہ تمہارے کاموں میں دخل نہ دوں؟ اندمیاں تو تم دخل دینے دیتے کب ہو؟ ربو کے بعد تو یہ موقع ملا اور یہ بات بھی یونہی بے ساختہ زبان سے نکل گئی۔ پرانی کج بخت بھیک مانگنے کی عادت اب تک نہ گئی۔ کیا کہا کہ معاف کر دیا؟ اچھا، تھینک یو۔ اندمیاں معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹے کی لغزش تم کبھی کبھی فوراً معاف کر دیتے ہو! کیا کہا کہ اگر معافی مانگتا تو معاف نہ کرتے؟ ہاں ٹھیک تو ہے اندمیاں! جس کج بخت کو تم پر اتنا بھی اعتبار نہ ہو کہ تم بن معافی مانگے بھی معاف کر دیتے ہو تو اسے تم معافی مانگے پر کیوں معاف کرو؟ یہ تو اندمیاں انصاف! اس میں تمہیں کوئی برا نہیں کہہ سکتا۔

اندمیاں میں سمجھا نہیں کہ کیا تم نے پوچھا؟ وہ بات! اندمیاں تمہیں خوب وہ بات یاد رہی! اندمیاں سچ تو یہ ہے کہ تمہارے نام پر کج بختی میں مجھے بے اتنا لطف آتا ہے۔ میں دل ہی دل میں تمہیں یاد کر رہا ہوں لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑا دہریہ ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ دیوانہ بکار خوش ہشیار! ہاں اندمیاں تو بات یہ تھی کہ میں نے کہیں کہہ دیا کہ بھئی مجھے تو پرانا بوسیدہ صدیوں کی ذمہ داری تلے دبا ہوا خدا رکھ رہیں بلکہ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سینڈ ہینڈ (Second-hand) کپڑا پہن لیں مگر سینڈ ہینڈ خدا رکھ رہیں۔ تم تو بالکل نوجوان ہونا اندمیاں! کس قدر یہ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ تم وہی ہو جو تھے! اتنا نہیں سوچتے کہ جس میں خدا ہو کر بھی شباب نہ ہو اسے خدائی کا کیا مزہ۔ اندمیاں کیا کہا کہ مجھے اس گستاخی کے بدلے چھوٹک دو گے؟ اندمیاں ہرگز نہیں تم خوب جانتے ہو کہ دنیا میں گنہ گزروں پر مگر گنہگار کوئی نہیں۔ اندمیاں کیا کہا کہ اس بات کا چرچا کروں گا تو ضرور سزا پاؤں گا! اندمیاں میں نہیں ماننا۔ اندمیاں کیا کہا کہ شاباش؟۔ اچھا اندمیاں تھینک یو مگر تم تو بڑے استاد ہو اور جو میں سچ منج ڈر جاتا؟ کیا کہا کہ جو میں ڈر جاتا تو مجھے سیدھا جہنم بھیج دیتے؟ اندمیاں بات تو ٹھیک کہتے ہو! ڈرنے والوں کے لئے جہنم ہی ٹھیک ہے۔ اندمیاں میں نے تو شروع سے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ دو مصیبتیں اکٹھی برداشت نہ ہونگی یعنی ایک یہ کہ تجھ پر ایمان لائیں اور دوسری یہ کہ ڈریں۔ بندے نے تو پہلی مصیبت انتخاب کر لی۔ اب جس کا جی چاہے وہ ڈرے۔ ہم سے تو یہ نہیں ہوتا کہ تو بھی ہوا اور تیرا ڈر بھی ہو۔ اندمیاں تو اکیلا ہی کافی ہے۔ اندمیاں

ایک بات پوچھنی تھی؟ کیا کہا کہ پوچھوں؟ ہاں تو اندامیاں گناہ تو تم معاف کر دو گے بشرطیکہ معافی مانگی نہ جائے مگر نیکی کون معاف کرے گا؟ کیوں اندامیاں جواب کیوں نہیں دیتے؟ یا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ نیکی ایسی جو کسی نیکی ہے قطعی طور پر ناقابل تلافی ہے؟ اچھا نہ بناؤ۔ کبھی کبھی تو یہ عقدہ بھی کھل ہی جائے گا۔ اندامیاں کیا بات پوچھی؟ بتئے والی؟ اندامیاں وہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔ کیا کہا کہ اب میرا کیا خیال ہے؟ اندامیاں بڑی دیر کی بات ہے کہ ایک دن یونہی میرے منہ سے شکر کا کلمہ نکلا کہ شکر ہے کہ خدا نے ہندوستان میں پیدا کر کے بھی مجھے بنایا نہیں بنایا۔ اس بات پر اندامیاں تم بہت بگڑے۔ ادھر میں بھی جل گیا کہ اندامیاں کی جوابات ہے نرالی۔ سید کی جائداد بنیا اڑے اور اندامیاں بس دیکھا کرے۔ خیر ادھر میں پیچ و تاب میں تھا ادھر اندامیاں تمہیں یہ ضد تھی کہ بننے کو کوئی بُرا نہ کہے کہ مٹر سمٹھ آگئے۔ مجھے درہم برہم دیکھ کر کہنے لگے کہ کیا بات ہے؟ اس انگریز کو اصل بات تو میں نے نہ بتائی مگر اس سے پوچھا کہ تم اس ملک میں اجنبی ہو تمہاری بنیوں کی نسبت کیا رائے ہے؟ سوچ کر کہنے لگا۔ ”ول بنیاست اچھا لوگ ہے۔ وہ دولت جمع کر کے کارخانے بناتا ہے۔ ہمارے ملک کی مشین خریدتا ہے۔ اکم ٹیکس دیتا ہے۔ بنک میں روپیہ رکھتا ہے۔ بنیا بہت کام کا آدمی ہے“ یہ تھی اس کی رائے۔ جواب میں اسے میں نے یہ کہا کہ بنیا غریب کا خون چوستا ہے۔ اس پر اس انگریز نے کہا کہ غریب آدمی کو خدا اسی لئے بناتا ہے کہ ہشیار آدمی اُس کی محنت سے فائدہ اٹھائے۔ خیر اندامیاں اُس سے تو بات ختم ہوئی مگر میں پھر سوچنے لگ گیا کہ اندامیاں اس قدر غریب آدمی کیوں بناتا ہے؟ کیا اسے غریب پیار ہے؟ بہت دیر تو یہی میرا خیال رہا کہ تمہیں غریبوں سے محبت ہے مگر پھر مجھ پر واضح ہوا کہ نہیں دراصل تمہیں بنیوں سے محبت ہے اور غریب آدمی تم اپنے لئے نہیں بناتے بلکہ بنیوں کے لئے۔ خیر تمہارے کام میں مجھے کیا دخل؟ ہاں مگر اندامیاں اُس دن تمہاری ایک بات پر بہت تعجب ہوا پوچھا تھا کہ تم نے مسلمانوں کو کیوں چھوڑ دیا؟ تم نے جواب میں کہا کہ ہرگز نہیں۔ پھر جو میں نے پوچھا کہ اندامیاں تم کن مسلمانوں کے ساتھ ہو تو اندامیاں تم نے کہا جاپان میں۔ پھر جو پوچھا کہ وہاں کون مسلمان ہیں تو اندامیاں تم نے کہا کہ مسلمان وہ ہے جو محنت سے کام کرے، تھوڑا کھائے بہت نہائے، ہر وقت مسکرائے اور میرا نام لے کر طارق کی طرح رخش عمر کو غلطی کے سمندر میں ڈال دے۔ پارلگنا میرا کام ہے۔ یہی بات پوچھتے تھے نہ اندامیاں؟ مگر اندامیاں میں تو اس نئی تعریف سے ایسا ڈرا کہ اسے اب تک چھپانے رکھا۔ آج تمہارے پوچھے پر ظاہر کرتا ہوں۔ مگر اندامیاں سینکڑوں دفعہ جی میں آیا کہ لوگوں سے کہوں کہ کبھی نمازوں کو صدیوں ہم سب نے آزمایا۔ اندامیاں بھی اتنا گیا ہو گا کہ یہ کنجنت فرصت ہی نہیں دیتے۔ ”اؤ نمازوں کو چھوڑ کر دیکھیں!“ اندامیاں کیا کہا کہ

یہ بات کیوں نہ کہی؟ السد میاں میری کمزوری رکھ کر کیا کہا کرتا بہت ہوں؟ ہاں السد میاں یہ بھی کمزوری مجھ میں ہے مگر السد میاں مجھ بگل ہی فیل تو نہ کرو کیا کہا کہ نہیں یہ خیال نہیں ہے۔ اچھا تو السد میاں یہ کام کیسے ہو کہ مذاق مذاق میں مسلمان کام کے آدمی بن جائیں؟ کیا کہا کہ کوشش کروں! السد میاں کچھ تم بھی تو مدد کرو! تمہیں کیا پتہ کہ مسلمان کی کھوپڑی کیا آفت ہے؟ گولی سے یہ نہ بچھے، علم سے یہ نہ بچھوٹے عقل سے عاری اور دولت پر بھاری کچھ تم اسے قدر سے نرم کر دو! کیا کہا کہ مسلمان بجائے مہلکے ہاتھ بکنے کے تمہیں خریدنا چاہتے ہیں اور یہ تمہیں ناگوار ہے؟ بجائے مسلمان خود بھی کچھ زبے اور تم سے بھی گئے!

اچھا السد میاں ایک بات اور بتا دو! کیا کہا کہ پوچھوں؟ ہاں السد میاں میں کیا کروں؟ کیا کہا کہ جو جی میں آئے کروں؟ نہیں السد میاں یہ بات نہیں۔ میں چاہتا ہوں تم کچھ میرے جی میں ڈال دو۔ نہیں؟ اچھا یہ بھی نہیں تو پھر یہ کرو کہ میرے دل میں رکھ کر دیکھا کہ اچھا! السد میاں تم تو میرے ہونا؟ السد میاں میں تمہیں کسی کو مانگنا نہ دوں گا لوگوں کی طرح گلی کو بچے میں تمہارا ذکر نہ کروں گا۔

السد میاں! السد میاں! اب کیوں نہیں سنتے؟ کہاں گئے؟
اے ابھی تو مجھے کیا کچھ کہنا تھا۔ السد میاں تم سنتے تو تمہیں سنا تا کہ کل رات تمہیں کس کس طرح یاد کیا۔

۲

السد میاں! وہ حقیقی بیداری کی زندگی جس میں تم اور میں رُودِ روتھے کس قدر جلد ختم ہوئی؟ اب پھر وہ کجنت خواب ہے جس میں زر کے زور سے عقل فرما نہ لے کا ہے، جس میں آج اور کل کا گورکھ دھندلا ہے۔ السد میاں! السد میاں!! اسنا نہیں تو دیکھ! دیکھ! عقل کس طرح میری گردن دبوچے ڈالتی ہے!۔ السد میاں اس خواب میں میرا ہونا اور تیرا نہ ہونا دونوں غضب ہیں۔

السد میاں! کاش ذرا تم اور ٹھہرتے! ایک بات تم سے کہنا۔ تمہیں بتلاتا کہ باوجود اس مساوات کے کہ تم میرا خواب ہو اور میں تمہارا خواب ہوں (اور یہ کون کہے کہ دونوں میں سے کس کا خواب بہتر ہے؟) میں تم سے معذرت کرتا۔ تم سے صرف ایک جملہ کہنا۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

السد میاں! تم خود سمجھ لیتے کہ کس کا حق کس نے ادا نہ کیا مگر میرا مطلب یہی ہوتا کہ تصور میرا تھا۔ السد میاں! السد میاں!! دیکھ! عقل کجنت مجھے کھائے جا رہی ہے، مجھے کہتی ہے کہ میرا جسم میرا اپنا نہیں۔ اس پر ملک کے،

شہر کے، ہمایوں کے، ماں جایوں کے، حقوق ہیں۔ کہہ رہی ہے کہ میرے خیالات میرے اپنے نہیں کیونکہ وہ عکس میں اُن حالاتِ گذشتہ و حاضرہ کا جن کا ظور میرے قربِ ذہنی میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ کہہ رہی ہے کہ ندی میں اگر ابر کی پرچھائیں ندی کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں تو میرے خیالات بھی میرے اپنے ہو سکتے ہیں ورنہ ہرگز نہیں۔ اسد میاں جب نہ جسم نہ خیال کچھ بھی میرا اپنا نہیں تو دنیا مجھ سے چاہتی کیا ہے؟ میرے کچھ نہ ہونے پر یہ دنیا مجھ پر کیوں اس قدر حاوی ہے؟ اسد میاں! جلدی پہنچ نہیں تو عقل مجھے مٹائے گی! اسد میاں! تم نہیں آتے! اچھا وہ تو سن لو کہ تمہیں کس طرح یاد کیا! اسد میاں! اسیر الیک بھائی ہی جو حاجی اور حافظ ہے اور تمہیں دوست بھی رکھتا ہے۔ اپنا دوست بنا کر تمہیں میں یوں یاد کر رہا تھا۔

لے دوست!

سورج اور ستاروں کا، چاند اور بادلوں کا ذکر نوکر دوں مگر زبان کہاں سے لاؤں؟ کس خلوص، کس تپاک سے فطرت کے یہ جھڑے انسان کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں؟ ان کی ثقافت میں کیا رعنائی ہے؟

لے دوست!

کیا تم نے سورج کی Courtesy پر کبھی غور کیا ہے؟ سورج میرا استاد ہے تو چاند میرا بھائی جسے گھٹنے بڑھنے کا گلہ نہیں، جسے نور اور سایہ برابر ہیں۔ استاد کو یا بھائی کو ترقی کی فکر نہیں، تنزل کا غم نہیں اور ہو تو کیوں ہو؟ جو اپنے کام پر مستعد ہیں غمِ فردا ان کی بلا کو۔

لے دوست!

مجھے لمبا سفر درپیش ہے۔ زادِ راہ کے لئے سورج اور چاند کی مثال کو اپنے دل میں سوا احتیاط سے نبھال لیا ہے۔ بادل مجھے پانی پلا دیں گے، تارے مجھے رستہ بتا دیں گے۔ نہ سموں گا، نہ جھٹکوں گا، سیدھا چلا جاؤں گا۔

لے دوست!

دل میں سب کچھ ہو گا مگر خالی ہاتھ جو دہاں جائے گا تو میرا کیا حال ہو گا؟ کیا تمہیں پتہ ہے کہ دہاں کیا تحفہ قبول ہوتا ہے؟ اتنا مجھے معلوم ہے کہ دہاں پوچھا جاتا ہے ”کیا لائے ہو؟“

لے دوست!

میں کیا جواب دوں گا؟ اپنے استاد سورج سے پوچھ چکا ہوں وہ کچھ نہیں بتاتا۔ بادلوں سے پوچھ تو غائب ہو

جاتے ہیں، تاروں سے دریافت کرو تو ہنسنے لگتے ہیں۔ انسانوں سے بہت پوچھ گچھ کیا۔ یہی کہتے ہیں کہ کوئی دلفریب سا جھوٹ پیش کر دینا۔

اے بھائی اور دوست!

اس دنیا میں کہیں کہیں صداقت کی خوشبو ہے۔ تم تو اس کا عطر پیش کر دینا اور جب مجھ سے پوچھا جائیگا کہ کیا لائے ہو؟ تو میں یہ کہہ دوں گا

”حضور میں تو کہیں گیا نہ تھا“

اور یہ سچ ہو گا۔ یہاں ہونے پر بھی وہیں ہوں۔

۳

اللہ میاں! یہ تھا تمہیں یاد کرنے کا ایک طریقہ مگر سچ پوچھو تو تصنع چاہیے کتنا ہی لیاقت کے عمامے اور اعتقاد کے جُتے میں ملبوس ہو پھر تصنع ہے۔ اور تمہارے اور میرے درمیان تصنع کیوں ہو؟ اللہ میاں! کیا کہا کہ ٹھیک کہتا ہوں؟ اللہ میاں! تم آگئے؟ بہت بہت ہڑے۔ اللہ میاں! تم کہاں تھے؟ کیا کہا کہ یہیں کہیں؟ اللہ میاں! تم چھپتے کیوں ہو؟ کیا کہا کہ چھپیں نہ تو اور کیا کریں؟

کس سے ملیں؟ کس سے نہ ملیں؟

عبدالعزیز

نظارہ تو تھا لیکن ابھی دیکھنے والی آنکھیں نہ تھیں، دیکھنے والی آنکھیں تو تھیں لیکن ابھی محسوس کرنے والا دل نہ تھا، محسوس کرنے والا دل تو تھا لیکن ابھی سوچنے والی روح نہ تھی۔ سوچنے والی روح تو ہے لیکن ابھی وہ پیدا کرنے والا خدا نہیں بنی!

شریںیاں، رنگینیاں، لکھنیاں بیدینیاں ہوں لیکن اگر حسن بینیاں ہیں تو یقیناً حق آفرینیاں ہیں!

مکائدِ نفس

تسکین کو، زندگی کا فنا نام رکھ دیا جو درد تھا، اُسی کا دو انا نام رکھ دیا
کیا شے ہی علم؟ حاصلِ اوہام رنگ رنگ ترکیب دے کے جہل کو، کیا نام رکھ دیا
کہتے ہو جس کو حق، وہ ہی باطل کا ایک سُرخ کیا تم نے اُس کا، نامِ خدا! نام رکھ دیا

فسودگی میں جب کوئی لذت نہ پا کے ہر کُنہ شے کا ہم نے نیا نام رکھ دیا
کل تک جو کُفر تھا اُسے ایسا بنالیا اپنی رضا کا حق کی رضا نام رکھ دیا
ایماں جو کل تھا آج اُسے الحاد کہہ دیا اتنا سا فرق ہے کہ جُد انا نام رکھ دیا
جس وضع سے ہو فطرتِ نوشیوہ کو ابا یونہی اک اُس کا بے سرو پا نام رکھ دیا

خالی سُبُوہیں شورِش دریا، فریب ہے، دل کی صدا کا حق کی صدا نام رکھ دیا
نیکی وہی ہے اے متذنب وہی بدی تُو نے ہی اک سے اک کا جُد انا نام رکھ دیا
دل جس پہ خوش ہوا اُسے پہنچا کے عرشِ بقبولِ خاصِ ربِّ علا نام رکھ دیا

دل جس سے پھر گیا اُسے شیطان بنا دیا مردودِ بارگاہِ خدا نام رکھ دیا
ظلمت پر نور، نور پر ظلمت ہے کامیابا غافل نے اس کا صبح و سنا نام رکھ دیا

قلّت ہمیشہ دہ گئی کثرت کے سامنے ہزار واکا اُس نے روا نام رکھ دیا
تسکین کہیں نہ جب دلِ مظلوم پاسکا حدِ ابد کا روزِ جزا نام رکھ دیا

اے دلِ طلسم خانہ وہم و خیال کا بھولے سے کس نے ارض و سما نام رکھ دیا
ہے ہر نفس پیامِ فنا باغِ زیست کو صرصر کا آہ کس نے صبا نام رکھ دیا
سودا سے جب ہوا دلِ وحشی کنسا گھر سودائیوں نے اس کا فنا نام رکھ دیا

معراجِ آرزو کی یہ پروازِ منکر ہے ناکامی طلب کا خدا نام رکھ دیا
جو کچھ نہیں ہو کیا ہے وہ، آخر کہاں ہوؤا جب کھوج ذات کا نہ ملا نام رکھ دیا

کیا تو بھی ہم سے ہے، عدمِ مطلق! اس پہ خوش

تو کچھ نہیں، یہ ہم نے ترا نام رکھ دیا!

حامد علی خاں

اب پھر۔ کم از کم مغرب میں۔ یہ زمانہ آتا ہے کہ پاکبازی و ذوقِ نظر کے اوصاف حاصل ہو جانے پر لباس ایک بار ناگوار قرار پاتا ہے اور جن مادر زاد کا نظر فریب اظہار اس درجہ خوبی تصور کیا جاتا ہے کہ اُس کی عملی تلقین و تشریح Demonstration and advertisement کی خاطر مس اڈالین کو جاہستان کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ فی الحقیقت، عریانی، ایسے زمانہ میں جب کہ حیثیاتِ حیوانی تعلیمِ رائج کے زیرِ سایہ معدوم ہونے کی حد تک پامال ہو چکی ہوں اور کپڑے کے حامی ملی درآمد و برآمد کے بدولت دو بالا ہو گئے ہوں، نسبتاً زیادہ مفید اور برتر نامِ مضرت رسالہ رہ جاتی ہے۔ عریانی کا ایک ادنیٰ کرشمہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ۔ یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا لٹا، اور اس میں شک نہیں کہ لٹے سیدھے کا امتیاز رفع ہو جانے پر اور کچھ نہیں تو یہی آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسے جامہ کو آنکھیں بند کر کے چاہے جس رخ سے استعمال کیا جاسکتا ہے!

(۲) مفلسی پر غور کیجئے :-

ایک زمانہ تھا کہ انسان کے کان سیم و زر کے نام تک سے نا آشنا تھے۔ ہر متنفس بے سیم و زر یعنی مفلس تھا اور مفلس اُس زمانہ میں شانِ انسانیت تھی۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ سیم و زر کا پتہ چل جانے پر، مال و دولت حاجتِ برآری کا ذریعہ قرار پائے اور مفلسی تکلیف دہ بھی جانے لگی، مگر پھر بھی اطمینانِ قلب کی خوبی افلاس ہی میں نسیم کی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ —

دو قرص نان اگر گندم است یا از جو دو تائے جامہ اگر کنہ است یا خود نو
بچار گوشہ دیوار خود بخاطر جمع کہ کس نہ گوید ازیں جانجیو آں جارو
ہزار بار فروں تر بہ نزد ابنِ مبین ز فر مملکت کیتباد و سمیخسرو!

اب ایک زمانہ آتا ہے کہ دولت۔ اور محض دولت۔ جو ہر شرافت و روحِ انسانیت قرار پاتی ہے سیم و زر کو "ستارِ عیوب و قاضی الحاجات" کا مرتبہ خداوندی مل جاتا ہے اور مفلسی بدترین عیوب تصور کی جاتی ہے۔ مفلسی کے اسباب کے متعلق ایک دوسرے کو شتم کرنے لگتا ہے۔

ایک کہتا ہے کہ گوشت خوری سے اصراف پیدا ہوتا ہے اور اصراف سے مفلسی؛ دوسرا کہتا ہے کہ گوشت خوری انسان میں اُس وقت پیدا ہوتی جب وہ فلاںچ ہونے کی وجہ سے جنگل کے جانوروں سے پیٹ بھرنے پر مائل ہوا۔ سبزی خور کا دعوئے ہے کہ گوشت خوری مفلسی کا پیش خیمہ ہے، اور۔ گوشت خور کا استدلال ہے کہ مفلسی گوشت خوری کی بنا ہے؛ واقعہ یہ ہے کہ مفلسی کو سبزی خوری سے لے کر گوشت خوری تک کسی "خوری" سے تعلق نہیں۔

البتہ چغل خوری اور حرام خوری خارج از بحث ہیں۔

فی الحقیقت، مفلسی ایسی بری چیز نہیں جیسی کہ سمجھی جاتی ہے۔ مفلسی کی موجودہ خوبی یہ ہے کہ وہ فاقہ مستی کا عادی بناتی ہے، اور فاقہ و فقر نفس کشی کی پہلی سیڑھی ہے۔ فاقہ مستی کے زیر سایہ قحط و دوبار کے نتائج نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کئے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ انسان کو خود فراموشی کا مرتبہ اعلیٰ حاصل ہو جاتا ہے۔ فاقہ مست کا ہاتھ حسب حیثیت اپنے ہی منہ کی طرف جائے گا اور شکم سیر کا ہاتھ حسب حاجت گوش تدعی کی جانب، بے بین تفاوت رہ از کجاست نابہ کجا!

(۳) ملازمت پر نظر ڈالئے:-

ایک زمانہ تھا کہ انسان کسی دوسرے ہم جنس کا مطلق تابع فرماں نہ تھا؛ ہر شخص اپنی بھوک کھاتا اور اپنی بنیند سوتا تھا۔ تمام عالم مساوات کا مکمل نمونہ تھا۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ کعبیتی اور بیوپار کے بعد چاکری بھی ایسا شیوہ زندگی قرار پایا جو بھیک کے سوائے سب سے بدتر مانا گیا۔ اب بھی یہ ایک وسیلہ مذموم ہی رہا۔ اس قدر مذموم کہ عمر خیام کی رائے میں دو دن میں ایک روٹی اور ایک کوزہ بھر ٹھنڈا پانی میسر آ جانا اپنے جیسے دوسرے انسان کی خدمت کرنے سے بدرجہا افضل تھا

ایک ناں بدو روزگر شود حاصل مرد وز کوزہ بشکستہ دے آبے سرد

ماوردگر کے چہرا باید بود یا۔ خدمت چوں خود سے چرا باید کرد؟

اب زمانہ آتا ہے کہ غلامی آزادی سے بہتر اور ملازمت دنیا بھر کے مشاغل سے افضل قرار پاتی ہے؛

نجات کمتر اور بزراعت زیادہ تر، محض جاہل یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ کا شیوہ حیات بن جاتے ہیں۔ ملازمت اس درجہ چوٹی کی خوبی مانی جاتی ہے کہ تعلیم کا مقصد انتہائی، تربیت کا مقصد آخری، بلکہ حیات کا مقصد واحد نظر آتی ہے۔ انسان پڑھتا ہے تو ملازمت کی خاطر، نیک اطوار بنتا ہے تو ملازمت کی خاطر، عبادت کرتا ہے تو

ملازمت کی خاطر اور جیتا ہے تو ملازمت کی خاطر اسنٹے آئے تھے کہ بھیریوں کی راگنی، ایک ایسی راگنی ہے جو صبح کے علاوہ اور وقتیں بھی کانوں کو جھلی معلوم ہوتی ہے، مگر اب دیکھتے ہیں کہ چاکری کی دھن، سوہنی سے لے کر بھیریوں تک درملہا سولے کر کجری تک، ہر راگنی پر ہر وقت و موسم میں غالب آ جاتی ہے۔

(۴) چند دیگر عادات کا تغیر مجملہ ملاحظہ کیجئے:-

انسان پہلے جینے کی خاطر کھاتا تھا، اب کھانے کی خاطر جیتا ہے؛ پہلے مذہب کی خاطر لڑتا تھا اب لڑنے

کی خاطر مذہب اختیار کرتا ہے؛ پہلے انسانی آبادی کی خاطر حیوانات کا استیصال کرتا تھا، اب حیوانات کی خاطر انسانی آبادی کا قلع قمع کرتا ہے۔

اس موقع پر احتمال پیدا ہوتا ہے کہ آپ امثال مذکورہ سے یہ نہ تصور کر لیں کہ ایک چیز کا نیک سے بد ہو جانا ایک عرصہ دراز کے تغیر پر منحصر ہے۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ انقلاب احتیاج۔ یا۔ تغیر میلان طبع کسی مدت کا محتاج نہیں؛ تبدیلی بھی صورت پذیر ہوتا ہے اور فی الغور بھی۔ گردش ایام کے ساتھ ساتھ بھی پیدا ہوتا ہے اور حالات گرد و پیش کے اعتبار سے بھی۔

مثلاً:۔ راست گوئی۔ یا۔ دروغ بانی ایک ایسا فعل ہے جو ایک ہی زمانہ میں محض حالات گرد و پیش کے اعتبار عیب بھی ہے اور ثواب بھی۔ راستی اگر عبادت کی شان ہے تو دروغ فنونِ لطیفہ کی جان ہے۔ راستی دہقان کی بھوپڑی اور خدا کے گھر میں ٹپکی ہو، مگر محفلِ مشاعرہ اور مجلسِ مباحثہ میں بدی ہے؛ دروغ غلامی کی حالت اور نزع کی کیفیت میں عیب ہو، مگر ایوانِ سلطنت اور عدالت کے کمرے میں خوبی ہے۔

اسی طرح:۔ چل قدمی ————— جو ان آدمی کے لئے حماقت ہے اور سن رسیدہ کے لئے ضرورت؛

فاقہ ————— مفلس کے لئے مصیبت آمیز ہے اور متمول کے لئے صحت انگیز؛

کوشش اتحاد ————— شملہ کی بلندی پر عیب، جنوبی ہند کی سطح پر خوبی، اور پنجاب کی

حد و دیں گناہِ عظیم ہے!!

نظریہ نیک و بد کی تشریح و توضیح کے بعد استدلال کی تکمیل محض اس جملہ سے ہو جاتی ہے کہ ”خانہ جنگی“ بھی گردشِ ایام کے تحت میں۔ یا۔ تغیر گرد و پیش کے اعتبار سے، عیب کے بجائے خوبی بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

* * * * *

محض تجربات انسانی کی بنا پر موازنہ کیجئے:۔

بظاہر اس استدلال میں اہمیت نظر آتی ہے کہ ”خانہ جنگی“ کو دنیا ہمیشہ سے نقصان رساں سمجھتی آتی ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ اس کو مضرت رساں ہی پایا — مگر باطن یہ استدلال محض نمائشی ہے واقعہ یہ ہے کہ انسان کے تمام مقولات کی بنائیں اس کے تجربہ پر نہیں ہوتی۔ اکثر کی بنیاد محض ہوا پر ہوتی ہے وہ مقولات جو دراصل تجربہ کی بدولت وجود میں آتے ہیں ہمیشہ عمل کے موافق ہوتے ہیں۔ اور حیوانی ہوتے ہیں؛ جن کو تجربہ سے تعلق نہیں ہوتا وہ عمل سے متناقض ہوتے ہیں۔ اور انسانی ہوتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل میں چند اقوال و افعال کا مقابلہ کیجئے۔

انسان کتنا ہے کڑنگی کا داردار پانی پر ہے۔ یا۔ آگ جلا دیتی ہے؛ چنانچہ وہ ہمیشہ پانی کو استعمال کرتا ہے اور آگ سے بچتا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں بتایا جاسکتا جب انسان نے پانی کا استعمال ترک کر دیا ہو۔ یا۔ اپنے جسم کو آگ سے محفوظ نہ رکھا ہو۔ ایسے مقولات تجربہ کی بنا پر وجود میں آتے ہیں اس لئے انسان اُن کے خلاف کبھی عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ غور کیجئے تو حیوان کو بھی آگ اور پانی کی بابت یہی علم ہے اور وہ بھی پانی کو استعمال میں لانے اور آگ سے محفوظ رہنے پر کاربند ہے۔ اس قسم کے مقولات کا علم انسان و حیوان میں مشترک نظر آتا ہے اس لئے وہ کثرۃً انسانیت نہیں مانے جاسکتے، بلکہ دراصل حیوانی ہیں۔

دوسری قسم کے اقوال میں، انسان ہمیشہ سے کتنا آتا ہے کہ جھوٹ بولنا بڑا فعل ہے، مگر ہمیشہ سے خلوت و جلوت میں جھوٹ بولتا آتا ہے۔ یا۔ انسان ہمیشہ ہنسا رہا ہے کہ شراب نوشی نہایت مضر حرکت ہے مگر ہمیشہ سے آشنائی پر عامل رہا ہے۔ ایسے مقولات پر عمل نہ کر سکنے سے ترشح ہوتا ہے کہ اُن کی بنا تجربہ انسانی پر نہیں ہے؛ اگر یہ تجربہ پر مبنی ہوتے تو انسان اُن کے برعکس عمل کرنے کی جرات نہ کر سکتا۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ایسے مقولات کو حیوان سے کوئی تعلق نہیں اور محض انسان کا طرہ امتیاز نہیں۔ لہذا انسانی ہیں۔

اسی طرح انسان ہمیشہ کتنا رہا کہ خانہ جنگی مضر ہے، مگر ہمیشہ خانہ جنگی پر عامل رہا ہے۔ گویا اس مقولہ کو فعل سے برعکس ہونے کی وجہ سے تجربہ پر مبنی نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ یہ بھی ایک ایسا انسانی مقولہ ہے جس کو عمل سے بہت کم تعلق ہے۔ ایسے مقولات محض انسانی غلط فہمی و غلط بیانی پر روشنی ڈالتے ہیں؛ غلطیہائے مضامین مت پوچھ لوگ ناکہ کو رسا باز دھتے ہیں!

✦ ✦ ✦ ✦ ✦ ✦

انسانی غلط فہمی و غلط کاری کے لحاظ سے مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے جو بجائے خود وقوع نہ ہو مگر بر عمل ضرور ہے۔ مضمون کی طوالت کا خیال بھی اُس کے بیان کر دینے کی خواہش پر غالب نہیں آتا اور میں اُس کو دُسرانے پر اترتا ہوں:-

حدیث دلکش و افسانہ افزا نامی خیزد

دگر از سر گزرتم قصۂ زلف پریشاں را

ایک روز شام کے وقت، تمام دن فیہر بہند اور غزم کے تنازعات میں سرسار چپکنے کے بعد، میں اپنے بنگلہ

کے سامنے والے چوبترے پر آرام کرسی پر دراز، حقہ سے لطف حاصل کرنے میں مصروف تھا اور سوچ رہا تھا کہ چاروں طرف نظر آنے والے بلند درخت بھی اگر جاندار سمجھ لئے جائیں تو یہ ایک ایسی مخلوق قرار پائے گی جو یک پائے ہوئے۔ ایک صاحب مع اپنے بیچ سالہ صاحبزادہ کے دفعتاً نازل ہوئے اور ایک کرسی آگے بڑھا کر جلوہ افروز ہو گئے۔ مجھے اپنے مشغلہ تخیل سے مادل ناخواستہ دست کش ہونا پڑا اور اُن کی مہمل گفتگو میں وقت ضائع کرنا پڑا۔ اُن کی گفتگو کا شباب تھا کہ آندھی آگئی اور ہم سب کو پوری عزت کے ساتھ برآمدہ میں پسپا ہونا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ بچہ اپنی پھول سی ٹوپی کو حلقہ باد سے بچانے میں مصروف تھا اور ہوا کا ہر جھکڑ ٹوپی اڑا لے جانے میں زور آزمائی کر رہا تھا۔ بالآخر اس کو شش مسلسل سے عاجز آکر بچے نے اپنے بزرگوار سے کہا: ”ابا یہ ہوا نہیں مانتی“

”لاؤ ٹوپی مجھے لے دو“ بزرگوار نے جواب دیا

جس قدر سوال کا بھولا پن مزہ دار تھا اُسی قدر جواب کا خراٹ پن قابلِ تفرقہ تھا۔ ساہ لوح بچے نے محض ہوا کی دست درازی کی شکایت کی تھی اور ٹوپی کے متعلق کسی امداد کی خواہش نہیں کی تھی۔ مگر گرگ بارانِ دیدہ نے ہوا کا معاملہ طعی نظر انداز کر دیا اور ٹوپی کو اپنی نگرانی میں لے لینے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ مجھے اس سوال و جواب میں وہی لطف آ رہا تھا جو ایک معاملہ فہم کو دو مختلف ممالک کے باہمی نامہ دپیام میں آتا ہے۔ بچے کا ننھا سادل اپنی ٹوپی سے دست بردار ہونے پر مائل نہیں ہوا۔ تاہم۔۔۔ ہوا سے پریشان ہو کر اب اُس نے مجھ سے خطاب کیا۔ تم ہو اکو یہاں کیوں چلنے دیتے ہو؟

”ہوا کو روکنا مجھے نہیں آتا“ میں نے اُس کی بساط کے موافق جواب دیا۔

”ان درختوں کو ہٹا دو۔ پھر ہوا نہیں چلے گی۔“ اُس نے بے ساختہ تدبیر بتائی۔

وہ آندھی اتر گئی، وہ صحبت گزر گئی۔ مگر۔۔۔ اُس معصوم سستی کی بظاہر لائق تبسم تدبیر میرے حافظہ میں باقی رہ گئی۔ میں نے بارہا اُس پر غور کیا اور ہر مرتبہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا کے تمام ذی منہم تدبیر اور طاقتور حکمران اسی تدبیر پر کاربند نظر آتے ہیں۔

ہوا اور درخت کے مسئلہ میں، درخت اُس جزو کو ظاہر کرتے ہیں جو مرنی ہے اور ہوا اُس کو جو غیر مرنی ہے۔ ہوا ایک نظر نہ آنے والی قوت ہے جو چلتی ہے اور درخت مادی شے ہے جس پر اس قوت کا اثر ہوتا ہے۔ ہوا بمنزلہ مذہب فلسفہ اور انقلاب کے ہے اور درخت بمنزلہ بشر، معاشرت اور انسان کے ہیں۔ ہوا کا اثر درختوں پر ہوتا ہے اور انقلاب کا اثر انسانوں پر۔ آپ نہ ہوا کو دیکھ سکتے ہیں نہ فی نفسہ انقلاب کو۔ درختوں کی جنبش، مگر وہ غبار کی سرگردانی

ابر کے ٹکڑوں کی دوڑ؛ یہ سب ہوا کے کرشمے ہیں، بذاتِ خود ہوا نہیں ہیں۔ اسی طرح۔ بازاروں کی ہڑتال، پٹریک
جلسوں کی بھڑکار، اخباروں کی زبان درازی، اور شہروں کی شورش؛ سب انقلاب کے نتائج ہیں، فی نفسہ انقلاب نہیں
ہیں۔ مشاہدہ کرنے والا نظر آنے والے نتائج سے نظر نہ آنے والے اسباب پر رلنے لگا دیتا ہے۔

ہر انقلاب و شورش کے موقع پر ایسے بھاری بھر کم افراد کا استیصال کیا جاتا ہے جو انقلاب و شورش سے
زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اور اس اعتماد پر کیا جاتا ہے کہ ان کے استیصال سے انقلاب و شورش مفع ہو
جائے گی۔ گویا۔ آندھی کے موقع پر بڑے بڑے درخت، جو زیادہ ہلتے ہوں، اس امید پر کاٹ ڈالے جائیں کہ آندھی
جاتی ہے گی۔ ان دونوں تدابیر میں بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا اور اس اعتبار سے میں اُس کم سن بچے کی
تدبیر اور مدبرین ملک کے عمل کو یکساں طور پر غلط فہمی پر مبنی پاتا ہوں۔

* * * * *

سب کے آخر میں، خانہ جنگی کی خوبیاں قابلِ غور ہیں:-
خانہ جنگی کی برکات کے لحاظ سے، چوٹی کی خوبی گھر کی رونق ہے جس گھر میں رونق نہ ہو اُس کو بقولِ مرزا
مرحوم دشت سمجھنا چاہئے۔ فرماتے ہیں:-

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھریا دیا

گھر کا لازمی عنصر رونق ہے، اور رونق کا انحصار گھر کی سجاوٹ پر نہیں ہو بلکہ گھروالوں کی چہل پھل پر ہی بات چیت پر ہونا
وغو غا پر ہے۔ سچ فرمایا ہے کہ ”ایک ہنگامہ یہ موقوف ہے گھر کی رونق“ اور ہنگامہ کے لئے خانہ جنگی اسی قدر ضروری
ہے جس قدر اتحاد کے لئے سائن کمیشن۔ یا۔ خوفِ عاقبت کے لئے طاعون!!

کبوتروں کی کاکب الے خانہ سے لے کر انسان کے وسیع مسکن تک، ہر جگہ خانہ جنگی کا امکان ہے خانہ جنگی
کی برکات بھی خانہ کے حدودِ اربعہ کی ماتحت ہیں۔ یعنی۔ جس قدر خانہ کی حدود وسیع ہوں گی اُسی قدر خانہ جنگی کی
برکات زیادہ ہوں گی جس گھر کی چار دیواری محض مایاں بیوی کے دو نفوس پر مبنی ہو اُس کی خانہ جنگی بھی چولیس اولنگ
تک محدود ہوگی؛ اگر ان دو نفوس میں صرف ایک ساس کا وجود اضافہ کر دیا جائے تو خانہ جنگی کی لطافت بھی المصطف
ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر خانہ کے حدود اربعہ ایک صوبہ یا ملک تک وسیع کر دیے جائیں تو اُس کی رونق کے
اسباب بھی ہنگامہ سے متجاوز ہو کر لمبہ تک پہنچ جائیں گے۔

ملکی خانہ جنگی کے زیر فیض۔ ہزاروں بیکاروں کو کار، فاقہ مستوں کو ادھار، ایڈیٹروں کو مواد اخبار، اور گریڈنگ کو عقیدت مندوں کی فرج بے شمار میسر آجائے گی؛ بلکہ راجہ سے پر جاتک، ہر ایک کو علی قدر مراتب خانہ جنگی کی برکات سے مستفید ہونے کا موقع مل جائے گا۔

خانہ جنگی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو سبزی خور کو دہی میں اور گوشت خور کو نمک چرچ میں نظر آتی ہیں تمام افراد کار بند سے مادہ فاسدہ خارج ہو کر ہستی کا جو رہائی رہ جاتا ہے اور خطرہ اجل سے نجات مل جاتی ہے —————
تم از ضعف چناں شد کہ اجل حبس نیست
نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن ست

کسی نقطہ نظر سے غور کیجئے۔ خانہ جنگی سے زیادہ مفید، اقتدار انگیز، محکوم ملک کے لئے موزوں، اور موجودہ آب و ہوا کے موافق، کوئی دوسرا فعل نظر نہیں آتا۔ اطمینان صرف اس سے ہوتا ہے کہ بفضلہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ نے عموماً اور ملازمت و وکالت پیشہ افراد نے خصوصاً، اس کی برکات کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا ہے۔

یقین مانئے آپ ایک عد حسین بیوی اپنے ساتھ تھی کر کے عیش و آرام نہیں پاسکتے۔ البتہ۔ عیش و آرام پا کر ایک درجن بیویاں وجود میں لا سکتے ہیں۔

اسی طرح

آپ اتحاد کے ذریعہ سے انقلاب تک نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ۔ انقلاب کے توسل سے اتحاد پاسکتے ہیں!

ازیک حدیث لطف کہ آن ہم دروغ بود

اشب ز دروغر گلہ صد باب شمشہ ایم

سلطان حمید

(جوش)



متین و شریر

لڑکے دوتھے زرخیز اور شیر
جو متین تھا شریر سے بولا
جی میں جو آئی بس وہ کٹہ الی
گالیاں یوں میں تیری چھڑیاں
بزم میں جس گھڑی تو جاتے
تو ہے شیرانی نسایت
بوڑھا ہونے کو آیا افسہ جوں
تو وہ ہند داکا ہے محبوب
کھیلتا بھی ہے سوچتا بھی ہے
گھورتا بھی ہے سکتا بھی
میں نے مانا تو مغل آرا ہے
لیکن اتنا بھی لاڈ لیکرنا
اُس کو دودن میں بھول جانا پھر
پھر وہ ندرت طرازیں اپنی
باوفا چاہتے ہے انسان

ایک ان میں متین ایک شریر
بات کو تو نے کہہ کیں تو لا
بات کڑوی یا مٹھی سی گالی
باتیں بھی موتیوں کی ہیں اڑیاں
نت نیارنگ تو دکھاتا ہے
تو ہے دلدادہ شبابیت
تیری فطرت جواں ترا شیطا
خاک میں ہے کہ فلک تہیا
چھوڑتا بھی دبوچتا بھی ہے
چار سنتا بھی دوسرا بھی
میں نے مانا تو سب کو پیار ہے
ہر بھلی شے پر دوسری من مریا
اپنی خوشبو پہ پھول جانا پھر
پھر وہ جدت نوازیں اپنی
راہ نیکی میں دکھ سے ازل

تم بلا ریب حق سے ہوا گا
تم جو بڑے تور و پڑا حق بھی
خود خدا کو سبق سکھایا ہے
دھونڈتے ہو خوشی کو درد کو
چھپے رہنا مجھے نہیں منظور
ہے اگر بے نیاز اسد مہیا
خیر و دانش میں کیوں میں نشا
کیوں نہ غم میں بھی سکرائیں ہم
مسکانا ہی زندگانی ہے
خیر و شر پر غم و مشقت پر
پارسا ناک بھونچا ہے میں
دنیا میدان ہے شرارت کا
گر شرارت ہوئی شیطاں کی
ہوتا باطل نہ آشکارا گر
کچھ برائی نہیں بُری اتنی
نیک بننا ہی گر تو نیک بنو
تم کو دینی ہے گر شرارت ہی
کچھ سری بھی سنو تو ہمانی تیں
پھول اگاؤ نہ پھول توڑو تم
بلغ دنیا کے باغبان بنو
پھول نگھنی کی طرح نہ گھونگٹا
واہ وا خوب ہے تمہاری آہ
تم کو سنتا ہی لو کھڑا حق بھی
نور کیا ہے تمہارا سایہ
میں تو پاؤں کا جو بھی کھوکھو
دُور سے دیکھتا ہوں کو طوط
کیوں سر اپنا نیاز ہوا ازل
کیوں نہ ہر سبک ہوں ہم آرز
کیوں نہ ہر شے کو بھول جائیں ہم
بھول جانا ہی زندگانی ہے
غفلتوں پر خمار شرارت پر
جو میں عاقل وہ مسکراتے ہیں
حق یہ احسان ہے شرارت کا
دنیا بیتی کبھی نہ انسان کی
کار نامے نہ حق کے آنے نظر
تم کو معلوم ہوتی ہے جتنی
نیک بن کر مگر نہ اتنے تنو
ہو بشارت میں کچھ شرارت بھی
نام کے باغبان نے گلچیں
حق پہ پھولوں کو اپنے چھوڑو تم
پھول پتوں کے پاساں بنو
اپنے تن میں کو خوشبوؤں سے سا

ہو چکی جب متین کی تقریر
اور کہنے لگا کہ بھائی جان
مجھ کو گو سب باتیں دے
واہ قرباں تمہاری الفت کے
عمر بالی یہ اور یہ فہم سا
پُر متانت ہوا وہ تھا جو شریر
تم نے مجھ پر کیا بڑا احسان
کلفتیں میری اپنے سرے
واہ احسان تمہاری الفت کے
بٹھے کھونٹا بھی سو نام خدا

سمندر

سمندر، سمندر، شان دار سیکراں سمندر! نہی، تری خشکی سے دُور، خشک مزاجی سے دُور
گویا سمندر دُنیا و ما فیہا سے دُور کوئی اور دُنیا!

دُھواں نہیں، گرد و غبار نہیں، پاکیزگی، لطافت، نزاکت — ”اک نزہت گاہ اُس“ ایک
کشتی بادبانی اور اُس میں دو صورتیں، دو انسانی صورتیں، سکون و محنت کی صورتیں! اُدھر، اوپر، دائیں
بائیں ہر طرف، سمندر کی چڑیاں لہروں سے کھیلتی ہوئی، پانی کی لہروں سے، ہوا کی لہروں سے،
سمندر کی گوری گوری چڑیاں! لہریں ملتے جلتے پانیوں کی، ہلکی ٹھلکی ہواؤں کی، لہریں کھیلتی ہوئی
سمندر کی انہیں گوری گوری چڑیوں سے!

چڑیاں ہواؤں سے اور ہوائیں لہروں سے، لہریں کشتی سے اور کشتی انسان سے اُٹھ کھیلنا
کرتی، الجاتی، شرابی کتراتی پر ساتھ ہی ساتھ وہ اس پر اور یہ اُس پر لپکتی اتراتی پھڑپھڑاتی! اک
دوسرے سے الگ تھلک، اک دوسرے سے دست و گریباں؟ نہیں نہیں! اک دوسرے
کا ساتھ چولی دامن کا جسم و جان کا روح و رواں کا! چڑیاں چاہتی ہیں ہوائیں ہو جائیں، ہوائیں
چاہتی ہیں لہریں بن جائیں، بادبان ہواؤں کا دم بھرتے ہیں اور لہراتے ہیں، انسان نازک لہروں
کے نرم تھپیڑے کھاتے ہیں اور اٹھتی گرتی کشتی کے ابھار گراؤ میں زندگی کا اتار چڑھاؤ بھولے
ہوئے ہیں!

غریبوں کی سیل

ساون کا مہینہ - بلا کا حبس - کلو کو دھیانگی اٹھانے کی تلاتوپ پڑی - پندرہ دن کا میلا چڑھا کرنا - پسینے میں شور بشور - گریبان کھلا - بازوؤں تک استینیں پتی ہوئی چڑھیں - ننگے سر - جوڑا بندھا - آڑا گلابی پیجامہ - مارک پسینے کے جگہ جگہ دھبے پڑے - موریان کہیں - گھیر کہیں - پنڈلیوں پہ کی نیچے کی سیون گھوم کے اوپر آئی - کان میں کندلے کی ایک ایک بالی جس میں سوکھے پھول مولسری کے بھرے - خیلہ خطنوں کی سی وضع - کارخانے پہ بیٹھی - سامنے بادے کے تارتنے - جھپا جھپ جھپا جھپ ہاتھ چل رہا - اور دونوں پاؤں کے انگوٹھے باری باری سے اوپر نیچے ہوتے جاتے - جیسے بھی چراغوں جلے تک ٹپٹپے کا نفعان اتار لے - کہ اترتے ہیں کھڑکی الی ہسائی نے کوٹھے پر سے آواز لگائی دونی بواؤں رحمت! بھلا یہ بھی کوئی کام کا وقت ہے؟ اے چٹو کی اماں! رتو کی خالا! بواؤ! آشا! بھابی ختیجہ! بھوری! بتو! بتو! اے شادو! دونی لڑکیوں تم کدھر سب کی سب گھس گئیاں؟ اے ذرا باہر نکلو دیکھو تو کیسی اندھیری دے کے آئی ہے - کیا دھواں دھار اٹھی ہے جدھی تو یہ قیامت کی گھمسی تھی - پرسوں مٹن - چٹی - شجی - مغلو - بندو - گھسیٹا - رکھا - غنی مولبی ساب والا کا لامنہ کالے ہاتھ کر کے "کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے برسیدگا برسا دیگا - کوڑی سیر لگائے گا - کوڑی گئی ریت میں پانی گیا کھیت میں" کہتے گھر گھر دیے کی دین کے لئے دام اکٹھے کرتے پڑے پھرے - نانی جتن - دادی شبتو - خالا خیرن - کنوئیں پہ جا کے روئیں - اندھی - جگنی - رحمت - فخری - بٹو نے پتلے لیے - "اندھیاں ہم لپییں تم بہادو! ان کنواری بالیوں کی بھی سنوائی نہ ہوئی - کیسی کالی بھوزالی گھٹا اٹھی - لیکن آندھی بھی وہ کالی آئی کہ بادلوں کو اڑا جانے کہاں کی کہاں لے گئی - بہتیر بچپوں نے غل مچایا - آندھی بیوی کے دامن سے باندھی - سل تلے جھاڑو بھی دبائی لیکن بادل کائی کی طرح پھٹ گئے - آج میں نے دھوپ میں ساری دوپہر کھڑے رہ کے کائی - اے اندھیرے صدقے جاؤں میری منہ نہیں جو میاں میرے تیری تعریف کر سکوں - کیا اپنی بندی کی بات رکھی ہے - کھڑکی والی ہسائی اپنے آپ ہی آپ باتیں کرتیں اور چہنیتی رہیں - نکلے کی بڑی بوڑھیاں لڑکیاں بالیاں ان کی آواز سن دلائوں میں سے نکل انگنائوں میں اکھڑی ہوئیاں - کوئی حبپ سے چر پائی دیوار سے لگا - ادوان پہ ایک پیر ٹکا - جالی پر نیچے جا پٹی

پکڑ۔ پائے پہ پاؤں رکھ۔ مُنڈیر پہ سے چڑھ۔ چھجے کو لٹک۔ جھٹ دینی چھت پہ جا پہنچی۔ کوئی بدھ بدھ کرتی سیڑھیوں پہ سے چڑھ۔ دبی دبی کوٹھے پہ جا کو دی۔ بچے بالے کُبل کُبل کر کھل پڑے۔ اُچھل رہے ہیں۔ کو دے ہیں۔ غل ہے کہ اسد میاں مینہ برسا دو کوڑی سیر لگا دو گھٹانے لٹیں بکھیر دیں۔ وہ پانی میں بھیگی بھیگی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آئی اور ایسی سو ندی سو ندی خوشبو کہ دل کے کنول کھل گئے۔ ساتھ ہی پٹ پٹ موٹی موٹی بوندیں پڑیں۔ وہ تل دھا اوپر دھار۔ دھونشالی مینہ برسا کہ اب برس کے پھر نہ برے اور پڑ کے پھر نہ کھلے پر ناے پڑے دھائیں دھائیں چھوٹیں۔ راہ چلتے جہاں را آسرا دکھیں جا کھڑے ہوں۔ کہ بھیگنے سے بچ جائیں۔ چھتوں۔ پھاٹکوں میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ چھجوں کے نیچے غول کے غول کھڑے ہو گئے۔ باہر مرد دوؤں کے یہ حال۔ یہ گھروں میں مچلی کی جابیاں اگنا بیلوں میں اور پر نالوں تلے۔ کھڑی ہو کے نہائیں اور ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالی۔ موریوں بند کر پانی روک ٹب چھک چھٹاکی۔ ایک ایک کو کچڑ کے اگنائی میں خوب لٹایا۔ جب اس شہد پن اور دھینگا مستی سے تھک کے بلکان ہو گئیں۔ شرمیت کے لوٹے ڈال پاک ہو۔ صاف ستھرے کپڑے پہن۔ ددون دلاؤں میں جا بیٹھیں۔ چھت کی کرٹکیوں تلیوں۔ قلابوں میں جھوٹے پڑے۔ کوئی تکیہ رکھ کوئی پٹری۔ اپنہ جائیگیں۔ ننھی نیدانوں نے گانا شروع کیا۔

”کوئی بند اچانول لائیوے دال ہے مسور کی“

گوری دھن کا بیجا ہر بالا ساون آیاری۔ گوری دھن کا بیجا۔ میری بھابھو پکے پوریوں میرا بھٹا لے لے

بھاگے ری۔ گوری دھن کا بیجا ہر بالا ساون آیاری“

”نیکو کھنول کھنول کا دن آدے گا۔ جیوے میری ماں کا جا پاؤلی صبح رنگاٹے گا“

”ماں آڑو جاسن گئے دھرے۔ ماں میں ہیں۔ تیری ماں۔ ماں کپڑوں کی بچی کھلی دھری۔ ماں میں نہیں

پینتی میری ماں۔ ماں تپا پانی گرم دھرا۔ ماں میں نہیں تھاتی میری ماں۔ ماں مٹی کی ڈیا کھلی دھری۔ ماں میں

نیں ملتی میری ماں۔ ماں سرے دانی کھلی دھری۔ ماں میں نہیں لگاتی میری ماں۔ ماں ساجن آئے لیے۔ ماں

میں نہیں جاتی میری ماں“

”ماں ایک کر لیا میں بویا۔ ماں بھابھو سے کہیو توڑے نا۔ جو توڑے چکو چار کر لیا میں بویا“

”جمنپا چھلے رہی کالی گھٹا۔ کالی گھٹا بھونرا لگھٹا۔ جمنپا چھلے رہی کالی گھٹا“

”ماں میرے بھائی کو بھجوجی کہ ساون آیا۔ اسے بیٹی تیرا بھائی تو بالاری کہ ساون آیا۔ ماں میرے باؤ کو بھجوری کہ

ساون آیا۔ بیٹی تیرا باؤ تو بڈھاری کہ ساون آیا۔ ماں میرے ماں کو بھجوری کہ ساون آیا۔ بیٹی تیرا ماں تو بڈھاری

کہ ساون آیا“

”ساون میں میں نہیں جاتیاں۔ ساون میں میں نہیں جاتیاں“

کسی نے پورا گیت گایا۔ کسی نے ادھورا چھوڑا۔ کسی نے چین کی۔ کسی نے پیں۔ غرض سب نے مل کر وہ چیاؤں پیاؤں چائی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ انہیں دیکھ جان جانوں کو بھی گلے لگی نہڑ دک اٹھی۔ بچپوں کو اتنا خود جا بیٹھیں۔ چھوٹے چھوٹے جھوٹے لے لے گا نا شروع کیا۔

”آئی اندھیری رات۔ سے میں بھیجی جاؤں۔ کہاں سکھاؤں سرخ چندریا کہاں سکھاؤں لمبی پاگ سے میں بھیجی جاؤں۔ کوٹھے سکھاؤں سرخ چندریا چھجے سکھاؤں لمبی پاگ سے میں بھیجی جاؤں“

”سانوناں میں میندھی مورے سیال کن بوئی۔ لے کن بوئی سے ہمارا ج۔ سانوناں میں میندھی مورے سیال کن بوئی۔ ناگھرتیاں ناگھردیورا۔ ناگھرتیاں ناگھردیورا۔ کس پر چاؤں دونوں ہاتھ۔ سانوناں میں میندھی میرے سیال کن بوئی“

”ہمارا جہ کیوڑیاں کھو لورس کی بونڈیں پڑیں۔ تم کھو لکھو کیوڑیاں میری جان رس کی بونڈیں پڑیں۔ اونچی اتریاں چندن کیوڑیاں تیری نا جو کھڑی ہے۔ شرابور رس کی بونڈیں پڑیں۔ ہری ہری چوڑیاں۔ گوری گوری بیتاں۔ توری بیتاں۔ جن کے ہاتھ رس کی بونڈیں پڑیں۔ ہمارا جہ کیوڑیاں کھو لو“

”سنو سکھی ستیاں جو گیا ہو گئے۔ سنو سکھی ستیاں جو گیا ہو گئے۔ میں جو گن نہرے ساتھ سنو سکھی ستیاں جو گیا ہو گئے جو گیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جو گیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ اور جو گن نے چھایا ہے بدیں۔ سنو سکھی ستیاں جو گیا ہو گئے۔ جو گیا بجاو بین اور بانسلی اور جو گن گا وے ہے مارا سنو سکھی ستیاں جو گیا ہو گئے۔ جو گیا رنگائے لال لال کا پڑے اور جو گن۔ کلب لمبے کیس سنو سکھی ستیاں جو گیا ہو گئے۔ ندیوں نے چھوڑا ہے قرار۔ سنو سکھی ستیاں جو گیا ہو گئے۔ سنو سکھی ستیاں“

”جھولا کن ڈالو سے امتریاں۔ جھولا کن ڈالو سے امتریاں۔ ایک تو میں جھولوں دو بے مورا ستیاں۔ جھولا کن ڈالو

سے امتریاں“.....

یگانہ ہی شروع ہوا تھا کہ ایک بولی وئی! یہ بھی کوئی برسات کا مزہ ہے؟ گانا ہے تو قطب صاحب چلو واں لاٹھ ہے۔ پھسلنا پھرتے۔ بھیم کی پھٹکی ہے۔ شمسی تالاب ہے۔ جھڑنا ہے۔ امتریاں ہیں۔ پائے کا تلاب ہے۔ اندھیرا باغ ہے۔ یاں سے وال تک جنگل ہی جنگل اور درخت ہی درخت ہیں۔ رسیاں پڑیاں ساتھ لے چلیں گے۔ کھانے پینے کا سامان لے لیں گے۔ کڑھائی چڑھے گی۔ پکوان ہوگا۔ گرم گرم گلگلے پھلکیاں اترتے جائیں۔ گاتے جائیں کھاتے جائیں۔

پھر لطف آئے۔ آٹھ آٹھ آنے سب مل کے پتی ڈالو۔ بہلی کر لئے پکرو۔ بھائی شرف کو ساتھ لیں گے۔ وہی اس گوں کے ہیں۔ بچائے السد کا جی۔ کچھ بھی کرو انہیں خبر نہیں۔ کہنے کو مرد کی صورت ساتھ ہونگے۔ ان سے رہا ہو بھی کھلا ہوا ہے۔ خالہ لطیفن کے میاں چلے۔ تو وہ بوا تعبیہ بٹھاتے ہیں۔ انہیں پرچھائیں میں غیر مرد نظر آتے ہیں۔ یوں ہی رنگ میں بھنگ ہوگی۔ وہ کام کے نہیں۔ ایک بولی بوا کلو کو پکڑ کر لاؤ۔ وہ آج خوب کارخانے پر چپکے بیٹھی ہیں۔ دوسری نے ایک آواز لگائی۔ خالہ ناؤ تو اس بندی کا حلو کھاؤ۔ کلو نے جواب دیا۔ اُچھال چرکاؤں! اچھے حلوے مانڈے کھلائے۔ مستانیوں کو فکر ہی کیا ہے۔ سانوں کے اندھے کو ہر اسی ہر اس جو جتنا ہے۔ جیسے ناقص! خود نقاشی گھوڑیاں۔ بے ماتھ کے بیل ہیں۔ سب کو ویسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ ”اچھا دیکھو خالہ! اتنی باتیں سنالیں۔ تمہارے صدتے جاؤں اب آٹھ آؤ۔ میری کلیجے کی ٹھکڑی خالہ! میں تیرے قربان گئی تھی۔ میٹھے دیدوں کی قسم تیرا دھبائی میں اٹھوا دوں گی۔“ ایک نے اتنی باتیں ہی کی تھیں کہ دوسری جھٹ کھڑکی میں سے گھس کلو کے گھر میں جا پہنچی اور پھر تو ایک کے پیچھے ایک ہو۔ دس پانچ مل۔ کلو کو کارخانے پر سے اٹھا ہی لائیں۔ اور کہا: ”خالہ! تمہاری اٹھتی برکت کی ہوگی۔ پہل تمہاری طرف سی ہو“ کلو نے کہا: ”چلو خاتواؤں! باؤ لیاں ہوئی ہو۔ اٹھنیاں دھڑول میں سے جھڑ رہی ہیں! آج اسمان پر سے برسی ہیں۔ یا فرنگیوں کی نیت درست ہو گئی۔ جو پیسے کی ریل پیل ہو۔ اٹھتی تو اٹھتی یاں آٹھ کوڑیاں بھی نہیں۔ نہیں بوانئیں! میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ نامیں کئیں آؤں جاؤں“

”اے خالہ چلو پر سے ہٹو۔ تم نے تو کتنا سہنے کی حد کر دی۔ جوڑ جوڑ مر جائیں گے اور مال جزائی کھائیں گے۔ تم تو ایسی نہیں تھیں۔ یہ کیا السد کی پھٹکار ہوئی ہے۔ کہ پیسا نہیں کھسکتا“ سب کے کہنے سننے سے چوتی نے پر راضی ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ ”چڑیلوں! میں نے آٹھ آنے کرتے کے لئے لگا رکھے ہیں۔ مرداریں پیچھے پڑ گئیں۔ بھلا مجھ پیاروں کی بلا کھانی کو گھسیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بڑھا چر خا۔ تم جان جانوں میں گھسیٹتی کیا اچھی معلوم ہوگی“ ”واہ خالہ اچھا کہا! یہ ساری برکت (تمہارے ہی) تمہاری دم کی ہے۔ تم نہیں۔ توسیل میں مرانئیں۔ یہ رست روپے جمع ہوئے ہیں۔ تمہارے سداں ساڑھے سات ہونگے۔ یہ روپے ہیں۔ تم جانو۔ تمہارا کام۔ ہمیں سیل کر لاؤ“

”وٹی روپوں کا میں کیا کروں۔ شرف کو خوشاد کرو۔ دو ڈھائی میں ساڑھے دن کی بہلی ہوگی۔ چاہے بھار کس منگا و چلے منجھولی۔ گنجائش کو دیکھ لو۔ روپے کا تیل بارہ آنے کا میں۔ سوار روپے کا گھی۔ سیریر بھڑا گھر سے باندھ لو۔ دو روپے اٹے ٹھڑے کو لگا رکھو۔ داں تندور پر روغنی مینی روٹیاں پکوالیں گے۔ آم کا اچار ہڈ کا۔ نیبو۔ پیاز۔ ہری مرچوں کی چٹنی بنالیں گے۔ بری پراٹھے پکائیں گے۔ تیل کے سلو بنے زیادہ ہوتے ہیں۔ ٹھنڈا ساتھ لیتے چلیں گے۔ سارے

دن رہیں گے۔ شام توڑی آجائیں گے۔ کڑھائی تو بھول ہی گئی۔ اپنے وہیں پکوان ہوتا جائے گا۔ گرم گرم کھانے کا مزہ ہوگا۔ سب منصوبے باندھ۔ شرف کی خوشامد کر مارو مار بزار بھجوا۔ وہ سب سامان لے آیا۔ گاڑی ملے کو بھی سانی لے آیا۔ سب نے جلدی جلدی سب سامان چلنے کا لیس کیا۔ باندھا بوندھی میں لگ گئے۔ ایک بیریاں لگا دو لڑا بچانے کو۔ ایک لوٹا ٹونٹی پچھنی۔ گردن مٹی۔ پیند ادھسا۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے۔ قلعی اڑی تانا جھکتا ساتھ لیا۔ محلے کے علوانی سے کڑھائی منگانی۔ مکے کرائے پڑھو لک بھی آگیا۔ مرغ نے اذان بھی نہ دی تھی کہ بہلی گلی میں اکھڑی ہوئی سہنا رہنی لٹک چلے تھے کہ ہر ایک اپنے اپنے بچوں کو ہتھار کر۔ سونوں کو گھسیٹ گھسیٹ لانے لگی۔ کسی نے پھٹی جازم اورھی کسی نے پیوند لگا برفہ سر پڑا کوئی ایک لک کی منت مالت کر کے مانگے کی چادر لینے لگی۔ گھروں سے نکلتے نکلتے ضرورت کی چیزیں یاد آتیں۔ دیوانوں کی طرح بھاگ بھاگ کے اندر جاتیں۔ اور پھر خالی ہاتھ واپس آتیں۔ بچوں کو بہلی میں ٹھونسن شروع کیا۔ اور ایک پر ایک لہنے لگی۔ بہلی ولے نے جو بیٹوں بدتمیزی دیکھا لگا چلانے۔ اری مایوں پہنے کا ڈھرا بھل جہانے گا۔ پل بیٹھ جائیں گے۔ اتنے تو گاڑی میں نہ بیٹھو۔ بھلا اس کھولا جلی میں اس کی سنتا کون؟ ایک پر ایک ٹھس ٹھس کے بیٹھ گئیں۔ چار پانچ تو سانگی میں جا بیٹھیں۔ جب بہلی دالے نے دیکھا کہ یہ یورش کسی طرح کم ہی نہیں ہوتی۔ تو خوب چلایا۔ کہ ان سب کے کانوں میں آواز پڑی۔ اور ایک ان میں سے تنک کر بولی۔ چل جو انا مرگ کیوں اپنا دم نکالے جا رہا ہے۔ موئے تیری بہلی میں کون بیٹھا ہے۔ میں تو باجی کے گھٹنے پر بیٹھی ہوں۔ اس نامراد نے اوپر چیخ چیخ کے بھیجا کھا لیا۔ جوں توں کر کے ایک میں بائیں تو خدا جھوٹ نہ بلائے گھس ہی بیٹھے ہو گئے۔ تو مجھ پر میں تجھ پر کا عالم تھا۔ بچے بچنے کی شکایت کرتے۔ تو بائیں اتار پھینکنے کی دھکی دیتیں۔ جانے کے شوق کے مارے دم نہ ماتے تھے۔ جب جان ہی پ بن جاتی تو پھر ایک آواز نکالتے۔ اے مرگے مرگے۔ بھج گئے۔ تو بائیں کہتیں۔ مد مر جاو گٹوڑویاں بھی چھپا نہ چھوڑو۔ کیا مجال جو ذرا یہاں چین سے گزر جائے۔ تھو تھو ٹوٹے بھوت ہو گئے جانوں کو۔ خدا خدا کر کے بھرتی کی شکل آسان ہوئی۔ اور بہلی والا بڑا تار بڑا بھلاکتا۔ سیلوں کو ہانکتا۔ سانٹے مارتا۔ سڑی سڑی گالیاں دیتا سب کو بھر گلی کے باہر نکلا۔ اور یہ سب تاروں کی چھاؤں چل پڑے۔ اجمیری دروازے پہنچے تو مچھوں والی مسجد میں صبح کی جماعت کی تیاری ہو رہی تھی سبے رتوں نے جلدی جلدی صندوق ایک طرف ہونا زبردھی اور جلدی سے پھر اسی طرح آٹھے جن کے سر کھلے تھے ان کو بڑی بوڑھیوں نے ڈانٹا کہ بے ڈھنگیوں! صفیلیں آگئیں۔ شہر پناہ کے دروازے سے نکلتا ہے سر تو زلدی ڈھانکو۔ سب نے جلدی جلدی سڑھانک لئے۔ اب بہلی شہر کے باہر ہوئی پہاڑ گنج تک تو ان سب کا پردہ رہا۔ جیسے ہی پہاڑ گنج محل گیا۔ تو جوتنی دیر ٹھسی ہوئی بیٹھے رہنے سے شل ہو گئی تھیں۔ وہ جلدی سے بہلی کو باہر کو پڑیں۔ پچھدی جوتیا کسی کا کتا چرا۔ کسی کی کھڑی گھسی۔ کسی کی ایڑی گئی۔ کسی کا پنجا دانت نکو سے۔ کسی کا پلوکان ندارد۔ کسی کی اوگی

الگ کسی کی ٹاٹ بانی صفا چٹ۔ کوئی نری کی کوئی اڈھوڑی کی۔ کوئی کیمخت کی۔ کوئی وصلی کی۔ کسی پر ڈیڑھ
 حاشیہ کسی پہل کسی پر پھول کوئی سادی۔ غرض عجیب عجیب ہیئت کی جوتیاں تھیں۔ انہیں اُتار بنگلوں میں دبا۔ ننگے
 پاؤں بہلی کے پیچھے پیچھے ہوئیں۔ بڑی کی دیکھا دیکھی بچے بھی اتر پڑے۔ اور پیدل ہوئے۔ جو بہلی میں بیٹھی رہیں۔ انہیں
 پھیل کر بیٹھنے کا موقع ملا۔ باجی میں سے ڈھولک کھلوا یا۔ اندر لے۔ بجا نا اور گانا شروع کیا۔ تیرے جھومرنے کھایا کھلوا
 سے۔ تیرے کھانے کو پاندان لے دوں گا۔ ”مڈنا گنڈیری والے۔ بلم گنڈیری والے۔ سوئے کی تیری ڈنڈی۔
 روپے کے تیرے پلڑے۔ نینوں کی جھونک ماری سے مڈنا گنڈیری والے“ دُور سے کوئی مرزا تا نظر آتا۔ تو دوڑی مرد
 کر کے چھین مارتیں۔ بڑی بوڑھیاں ڈانٹتیں کہ اوہ مونی متانیوں! مرد واسے تو کیا کھا جائے گا؟ آنکھوں کے اندھے
 نام نہن مسکھ۔ بلاؤں یہ مرد واسے یا باہر والا ہے موانوار۔ اُدھلن ہارہو بانس بلینڈوں کو سانپ بتائے۔ اُس کو نہ
 اپنے آپ کے کی خبر نہ جان کا ہوش + جہاں کوئی اُبلے پوش شہری دکھائی دیا۔ جلدی سے کترا کے بہلی کے پیچھے ہو جاتیں۔
 جن کے پاس چادریں اور بقمے نہ تھے وہ دوسروں کے برقعوں اور چادروں میں گھس جاتیں۔ یا ذرا سی بھی آڑ پاتیں تو اُس
 کی اوٹ میں آ جاتیں۔ گنواروں کو دیکھ کر خوب مذاق اڑاتیں۔ فقرے کستیں۔ پھبتیاں کستیں۔ رگنوار نے گہوں کھایا
 سیڑھی لے آسمان کو دھایا۔ ”گنوار بھیلی دے گنا ندے“ ”گاؤں میں اونٹ آیا۔ لوگوں نے جانا پنیشر آیا“ جس گنوار
 کی چٹیا نظر نہ آتی تو آواز لگاتیں۔ ”لکھو بندر یا چا بے پان۔ اڑ گئی چٹیا رہ گئے کان“ وہ بھی بے سمجھے ان کے کھٹو
 باوے پنے سے کھلے جاتے۔ دانت بکھلے پڑتے۔ جو چلتے چلتے تھک جاتیں۔ وہ بہلی میں آ بیٹھتیں اور بہلی والیاں اُتر
 کے چلنے لگتیں۔ اس طرح باری باری اترتے چڑھتے۔ تین پہر دن چڑھے تک مضور کے در سے آ پیچھے۔ یہاں بیلوں
 نے دم لیا۔ سواریوں نے اتر کے بچے۔ مٹر۔ چنے۔ چٹ پٹی دال۔ بوریوں پرل۔ بہادر شاہی سیو پیسے پیسے دھیلے
 دھیلے کے لئے۔ اب ان کے ساتھ کہاں کہاں مارا مارا پھرا جاتے۔ قطب صاحب گئیں۔ سائے دن رہیں۔ ساری
 رات رہیں۔ دوسرے دن تھک کے ہلکان ہو۔ کسی کا گلابیٹھا۔ کسی کے کھر بچیں لگیں۔ کسی کے کھونچیں گرتی پڑتی۔
 لنگتی لنگاتی۔ اپنی جانوں کو گھسیٹتی گھسیٹتی گھروں میں گھسیں۔ بچوں پر خفا ہونے کا بھی دم نہ تھا۔ ڈھیر ہو پڑ رہیں۔
 کماؤ میاؤں نے بھی ڈر کے ماسے اُف نہ کی۔ اس لئے لڑائی کے ٹینگے نہ تھے +

آغا حیدر حسن دہلوی

۱۵ یہ کیت حضرت نضر بہادر شاہ بادشاہ غازی نے ”مڈنا“ گنڈیری والے بنیکر فروش پر جوڑا تھا۔ شہر آبادی میں مڈنا کا بڑا چھوٹا اور یہ گیت
 میرے چھپن تک گایا جاتا تھا +

بیکھڑی ہوئی جوانی

گاہ در در بے نوائی، گاہ کربِ انتظار
وصل کی کچھ دل نشیں راتوں کا نورِ مہتاب
کچھ تمنائیں شبِ مہتاب و روزِ ابر کی
گاہے چاندِ راتیں مہوشوں کے درمیاں
زانوؤں کے چند تھکے، چند جامِ مشکبو
کچھ شبوں میں پھول سے چہروں کی ٹھٹی چاندنی
چاردن کو کچھ سنہری کنگنوں کی آب و تاب
چند لمحوں کے لئے رنگین بانہوں کا گدا
دل نشیں باتوں کا رس، گلزنگ چہروں کی مٹھاس
کچھ رُخوں کی سرخیاں کچھ مست آنکھوں کی شراب
کچھ لبوں کا شہد، کچھ زلفوں کا عطِ مشکب

کچھ کسک سی دل میں کچھ آنکھوں میں آنسو آبدار
ہجر کی کچھ خشکیاں تاریکیوں کا پیچ و تاب
چند وقفے خوش دلی کے، چند گھڑیاں جبر کی
کچھ لگاوٹ، کچھ ستم، کچھ نرمیاں کچھ گرمیاں
کچھ نسیمِ عیش کے جھونکے کنارِ آب جو
کچھ دنوں چھائی ہوئی شامِ بلا کی تیرگی
چند لمحے ظلمتِ ہول آفریں گرم غتاب
دو گھڑی کے واسطے احباب کے راز و نیاز
کچھ دنوں بھگی ہوئی راتوں کا لطفِ بے قیاس
ساعدوں کی چند شمعیں، عارضوں کے کچھ گلاب
کچھ خنک اجوں کی شبنم، کچھ ترانوں کی پھوار

لطف کے دو ایک دنِ افراح کی ایک آدھ رات

اے جوانی! تھی تری لے دے کے اتنی کائنات !!!

خندہ زن ہے آج تک عمرِ سحر و خضر پر
تُو ہے فانی زندگی کے سر پہ وہ انمول تلج

پھر بھی تیرا وہ سبک پروازِ عہدِ مختصر
داغ ہے تجھ سے حیاتِ عابدانی کا سراج

وقت کی سی جفا پر بڑھ کے پانی پھیر دے

اُن دنوں کے چند لمحے اے جوانی پھیر دے !!

جوش
بیچ آبادی

غزل

ہم نے مانا کہ عمر فانی ہے موت تمہیدِ زندگی فانی ہے
 سوزِ عشقِ اصلِ زندگی فانی ہے درِ غمِ دلِ مہرِ کامرانی ہے
 کیوں ہوا فسرِ وہ اس قدر اے دل ہم بھی فانی ہیں غم بھی فانی ہے
 سبزہ و سایہ و نسیم و طیور میری دنیا اے شادمانی ہے
 محو رہتا ہوں سیرِ دریا میں کیا تجھل ہے کیا روانی ہے
 نغمہ طائرانِ خوش الحان سازِ گلبانگِ دستانی ہے
 پر تو حُسنِ دوست ہیں ہم بھی اپنی ہستی بھی جاودانی ہے
 ہے نوائے سروشِ عشقِ سخن شاعریِ دل کی ترجمانی ہے

جس سے پروانہ بنتا ہے شعلہ

وہ جگر آتشِ نہانی ہے

جگر بریلوی

خوبصورتی

خوبصورتی، حُسن، رعنائی ————— زندگی! تُو اُس دنیا میں چل بس جس کی آبادی یہ پریان ہیں!

وہ خوبصورت ہے ————— رسیلی خوبصورت آنکھیں، لمبی خوبصورت پلکیں، گول خوبصورت چہرہ
موتی سے خوبصورت دانت، پنکھڑی سے خوبصورت لب ————— اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے
ساتھ اک دروہرا خوبصورت دل، اک خوش خیال خوبصورت دماغ اور اک نیک روش خوبصورت روح!

میں خوبصورت ہوں ————— خوبصورت صورتوں کی تصویر دل میں لٹکائے ہوئے، خوبصورت
خیالوں کی بساط دماغ میں بچھائے ہوئے، نفس کو خوبصورت جذبات کی مسلسل تلاش، روح میں خوبصورت
حقیقتوں کی بے تاب محبت اور یہ اس طرح کہ میرے تصور میں بیک وقت ظہور میرے وجود میں بیک وقت لہو
ایسی ایسی خوبصورتیوں کا کہ جھلمل جھلمل کرتے تاتے، پھول اور پتیاں سمیں زریں رنگین، جواہر ریزے اور وردا
اونچے پہاڑوں کے گہرے سمندروں کے، عرب کے صحراؤں کی خیال انگیز وسعت، اور ہند کے دریاؤں کی
روح پرور روانی، اپنی ننھی بچی کے لبوں کی اچھوتی مسکراہٹ، اپنی رفیق کی نگاہوں کا متین و معصوم حُسن، انسان
کی قوت کا پھیلا ہوا زمینی نقشہ، اور حق و باطل کے تضاد سے پیدا ہونے والی روشنی اور آواز ہزاروں بلکہ لاکھوں
بلکہ کروڑوں خوبصورتیاں جن میں کسی کا ٹھیک ٹھیک عکس اور کسی کی محض دھندلی سی تصویر!!

نفیس ستھرا مکان، چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی، پھولوں سے بچے بچوں سے پھول کھیل رہے آقا و بندہ کا
تعلق سدھرا ہوا، گفتار شائستگی کردار تمدن، رواداری، آزادی، غلطیاں لیکن نیک غلطیاں، زمین سبزہ دگل سے
بھی صحن خوشبوؤں میں بسا ہوا ————— یہ ہے میرے اُن دیکھے دوست کا مکان جہاں آنے جانے کا اذن عام مجھ
کو پہلے خوبصورتی!

باغبان

ایک خط اور ایک پارہ

خط

نیویارک، ۱۶- نومبر ۱۸۸۳ء

عزیز دوست!

امید تو نہیں کہ تمہیں یاد ہو مگر میری شادی کو آج پانچ سال ہوئے ہیں، اور کل — کہ یہ خط کل سے پہلے ہی بند ہو جائے گا — میری سالگرہ ہے — چالیسویں سالگرہ — میرا دلغ خیالات سے پُر ہے اور انہیں میری روزمرہ کی عادت صفحہ قرطاس پر لانے کے لئے مجبور کر رہی ہے، جہاں میں اُن کا اظہار بہترین طریقے سے کر سکتا ہوں، اور وہ وہ خیالات ہیں جنہیں میں صرف شفیق ترین اور ہمدرد ترین آنکھوں کے لئے لکھنا چاہتا ہوں میری زندگی میں میرے لئے یہ امر کچھ کم مسرت کا باعث نہیں کہ میرا ایک دوست ہے جس کے سامنے میں اپنے دل کو کھول کر رکھ سکتا ہوں۔

میری بیوی اس وقت تنہا ہے ہم نام کو ٹل رہی ہے، مگر تم اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا کہ اس تقریب پر اُسے بھی اس وقت تک کہ ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں، جاگنا پڑا ہے، نہیں، وہ ٹھیک آٹھ بجے ایک دو آنسو بہا کر سو گیا تھا، لیکن اب جب کہ اُس کی ماں اپنے معمول کے مطابق اُس کے کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے اُس کی نیند میں ڈوبی ہوئی نخی سی مستفسر آواز سنی، پھر میں بھی اُس کے پیچھے چل دیا اور دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ مگر میں کمرے میں داخل نہیں ہوا۔

سایہ دار شمع کی زرد زرد روشنی کا ایک دھبہ سا پانے کے سر ہانے کے قریب چمک رہا تھا، جہاں میری بیوی میرے بیٹے کے قریب جھکی ہوئی تھی۔ اُس کا نھاسا چہرہ جو ہو ہوا اپنی ماں کی تصویر ہے اُس کی طرف متوجہ تھا۔ بچے کے ہونٹوں پر ایک تبسم تھا، اور میں جانتا ہوں کہ یہ بھی اُسی کے تبسم کا عکس تھا۔ وہ بیدار رہنے کی نيم کوشش میں خوشی سے اپنی آنکھیں جھپک رہا تھا، مگر اُس سحر آفرین تبسم کے اثر سے جسے میں نہیں دیکھ سکا، بیداری اُس سے اپنا دامن

چھڑا رہی تھی۔ اُس کی بھوری آنکھیں بند ہو گئیں، ایک لمحے کے لئے کھلیں اور پھر بند ہو گئیں! نیند کی ہلکی چادر اُس پر تن گئی اور وہ وہاں پہنچ گیا جہاں ہم اپنی گہری نیندوں میں بھی اُس کا تعاقب نہیں کر سکتے۔ پھر قبل اس کے کہ میں اپنی بیوی کا چہرہ دیکھوں جواب جھک کر اُس کا منہ چوم رہی تھی میں نے پردے کو چھوڑ دیا اور یہاں واپس چلا آیا تاکہ اپنی زندگی کی آخری آگ کے سامنے بیٹھ کر اس مقدس لفظ کے کو اپنی روحانی آنکھوں سے ایک مرتبہ اُور دیکھوں، اور اُس ناقابل بیان مسرت کو حیران ہو کر سوچوں جو بلا استحقاق اور کسی پُر اسرار طریقے سے مجھ پر چھا گئی ہے۔

میں بتیں بتاؤں، وہ لمحہ سوتے سے جاگ اُٹھنے کے اُن لمحوں کی طرح تھا جن کا احساس کبھی کبھی جین بچپن میں ہوتا ہے، جب ہم کسی لطیف و خوشگوار خواب کا دامن جاتے جاتے پکڑ لیتے ہیں — وہ خوشگوار خواب جو ہماری آنکھیں اچھی طرح کھلنے سے پہلے ہی غائب ہو چکا ہے، جس کی تصویر دنیاوی تصورات نہیں بنا سکتے جو اپنی راہ میں ایک بلند و بزرگسرت چھوڑ جاتا ہے اور جس کی نسبت شاعر کہتے ہیں کہ وہ کسی جنت کی یاد ہے جس کی تازگی ہماری نوحیز روحوں میں ابھی باقی ہوتی ہے۔

تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میرے لئے اُن چیزوں کی واقعیت کا یقین کتنا تعجب خیز ہو گا جو اب میری زندگی میں داخل ہو چکی ہیں؛ کیونکہ تم جانتے ہو کہ آج سے چند ہی سال پہلے میری زندگی کیا تھی میں اُس آدمی کی طرح ہوں جس نے اپنی عمر کے پہلے تیس سال کسی تاریک غار میں گزارے ہوں۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو دس سال سے پہلے پہلے آفتاب کے نور اور آسمان کے نیل کا یقین دلا سکتے ہو۔

میں ابھی ابھی آتش دان کے سامنے بیٹھا تھا اور میرے پاؤں اُس صوف میں لپٹے ہوئے تھے جو تم نے ہم دونوں کو پھیل کر مس کے موقع پر بھیجی تھی۔ ہلکی ہلکی آگ کی روشنی کمرے کے سایوں پر، میری کتابوں پر اور تصویروں پر، اور اُن تمام نادر و نفیس ساز و سامان پر رقص کر رہی تھی جو اب میری آنکھوں اور میرے دل کو مسرور کرتا ہے اور اُس مذاق کے لئے تسکین کا باعث ہوتا ہے جو روٹی میسر آنے پر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ سو کچھ اس طرح میں اپنی شاد کامی اور کامرانی کا جائزہ لے رہا تھا — اپنی مادی دولت کا، اپنی اُس بہتر دولت کا جو مجھے دنیا کی طرف سے ملی ہے یعنی شہرت کا اور بے سے بڑھ کر اُس دولتوں کی دولت کا جو ساتھ کے کمرے کی دہلیز کے پار — اُس کمرے میں؟ نہیں —

وہاں، یہاں، ہر کمرے میں، گھر کے ہر کونے میں اس کی روح بن کر بسی ہوئی ہے، یہ محبت کی پاک و پاکیزہ روح ہے، جب میں بیٹھا اُن باتوں کو سوچ رہا تھا تو میسر خیال آج سے بائیس برس — ہاں آئندہ فروری یا

بائیس برس قبل کی دنیا میں پہنچ گیا جب ہم پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے تھے۔ میں اُس ہیبت ناک دن کو ابھی اور بائیس برس تک بھی نہ بھول سکوں گا جب میں "مارنگ ریکارڈ" کے دفتر میں داخل ہوا۔ ایک بڑے سے تاریک اور افسردہ کمرے میں گیس کی چھوٹی چھوٹی بنیاں جل رہی تھیں، جابہ جازر دچھروں والے کلرک بیٹھے تھے اور دیواروں پر روشنائی کے بڑے بڑے دیسے پڑے ہوئے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور باہر بارش ہو رہی تھی۔ گونا صاف روشنائیوں میں سے کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن میں اُس کی ہنسی اور سردی کو محسوس کر رہا تھا۔ عقب کے کمرے سے سیاہی اور کھٹے کی بو آرہی تھی، اور چھاپے کی بڑی بڑی کلوں کا شور اور لرزش نیچے سے اوپر پہنچتا تھا۔ میں اپنے گیلے کپڑوں میں دہل بیٹھا تھا اور اپنے پہلے تقرر کا انتظار کر رہا تھا۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور میں بے حد غریب تھا۔ لڑکپن کی امید میرے دل میں تھی اور میرے سر میں کلج کے ایک واحد سال کی لاطینی اور یونانی کا سرماڑی علم تھا۔ میری طبیعت بیٹھی جا رہی تھی۔ میرا دل ایڈیٹر کی ہر آواز پر جب وہ اپنے سنئے زنگروں کو ایک ایک کر کے بلاتا اور انہیں اُن کے فرائض تفویض کرتا تھا دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ میں خاموش یہ دعا مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے کوئی آسان سا کام دے اور مجھے اُس کے انجام دینے میں خفت نہ اٹھانی پڑے۔ الا مان، ولیم، بوڑھا بالڈون نیک دل ہونے کے باوجود کتنا سخت گیر منتظم تھا! کیا تمہیں اُس کی تیز کوکھی ہوئی آواز یاد ہے اور اُس کا "مختصر! مختصر! کتنا جو انسان کے دماغ سے تفصیل کو اجمال کے ساتھ پیش کرنے کی تمام قابلیت سلب کر لیتا تھا اور اُس کی کہانی کے الفاظ کو منتشر کر کے اُسے ہکلاتے ہوئے چھوڑ دیتا تھا؟ بالڈون کا نام اب تک "مارنگ ریکارڈ" کی پیشانی پر موجود ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ کون بہجت اس وقت اُس پریشان کن ہنکتہ چینی کے سامنے کھڑا رہا ہوگا۔ وہ کیسا کم نصیب دن تھا! وقت کی رفتار غم کی طرح سست تھی۔ داغ دار، چھوٹی، تنگی باہوں والے بھٹنے ہوئے پھر پھڑپھڑاتے ہوئے لمبے لمبے پروف مانعوں میں لٹے پھرے تھے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص مجھے تعجب اور حقارت کی ایک نظر ڈالتا ہے اور پھر مجھے اپنے خیالات سے نکال دیتا ہے۔ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام تھا مگر مجھے کوئی کام نہ تھا جو لوگ میرے ساتھ انتظار کر رہے تھے ایک ایک کر کے بلا لئے گئے اور انہیں کام بتا دیا گیا میں اکیلا رہ گیا۔

تب ایک اور خطرے نے میری کمزور و مصروف تخیل کو عذاب دینا شروع کیا۔ کیا میرا افسر اپنے نئے زنگروں کو بھول گیا؟ یا اُسے میری کم حیثیت کے مطابق کوئی کام ہی نہیں ملا؟ اس خیال نے پہلے تو مجھے شرم میں غرق کر دیا پھر کچھ ایک غصے اور غلط کاری کے جذبے سے بھردیا۔ آخر وہ کیوں میری یوں ٹخیر کرے؟ کیا میں حق نہیں رکھتا کہ

کیونکہ ہم مردانہ دار ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ میرا ادھر کا ہونٹ بھی اُننا ہی تنا ہوا تھا جتنا کہ تمہارا، صرف اُس پر بال نسبتاً ذرا کم تھے۔ شاید یہ تمہیں بالذمہ معلوم ہو۔ لیکن تمہارے اور میرے حالات میں بڑا فرق تھا۔ جب محبت کے دیتوانے تم پر نگاہ کی تو تم نے اپنے قلم کا رخ دولت کی طرف پھیر لیا؛ تم ایک جج کی بیٹی سے شادی کرنے جا رہے تھے اور ایک بہت بڑی جاگیر اور روپے کے مالک بننے والے تھے۔ اور اس کا بڑی حد تک تمہیں علم بھی ہو گیا تھا یا کم از کم تمہیں امید ضرور تھی۔ امید بڑی چیز ہے۔ لیکن میں؟ میں اسی کلبہٴ حزان میں رہ گیا، اپنے بہترین دوست کو کھو کر، اور میرا دل ویران تھا، اُس میں نہ کسی کی یاد تھی نہ امید، اور میرا آخری افسانہ تمام رسالوں کے دفاتر کو گھوم کر میرے پاس آچکا تھا۔ مجھے پھر اپنے نفیس کتب خانہ میں پہنچ جانے دو، جہاں اچھی اچھی کتابیں ہیں اور روشن آگ ہے۔ اب میں پھر اپنے پاؤں تمہارے سوز میں ڈلے بیٹھا ہوں اور دوسرے کمرے میں اپنی بیوی کے قدموں کی آواز سن رہا ہوں۔

چونکہ ہم ایک مدت تک اس درجہ متحد و متفق ہو کر رہے ہیں کہ ایک کی آواز کی ہلکی سے ہلکی لرزش بھی دوسرے کے لئے صریح الفاظ سے زیادہ معانی رکھتی ہے اس لئے جو کچھ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس میں تمہارے کانوں کے لئے میرا پُر افسوس لہجہ بھی شامل ہو گا۔ افسوس اُن دنوں کے لئے جو گزر چکے۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات ہے اگر میں اُن دنوں کے لئے متاسف ہوں؟ ایک غریب سپاہی جسے قسمت نے اپنے بے بسا لڑکپن میں بھی کام سے فرصت نہ دی ہو، جو صحافت کی آرام نہ لینے والی، اور دوسروں کے لئے راستہ صاف کرنے والی عظیم الشان محرابِ فوج میں ایک اذنی درجہ سے ترقی کر کے اعلیٰ رتبہ پر پہنچا ہو؛ کیا وہی آدمی، ایک لخت، اپنے تئیں ہوئے سخت اعضا کو گھر کے آتش دان کے سامنے ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ سکتا ہے؟ کیا اُس کی ٹانگیں سفر کے تصور میں خود بخود ہلنے نہ لگیں گی؟ کیا اس کا سیم زدہ چہرہ بارش کے چھینٹوں کی آرزو نہ کرے گا؟ کیا تمہیں اس پر حیرت ہوگی اگر رات کے وقت وہ اپنا نرم نرم سفید تر چھوڑ کر ایک کبل اور سے کھلے میدان میں پھرتا چاہے جہاں اُس کے سر کے اوپر رات کی نیلی دستوں کے پرے چمکنی دھمکی دنیائوں کا جلوس گزر رہا ہو؟ اور اگرچہ ساتھ کے پلنگ پر وہ پیاری پیاری آنکھیں بیدار ہو کر سرزنش آمیز حیرت کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگیں؛ اور اگرچہ محبت آمیز زباں کھینچ کر پھر اُسے اپنا مطیع کر لیں، لیکن اس پر بھی کیا اُس کا دل دھڑکتا ہوا خوابوں میں اُس جگہ نہ پہنچ جائے گا جہاں سے ڈھول کی آواز آرہی ہو یا کیپ کے گینتوں کی موسیقی بلند ہو رہی ہو؟

پہلے سال کی بے قیاس مسرت میں میرا یہی حال تھا، بلکہ بچے کی پیدائش کے بعد تک یہی حال رہا۔ مگر یہ معلوم ہے کہ کئی مہینوں تک میں اپنے لڑکے کے وجود کو ایک حقیقت تسلیم نہ کر سکا؛ اس عرصے میں اگر کسی وقت بھی وہ

اپنے کھٹولے سمیت میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوتا۔ مجھے اُس وقت اس کا یقین آیا کہ اُس کی آنکھوں میں اُس کی ماں کی آنکھوں کی جھلک نظر آنے لگی۔

ہاں، اُن دنوں میرے اندر کوئی پرانا جذبہ کام کرتا تھا۔ بعض اوقات مجھ پر وہی وحشیانہ آزادی غالب آ جاتی تھی جس کے نشہ سے سرشار ہو کر ہم دنیا کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔ وہی جذبہ جس کے رُوسے ہم اپنی مرضی کے علاوہ دنیا کی کسی ہستی کے آگے جواب دہ نہیں تھے۔ وہی احساس جو ایک غیر پابند اور بے پروا طاقت تھا۔

کیا متیں وہ رات یاد ہے جب ہم طلوع آفتاب تک گھومتے رہے تھے؟ تمہیں یاد ہو گا کہ آدھی رات کے قریب جب ہم نے دفتر چھوڑا کتنی گرمی تھی، اور ایوانِ بلدیہ کے بالمقابل چھٹکی ہوئی چاندنی ہمیں کس طرح میدان کی طرف کھینچ رہی تھی جہاں نہ لگیں کی روشنی کی چمکا چوند تھی نہ کسی بتی کی جھللا ہٹ۔ ہم یوں ہی سکوت زدہ گلیوں، بے قرار بازاروں اور پرسکون راستوں سے گزرتے گئے۔ بند اور تاریک مکانات پیلی پیلی چاندنی کے اندر بڑے بڑے مقبروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ہم حوالی شہر سے گزر گئے، ہم بیرون شہر کی باغوں سے گھری ہوئی کوٹھیوں سے بھی گزر گئے اور ہم اُس وقت ایک پہاڑی پر پہنچ چکے تھے جب سورج کی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی چوٹیوں کو چھونے لگیں۔

میں اُس وقت اس آزاد سفر کی پاکیزہ سرت کی خاطر ساری زمین کو طے کر جانے پر تیار ہوا تھا۔ اُس وقت ہمیں روکنے والی کون سی چیز تھی؟ گھر بار کا کوئی رشتہ نہیں۔ دنیا کے لئے ہم پیچھے کیا چھوڑ رہے تھے؟ چند بے سرو پا ممل تحریک اور یہ ایک ایسا سراپہ تھا جس سے ہمارے سرخوب پڑتھے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ حقیقی موقع تھا کہ ہم اس سیر کو شروع کر کے رک گئے جس سے اگر ہم جی بھر کر لطف اندوز ہوتے تو اپنی زندگیوں کو تباہ کر لیتے۔

ہاں تو آوارگی کا وہی گستاخِ عنان جذبہ کبھی کبھی مجھ پر غلبہ پالیا کرتا تھا۔ ایسے اوقات بھی آتے تھے کہ ایک لمحے کے لئے میں بھول جاتا تھا کہ میری ایک بیوی ہے اور ایک بچہ ہے۔ ایسے اوقات بھی آتے تھے جب میں انہیں اپنے لئے ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ میں اسے کیوں نہ کہہ ڈالوں؟ یہ ہر شادی شدہ آدمی کی سرگزشت ہے۔ کم از کم ہر آدمی کی۔ خواہ اُس کی شادی دنیا کی بہترین عورت ہی سے ہوئی ہو۔ اس کے معنی محبت کا فقدان نہیں ہیں۔ یہ انتہائی ناگزیر ہے جتنا نفیری کی آواز پر ہمارے خون کا اچھلنا ناگزیر ہے۔

پہلے پہل میں ڈر گیا اور اس جذبے کے خلاف جنگ کرنے لگا جیسے کسی بری عادت کے خلاف جنگ کی جاتی ہو۔ عالم خیال میں غیر فادار ہونے پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ آہ جنگ کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی؟ اپنے باغی تخیلات کا گلا گھونٹنے کی مجھے کیا ضرورت تھی جب میری بیوی کی محبت وہ معجزہ دکھا رہی تھی جس سے دور وحیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں؟

آخر یہ اتحاد کیا ہے جو ہمارے لئے ایک حیرت بن کر آتا ہے اور تمام بیرونی دنیا کے لئے ایک ناقابل بیان راز بن کر رہتا ہے؟ یہ کیا ہے جو ہماری غیر ازدواجی محبت کو ہماری نظروں میں حقیر اور طفلانہ بنا دیتا ہے؟ تم اویں، جو اس سے بہرہ ور جانتے ہیں کہ محض ارتباط و اختلاط کا ثمر نہیں ہے، گو اس کی نشوونما انہیں کے پہلو بہ پہلو ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک عجیب انداز سے مرد کو ملتا ہے کہ وہ عورت کی روح کو دیکھے جس طرح وہ اپنی روح کو دیکھتا ہے اور عورت کو کہ وہ مرد کے دل میں نگاہ ڈالے جیسے یہ اُس کا اپنا دل ہے۔ میرا کوئی دوست جب دیکھتا ہے کہ میری بیوی اویں ایک دوسرے کی بات کو آنکھوں کے اک ذرا سے مل جانے ہی سے پا جاتے ہیں تو وہ اسے ذہانت کی اُس نگاہ سے زیادہ بہت نہیں دیتا جو عموماً مرد دلی دوستوں کے درمیان بات چیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اُسے اُس مسرت کا وہم و گمان تک نہیں ہوتا جو ہمیں اپنی اس گفتگو میں حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ گفتگو جس کی زبان کو وہ سمجھ نہیں سکتا، جسے وہ سن نہیں سکتا۔ وہ زبان جس کے باضابطہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ جس میں جذبات جذبات کا جواب دیتے ہیں۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ میں اُس اتمان کا اظہار چاہوں جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کو یوں پھلتے پھوٹتے دیکھا ہے۔ اپنی احسان مندی کا، محبت کے لئے، جس نے مجھے نہ صرف سرور تر بلکہ میں عاجزانہ اقرار کرتا ہوں کہ بہتر و بلند تر دل و دماغ عطا کیا ہے۔ مگر مجھے اس اظہار کے لئے اپنے عجز بیان کا اعتراف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں شاعر ہوتا تو میرا بہترین شعر بھی پوری صفائی سے اسے ادا نہ کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ابھی میرے پیچھے کوئی سرسراہٹ سی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر میں میری بیوی آہستہ سے کمرے میں داخل ہوگی اور آہستہ سے میرے پاس آکر کھڑی ہو جائے گی پھر ایک ہاتھ آہستہ سے میرے کندھے پر رکھے گی اور اُس کا دوسرا ہاتھ میرے اُس بازو تک بڑھ جائے گا جس سے میں یہ خط لکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ وہ نرمی سے مگر اس نرمی میں محبت کی قوت ہوگی، میرے اُس ہاتھ کو پکڑے گی جس میں قلم ہے۔ اور میں کہوں گا ”بس آخری الفاظ، ولیم اور اُس کی بیوی کے لئے، پیاری“ اور وہ میرے ہاتھ کو چھوڑے گی اور اپنا ہاتھ اٹھا کر میرا خیال ہے، کہ میرے کنپٹی پر کے سفید بالوں کے گچھے کو چھوئے گی، یوں جیسے اُس کو ان پر رحم آ رہا ہو کہ یہ بھی اُس کی ایک ادا ہے، اور وہ کہے گی، ”میرا بھی اُن کو سلام لکھنا اور کہنا کہ اس کمرے پر وہ ضرور ہمارے ہاں آئیں۔ میں اُن کو دکھانا چاہتی ہوں کہ ہمارا ولی کتنا بڑا ہو گیا ہے“ اور جب وہ ہمارا ولی کہے گی تو اُس کا وہ ہاتھ جو میرے کندھے پر ہے بے اختیار ذرا سبند ہو جائے گا، اور وہ اپنا سر جھکا دے گی اور میں مڑ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دوں گا۔

پیائے دوست صبر کرو یہاں تک کہ میں تمہیں بتا چکوں کہ یہ خط میں نے کیوں لکھا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ ایک بات میں نے تم سے گزشتہ چھ ماہ سے چھپائے رکھی ہے۔ مجھے دل کی بیماری ہے اور ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ ہر لمحہ متاری موت کا امکان ہے۔ مجھے خیال ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہو رہا ہے کہ وہ لمحہ اب قریب ہے۔ میں جلد ہی اپنے بستر پر چلا جاؤں گا جو دروازے کے دائیں طرف بچھا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ صبح میں بیدار ہوں گا۔ اور آفتاب کی کرنیں میری آنکھوں کو یہ دکھانے کے لئے روشن کریں گی کہ میرا رفیق مجھ سے جدا ہو چکا ہے۔

کیونکہ میں اُسی پرانے کمرے میں ہوں جیسا کہ تمہیں علم ہے، اور تمہیں یہاں سے گئے دس سال نہیں ہوئے بلکہ دو دن ہوئے ہیں۔ وہ تصویر جو ان صفحات کو لکھتے وقت مجھے حقیقی نظر آرہی تھی اب آہستہ آہستہ ماند پڑتی جا رہی ہے، اور شمع کی کو تھخر تھخر کر ڈوبی جاتی ہے۔ صبح قریب ہے اُس کے سبنگاموں کا آغاز ہے۔ ہوا بخاری میں داخل ہو کر ہانپ رہی ہے اور تڑپ رہی ہے اور نیچے آتش دان میں آکر سفید راکھ کو اڑا رہی ہے۔ میں نے ابھی ابھی اپنی نفلیں اور ڈراما جلا دیا ہے۔ اب میری دونوں درازیں خالی ہیں، اور بہت جلد دونوں خالی کریاں میری دونوں اطراف سے ایک دوسری کی طرف تینکتی رہ جائیں گی۔ اس غظیم خلو میں میرے تصور کے کتنا وحشت ناک خواب دیکھا ہے! ابھی ابھی میں اسے حقیقت سمجھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اپنے پیچھے کسی عورت کے قدموں کی چاپ سنی ہے، اور اس لئے میں مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

میرا چہرہ جنتِ سلام لو، میں اب سونے کے لئے جا رہا ہوں۔ شاید میں اس خواب کو ایک بار پھر دیکھوں، اُوں دھیمے قدموں کی آواز کو ایک مرتبہ پھر سنوں، جب رات پلٹنے لگے جب پچھے پُرلنے پردوں میں سے پیل پیلی روشنی نمودار ہونے لگے اور جب اس طویل تنہائی کا انجام آپہنچے۔

جب میں مرجاؤں تو میں چاہتا ہوں کہ تمہارے خیال میں میں وہ نہ ہوں جو میں تھا بلکہ وہ ہوں جو میں بننا چاہتا تھا۔ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ متاری رفاقت میں میں نے امید اور چاہت کی اُس سے ایک خوش تر اور محبوب تر زندگی بسر کی ہے جسے تم نے دیکھا ہے میں نے تمہارے تصور کے لئے اپنی ایک ایسی تصویر چھوڑ جانے کی کوشش کی ہے کہ جب اُس دوست کی یاد کے لئے جسے تم اچھی طرح جانتے تھے اور جسے شاید اُس کے مرنے کے بعد تم بہتر طریق پر جاننے لگو تمہیں سکون اور تنہائی کی ایک ساعت میسر آجائے تو تمہیں اُس کو اپنی نظروں کے سامنے لانے میں کوئی تکلف نہ ہو۔

ریجنی ملڈ بارکلی

پارہ

(۸۱ نومبر ۱۸۸۳ء کے "نیویارک ہیرلڈ" سے لیا گیا)

ریجنی ملڈ بارکلی، ایک اخبار نویس، کل صبح اپنے بستر میں مردہ پایا گیا۔ موت کا باعث دریافت کرنے کے لئے کوئی طبی تحقیقات نہیں کی گئی کیونکہ اُسے اختلاجِ قلب کا عارضہ تھا اور اُس کی موت غیر متوقع نہ تھی۔ مرحوم ایک ہونہار نوجوان اخبار نویس تھا۔ چند سال تک وہ مارٹنگ ریکارڈ کے شری علیے میں کام کرتا رہا اور کئی ایک غیر مقامی اخبارات کا نامہ نگار بھی رہا۔ اُس کے مضامین نظم و نشر ہموار رسالوں میں بھی چھپتے رہے ہیں جن سے کسی حد تک اُس کی داغی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بارکلی کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور ابھی اُس کی فاضل نہیں ہوئی تھی۔

منصور احمد

گزرتا ہوا لمحہ

ٹھہر ٹھہر، اوگرنے والے لمحے، ذرا ٹھہر دینا سے ہوں بے نصیب جا! میں تجھے لالال کر دوں گا، تجھ میں مٹی کا آبِ حیات بہروں گا تجھے حسین بنا دوں گا۔ ذرا ٹھہر کیا تیرے تجھ سے پہلے آنے والوں بھائیوں نے میری کوئی غیبت تو نہیں کی کہ تو یوں مجھ سے خائف ہے؟ ذرا ٹھہر! انیس ہیں کسی کی یادیں تجھے نہ ڈوبوں گا۔ ہرگز تجھے حق و عشق کی گھفر و شیوں کی نذر نہ کروں گا! اذرا دم لے!

مجھے معلوم ہے کہ تُو وہ اچھا وقت نہیں جس کا سب کو انتظار ہو مگر مجھے اس علم سے کوئی بے چینی نہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں وہ استاد نہیں جو تجھے کوئی غیر فانی انا اتنی کا سبق سکھلائے۔ تو بھی معمولی ایک لمحہ جرفانی، ان پڑھ، جلدی کا مارا میں بھی ایک معمولی انسان ہوں ظالم، جاہل، بے بھوں کا شکار مگر جو ہم دولٹھیں، مل کر کچھ کام کریں تو کیا ممکن نہیں کہ

گاہ ہاشد کہ کوہ کے ناداں از غلط بردف زند تیرے

آ، مجھ سہل!۔ مجھے یقین ہے اے گزرتے والے بھولے بھولے لمحے، کہ تیرا استاد جھکے گا۔ اس تارے کو بٹ دکھیں دکھیں گی بیٹھنا نہیں تو تیری رکھڑا! ہاں میں مجھ سے میرے ایمان کی شریں سن۔ کہنے کو یہ شرطیں ہیں مگر جو تو انہیں اپنا لباس سمجھے اذرا سے نہ آتا ہے تو خدا جانے تو کیا بن جائیگا۔

لے اب سن۔

اول میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کو ہر ذی روح یکساں عرب ہے۔ دوم میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کو تپہ بھی نہیں کہ گناہ کیا چیز ہے۔ سوم میں شہادت دیتا ہوں کہ دکھ انسانوں میں مرتبہ ہوتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ہر انسان قسمتا قسم کے دکھ درد کا چلتا پھرتا قبرستان ہے۔ چہارم میں شہادت دیتا ہوں کہ دکھ انسان میں ہے مگر انسان دکھ میں نہیں۔ پنجم میں شہادت دیتا ہوں کہ سکھ انسان میں جنم لیتے رہتے ہیں مگر ہر انسان انہیں بغیر پاپے پوسے اُن کے اپنے گھر سے نکالتا رہتا ہے ششم میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا انسان کو بچا رکھا کہ وہ رہا ہے۔

مگر تو نہ ہی پسندی تغیر کن قضا را

فلک پیا

تو سن چکا!۔ جا سب کو تادے۔

آئینہ حیرت

وہ جس نے ڈال رکھا ہر زمانے کو تیر میں وہ جو محبوس ہو سکتا نہیں قیدِ تصور میں

وہی ہے جس سے اے نورِ نظر حیران ہے تو بھی!

مجھے حیرت پہ حیرت ہے کہ تو ہو وقفِ حیرانی یہ حیرانی تری ہے مجھ کو وجہِ صد پریشانی

اگر آئینہ بے حس ہے تو کیا بے جان ہے تو بھی؟

کہوں کیا راگ کیسا کھلتا ہیرے نکھرے میں کہ دکھیارے کا جی لگتا نہیں اپنے دکھڑے میں

خدائی جس سے ہو مدہوش سیوہ تان ہے تو بھی!

کرشمے سینکڑوں رت کے ہیں جس طرح فطرت میں بسک نازک حسیں نایاب ہیں اس طرح فطرت میں

قضا کی آن ہے تو بھی خدا کی شان ہے تو بھی!

جو کوئی غور سے دیکھے تو اک اک شے کو حیرت سے وہ حیرت جو دل کو نِ مکاں کو وجہِ غیرت سے

میں سمجھا ہاں میں سمجھا کس لئے حیران ہے تو بھی!

سمجھ ہی میں نہ آیا تجھ کو دل کی آرزو کیا ہے؟ خودی کی زندگی میں یہ کسی کی جستجو کیا ہے؟

جو سمجھے بھی تو کیا سمجھے کہ اک انسان ہے تو بھی!

ب

”من سکھی اور سندرسنگھ کا قصہ“

کسی قوم کی ادبی زندگی میں اس سے زیادہ افسوس ناک بات کوئی نہیں کہ بلند پایہ تصانیف سے اُس کا سراپا خالی ہو۔ کسی قوم کی ادبی زندگی میں اس سے زیادہ شرمناک بات کوئی نہیں کہ نہایت بلند پایہ تصانیف اُس کے سرمائے میں موجود ہوں مگر اُن کی صحیح قدر و قیمت پہچاننے کی توفیق بھی اُسے میسر نہ ہو۔ لو لوئے شاہوار گھر میں نہیں ہے تو نہ سہی لیکن لو لوئے شاہوار کا گھر میں ہونا اور پھر کوڑے کرکٹ کے ڈمیر میں پڑے رہنا یقیناً اہل خانہ کی کور و ذوق کا ثبوت ہے۔ ”من سکھی اور سندرسنگھ کا قصہ“ بھی ایک ایسا ہی موتی ہے جو ہماری غفلت اور ہنرنا شناسی کی خاک و بھول میں اٹا ہوا آج تک کچھ گم نامی میں پڑا رہا ہے اور خدا جانے ابھی کب تک پڑا رہے گا۔

کچھ عرصہ گزرا راقم الحروف کو اپنے ایک عزیز کے مکان پر چند گھنٹے بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ وقت گنارنے کے لئے کسی اچھی کتاب کی تلاش ہوئی تو اُن کے ذخیرہ کتب پر نگاہ دوڑانی شروع کی۔ اُن کتابوں کے پیچھے جو اس لئے اچھی سمجھی جاتی ہیں کہ نئی ہیں ہر شے تعلیم پنجاب کی کچھ پرانی درسی کتابوں کا الٹا سیدھا انبار بھی لگا تھا۔ اس پر ہاتھ مارا تو ایک فرسودہ سی کتاب نکل آئی جسے اس سے پہلے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کتاب میں دوسری چیزوں کے علاوہ تین قصے تھے۔ ایک نادیدہ مگر بظاہر معمولی چیز سے انسان کو جو معتدل سی دلچسپی ہو سکتی ہے اُسی کے ساتھ پہلا قصہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ قصہ کتاب کے ساٹھ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اس کے ابتدائی چند صفحے ہی چوکھانے کے لئے کافی تھے۔ اور جوں جوں اُسے آگے پڑھا، استعجاب اور فریفتگی اور پھر استعجاب رہ رہ کر پیدا ہوتا گیا۔ ”من سکھی اور سندرسنگھ کا قصہ“ تھا۔ اس قصے کے مطالعے سے راقم الحروف کو جو تجربہ ہوا وہ بلا مبالغہ ایک نئی دنیا کے انکشاف سے کم نہ تھا۔ اور اس کی کم سے کم تعریف جو کی جاسکتی ہے، یہ ہے کہ یہ قصہ اپنی نوعیت میں بہ نظیر ہے۔

کتاب کے تین مضموں میں سے ایک ہندوستان کی اسلامی معاشرت اور باقی دو ہندوؤں کی معاشرت کے متعلق ہیں۔ ایک سرسری نظر سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ معاشرتی انسانوں کی یہ دو گانہ تقسیم دو مختلف قلموں کی شہنائی افسانہ ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرت کے ترجمان کو وہ کمال فن عطا نہیں ہوا جو اُس کے ہم قلم

کے حصے میں آیا ہے۔ معاشرت ہنود کے مصوٰر کی قوتِ اظہار میں اس بلا کی شدت اور فراوانی و جہتنگی ہے اور اس کا مؤقلم نظریہ کے پردے پر بغیر کسی کوشش کے اس صفائی کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ اس خاص وصف میں اُس کا کمال انگلستان کے سب سے بڑے ڈراما نویس شیکسپیئر کی یاد دلاتا ہے۔

تینوں قصوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں:-

(۱) من سکھی اور سندرنکھ کا قصہ۔

(۲) خوشحال چند اور میرا، دولت رام اور مونگا، کر وڑی مل اور گنگی کا قصہ۔

(۳) جہاں آرا سیکم اور محمد یوسف گہیتی آرا سیکم اور محمد جمیل الدین کا قصہ۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ پہلے دو قصے رائے بہادر لالہ پیارے لال دہلوی کی تصنیف ہیں جو مرثیہ نگار اہم سے جج ٹائی کورٹ کے بڑے بھائی اور لالہ سری رام صاحب مولف "خمنائے جاوید" کے تایا تھے۔ تیسرا قصہ اعتباراً فن سب میں فروتر ہے اور مولوی کریم الدین صاحب پانی پتی کا لکھا ہوا ہے۔

"رسوم ہند" جس میں یہ قصے شامل ہیں اردو نثر کے دورِ جدید کی بہت ابتدائی کتابوں میں سے ہے۔ اور یہ غالباً اُسی زمانے میں لکھی گئی جب لاہور میں نئی شاعری کا آغاز ہوا۔ پنجاب کے مشہور ناظم سر ششہ تعلیمات کرل ہارلڈ کا نام کئی جینیتوں سے محض ان اردو کی ضرورت میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور اردو زبان کے بھی خواہ ان کو ہمیشہ محبت اور شکر گزاری سے یاد رکھیں گے۔ تاریخ ادب اردو میں یہ نیک نفس انگریز ایک زبردست مصلح بلکہ مجددِ اول کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اُسی کے مشورہ و ہدایت کے ماتحت پہلے پہل حالی اور آزاد نے اردو نظم میں ایک بالکل نئے طرزِ فکر کی داغ بیل ڈالی جو آج ہماری شاعری کا عام انداز ہے اور غالباً ان معجزاتِ نثر کے لئے بھی جن کا ذکر اب ہو رہا ہے ہم اردو ادب کے اسی سچا کے ممنونِ فیض ہیں۔ قیاس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کرل ہارلڈ نے جب اردو نظم و نثر میں انسانوں کا عام انداز دیکھا کہ وہ تقریباً سب کے سب بے جان شہزادوں اور شہزادیوں کے بے رنگ عشق و محبت کے بے لطف سوانح سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے تو انہوں نے مرثیہ پیارے لال اور مولوی کریم الدین کو قصہ نویسی کے فن میں اُسی طرح ایک نئی راہ نکالنے کی ہدایت کی جس طرح ان کی رہنمائی میں حالی اور آزاد نے شاعری کی کاہلیٹ دی تھی۔

اس بے مثل کتاب کو قلم بند ہوئے غالباً نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ منقض ہو چکا ہے۔ یہ ایک سنگِ میلِ تعلیم پنجاب کے نصاب میں داخل رہی مگر تعجب ہے، کہ ہزاروں پڑھنے والوں کے ہاتھوں سے گزرنے کے باوجود بھی

اس کی حقیقی عظمت و اہمیت کا اندازہ قائم نہ ہو سکا اور اس کے کم از کم ایک قصے کو ادبِ اردو میں وہ مستقل حیثیت نہ ملی جو یقیناً اُس کا جائز حق تھی۔ میں سبھی اور سندرسنگھ کا قصہ، ایک ایسا گراں مایہ اور نادر کارنامہ ہے کہ مغرب میں اس صنفِ ادب کے بہترین استادین فن کے سامنے ہم اسے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

کہانیوں کے اس مجموعے کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کرنل ہارلڈ فرنق قصہ نویسی کے کس پہلو پر سب سے زیادہ زور دینا چاہتے تھے جن ہندوستانی قصوں کی فضا اور تمام تعلقات بطور تصنیع ایرانی کہانیوں کے مخصوص لازم سے مستعار لئے گئے ہوں وہ محض بے حقیقت ہیں۔ اچھا قصہ وہ ہے جو غیر ملکی حالات کی نقالی پر مبنی نہ ہو بلکہ سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنے ہی ملک کے حالات و واقعات رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کا آئینہ دار ہو، کیونکہ یہ چیزیں قصے میں ایک عجیب روح چھونک دیتی ہیں جس کے بغیر وہ بالکل پھیکا اور بے جان رہ جاتا ہے۔ قصہ نویس کو چاہئے کہ اپنے ملک کی رسم و تمدن کا غور سے مشاہدہ کرے اور یہی چیزیں اُس کی تحریروں میں خود بخود جھلک پڑیں۔ اس مقصد کو لئے ہوئے مسٹر پیاسے لال اور مولوی کریم الدین نے اپنا کام شروع کیا اور یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں بہ لحاظ کامیابی جو فرقِ مراتب ہے وہ بالکل اُس فرق کے متناسب ہے جو نظم کے میدان میں حالی اور آزاد کے درمیان قائم ہے۔ مسٹر پیاسے لال ایک زبردست صناع کی طرح اپنے مقصد پر غالب آگئے ہیں لیکن مولوی کریم الدین پر خود اُن کا مقصد غالب آگیا ہے اور اُن کا قصہ صحیح معنوں میں قصہ نہیں رہا۔ مولوی کریم الدین کے قصے میں واقعات اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ رسوم کا اظہار ہو مسٹر پیاسے لال کے دونوں قصوں میں رسوم کا اظہار واقعات کے ضمن میں خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا قصہ محض ایک دل نشیں داستانِ سنا کر مہارادل بہلانا ہے نہ کہ کسی اور نیت سے ہم پر حملہ آور ہونا۔ مولوی کریم الدین کے واقعات میں ایک پریشانی و آشفتگی ہے کیونکہ قصہ بجائے خود اُن کے لئے اتنا اہم نہیں ہے جتنا رسوم کا بیان۔ بخلاف اس کے مسٹر پیاسے لال کے واقعات کا تسلسل بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک استادِ فن کی طرح اول سے لے کر آخر تک قصے کی تمام جزئیات اُن کے دماغ میں قائم اور روشن ہیں۔ اپنے قصے کے افراد پر اُن کی گرفت غیر معمولی طور پر مضبوط ہے اور وہ اُسی قدر سلیقے سے انہیں حرکت میں لاتے ہیں۔ مولوی کریم الدین کے افراد بے جان بعتیں ہیں جو مصنوعی کل پُر زوں کے بل پر متحرک ہوتی ہیں۔ مسٹر پیاسے لال کے افراد زندہ ہیں، ہمیں اُن کی نبض کی تڑپ اور دل کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ جو الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے ہیں اُن سے اُن کی کسی نہ کسی مخصوص طرزِ فکر و عمل کا اظہار ہوتا ہے یعنی وہ الفاظ ایسے نہیں ہوتے کہ اُن خاص حالات میں

ہر کسی کی زبان سے لازماً وہی ادا ہوں سیرت نگاری اسی کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ پورا قصہ پڑھ چکنے کے بعد من سکھی، پاربتی، چندر کور، سندرسنگھ، گیان چند اور سچان سنگھ سب کی واضح تصویریں ہمارے ذہن میں رہ جاتی ہیں اور ہم اُن کے ساتھ الگ الگ اسی طرح واقف ہو جاتے ہیں جس طرح اپنی جان پہچان کے زندہ آدمیوں کے ساتھ۔ یہ اس لئے کہ مصنف اپنے قصے کے واقعات بیان کرتا ہوا قلم کی ذرا ذرا سی جنبشوں میں اُن کے خدو خال نمایاں کرتا چلا گیا ہے۔

مولوی کریم الدین کا قصہ سیرت نگاری کے لحاظ سے بالکل ساقط الاعتبار ہے۔ مثلاً پوری داستان کو شروع سے لے کر اخیر تک پڑھ جانے کے بعد بھی اگر ہم یہ سوچنا چاہیں کہ جہاں آرا سنگیم، گیتی آرا سنگیم اور دل افروز سنگیم میں بحیثیت مختلف انسانی افراد ہونے کے کون کون سے امتیازی اوصاف ہیں تو کوئی بابہ الامتیاز ہمارے تصور میں نہیں آتا۔ یہ سب دھندلی سی شکلیں ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ امتیاز یہی ہے کہ اُن کے نام مختلف ہیں۔ ان کا ٹھہ کی پتیلیوں کی مسرت و غم سے ہمارا دل بالکل غیر متاثر رہتا ہے کیونکہ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک فریب، ایک کھیل ہے لیکن من سکھی اور سندرسنگھ کی قسمت کے ساتھ ہمیں اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی دوزندہ انسانوں کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ جو جو تفصیل ان دونوں کے متعلق مصنف کا قلم ہمیں دیتا ہے ہم اسے شکرِ یے کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ رسوم کا بیان اس قصے میں ہمیں ناگوار نہیں ہوتا بلکہ ہم اُن کی تفصیلات متعلقہ کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے کہ خود من سکھی اور سندرسنگھ کے ساتھ ہمیں نہایت گہری دلچسپی ہے۔ ہندو تیبہاروں اور مندروں کی تصویریں بھی اسی ضمن میں آتی ہیں کیونکہ ان کو جلا دینے کے لئے زندہ انسانوں کی صورتیں ان میں حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ بات آگے چل کر مثالوں کے ذریعے سے زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آسکے گی۔

مسٹر پیارے لال کا دوسرا قصہ یعنی ”قصہ خوشحال چند وغیرہ“ بھی ادبی پائے کے لحاظ سے من سکھی اور سندرسنگھ کی کمائی کو نہیں پہنچتا۔ الگ الگ طور پر وہ سب خوبیاں اس میں بھی موجود ہیں جو من سکھی اور سندرسنگھ کے قصے کا طرزِ رائے امتیاز ہیں۔ یہاں بھی مصنف کا قلم ایک سیر حاصل دماغ کے اشاروں پر اُسی حیرت انگیز چابک دستی کے ساتھ سانس لیتی اور حرکت کرتی ہوئی زندگی کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا چلا جاتا ہے اور مصنف کے تخیل کی تازگی اور پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن باعتبارِ فن اس قصے میں ایک نقص ہے اور یہ نقص قصے کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ کمائی ایک کنبے کی تین مسلسل سلسلوں کی داستان ہے اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ کمائی کی بنیاد جس نقشے پر قائم ہے اُس کے توازن میں خلل آ گیا ہے۔ توازن میں خلل آ جانے سے مراد یہ ہے کہ کمائی کے نقشے میں کوئی ایسی

وحدت مرکزی موجود نہیں رہ سکی جو قصے کے تمام منتشر اجزاء کی شیرازہ بند ہو جاتی۔ اس وحدت کے بغیر قصے اور روزنامے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ سچ ہے کہ ایک قسم کی وحدت کمائی کے نفع کی موجودہ صورت میں بھی پائی جاتی ہے کیونکہ سب واقعات ایک ہی گھرانے کی تین سسلوں کو پیش آئے ہیں لیکن یہ وحدت محض مصنوعی ہے اور یہ لحاظ فن قصے میں اس کا وجود عدم تقریباً یکساں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کنبے کی تینوں سسلیں براہ راست باہم ملی ہوئی ہیں لیکن باہم کمائی کے نفع میں اس سے جو وحدت پیدا ہوتی ہے اُس کی نوعیت محض خارجی ہے جو پوری کمائی کو کوئی ایک روح نہیں دے سکی۔ بخلاف اس کے من سکھی اور سندرسنگھ کے قصے میں وحدت معنوی کی وجہ سے ایک نئی شان پائی جاتی ہے۔ وہ بنیاد جس پر اس لاجواب قصے کی ادبی وحدت قائم ہے من سکھی اور سندرسنگھ کی محبت ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد اول سے لے کر آخر تک قصے کے تمام واقعات پھیلے، چکر کھاتے اور سمٹتے ہیں۔ ”رسوم ہند“ کے باقی دونوں قصوں میں یہ بات نہیں۔ پس من سکھی اور سندرسنگھ کا قصہ بہر حال اس مجموعے کا بہترین نقطہ ہے۔

اس قصے کو اردو افسانہ نویسی بلکہ اردو نثر میں ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ اردو ادب کا وہ نیا دور جس کا زمانہ غالب کی وفات کے بعد سے شروع ہوا، قدیم ادبی روایات سے ہماری بغاوت کا دور ہے۔ من سکھی اور سندرسنگھ کا قصہ اس بغاوت کا اولین نقیب نہیں تو اولین نقیبوں میں ضرور ہے۔ اس کو ایک نگاہ دیکھنا، یہ جان لینے کے لئے کافی تھا کہ ایک نئی نثر دفعۃً وجود میں آگئی ہے جس طرح اُسی زمانے میں حالی کے ہاتھوں ایک نئی نظم دفعۃً وجود میں آئی۔ ”دفعۃً“ کا لفظ ہر اداں اضافی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ حیات انسانی کے کسی شعبہ میں کوئی نئی ترقی ترقیاً یا سبقت سے بالکل بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ باہم یہ بہت بڑا انقلاب ہے کہ دربار اور محلوں سے نکل کر افسانہ ایک بیک دربار سے جھونپڑوں میں پہنچ جائے۔ عجب و غرائب کی سرکاریوں اور سہمندیوں کی ہوشربا داستانیں اور اُن کی ثرولیدہ بیانیات یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ سیدھے سادھے لوگوں کی کمائی ہے۔ جو سیدھی سادھی طرح لکھی گئی ہے۔ اس میں نہ مبالغہ کو دخل ہے نہ بناوٹ کو۔ یہ ہندوستانی کسانوں اور اُن کی عورتوں اور بچوں کی زندگی کی سچی تصویر ہے۔ ایسی سیدھی سی حکایت کو ہنگامہ خیز اور سنسنی پیدا کرنے والے عناصر کی مدد کے بغیر دلچسپ بنادینا مصنف کا اعجاز ہے۔ کمائی یوں ہے کہ ایک امیر کی لڑکی من سکھی جس نے بچپن ہی میں یتیم ہو جانے کے بعد اپنے چچا سجان سنگھ اور چچی چندر کو رکھے گھر میں پرورش پائی تھی جب پورے پندرہ برس کی ہو گئی تو سندرسنگھ نام ایک شریف اور صالح نوجوان سے اُس کی شادی ہوئی۔ دونوں کی طبیعتیں ایک دوسرے کے لئے اس قدر

موزوں تھیں کہ بہ حالات ظاہر ایک لمبی اور پُرست زندگی اس نے بیا ہے جو بڑے کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ لیکن تقدیر کی نیرنگی نے ان سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ ہے من سکھی اور سندرنگہ کے قصے کا سیدھا سادھا خاکا۔ اور بہ ظاہر اس میں کوئی بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی لیکن جس طریقے سے مصنف نے یہ معمولی سے واقعات بیان کر دیئے ہیں اُس نے ان میں ایک روح چھونک دی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بہت بڑے بڑے ڈراما نگاروں اور شاعروں نے جن کی مغربی مثالوں میں ہومر اور شکسپیئر اور ملٹن اور مشرقی مثالوں میں کالی داس اور دامیک اور فردوسی جیسوں کے نام آتے ہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ جس داستان کو وہ ہاتھ میں لے رہے ہیں طبع زاوہ ہے یا مستعار لی گئی ہے، یا اس میں حیران و ششدر کر دینے والے عجیب و غریب واقعات ہیں یا نہیں۔ کمائی بجائے خود اس قدر اہم نہیں ہوتی جس قدر وہ انداز جس میں کمائی بیان کی جائے۔

سب سے بڑی خوبی اس کمائی میں یہ ہے کہ یہ ہندوستان کی کمائی ہے۔ اور اس خوبی کے لئے ہندوستان اس کی جتنی قدر کریں کم ہے۔ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ روسیوں کو اہل فرنگ ایک جاہل اور غیر متدین قوم سمجھ کر نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے بعد جب روس نے گزشتہ صدی میں بعض معرکے کے فسانہ نگار اور شاعر پیدا کئے جنہوں نے روس کا دل چیر کر دنیا کے سامنے رکھ دیا اور روسی معاشرت کی تصویر کھینچ کر اغیار کو دکھا دی تو اہل روس کے متعلق وہ پرانا تعصب یورپ کے دل سے نکل گیا۔ روسی افسانے کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ افسانے کے مصنف اور افسانے کے افراد کی مخصوص قومی سیرت اور مخصوص قومی حالات افسانے میں سے پھلکے پڑتے ہیں یہی بات شاہنامہ فردوسی کا ایک نمایاں وصف ہے بلکہ بڑے بڑے اساتذہ فن جب اقوام غیر کی کسی داستان کو بھی لیتے ہیں تو ان کی اپنی قومیت کی روح، اپنی پوری زندگی اور تازگی کے ساتھ اُس میں سے اہل پڑتی ہے شکیپیر اس دعویٰ کی زندہ جاوید مثال ہے اور خود اردو میں انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ نگار خلوص اور تاثیر کی جس شان کے حامل ہیں، اُس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اہل بیت کی زندگی کو ہندوستان کے مسلمان شرفا کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔

ہماری ادبیات کا دور جدید ترجمے کا دور ہے یعنی آج کل ہم اقوام غیر سے مطالب کا سرمایہ اخذ کر رہے ہیں اور غیر زبانوں کے ظاہری و معنوی محاسن کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ یہ زمانہ بحیثیت عمومی ادبی "تخلیق" کا زمانہ نہیں کہلا سکتا مختصر افسانہ جو آج کل اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے اسی مترجمانہ

۱۰ کمائی اور کمائی کے انداز بیان کے درمیان یہ تفریق اکثر ماہرین فن کے نزدیک اتنی طور پر یکساں نہیں ہے لیکن تفہیم کی غرض سے یہ طریق تعبیر اختیار کرنا پڑا ہے۔

انہماک کا پروردہ ہے۔ اسی لئے افسانوں میں عام طور پر ایک بڑا عیب یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان کی قومی خصوصیات اور مقامی حالات یا تو سرے سے غائب ہوتے ہیں اور یا کافی حد تک واضح نہیں ہوتے جو افسانے ”طبع زاد“ بیان کئے جاتے ہیں ان میں بھی بسا اوقات فسانہ نگار کا دماغ کسی ناموجود ماحول کی ترجمانی کرتا رہتا ہے، حالانکہ کسی خلاق صانع کو کبھی نقالی یا مسترجانہ انداز فکر و تحریر سے تشفی نہیں ہو سکتی۔ من سکھی اور سندرسنگھ کے قصے کو جب ہم نے خالص ہندوستان کی کہانی کہا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ یہ ایک زبردست صانع کے دماغ کی خلاق کارکنہ ہے اور اس کا مصدر خود اس کی اپنی ذات اور اس کا اپنا مشاہدہ حیاتِ انسانی ہے۔ ایران یا انگلستان کی ذہنی غلامی کی عمر اس قصے پر ثبت نہیں ہوئی۔

ہمارے اُن مختصر افسانوں پر بھی جو زمانہ حال کی منتدن ہندوستانی زندگی کے واقعی مشاہدے پر مبنی ہوتے ہیں، زمانے کے عام مترجمانہ میلان کا سایہ پڑے بغیر نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ہندوستانی زندگی خود مغربی زندگی کا ترجمہ ہے، اور یہ ترجمہ بھی ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا۔ ہماری تہذیب ایک منزل سے نکل کر دوسری منزل میں داخل ہو رہی ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے موجود الوقتِ منتدن کے کون کون سے عناصر کو خالص ہندوستانی معاشرت اپنے اندر جذب کر لے گی اور کون کون سے عناصر کو بالآخر دو کرے گی۔ بہ الفاظِ دیگر اس وقت ہندوستان میں اعلیٰ طبقوں کا منتدن کسی پائدار قومی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اس لئے اگر ہمیں ہندوستان کے دل تک پہنچنا ہو تو اس مصنوعی زندگی کی تصویر کو خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی سچی اور صحیح ہو، ہم اپنے مقصد کے لئے نا تمام پائیں گے۔ اس کے علاوہ عالمانہ طرزِ گفتگو عام انسانی جذبات اور وارداتِ قلب کی تصویر کھینچنے کے لئے ہمیشہ غیر تشفی بخش سمجھا گیا ہے۔ کسی قوم کی زندہ تصویر دیکھنی ہو تو اعلیٰ طبقے کے لوگوں سے، جو بڑی حد تک انسانیت کے مصنوعی نمونے بن جاتے ہیں، قطع نظر کر کے اُس طبقے کی طرف آنا چاہئے جو بجا طور پر قوم کی ریڑھ کی ہڈی کہلاتا ہے۔ کسانِ نقش سے آزاد ہوتے ہیں۔ اُن کا طرزِ گفتگو صاف اور قدرتی ہوتا ہے۔ اُن کی ایک ایک حرکت سے اُن کی فطرت بے نقاب ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے پاس جو کچھ ہے، سب اپنا ہے۔ نقل یا مٹع کو یہاں کوئی دخل نہیں یہی باعث ہے کہ قدیم یونانی تہذیب کے زمانے سے لے کر اب تک مغربی ادیبوں کو ملک کے اس طبقے کو خاص دلچسپی رہی ہے، یہاں تک کہ ادبیاتِ مغرب میں ”دہقانی شاعری“ نے ایک مستقل صنفِ ادب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بحیثیتِ صناع مصنف کے وجدانِ صحیح کا ثبوت یہی ہے کہ من سکھی اور سندرسنگھ کے قصے میں بادشاہ اور اُس کے اُمرا غائب ہو جاتے ہیں اور ہندوستان کے امیر اور اہم پیرزیاں منصوبہ عمل پر حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قصہ اس طریقے

پر ہندوستان کی مخصوص قومی سیرت میں دُہری طرح ڈوبا ہوا مصنف کے دماغ سے ابھرتا ہے۔

قصے کا پہلا نظارہ ہی ہمیں بتا دیتا ہے کہ ہم ہندوستان میں کھڑے ہیں۔ امیر لوہ گاوٹوں میں سینٹلا کا بڑا میلا، بڑا جاڑے کا موسم نکل چکا ہے۔ گاؤں کے پیچھے جو جنگل پھیلا ہوا ہے، اُس میں طبع طرح کے بل بوتے اور رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ صبح ہی صبح گھر کے کام دھند سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے، گاؤں کے سب چھوٹے بڑے باہر نکل آئے ہیں۔ تمام عورتیں اور مرد لائقوں میں نیچا پالنے سینٹلا کے مندر کو جاتے ہیں۔ نوعمر لڑکیاں بل بل کر اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ بعض آپس میں ہنس بول رہی ہیں اور بعض سینٹلا کے سٹیبلے گاٹی چلی جاتی ہیں۔ یہاں مصنف ہمیں دو ہم عمر لڑکیوں کی باہمی گفتگو کا نقشہ دکھاتا ہے:

من سکھی نے پاربتی کو دیکھتے ہی اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور دونوں کی باتیں ہونے لگیں۔ اس میں پاربتی نے کہا من سکھی! تیرے بیاہ کو تو پانچ برس ہو گئے ہونگے اور تو بھی پندرہ برس کی ہوئی۔ اب گونا گب ہو گا؟ اُس نے جواب دیا۔ اب کے میاں کھ میں بتاویں میں؟ پھر پاربتی نے کہا۔ جی جی تیرا ننڑا تو بڑا سندر ہے۔ یہ بات سن کر من سکھی مسکرائی اور کہنے لگی۔ بل جی جی! میں نے بھی اُسے کئی بیر چھپ چھپا کے دیکھا تھا۔ مجھے بھی اُس کی صورت بھلی لگی تھی۔ پاربتی نے کہا من سکھی! اب تو تیرے گونے کا مینا ہی بھر رہا ہے۔ جب تو اپنے ننڑے کے ساتھ چلی جائے گی۔ تو مجھ سے کات کوٹے گی؟ چھ سات مینے پیچھے کبھی آئی۔ دو چار دن رہ گئی۔ پھر تو کہاں اور ہم کہاں!

یہ پورا منظر جس میں دو رہاتی لڑکیوں کی بول چال کی یہ تصویر دکھائی گئی ہے پہلے ہی ایک صفحے میں گزر جاتا ہے اور پڑھنے والا شروع ہی میں چوکتا ہو جاتا ہے کہ اُسے معمولی قوتِ بیان کے کسی قصہ نویس سے سابقہ نہیں پڑا۔ پھر مندر میں پہنچ جانے کے بعد یہ عجیب و غریب تصویر آتی ہے:

من سکھی کے چچا نے اپنی بیوی سے کہا۔ اے موہن کی ماں! بچا پا نکال اور چھوڑے کے ہاتھ سے چھوڑا کے مہارانی پر چڑھانے۔ اور بھگت جی کو جوڑا پہنا دے۔ اور بچہ پڑے کو چھوڑ دے۔ من سکھی کی چچی نے سب بچا پا چڑھا دیا۔ پھر سب مندر کے باہر نکلے۔ ایک بھگتی نے آتے ہی مرغ پھڑ پھڑایا۔ اور کہا۔ انا کی خیر اصد تے کا پیسہ دلاؤ۔ دوسری طرف سے ایک دھنگی سڑک کا بچہ ہاتھ میں لئے ہوئے آیا۔ اور دو چار دفعہ لڑکے کے سر پر دار کے چھوڑ دیا اور کہا۔ گھینے کی چھڑوائی کا پیسہ مل جائے! چند رکورنے ان دونوں کو ایک ایک پیسہ دے دیا۔ ذرا ہی آگے بڑھے ہو گئے کہ ایک عورت مٹی کی مورت لئے ہوئے سامنے سے نظر پڑی۔ اور چند رکور کو دیکھ کر بولی۔ کلچے والی کی بھی بیٹ چڑھاتی جا! ایک اور

بولی ”پھپھو نے والی سے بھی ڈر“ ایک نے کہا کھیل ماتا کا بھی پیسہ رکھتی جا۔ من سکھی کی چچی ایسی خوفناک آوازیں سن کر کانپتی تھی اور ہر ایک کے آگے پیسہ رکھتی جاتی تھی۔ آخر کار جب پیسے بیتے بیتے حیران ہو گئی تو جلدی سے پھیپھا چھڑا کر ایک طرف کوچلی اور وہیں کسی درخت کے تلے سبے جمع ہو کر باسی کھانا کھایا۔

ذرا اس ایک لفظ باسی پر غور کرو۔ اس کے بغیر بھی قصہ بجائے خود قصہ ہی رہتا مگر اس ذرا سی تفصیل نے بات کو کما سے کہاں پہنچا دیا۔ ان حقیر جزئیات کو سبھی دیکھتے ہیں مگر کتنے میں جن کے دل پر ان کا کوئی مستقل نقش رہ جاتا ہے؟ اس سیدھے سے لفظ کا اضافہ یہاں کسی استاذ کا قلم ہی کر سکتا تھا۔ ہندوستان کی انسانی معاشرت کے متعلق واقعات کا ایک پورا سلسلہ اس میں پنہاں ہے۔ اس سے کہیں یہ نتیجہ نہ نکال لیا جائے کہ من سکھی اور سند رنگھ کے قصے کا مصنف تمام حقیر اور ناقابل اعتنا جزئیات کو قابل توجہ سمجھتا ہے۔ ان باتوں کے متعلق جن کے گرد و پایہ فسانہ نگار رہ کر چکر کاٹتے ہیں اور جن کی تفصیلات دینے میں ان کے صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جاتے ہیں، اس قصے کا مصنف محض ایک اشارہ کر کے گزر جاتا ہے۔ لیکن یہ اس کا خاص فن ہے (جو اس کے کمال کی دلیل ہے) کہ ایک بہت بڑے سیلے کے حالات بیان کرتا ہے اور کسی شاذ اور مندر کے جگ جگ جگ کرتے ہوئے چرلغ ہمیں دکھا دیتا ہے۔ گھنٹہ، گھڑیاں اور سنکھ کی آواز ہم سنتے ہیں۔ مندر کے پجاری کا خاموش اور بادقار پیکر، اور پتھر کی سورتوں کے گرد آہستہ آہستہ اس کا چرلغ پھرانا ہمیں نظر آتا ہے۔ مذہبی رسوم کو ایک شانِ تقدیس کے ساتھ ادا ہونے ہوئے ہم دیکھتے ہیں اور مجنوں کے دھیمے دھیمے سر جو سننے والوں کی روح کو اخزام و عقیدت سے لبریز کر دیتے ہیں، ہمارے کانوں میں پڑتے ہیں۔ اس کے بعد دفنہ ہمیں یہ الفاظ نظر آتے ہیں:

سہان نگھ نے دو پیسے اس مندر پر چڑھائے

باسی کھانے، بادو پیسوں کی تفصیل دینا ہر کس و نا کس کا کام نہیں۔ اس قسم کی تفصیلات کو دیکھنے سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف اپنے کام سے خود بھی کس قدر لطف اندوز ہو رہا ہے اور اپنے فن کے استعمال سے لطف اندوز ہونا ایک بڑے صنایع کی انتیازی نشانیوں میں سے ہے۔

مندروں کے متعلق اد پر جو دو اقتباس دیئے گئے ہیں ان کو پڑھ کر اس مضمون کے ناظرین میں سے جنہوں نے ذرا بھی غور کیا ہوگا ان کا ذہن فوراً اس حقیقت کی طرف منتقل ہو گیا ہوگا کہ جس شخص کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں اس کا عام انداز تحریر ظرافت کی ایک لطیف سی چاشنی سے خالی نہ رہتا ہوگا۔ یہاں ظرافت اور مسخر کافرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ ظرافت نگاری سے مراد محض ہنسی ٹھٹھا نہیں بلکہ یہ ایک برتر چیز ہے جس کے معیار پر مصنف کے ظرف کی وسعت پابندی

دماغ کی دقیقہ رسی و تیر مبنی، فہم کے توازن و استقامت اور ذوق کی لطافت و پاکیزگی کا امتحان ہو جاتا ہے۔ دو چیزوں کے باہمی عدم توافق کو محسوس کر لینا ظرافت کی اصل بنیاد ہے۔ موٹے الفاظ میں ظرافت کی عام تعریف یہ ہے کہ یہ نام ہے بوالعجبیوں کے احساس کا۔ ان بوالعجبیوں کی نوعیت اس لحاظ سے کہ ان سے مصنف کی دلچسپیوں کے وسیع یا محدود ہونے کے متعلق کیا پتا چلتا ہے اور پھر ان بوالعجبیوں کے احساس کی نوعیت کہ مصنف کا ذوق کس حد تک سلیم و لطیف یا اسکے برعکس ہے، اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ ظرافت نگاری کی صف میں مصنف کا پایہ کیا ہے۔ پیارے لال کی ظرافت نگاری میں جو پاکیزگی اور بے ساختگی ہے کوئی شخص اس کو فی الفور محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان صفات میں ہمیں ظرافت کی وہ بے اختیارانہ شدت کمیں نہیں ملتی جو پیٹ میں بل ڈال دیتی ہے۔ ایک خاموش ظرافت شروع سے آخر تک قصے کے صفحات کو روشن کر رہی ہے۔ ظرافت نگاری کا یہ بہت بڑا اکمال ہے کہ تمام قصے میں غالباً کمیں بھی قصے کے افراد کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ ان کو غالباً یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان سے کوئی مضحکہ خیز حرکت سرزد ہو رہی ہے، لیکن پھر بھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ ظرافت کے لطیف ترین جوہر قصے میں جو ہیں۔ اس لئے کہ خود مصنف ان کی بوالعجبیوں پر ایک ملاطفت آمیز تبسم کی نظر ڈالتا ہوا گزرتا چلا جاتا ہے۔ چنیدہ جی کے شان دار مندر پر دو پیسے چڑھانے میں سببان سنگھ کو کوئی بات خلاف معمول نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم اس پر مسکراتے ہیں۔ یہ اُس وضع الشیء فی غیر محلہ کی نہایت عمدہ مثال ہے جس سے ظرافت نگار کا احساس اپنا بہترین سرمایہ حاصل کرتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہم کو ہنسائے کے لئے مصنف واقعات کی تحریف نہیں کرتا نہ حقائق کی صورت بگاڑتا ہے۔ کسی مندر پر دو پیسے چڑھانا ایک ذاتی کے لئے کوئی عجیب بات نہیں ہے مصنف نے صرف اُس بوالعجبی کو کسی قدر واضح کر دیا ہے جو اس فعل میں چھپی ہوئی ہے۔

تشریح بالا سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مصنف کا احساس ظرافت کس قدر پاکیزہ اور سلیما ہوتا ہے اور اس کی لطافت بعض بعض جگہ اس قدر مصفا ہے کہ پڑھنے والے کا احساس اگر مساوی طور پر لطیف نہ ہو تو اس کا نظر انداز ہو جانا بھی بالکل ممکن ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ بوالعجیاں جو مصنف کے احساس ظرافت کے لئے موجب کشش ہیں مصنف کی دلچسپیوں کے وسیع یا محدود ہونے کے متعلق ہمیں کیا پتا دیتی ہیں۔ اہیر پور کے مندر میں من سکھی کی چچی کو جو قوم پیش آیا وہ ظرافت نگاری کا ایک اور عمدہ نمونہ ہے۔ بلکہ یہاں مصنف کا ظریفانہ کنایہ صاف اور غیر مشتبہ ہے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف چھوٹی چھوٹی تنگ نظرانہ انفرادی اور منتشر جزئیات کو مرثقی ظرافت نہیں بناتا بلکہ ظرافت کے لئے اُس کی نظر اتنی ہی وسیع ہے جتنی ہندو قوم۔ وہ اُس رسم و رواج پر مسکراتا ہے جو اس کی قوم کو

ایک پیچ پیچ جال میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہے۔ جو مذہبی یا معاشرتی رسوم اپنا وقت گزار چکی ہوں اور اُن کی اصل روح فنا ہو چکی ہو وہ مٹی کے بے جان بُت ہیں جنہیں خدا کا نورِ رخصت ہو کر مُردہ بھٹور گیا ہے۔ اس کے باوجود ان بے روح پیکروں کی پرستش کرتے چلے جانا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ ظرافت نگار اہل قلم اس بواجبی کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ خود لطف اٹھاتا ہے اور دوسروں کو اس لطف میں شریک کرتا ہے ہندوستان آج کل اپنی قومی زندگی کے جس دور میں سے گزر رہا ہے اس میں ہندوستانی مصنفین کو ظرافت کا سب سے بڑا طریقہ رائج الوقت رسوم و اہام میں مل سکتا ہے۔ پیاسے لال کی ظرافت نگاری کا رخ زیادہ تر انہیں چہروں کی طرف مائل ہے۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں لیکن قصے کو جوں جوں ہم آگے بڑھیں گے، اور مثالیں بھی ضمناً آتی جائیں گی۔

سجان سنگھ اور اُس کا پردہت گیان چند شرنگا جی کے کنا سے پھر رہے ہیں۔ ایک مندر میں سجان سنگھ ایک مورت دیکھتا ہے اور گیان چند سے پوچھتا ہے ”یہ کس کی مورت ہے؟“

گیان چند نے کہا: ”بھائی سجان سنگھ اس مورت کی بڑی کتھا ہے۔ ارجن کے بھائی راجہ بھیم نے جو بڑے بلوچ تھے جب دیکھا کہ اس سنار میں اُس سے کوئی لڑنے والا نہیں رہا تو اُس کے بازو کھلانے لگے۔ اور اُس نے اپنے دل میں بھارا کہ میں ماد یو جی کی پوجا کروں تو وہ ضرور مجھ سے آکر لڑیں گے جب ماد یو جی مہاراج اُس سے پرسن ہوئے تو بھیم نے کاروپ دھار کر اُس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ بھیم نے چاہا کہ اُن سے لڑے۔ وہ بھاگ نکلیے بھیم نے اُن کا پیچا کیا۔ ماد یو جی زمین میں گھس گئے۔ یہ دیکھ کر بھیم نے اُن کی پونچھ خوب زور سے پکڑ لی۔ اور کہا مہاراج اب گھا کر کہاں جاؤ ہو؟ اب تو میں نہ جانے دول کاؤ سو پونچھ اور کھچلا دھڑ تو بھیم کے ہاتھ میں رہ گیا اور منہ نیپال کے پہاڑ میں جا نکلا۔ اب منہ کی پوجا نیپال میں ہوتی ہے اور پونچھ اور کھچلے دھڑ کی کد راتھ جی میں۔ سو یہ کد راتھ جی کی مورت ہے۔“ سجان سنگھ نے یہ بات سن کر کہا ”مہاراج ماد یو جی بڑے بھولے ہیں! دیکھو! بھگت کے کارن کیا روپ دھار رہے؟“

لیکن مصنف نے رسمی پابندیوں کو جہاں ہدفِ بذلہ بھی بنایا ہے، وہاں اُس درود و تاثیر کو بھی جا بجا نمایاں کیا ہے جو ان قدیم رسوم میں چھپی ہوئی ہے۔ پجاری من سکھی کی شادی ہو رہی ہے:

دولہا کے گاؤں میں آتے ہی من سکھی نے گھر سے باہر نکلتا چھوڑ دیا۔ جو کبھی نکلتی بھی۔ تورات کے وقت محبوبوں سے ملنے جاتی اور خوب گلے مل کر روتی۔ وہ سب کی سب اُسے سمجھاتیں: ”کیوں روو رہے؟ پندرہ دن پیچھے تیرے پاپا چاچی تجھے بلالیں گے۔“

اور پٹا پھیر کی رسم میں

جس وقت ناٹی نے پٹوں کو مہلنے کے لئے اٹھایا۔ تو بارتی جو وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ اُس سے کہنے لگی۔ ”دیکھو! یہ پٹے آپس میں بکرا دیں نہیں۔ جو ایسا ہوا تو من سکھی اور جیہا میں سدا کھٹا پٹی ہے گی۔“

ہنسی کھیل کی ان باتوں کے بعد فوراً ہی درد کی اس تصویر کا تضاد کس قدر اثر انگیز ہے:

جب وداع کی تیاری ہوئی من سکھی اپنے سارے رشتہ داروں اور سہیلیوں سے مل کر خوب روٹی اور مہن کو گود میں اٹھا کر کہنے لگی:- ”بھائی تو چاچی سے کتنا رہو۔ جیجی کو جلدی بلا لے۔“

یہ آخری الفاظ کہنے سے اور اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں!

من سکھی اور سندرسنگھ کی شادی سے پہلے ہی مصنف نے ایک صناعتی چابک دستی کے ساتھ اُس آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اس دولہا دلہن کی زندگیوں کا رخ پھیر دینے والا ہے۔ واقعات اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ شادی سے فوراً پہلے اور شادی سے فوراً بعد وقفے میں وہ تاریک مایہ نمودار ہوتا ہے جو اس شادی پر منڈلا رہا ہے۔ سینٹلا کے میلے کی شام کو پہلی مرتبہ سجان سنگھ اپنی بھتیجی کی شادی کے بارے میں اپنی بیوی سے صلاح مشورہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ابھی یہ رات گزری ہی ہے کہ صبح ہی صبح وہ شخص کمائی میں داخل ہوتا ہے جسے تقدیر نے نوجوان دولہا دلہن کی قسمت پلٹ دینے کے لئے بھیجا ہے:

جب صبح ہوئی تو منبردار چارپائی سے اٹھ کر اپنی چلم بھر ماچے پر آ بیٹھا اور حقہ پینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک فقیر چٹا دھاری کندھے پر مرگ بچھا ڈالے ہاتھ میں چمٹالے ہوئے اس طرف سے گزرا اور منبردار کو ماچے پر بیٹھا ہوا دیکھ کر چپ چاپ اس کے سر ہانے آ بیٹھا۔ منبردار نے کہا: ”ہمارا ج کماں سے آنا ہوا؟ کیا چاہئے؟“ فقیر نے کچھ جواب نہ دیا۔ منبردار بولا: ”ہمارا ج! کچھ کہئے؟ کیا اچھا ہے؟“ فقیر نے کہا: ”ابا کچھ اچھا نہیں۔ جو تیرا جی چاہے تو ایک سلفا پلاوئے۔“ منبردار نے اپنے حقے پر سے چلم اتار کر فقیر کے حوالے کی۔ اُس نے ایک ایسا دم لگایا کہ لو اٹھ آئی۔ یہ دیکھ کر منبردار نے کہا۔ ”ہمارا ج! کیا تمباکو کی چانڈی ہی کھو گئے؟“ فقیر نے جواب دیا: ”سائیں کے بھنڈا میں کچھ کمی نہیں ہے۔ جو تیری یہ مرضی ہے تو ایسا ہی ہو جائے گا۔“ فقیر تو یہ کہہ کر چل دیا اور منبردار کو گھڑی بھر کے بعد جب پھر حقے کی طلب ہوئی تو وہ چلم بھر لے گیا اور جوں ہی چلم الٹی۔ ایک چانڈی کی ڈٹی اس میں سے نکل پڑی یہ دیکھ کر منبردار جبراً ہو گیا اور دفعتاً پکارا مٹا ”موہن کی ماں دوڑو! موہن کی ماں دوڑو!“

۱۔ جس وقت حقے کا ایسا دم لگاتے ہیں کہ تمباکو مل کر رکھ ہو جاتا ہے اُس وقت کہا کرتے ہیں کہ تمباکو چانڈی ہو گیا۔

ہندوستان کے فقیر کی کیسی ہو بہو تصویر ہے اور وہ جہالت اور خوش اعتقادی جو ان فقیروں کی پشت پناہ، سجان سنگھ کی اس ایک متحرانہ اضطرابی جنبش اور ان چند الفاظ میں اختصار کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہے۔ اجمال سے کام لینا مصنف کے فن کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور اس کے ذریعے سے مصنف نے بڑے بڑے استادانہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ خصوصیت ان ناظرین کو جو قصے کے اقتباسات بعد کو نوٹر پڑھیں گے جابجا از خود نظر آجائے گی۔ سند سنگھ کی اپنی سسرال سے جو ناپاکی ہوئی اُس کا ذکر شادی کی سرگزشت کے ساتھ ہی ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

سند سنگھ اپنی سسرال میں رہنے لگا۔ مگر وہاں رہنے سے اس کی طبیعت کچھ خوش نہ ہوئی کیونکہ سجان سنگھ اس کو حق سے بہرہ رقت طے دینا اور کبھی کبھی یہ کلام بھی اپنی زبان پر لاتا۔ من سکھی بڑی بھاگی ہے جو تجھ سے زرخیز کے پلے پڑی اور پھر ان چند فقروں کے فوراً بعد وہی مکار فقیر جو ایک بڑے فتنے کا سرچشمہ ثابت ہونے والا ہے اُسی پہلی خاموشی کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ شادی کو یقیناً کچھ عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس عرصے کی کوئی تفصیلاً مصنف نے ہمیں نہیں دی۔ اس لئے قصے میں جس ہنرمندی کے ساتھ شادی سے فوراً پہلے اور فوراً بعد فقیر کا ناگمانی ظہور دکھایا گیا ہے اُس سے ناشاد و لہذا من کی بد قسمتی کے متعلق ہمارا احساس زیادہ واضح اور قوی ہو جاتا ہے۔ سجان سنگھ جاہل ہے اور چند رکور اپنے شوہر سے زیادہ جاہل۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس فقیر کی مدارات کرتے ہیں۔ سند سنگھ جو اس قسم کے لطیروں سے بہت بدگمان ہے پاس بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ فقیر اُس کی نظروں سے بھانپ جاتا ہے کہ یہ میری دال یہاں نہ گلنے دے گا۔ اس پر جس ادا سے وہ رخصت ہوئے مصنف کا اعجاز ہے۔ یہ بات ناظرین کی توجہ میں اکثر آئی ہوگی کہ ہمارے پرانے قصوں میں دو مختلف آدمیوں کے انداز گفتگو میں بالعموم کوئی فرق ملحوظ نہ رکھا جاتا تھا۔ کمانیوں میں مکالمے کا جزو اس قدر ناقابل التفات خیال کیا جاتا تھا کہ عورت اور مرد، جوگی اور گرہتی، گنوار اور شہری، شاہ اور گدا سب کی زبان ایک ہی تھی۔ اس قصے کی ایک بڑی ادبی فتح اور اصلاحی کارنامہ ہے کہ قصے کے افراد بعینہ اسی طرح بولتے ہیں جس طرح واقعی زندگی میں انہیں بولنا چاہئے اور ان کی ایک بات سے اعلیٰ درجے کی میرٹ نگاری کے لوازم پورے ہو رہے ہیں۔ اس کے

۱۔ یہ مصنف کی انتہائی قریب شناسی کا ثبوت ہے کہ کمانی کے اخیر میں چل کر وہ ہمیں بتاتا ہے کہ شادی کے بعد کے زمانے میں کس طرح من سکھی اور سند سنگھ کا انس بڑھتے بڑھتے عشق کے دے کو پہنچ گیا۔ اور وہاں ان تفصیلات نے کمانی میں غضب کی تاثیر اور توت بھردی ہے۔

بعض نمونے بخولہ بالا انتباہات میں بھی گزر چکے ہیں لیکن یہاں فقیر چلتے چلتے جو بات کہہ جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔
 ”من سکھی اور سندرسنگھ کا قصہ“ ڈراما نہیں ہے، محض ایک کہانی ہے لیکن فقیر کے یہ الفاظ خود بخود بولتے ہوئے معلوم
 ہوتے ہیں اور فقیر سلسلے کھڑا دکھائی دیتا ہے:

لے بابا سجان سنگھ فقیر کے دل میں موج آگئی تھی جو تیرے پاس آنکلا تھا۔ اب ہم رتے ہیں پر ایک بات تجھ سے کہے
 جاتے ہیں شاید تجھ کو کڑی معلوم ہو۔ پر یہ بھی کہا ہے۔ ”آئی بات کو من میں نہ رکھے۔ یہ لڑکا سندرسنگھ جو تیرا جانی ہے۔ اس کا
 بیان رہنما تیرے واسطے اچھا نہ ہوگا۔ ہم نے تو کچھ اور چاہا تھا۔ پر مونی بلوان ہے۔ اپنا چاہا ہوتا نہیں۔

فقیر کے چلے جانے سے سجان سنگھ غصے میں آ جاتا ہے اور سندرسنگھ کو بھی ایک آدھ علی کٹی سنا دیتا ہے:
 سندرسنگھ جو وہیں کھڑا ہوا تھا یہ بات سن کر نہایت ناراض ہوا۔ اور آسنو بھر کر کہنے لگا ”اس پاکھنڈی کا جانا ہنٹا لے
 اچھا ہوا جو میں آج نہ ہوتا یہ ضرور مٹا راستیاں اس کر جانا۔ اور ایسا لوٹنا کہ بن پر ایک لٹا بھی نہ چھوڑتا“ سجان سنگھ سنگھ
 کی طرف مخاطب ہو کر بولا ”اے زہنگاک کیوں جھک مائے ہے۔ میں نے تو تجھ کو اسی دن جان لیا تھا جس دن تیرے ساتھ
 چھوری کے پھیرے ہوئے تھے۔ پر کیا کر دل کموں کی ریکھ امٹ ہے۔ نہیں تو اور میرا گھر“۔ جب سجان سنگھ نے سندرسنگھ کو
 ایسی سخت باتیں سنائیں، تو وہ بھی بھرا یا اور آسنو سر کر کے کہنے لگا ”بھگوان سب پر دیا رکھے کسی کو بگاڑے نہیں جب
 میں تیرے گھر آ کے رہا تو تو نے مجھے یہ باتیں سنائیں۔ لے اب تو جان اور تیرا گھر“ یہ کہہ کر سندرسنگھ غصے میں بھرا ہوا مکان کے باہر
 آیا۔ اور جنگل میں جا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

سندرسنگھ سترہم بیان پہلی مرتبہ دو چار ہوتے ہیں لیکن مصنف کے فلم کی چند پے در پے جنبشوں میں اس نیک نما
 نوجوان کی ایک روشن تصویر نگاہ کے آگے آ جاتی ہے۔ نیکی کا بدلہ بدی ملتے دیکھ کر رنج کے مائے اس کا آنکھوں میں آنسو
 بھرانا اور ایک نئے طعنے پر غصے سے بے تاب ہو کر صرف یہ کہنا کہ ”بھگوان سب پر دیا رکھے“ پھر اسی غصے میں تیزی کے
 ساتھ گھر سے نکل جانا اور جنگل میں الگ بیٹھ کر رونا، امور متوقعہ نہیں ہیں بلکہ نئے انکشافات ہیں یعنی ہم اس صورت حال
 میں ہر انسان کے متعلق یہ پیش گوئی نہیں کر سکتے کہ وہ اٹھ کر جنگل میں جائے گا اور پھوٹ پھوٹ کر رہے گا۔ یہ ہمیں
 ایک خاص طبیعت کے آدمی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اور یہی تخصیص و تعین ہر ت نگاری کا کمال ہے۔ ایک اچھا متاع
 جب اپنی داستان کے افراد کی تخلیق کرتا ہے تو ہر ایک کو ایک جدا گانہ سیرت دیتا ہے جو قدرت کے انتظام کے بال
 مطابق ہوتی ہے۔ مثلاً سجان سنگھ کے متعلق ہم یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ بھی غصے میں یہی طرز عمل اختیار کرتا۔ اُسے غصہ
 آتا تو وہ غالباً سب سے پہلے اپنا لٹھ سنبھالنے کے لئے دوڑتا۔

اس واقعے کے بعد سندرسنگھ تنبیہ کر لیتا ہے کہ وہ سجان سنگھ کے گھر میں نہیں رہے گا۔ اور جا کر سپاہیوں میں بھرتی ہو جائے گا۔ من سکھی اُس کا یہ ارادہ اُس کر روتی ہے اور بے اختیار پکار اٹھتی ہے:

لے تو مرے باباجی! تجھ میں یہ گن تھے۔ تو میرے دھنی کو مجھ سے بچھا لئے آیا تھا۔ نیراستیا ناس جائے! آگ لگاؤں

نیری جٹا میں۔ چھونک دوں تیرے سونے چاندی کو۔

یہاں من سکھی اور سندرسنگھ کی جو گفتگو ہے وہ فطرت کی ترجمانی کا ایک نیا معجزہ ہے۔ اس میں غور کرنے والوں کے لئے معانی کے دفتر پھنسا ہوا ہے:

پھر سندرسنگھ سے کہنے لگی کیا تو چلا جائے گا اور مجھے چھوڑ جائے گا؟ دیکھ میں کہے دوں ہوں۔ جو ایسا کیا، تو میری صورت ہی کو ترستا پھرے گا۔ بس دیکھ لی تیری پریت جو پیٹھ لٹے جائے ہے۔ سندرسنگھ نے من سکھی سے کہا تو ہی بنا۔ اب میرا یہاں رہنا کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا تو اس بات کو اچھا جانے ہے۔ کہ تیرے چاچا کے روز روز کے طعنے منہ سنوں؟ دھڑکا رہے میرے ایسے بھنے پر۔ نام تو میں جانی تھا۔ پر تیرے چاچا نے تو کہتے کہ برابر بھی آؤ نہ دیا۔ اب میں یہاں ہر کیا کروں۔ میرا یہاں سے جانا تجھے بھی اچھا ہوگا۔ دیکھ تو بھگوان کیا کرے ہے۔ کیسے دلدار پارہو دیں ہیں۔ بہت سارے پیہ کماؤں گا اور تیرے واسطے اچھے اچھے گھنے اور اوڑھنیاں بھجوں گا۔ اور تھوڑے دنوں میں تجھے بھی اپنے پاس بلاؤں گا۔ من سکھی نے کہا جو تو جائے ہے تو مجھے تھوڑا سا بس دیتا جا اور اپنے ہاتھ سے میری کفن کا ٹی کرنا جا۔ پھر جہاں تیرے من میں آئے، چلا جاتیو۔

سندرسنگھ کے جانے کے بعد پاربتی آتی ہے:

پاربتی فوراً من سکھی کی کوٹھڑی میں گئی اور کہا۔ جی جی! آج کیا ہے؟ جو تو ایسی اداس پڑی ہے۔ من سکھی ایسے کچھ کر رہی اور کہنے لگی۔ اس سے تو مر جانا ہی اچھا ہے۔ میں نے سنا نہیں؟ آج تیرا جیجا نکل گیا۔ پاربتی اِدکھ میں کوئی کسی کا ساقی نہیں۔ کس کا چاچا۔ کس کی چاچی۔ جو آج میرے ماں باپ ہوتے تو ہیں ایسی نرادی کیوں ہوتی؟

”میں نے سنا نہیں؟ آج تیرا جیجا نکل گیا۔“ صرف یہی الفاظ من سکھی اور سندرسنگھ کے مصوّر کی استاد ہی کا لولہ مٹانے کے لئے کافی ہیں۔

ایک بہت بڑی خوبی جو کسی فسانہ نگار میں ہو سکتی ہے، یہ ہے کہ اُسے اپنے قلم پر قابو اور اپنے جذبات پر ضبط حاصل ہو یعنی اپنی داستان میں کسی خاص موقع کی اہمیت اُس کو اس درجہ متاثر نہ کرے کہ اُس کے بیان میں بے محابا پھیلاؤ پیدا ہو جائے۔ اس وصف میں بہت کم مصنف پایہ لالہ پر فوق رکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ من سکھی اور سندرسنگھ کے سینے

میں جذبات کا جو سمندر موجیں مار رہا ہے اُس کی ایک جھلک اُس نے ہم کو دکھا دی ہے۔ لیکن اس کے بعد اُس کے خاص اندازِ فن سے یہ بعید ہے کہ وہ رہ رہ کر اسی موضوع کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ اس کے بعد نئی دلچسپیاں اور نئے واقعات بننا اُس کی توجہ کو تمام تر اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں۔ میں سکھی کا چچیرا بھائی جو موہن سے چھوٹا ہے چچک کا شکار ہو کر چل بسا ہے۔ سجان سنگھ اپنے کنبے سمیت گنگا اشنان کو روانہ ہوتا ہے۔ گاؤں کے اور لوگ بھی چھکڑوں کا ایک قافلہ بنا کر اسی طرف کو روانہ ہوتے ہیں۔ عورتیں راگ گاتی ہوئی نکلتی ہیں:

رام!

جینا اُڑے گنگا پرے اور نیچ بے دریاؤ

رادھا پیاری ہے!

لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے

پہلا جھکولا میرے رام کا جن یہ سر شٹاپائے

رادھا پیاری ہے!

لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے

دو جا جھکولا میرے باپ کا جن منڈھا چھوایا

رادھا پیاری ہے!

لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے

اسی طرح سات آٹھ جھکولے گزر جاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ مصنف کی توجہ انہیں نئی دلچسپیوں میں غرق ہو لیکن اکبار لگی وہ ہم کو اس بات کا ثبوت دے کر چوکھا دیتا ہے کہ صرف ایک نے بدورت تو ہے اُس نے اپنے قلم کو تمام رکھا تھا، ورنہ میں سکھی کے متعلق خود اُس کے احساسات بھی اُسی قدر بیدار تھے جس قدر اُس کے قصے کے ناظرین کے۔ عورتیں گاتے گاتے نوب جھکولے تک پہنچتی ہیں:

نواں جھکولا میرے پُرسنہ کا جو لایا تھا سردھڑوٹ

رادھا پیاری ہے!

لینا جھکولے ٹھنڈے نیر کے

اس کے بعد ہم ناگماں یہ عبارت پڑھتے ہیں:

میں سکھی بھی اس راگ کے گانے میں شریک تھی مگر اُس کی آواز میں کچھ خوشی نہیں باقی باقی تھی۔ اور جب نوب جھکولے میں

پڑکھ کا نام آیا تو یکایک اُس کے آنسو ٹھک پڑے۔

مصنف نے صرف ان چند آنسوؤں سے من سکھی کے متعلق اپنی خاموشی کی پوری تلافی کر دی ہے۔ یہ کمال فن کی انتہا ہے۔ من سکھی کے نہ ٹٹنے والے رنج کا جیسا نقشہ اس طریقے پر پیش نظر آگیا ہے ویسا شاید تفصیلات کے بیان کر دینے سے بھی نہ آتا۔ ان دو چار آنسوؤں نے ایک پورے صفحے کو جگمگا دیا ہے۔

گنگا جانے والوں کی کیفیت بجائے خود ایک نا در چیز ہے اور اس کی سطر سطر سے ہندوستان کے مقامی حالات کی تصویر کھینچتی چلی جاتی ہے کھیتوں سے گھرے ہوئے میدانوں میں چھکڑوں کی قطار، مسافروں کا شور، ہل ٹانجنے والوں کی پکار، گنگا مائی کے جیکارے، کچھ پیادہ پالگوں کا ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے اور جنس کا گھوڑوں پر سوار ہو کر ساتھ چلنا، پھر دو گھڑی دن ہے پڑاؤ پر پہنچنا اور بیلوں کا کھولنا، صبح توپ چلنے پر چھکڑوں کی روانگی، سب گریہ نہایت دلچسپ ہیں لیکن اسی سفر کے ایک پڑاؤ میں ہندوستان کی غامض زندگی کا ایک شیریں اور دل نشیں نظارہ جو مصنف نے دکھایا ہے وہ اپنی لطافت میں حیرت انگیز اور لا جواب ہے:

من سکھی اور پارتی بھی گانے میں شریک تھیں مگر موہن ہر گھڑی اُن کے رنج میں آبیٹھتا اور غل چمانے لگتا۔ من سکھی نے پارتی سے کہا ”جی جی! اپنے میں اپنے بھائی کو مسلا آؤں۔ پھر آکے گاؤں گی۔ یہ کہہ کر موہن کو گود میں لے گئی اور چھکڑے میں لٹا دیا۔ مگر وہ اٹھ کر ضد کرنے لگا اور بولا ”میں سو رہوں گا تو تو پھر وہیں چلی جائے گی۔“ من سکھی نے کہا ”نہیں! میں ایک پہیلی کہوں۔ بتا دے گا؟“ ”موہن نے کہا ”کہہ“ ”من سکھی بولی ”کھیت میں ایسے سب کوئی کھائے۔ گھر میں ہوئے تو گھر بہ جائے۔“ ”موہن نے جواب دیا۔ ”پہیلی کہی۔ یہ تو پھوٹ ہے پھوٹ۔“ پھر من سکھی نے کہا ”اچھا! یہ بتا ہری تھی من بھری تھی سوال کھ موتی جڑی تھی۔ راجہ جی کے باغ میں دو سالہ اورٹ سے کھڑی تھی۔“ ”موہن نے کہا۔“ جی جی! یہ تو نہیں بتائی جائے۔ تو ہی بتائے۔“ وہ بولی ”کہہ دارا۔ جھک مارا۔ کوئیں کا پھنارا۔“ ”موہن نے کہا۔“ یہ تو نہیں کہوں۔“ ”من سکھی نے کہا۔“ اچھا تو بتا ہی دوں۔ کوڑی ہے۔“ اس کے بعد من سکھی نے اور بہت سی پہیلیاں کہیں۔ پھر موہن نے کہا ”جی جی! اب تو کوئی کہانی کہہ۔“ ”من سکھی نے اس کے آگے ایک کہانی کہنی شروع کی۔ اتنے میں موہن کی آنکھ لگ گئی۔ اور من سکھی اُٹھ کر پارتی کے پاس جا گانے میں شریک ہو گئی۔

انہیں تفصیلات میں کئی صفحے گزر چکے ہیں لیکن مصنف پھر چاک ہمیں یاد دل دیتا ہے کہ اُس نے اپنی کہانی کے اصل موضوع کو فراموش نہیں کیا۔ من سکھی ایک بیک پارتی سے کہتی ہے کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح پیپل کی پوجا کرے گی۔ من سکھی نے کہا ”اے توجی جی! اب تو جا کے تھوڑا سا دود لاے میں کوئیں پر سے پانی لاؤں ہوں“ ”عجب دود اور

پانی آگیا تو من سکھی نے دونوں کو ملا کر اُس میں پھول بتا سے اور رولی ڈالی۔ پھر اُسے پیل پر چڑھا کر اُس کے آگے گھٹی کا ایک چراغ روشن کر دیا۔ اور آپ ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔ اور کہنے لگی۔ ”یہ پیل دیوتا جو میرا مالک آجائے تو میں تجھے ہر شیچر دھاؤں گی“

پوچھا کہ رسم کی تمام تفصیلات متعلقہ کو ہم دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے کہ اس تمام عمل میں من سکھی کی جو قلبی کیفیت ہے وہ ہمارے لئے موجب دلچسپی ہے۔

گر ڈھ مکتیر کے میلے میں سجان سنگھ کی بڑبھڑ پھر اُسی پاکھنڈی فقیر سے ہوتی ہے اور یہ مزدور وہ اگر اپنی بیوی کو ستاتا چند رکوریہ بات سن کر بہت خوش ہوتی مگر من سکھی نے جس وقت بابا جی کا نام سنا اپنے دل میں ہزاروں گالیاں دیں۔ اور پاربتی سے کہا۔ ”پہلے تو یہ کچھ کر گیا اب اس کا کھوڑا اجائے جائے کیا کرے گا؟“

سجان سنگھ فقیر کو اپنے پاس روکنا چاہتا ہے کس قدر سید سے سادھے الفاظ یہاں استعمال کئے گئے ہیں۔ مگر یہ الفاظ نہیں ہیں، یہ ایک متحرک تصور ہے۔ چھکڑوں کی قطار پاس سے گزرتی جا رہی ہے لیکن سجان سنگھ اور فقیر الگ ایک رخت کے تلے کھڑے گفتگو میں محو ہیں۔ سجان سنگھ بہت شوق ہے اور فقیر بہت تنہا۔ اور جہالت کا ذوق عقیدت جس قدر زیادہ بیٹاب ہوتا ہے، خرچہ پوش زہد اپنے لشکار کو قابو میں پا کر اُسی قدر زیادہ استغنا اور تمرد کا ثبوت دیتا ہے غرور و خود پسندی اور عجز و الحاح و دبدو کھڑے ہیں۔ یہ موقع ہے جب ایک ایسی

سجان سنگھ فقیر کے قدموں پر گر پڑا۔ فقیر نے کہا ”سجان سنگھ! کیوں دیر کر رہے؟“ ”میلہ تو نکلا جائے ہے“ اُس نے کہا ”معالج! میں کہاں جاؤں؟“

اس ضمن میں مصنف سجان سنگھ کے پروہت گیان چند کو اپنی لطیف اور بے نیش ظرافت کا ہدف بناتا ہے: گیان چند چھکڑے پر بیٹھا ہوا دل ہی دل میں جلتا تھا اور کہتا تھا ”دیکھو سجان سنگھ کیا باہل ہوا ہے جھکڑا چھوڑ کر فقیر کے ساتھ پیدل ہولیا ہے بھلا اس پاکھنڈی میں کیا رکھا ہے جو اس کی اتنی چالوسی کر سکتا ہے۔ آخر تلے کیا بیٹلا کس جلا ہے کے ساتھ ہولیا ہے۔ جو کسی پنڈت کی سیوا کرتا تو اچت بھی تھا۔“

لیکن مصنف کی ظرافت نگاری کا نقطہ کمال وہ مقام ہے جہاں قصے کی دردناکی قصہ کہنے والے کی پاکیزہ نظر کے ساتھ مل جاتی ہے:

فقیر سب سے الگ ہو کر ایک کونے میں ہو بیٹھا اور ظاہر میں خدا کا دھیان کرنے لگا سجان سنگھ اس عرصے میں پورے جمع کرتا رہا۔ من سکھی نے جو مون کو کھانا کھلا رہی تھی۔ دُور سے فقیر کو دیکھ کر کہا ”مر جانا بگلا بھگت بن کر بیٹھا ہے۔“

اگر یہ ممکن ہے کہ کسی طرح الفاظ میں جا دو بھر دیا جائے تو وہ اس آخری جگہ میں ہے۔ بولنے والی کا نوخیز چہرہ ان اصد میں ابھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور پھر سیرت کے اظہار میں بھی ان چند الفاظ کا رتبہ اس قدر بلند ہے کہ پورے قصے میں بہت کم فقرے اس اعتبار سے ان کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ یہ الفاظ من سکھی کے جس درد و الم کا پتہ دیتے ہیں اس کے باوجود ہم تصور میں سب اس کی پیشانی کی شکنیں دیکھتے ہیں تو مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور یہ مصنف کے کمال فن کی دلیل ہے۔ اس کے بعد کی رات کو من سکھی کا خواب عجیبے مثال چیز ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔ یہاں قصے کا آخری حصہ اپنیچا ہے۔ اب واقعات کی رفتار میں بالکل قدرتی طور پر یک بیک سرعت آگئی ہے اور قصہ اپنے انجام کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا ہے۔ فقیر کا رات کی تاریکی میں بے پاؤں آنا اور چوری چوری موہن کا ماتھ کھینچنا من سکھی کا جاگ اٹھنا اور شور مچانا، فقیر کا اس کی کنپٹی پر لٹھی کا ایک تلابو اوار کر کے اسے بے ہوش چھوڑ جانا اور موہن کو چڑالے جانا، سندر سنگھ سے ٹھیکر اور موہن کی نجات یہ سب باتیں ڈیڑھ دو صفحوں کے اندر اندر گزر جاتی ہیں۔ مصنف حسب معمول من سکھی کے متعلق ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ اس کا زخم خطرناک ہے یا سمولی۔ اس کے بعد ہم سجان سنگھ کو سندر سنگھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس گفتگو میں اچانک سجان سنگھ کے یہ الفاظ سن کر چونک اٹھتے ہیں:

تمہارا کتنا سچ بھلا۔ اس چندال بی لگی۔ نے ہمارا گناہی لوٹا اور پھر چھوڑے کو لے کر بھاگا۔ اور کیا کہوں چھوڑی کے

ایسا سوشا مارا کہ اس کا بیچا بھی دو بھر ہے۔

عرصے کی جدائی کے بعد دولہا دلہن پھرتے ہیں مگر اس حالت میں کہ دلہن مجروح ہو کر ایک چمکڑے کے نیچے زمین پر پڑی ہے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے اور لمبے لمبے بال خاک میں کھلے ہوئے پڑے ہیں۔

من سکھی نے اس وقت آنکھیں کھول دیں اور سندر سنگھ کی طرف نظر پڑی۔ تو اس کی آنکھیں بھڑکیں۔ اور جاہا کہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہے مگر کھاخا کے سبب سے اپنا منہ پھیر لیا۔ جب چندر کو رنے یہ حال دیکھا۔ تو اس نے اپنے خاوند اور سب لوگوں کو جو ہاں کھڑے تھے اشارے سے ٹال دیا۔

گزیری ہوئی باتیں اس وقت تصویر کی طرح سندر سنگھ کے دہن میں پھر جاتی ہیں:

سندر سنگھ حیران رہتا سا کھڑا تھا اور دل میں کہتا تھا۔ اے کیا تھا کیا ہو گیا! کبھی اسے اپنی شادی کی امنگ اور من سکھی کے ساتھ لگنا کھینے کا دھنیاں آتا۔ کبھی شوخی اور اچھلاہٹ سے اس کے یہ کہنے کا خیال آتا کہ کبھی پہلے لگنا کون لے گا کبھی من سکھی کا اس کی مان کے رو بہ رو پیروں پڑنا۔ اور گھر کے سب آدمیوں کا ادب کرنے اور سب چھوٹے بڑوں کو خوش رکھنے کا تصور بندھ جاتا۔ کبھی اس کا پیار سے یہ کہنا کہ مجھے جگ میں

تجھ سے زیادہ کون ہے، یاد آتا۔ اور کبھی یہ سوچتا۔ کہ جب میں کھیت پر جاتا تھا تو یہ میری راہ دیکھا کرتی۔ اور تھوڑی سی یر میں غم کے مارے مرجھا جاتی۔ اور پھر جب میں اس کے پاس آتا تو مجھے دیکھ کر کھل جاتی۔ کبھی اپنے دل میں یہ کہتا کہ ٹائے! یہ وہی من سکھی ہے۔ کہ جب میں سجان سنگھ کے طعنہ شن کر جنگل میں جا کر رویا۔ اور پھر اُس سے ملنے گیا تو جج مار کر بولی۔ ”جو تو جائے ہے تو مجھے تھوڑا سا بس دینا جا“

سندر سنگھ کے بے اختیار نکلنے والے آنسو اس حیرت کا طلسم توڑ دیتے ہیں:

آخر کار وہ اپنا منہ ڈھانپ کر بے اختیار دوڑا اور زمین پر گر کر من سکھی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔ ”ٹائے! میں تجھے اس واسطے چھوڑ کر گیا تھا۔ کہ یہ دن دیکھوں۔ جو میں یہاں رہتا۔ تو تیرا یہ حال کا ہے کو ہوتا۔ وہ کون سی بڑی گھڑی تھی جب میں یہاں سے گیا۔ اب ذرا آنکھ کھول اور دیکھ تیرا سندر سنگھ آگیا۔ اور اب تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ پر تو اسے چھوڑ کر چلی“

من سکھی اپنا ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال دیتی ہے:

”میں تو گھنے دن سے تیری باٹ دیکھ رہی تھی۔ اب مجھے مر جانے کا تو فائدہ فکر نہیں ہے پر یہ سوچ تھا کہ تیرے لمبے بدوں مر جاؤں گی۔ سو بھگوان نے تجھے بھی بھیج دیا۔“

یہ بات سن کر سندر سنگھ کا کلیجہ پھٹتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو تسلی دینا چاہتا ہے:

..... من سکھی نے کہا تو کیوں چننا کرے ہے؟ تھوڑے دن پیچھے تیرا دوسرا بیاہ ہو جائے گا۔ اور سارا

دکھ جاتا رہے گا۔ بر باری من سکھی کہاں!“

لیکن سندر سنگھ پھر کوشش کرتا ہے کہ اپنی کامیابیوں کی داستان سن کر من سکھی کے دل کو مطمئن کر دے:

دیکھ۔ اب تو بھگوان نے دن بھی پھیر دئے ہیں۔ سجان سنگھ جو پہلے طعنہ دیا کرتا تھا۔ اب موم ہو گیا ہے۔ اور بڑی خوشامد کرے ہے۔ اور روپے بھی ہمارے ہاتھ گھنے سے لگے ہیں۔ اب بن تیرے پاس پل بھر کو نہیں ملوں گا۔ اور تجھے اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ یہ بات سن کر من سکھی کی آنکھوں میں آنسو بھرائے۔ اور کہنے لگی۔

”جو میں جیتی رہتی تو تو بھی دیکھتا پریت کیسی ہوتے ہے۔ پر میری زندگی ست سمجھید۔ میں تو دھرتی پر یوں ہی آئی اور یوں ہی چلی۔ جب ہالک تھی تو ماں باپ مر گئے۔ اور جب بڑی ہوئی اور تجھ سے ملی۔ تو یہ سمجھی کہ اس جگت میں آنے کا پھل مل گیا۔ پر رام چاہے سو کرے۔ یہ بھی بڑی بات ہے کہ تیرے ہاتھ سے مٹی تو ٹھکانے لگ جائیگی“

خاتمہ کتنا موثر اور حسرت ناک ہے۔

پھر من سکھی نے سندر سنگھ کا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اور پپ چاپ آکھیں بند کئے ہوئے پڑی رہی۔ جب اس طرح پڑے ہوئے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ اور سندر سنگھ نے اس کے جسم میں کچھ حرکت نہ پائی اور نہ سانس آنا جاتا دیکھا تو گھبرا کر اسے پکارنے لگا۔ اور بہت سی قسمیں دلائیں۔ مگر کچھ جواب نہ پایا۔ تب تو بے قرار ہو کر اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے اور ایک بار گی چلا اٹھا۔ ”لوگوں! میں لٹ گیا“

زرد و حسرت کی اس تصویر کے ساتھ انسانی خود غرضی اور شقاوت کے حسب ذیل مظاہرے کا تقاضا کس قدر واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ من سکھی کے مرجانے کے بعد سب لوگ اس کی لاش کے پاس جاتے ہیں:

پارتی نے بھی وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر اس کی ماں نے یہ اندیشہ کیا کہ ایسا نہ ہو۔ مرنے کے پاس جاتے اس کو کچھ ہو جائے اور یہ سچ کر اس سے کہنا۔ ”تو مہن کو لئے بیٹھی رہ“

یہ واقعہ مصنف کی بے دردانہ حقیقت نگاری کی دلیل ہے۔ من سکھی کو بھی یہی حقیقت پرستی موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ اور کمزوری کا کوئی جذبہ مقتضیات فن کے خلاف مصنف پر غالب نہیں آ سکتا۔ یہی اصول قصے کے انجام تک مصنف کی رہنمائی کرتا ہے۔

من سکھی کی موت کے بعد کے واقعات مصنف نے کسی قسم کی رنگ آمیزی و جذبہ آرائی کے بغیر نہایت سادگی سے بیان کئے ہیں:

سندر سنگھ وہاں سے اٹھ کر ایک طرف جا بیٹھا۔ اور دھاڑیں مار مار کر روتے لگا۔ جب سب کو روتے پیٹتے گھنٹہ بھر ہو گیا۔ تو گیان چند نے کہا۔ ”دو گے تو ساری نمر۔ ہر اس کی مٹی تو تھکانے لگاؤ۔ لنگاہاں سے دور ہے۔ سورج چھپے سے پہلے اس کو بھوکنا چاہئے“

گیان چند ہمیشہ سمجھ کی بات کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ قصے کے زیادہ اہم افراد میں سے نہیں ہے اس کی سیرت کافی حد تک واضح معین اور یک رنگ ہے۔ قصے کے آغاز میں جب سجان سنگھ نے سندر سنگھ کو اپنے گھر سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر دیا تو

گیان چند مشر نے جس وقت یہ حال سنا۔ فوراً سجان سنگھ کے پاس دوڑا گیا اور کہا۔ ”چودھری جی یہ بات تمہارے جوگ تھی۔ کہ تم اپنے جائی کو نکال دو؟ بھائی کسی کا ایک سا سمانیں رہا۔ کیا تمہیں اس کا آدھ میرا آدھ دو؟“
تھا؟ ان دنوں کو بھوں گئے؟ جب تمہارا ہیر پور کا بگاؤں اس کے دادا کی چودھری میں تھا۔ بھائی کیا ٹوٹا

آجاتا؟ جو امیر کا چھوڑا اپنے کڑے کیلے دن لتاے گھر کاٹ جاتا؟

اسی طرح جس وقت فقیر کے جھانسنے میں آکر سب ان سنگھ موہن کا زیور زبردستی اتارنا چاہتا ہے، گیان چند پاس سے گزرتے گزرتے رک جاتا ہے اور موہن کو اٹھا کر سب ان سنگھ سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

”چودھری جابھی۔ کیوں ہٹ کر رہے ہو۔ ناحق لڑکے کو دکھی کر رکھا ہے۔ اس کی روتے روتے بچیاں بھی بگڑتی ہیں۔“

پورے قصبے کو پڑھنے پر چند روز تک کی ایک نمایاں انفرادی سیرت تصور میں قائم ہو جاتی ہے اور یہ کہ قدر صاف ہے کہ ہر شخص قصبے کو پڑھ کر بطور خود اسے سمجھ سکتا ہے۔

من سکھی کی موت کے بعد کی رسوم سندرسنگھ کے ہاتھوں ادا ہوتی ہیں مگر یہ سب باتیں اصل قصبے کے ساتھ پڑھنے کی ہیں۔ جب سندرسنگھ کرپاکرم سے فارغ ہو جاتا ہے تو سب ان سنگھ چاہتا ہے کہ اُس کو اب اپنے ہی پاس رکھے لیکن سندرسنگھ یہ بات نہیں مانتا:

”انسنے میں پاربتی بھی آگئی اور دیر تک یہ باتیں سننی رہی۔ پھر کہا۔ ”جیجا! ادھر آئیں تجھ سے ایک بات کہوں۔“

سندرسنگھ اُٹھ کر اس کی طرف چلا گیا۔ وہ بولی۔ ”اب جیجا! تو یہاں سے کیوں جاؤں؟۔ رسلے میں جا کر کیا کرے گا؟

تو تو ہمیں کھدتی کیا ری کیا کر۔ یا اپنے باپ کے گھر جا رہو۔“ سندرسنگھ نے کہا۔ ”واہ تو تو جان بوجھ کر ایسی باتیں کہے

ہے۔ بھلا اب جی کر کیا کروں گا؟“ پھر پاربتی نے کہا ”جیجا! ایسی بات نہیں کہیں ہیں۔ اب تو تیرے پاس گھنے روپے

ہیں۔ اور تیرے ماں باپ بھی تیرے لئے روتے ہوں گے۔ اب جا اور ان کو سکھ دے۔ دیکھ۔ ان کی آہ مت لے۔“

یہ سن کر سندرسنگھ نے کہا۔ ”میں تجھے کہاں تک سمجھاؤں؟ تو تو جانے ہے مجھ کو تیری بہن سے کیسی پریت تھی۔“

”میں تجھے کہاں تک سمجھاؤں!“ یہ جملہ کتنا حسرت بھرا ہے۔ بچاے سادہ دل امیر نے سمجھایا کچھ بھی نہیں

مگر سمجھتا ہی ہے کہ میں نے سب کچھ سمجھا دیا، اس لئے کہ خود اس کے دل میں اپنی لائے والی محبت کے متعلق

تشریحات کی ناگفتہ داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد اس کا رنج عظیم خود ہی اُسے طاقت اظہار دے دیتا ہے:

”میراجینا تو اُس کے ساتھ تھا۔ اب بھگوان نے اُسے اٹھا لیا۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بہ

آئے اور پھر رو کر کہنے لگا۔“ پاربتی میں کیا کروں؟ میرا دل میرے بس میں نہیں ہے۔ تیری بہن کی صورت آٹھ پہر میرے

من میں بسی رہے ہے۔ مجھے نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند۔ اور اس گاؤں میں جس چیز کو میں دیکھتا ہوں۔ مجھے سب

اُس کی یاد دلاویں ہیں۔“

رخصت کے وقت اُس کے الفاظ میں وہ تاثیر ہے جسے درد دل اور خلوص ایک دہقان کی زبان میں بھی

پیدا کر سکتے ہیں:

چلتے دقت موہن کو گو دیں اٹھا کر بیار کیا۔ اور ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا: ”جو تجھے جان کے برابر رکھے تھی۔ وہ تو مر گئی۔ اب تو اُسے اور مجھے یاد رکھیو“ اور پھر پاربتی کو بلا کر کہا: ”لے رام رام پاربتی! جیسی پریت تیں نے اُس کے ساتھ کی۔ اور جیسی تیں نے میری ہیر بندھائی۔ بھگوان تجھے راضی رکھے۔ اب ہمداتیرا ملنا نہیں ہوئیگا۔ جہاں تو اُسے یاد کرے وہاں مجھے بھی یاد کر لیو۔ اب میرے جینے کا بھی کچھ بھروسہ نہیں ہے۔“

فقتے کے انجام میں بھی حقیقت و صداقت کے ساتھ مصنف کی وابستگی اُسی پہلی بے رحمانہ سختی سے قائم رہی ہے۔ اور کوئی بیرونی خیال اُسے مقتضیات فن سے سرتابی کرنے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ یہ آنکھوں میں آنسو بھر لانے والا نوجوان جو فقتے کے آغاز میں سہجان بنگلہ کے گھر سے رخصت ہوا تھا، اب خود فقتے میں سے اُس شان کے ساتھ رخصت ہوتا ہے جو اُس کا حق ہے۔ انجام اگر یوں نہ ہوتا۔ تو وہ آب جو فقتے کی موجودہ صورت میں ہم کو نظر آتی ہے یقیناً کسی حد تک ماند پڑ جاتی۔ ایک کسان لڑکی اور کسان لڑکے کی سیدھی سادھی محبت کی داستان کو ایک نرمیہ نظم کے تخیل کی عظمت و شان سے کوئی خاص مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن داستان کے آخری واقعے کی اہمیت اور پھر انداز بیان کی وہ خاموشی جس سے یہاں کام لیا گیا ہے بے اختیار انگریزی کی سب سے بڑی رزمیہ نظم کے خاتمے کی یاد دلادیتی ہے۔ پیارے لال کی خاموش اور شفاف روانی کو ملٹن کے شکوہ و جلال سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ باایں ہمہ درد و کرب کے ایک طوفان کو سمیٹتا ہوا، جس سکون کے ساتھ یہ قصہ انجام کو پہنچتا ہے اُس میں وہی اداجعلکنتی ہے جس سے انگریز شاعر نے آدم اور حوا کے بہشت سے نکلنے کا ذکر کیا ہے: پھر امیر پور پر جہاں ایسے دکھ اٹھائے تھے آخر نظر ڈال کر اپنے رسالے میں چلا گیا۔ اور وہاں رات دن بن سکھی کے خیال میں رہا۔ اور انجام کار اسی غم میں گھل گھل کر مر گیا۔

حمید احمد خاں

ضمیمہ

اس مضمون کا بیشتر حصہ قلم بند ہو چکا تھا کہ راقم الحروف کو اسی سلسلے میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا کی ”بیر المصنفین“ جلد دوم کی طرف توجہ دلائی گئی جنہوں نے اپنی کتاب کے ایک حاشیے میں سطر پیارے لال کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ نکالی ہے۔ اس طرح سطر پیارے لال کے متعلق کچھ نئی معلومات بہم پہنچیں جن کو پڑھ کر اپنی اس مجرمانہ غفلت پر اور زیادہ افسوس ہوا کہ ایک ایسے جوہر قابل کی موتی اب تک کیوں گلدستہءِ حلق نسیاں بنی رہی۔ پنجاب کی نوجوان نسل کے نہایت طالب علمی سے پہلے ”روم ہند“ نصاب تعلیم سے خارج ہو چکی تھی اور بعد میں اسے کوئی

مستقل ادبی حیثیت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے روپوش ہونا پڑا۔ اس لئے اس کتاب سے ہماری اداغیت باعثِ تعجب نہیں البتہ رنج کا مقام یہ کہ اردو کی قیسری کتاب "انقص ہندو" میں جو غالب ہم سے پہلے پڑھی ہیں، اب تک ایک عام مغالطے کی بنا پر بالعموم مولانا محمد حسین آزاد سے منسوب کی جاتی رہیں حالانکہ ان کا حق تصنیف سطر پائے لال کو پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی غالی از دلچسپی نہیں کہ سطر پائے لال ہی کے مروجہ او ہمدردانہ کشش سے محکمہ تعلیم پنجاب نے آزاد مرحوم کی قابلیت کو پہچان کر ان کی قدردانی کی تھی ریسرلٹنمن جلد دوم ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء سرکاری اخبار اتالیقی پنجاب "ستر پائے لال کی اوٹیری میں نکلتا تھا اور اس کے سب ایڈیٹر آزاد مرحوم تھے۔ جب آزاد پروفیسر ہو گئے تو عالی مرحوم نے بھی کچھ عرصے تک اس اخبار کی سب ایڈیٹری کی۔

ناظرین کی آگاہی اور دلچسپی کے لئے ہم ریسرلٹنمن "میں سے سطر پائے لال کے حالات یہاں نقل کرتے ہیں۔

"ما سطر پائے لال آئوٹب ۱۸۹۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے جو تین سو برس سے ان کے بزرگوں کا مسکن رہا ہے۔ ان کا بنی سلسلہ شغفشاہ اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرل تک پہنچتا ہے۔ آپ پانے دہلی کلچر کے تمام درجے طے کر کے ۱۸۹۵ء میں مکمل علم کے لئے آگرہ کلچر میں داخل ہوئے اور وہاں سے سند حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۷ء میں بریلی جاکر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مگر ایک سال کے بعد پنجاب چلے آئے۔ قحور سے عرصے تک گورکھاؤں اور دہلی میں بیڈا سطر پائے لال ۱۸۹۷ء میں دہلی سے تبدیل ہو کر لاہور پہنچے۔ اور وہاں کیویریٹر کے نازک عہدے کے ہم فرما رہے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی نیت ہوشیاری اور صفات ادبی و انجام دیا ۱۸۹۸ء میں ان کے پڑھنے اور ۱۸۹۵ء میں ان کے پڑھنے پر فائز المرام ہے۔ قیام لاہور کے زمانے میں کئی برس تک سرکاری اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ مگر فلا صاحب ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم ان سے بہت خوش تھے ان کے پاس ہلکتہ پونچر سٹی سے سوال آیا کرتے تھے۔ اور وہاں کے جواب میں اکثر ایسے بہادری صاحب سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہلکتہ پونچر سے یہ سوال آیا کہ سبج و معنی عبارت میں کیا فرق ہے، مع مثال بیان کرو۔ حسب معمول یہ سوال بھی لئے صاحب کے پاس بھیجا۔ لئے صاحب نے یہ سوال بھیج دیا جن کی خدمت میں لئے صاحب کو نیاز حاصل تھا اور مرزا صاحب ان پر بہت مہربانی فرماتے تھے انہوں نے اس کا جواب مع مثال نظم میں لکھ کر بھیج دیا جس کا اخیر شعر یہ تھا ہے

تحریر ہے یہ غالب بڑاں بہت کی تاریخ اس کی آج نویں ہے گت کی

سندھ کے پروفیسر آزاد اور مولانا حالی کو نچل شاعری کا شوق اور خیال آپ ہی کی صحبت میں ہوا اور آپ ہی سے اس کے مستقل معلومات حاصل کیے لیکن ہمارے نزدیک جو کچھ شوق ہوا وہ کرل لالہ ایڈیٹری کی تحریک اور امداد سے ہوا۔ اب جو چاہے اپنا نام کر لے۔

آپ نے روم ہند کے پہلے تین باب "انقص ہند" اول و سوم "اندو کی تیسری کتاب" لکھی اور ترجمہ تاریخ انگلستان کلاں کیا۔ نیز رسالہ "اتالیقی پنجاب" کے اکثر مضامین لکھے۔ ترجمہ دربار قیسری ۱۸۹۵ء مولفہ سطر پائے لال شہتہ و با محاورہ بلکہ جربہ و دل آویز کیا۔ اور اس کے سطر میں آپ کو ایک تمغہ اور ایک جلد مطالعہ مذہب مرحمت ہوئی ۱۸۹۵ء میں آپ کو لئے بہادری کا خطاب ملا اور ۱۸۹۵ء میں ۳۶ سال کی ملازمت کے بعد پینشن لے لی۔ آپ ایک علم دوست آدمی تھے۔ عرصہ ہوا کہ آپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہوں نے صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں ہوئی ۴

۱۷ کاش کہ مولوی محمد یحیی صاحب اس روایت کے ماخذ کی تصریح فرما دیتے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیتے کہ کس سند پر وہ اس بات کی (جو واقعات پر غور کرنے سے بڑی حد تک قرین قیاس معلوم ہوتی ہے) اس شدت کے ساتھ تردید کرتے ہیں۔

نشاطِ روح

خونِ آرزو افشا ہو کسی بہانے سے
 اس فضا ئے تیرہ کو گرم کر منور کر
 سکرائے جاتا ہوں اشک بہتے جاتے ہیں
 زخمِ آپ لیتا ہوں لذتیں اٹھاتا ہوں
 اک نگارِ محبوبی اشکِ خوں میں پہنا ہے
 اینک ایک تنکے پر شوکتگی طاری
 اب جو کچھ گزرنا ہو جان پر گزر جائے
 جلوہ مظاہر ہے دفترِ فنا آمونہ
 روشنی ہو جگنو کی جیسے شبِ بستان میں
 وہ نقاب کا عالم اُس کے مکرانے سے

بیخودی کا عالم ہے موجبِ سائی ہو

اب نہ سر سے مطلب ہے اور نہ آستانے

قبرستان

خوشی کے چھپوں سے دُور یہ نسان بستی ہے
قیامت کی سیاہی ہے، قیامت کا اندھیرا ہے
مدائیں گیدڑوں کی دُور میدانوں سے آتی ہیں
زمین پر خشک پتوں کی اچانک سرسراہٹ ہے
صدائے بوم گونج اٹھتی ہے برگد کے درختوں پر
نخوستِ دہری ہے اس جہاں کے تیر و بختوں پر

بدن میں سنسنی پیدا ہے تاریکی کے اثر سے

لرز جاتا ہے دل ہر گام پر اسید کے ڈر سے

تم ان ٹوٹی ہوئی قبروں کی بربادی پر مست جاؤ
یہاں کے ساکنوں کی ظاہری حالت کو جانے دو
جو سچ پوچھو تو کتنی قابلِ رشک ان کی حالت ہے!
نہ دنیا کے بچھڑے ہیں مصیبت سے، نہ بیماری!
میتس رہے یہاں عالم کی سب فکر سے آزادی
یہاں کی سرزمین اک دوسرے عالم میں شامل ہے
یہاں ٹوٹے دلوں کو مرہم تکیں مہیا ہے

حقیقت سے متہیں آگاہ کرتا ہوں ادھر آؤ
زمانہ گزشتہ ان کے مٹاتا ہے مٹانے دو
میتس ان کو کتنا چین ہے کیسی فراغت ہے!
نہ آپس کی عداوت ہے، نہ چالاکي نہ مکاری!
خوشی اور سکون کا گھر ہے یہ ویران آبادی
یہاں غمناک روجوں کو دوامی عیش حاصل ہے
یہاں کی نیند انسانی مصائب کا مداوا ہے

شکستہ خاطر وں کی آخری منزل ہے یہ بستی

تھکے ہائے ہوؤں کی جاوداں محل ہے یہ بستی

ذوق

میری

(جاپان کی ایک سچی کہانی)

جاپان کی سرزمین کے چتے چتے میں قدرے اُن گنت خزانے مدفون ہیں اور انسان کو اُس کے گوشے گوشے میں ہر اُن پُر اسرار خطروں کا دھڑکا رہتا ہے۔ اُس کے تہذیب تمدن اور جغرافیائی حالات سے اجنبیوں نے جو واقفیت حاصل کی ہے اُس کو محض بالائی سطح کی گھڑچن یا پت جھڑکی رُت کے ٹوکے پتوں کے ڈھیر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ بالخصوص اس کے باشندوں کی سیرت اور عادات و اطوار کے متعلق تو کسی اجنبی کے لئے کوئی رائے قائم کرنا نہایت مشکل ہے۔ جاپانی مذہب اقوام میں سب سے زیادہ خاموش و لاپرواہ ہے۔ غیر ملکی سیل طویل سے طویل قیام کے بعد بھی جاپانیوں کے جذبات احساسات کے غم سے بالکل کور رہتے ہیں لیکن ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی غیر ملکی باشندہ اپنے ہمدردانہ طرزِ عمل سے جاپانیوں کے دل میں جگہ چل کر کے اُن چھپے ہوئے حقائق سے واقف ہو جاتا ہے جو نہ صرف انہیں بلکہ اکثر خود جاپانیوں سے بھی اُسی طرح پوشیدہ رہتے ہیں جس طرح عام نظروں سے لومڑی کا بھٹ یا دہ مارک یا بانی جہاں ناگ کی زہریلی آنکھوں میں بھی گھڑی دو گھڑی کیلئے نیند کا امرت گُل مل جاتا ہے۔ جاپانی اہلِ علم بھی اپنی مخصوص ذہنیت کے باعث اپنے ہم وطنوں کی سیرت کی حقیقی تصویریں پیش نہیں کرتے۔ چھوٹ کی طرح کسی جاپانی مصنف نے اپنے ادب کو اپنے اہل ملک کی سیرت کے فرقوں سے بالامال نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن ہو کہ جدید تہذیب و تمدن کے گھمنڈ میں جاپانی اپنے پس ماندہ ہمنسوں کے حالات کو قابلِ ذکر ہی نہ سمجھتے ہوں، اسی لئے کسی جاپانی مصنف نے اُس قسم کا ذخیرہ ادب بہم نہیں پہنچایا جس قسم کا سیکسم گور کی نے روسیوں کی زندگی اور معاشرت کی صحیح صحیح تصویریں پیش کر کے فراہم کیا ہے۔ جاپانی مصنف کم از کم معرضِ تحریر میں کوئی ایسی بات نہیں لائے جو ناقابلِ توجیہ ہو اور جس سے اہل ملک پر اوام پرستی کا الزام عائد ہونے کی گنجائش نکل سکے۔ ان حالات کی موجودگی میں کوئی غیر ملکی سیل خواہ وہ کیسا ہی صاحبِ بصیرت کھل نہ ہو طویل سے طویل قیام کے باوجود بھی اہل جاپان کی زندگی اور سیرت کے متعلق بھول بھلیاں میں پڑا رہتا ہے۔

جاپانیوں کے متعلق یہ نظریہ جو میں نے پیش کیا ہے کچھ زیادہ واضح نہیں مگر فی الحال میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس عظیم الشان ایشیائی ملک کی زندگی میں دلچسپ اور پُر اسرار واقعات اور خوفناک حقائق بہت کثرت

سے موجود ہیں لیکن اس کے باشندوں کے قدیم یا جدید تمدن معاشرت کے عام مطالعے سے ان پوشیدہ حقائق پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔

میں جو درونماک داستان ذیل میں سپرد قلم کر رہا ہوں اُس کے ماخذ تک میری رسائی شخص اتفاقی طور پر ہو گئی تھی۔ اس داستان کا تعلق میرے ایک جاپانی دوست اور سابق شاگرد سے ہے جو جدید تہذیب و تمدن سے بدرجہ اتم بہرہ مند ہے۔ اُس کی وضع و قطع امیرانہ ہے اور اُس کے زرد چہرے سے فطری ذہانت کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ پہنچے لباس اور آداب معاشرت سے وہ بالکل یورپین معلوم ہوتا ہے جب وہ کالج میں پڑھنا تھا تب مجھے اُس کی انگریزی تحریریں دیکھ کر اُس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُس کی خوش آئند سیرت نے رفتہ رفتہ مجھے اُس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ اکثر شام کو ہم مل کر سیر کے لئے جایا کرتے تھے اور اُس کے ذریعہ سے مجھے جاپان کے قدیم آثار و مقامات کے متعلق نہایت دلچسپ اور اہم معلومات حاصل ہوا کرتی تھیں۔

وقتاً فوقتاً وہ اپنے مضامین میں اپنے دور افتادہ کوہستانی گاؤں اور اُس کے مضافاتی علاقے کے مرقعے بھی پیش کیا کرتا تھا۔ ان مضامین کے پڑھنے سے میرے دل میں اُن مقامات کو دیکھنے کی غیر معمولی خواہش پیدا ہو گئی۔ آخر ایک دفعہ موسم بہار کی تعطیل میں اُس نے مجھے اپنے پہاڑی مسکن میں کچھ دن گزارنے کے لئے مدعو کیا اور میں نے اُس کی دعوت کو بخوشی قبول کر لیا۔ ہم نے اپنے شہر سے جو بحیرہ جاپان کے ساحل پر واقع ہے تین گھنٹے تک ریل کا سفر کیا۔ اس کے بعد ہم برقی گاڑی پر سوار ہوئے۔ اس قسم کی برقی گاڑیاں جدید جاپانی معاشرت کا ایک لازمہ ہیں۔ سر شام ہم ایک اسٹیشن پر پہنچے جو ایک پُر شور پہاڑی ندی کے کنارے واقع تھا۔ ندی کو ایک پتھر پل کے ذریعے سے عبور کر کے ہم ایک گاؤں میں پہنچے جس میں ایک لمبا بازار دوڑ تک چلا گیا تھا۔ ہماری نظروں کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک دراز سلسلہ کوہستان پھیلا ہوا تھا جس کی بلند ترین چوٹی کو سان بارہ سینے برف سے ڈھپی رہتی ہے۔ میرے شاگرد نے کسی دوکان سے ایک قندیل جلا کر ساتھ لے لی۔ اس کے بعد اُس نے اُس طویل سلسلہ کوہستان کے دامن کا رخ کیا جس کے پیچھے کو سان کی فلک بوس چوٹی ٹری کو ٹریاے ملا رہی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد ہم ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئے۔ اس وقت رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نے چاروں کھونٹ چھاؤنی پھالی تھی اور ہم اس تنگ پتھر ملی سڑک پر چراغ کی مدد سے بمشکل اپنی راہ کا پتہ چلا رہے تھے۔ میرے شاگرد نے مجھے بتایا کہ یہ سڑک آٹھ سو سال قبل اُن کے مندر کے ساتھ ہی تعمیر ہوئی تھی۔ سالہا سال

سے برف و باراں کا طوفان پتھروں کو اپنی جگہ سے ہٹا رہا ہے۔ اسی وجہ سے سروک کے آثار قریب قریب مفقود ہو رہے ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد ہم ایک گنبد کے پاس پہنچے یہاں اُس نے براءب اپنا سر جھکایا اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ہم اُس کے گھر کے بالکل قریب پہنچ گئے تو اُس نے ایک درخت پر اپنی کاغذی منڈیل سے روشنی ڈال کر مجھے بتایا کہ اس کے نیچے شا کا سامانی ہما تمام بدھ روحانی ریاضت کے لئے بیٹھے تھے۔

آخر ہم اُس کے گھر کی تاریک عمارت میں داخل ہوئے جہاں اُس کے سن رسیدہ باپ نے جو مندر کا محافظ اور مذہبی پیشوا تھا نہایت عظیم و نکیم سے ہمارا استقبال کیا۔ اُس کی ماں مختصر قد و قامت کی ایک غریب مزاج خاتون تھی اُس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے نہایت محنت اور مشقت کی زندگی بسر کی ہے۔ میرے دوست کے والدین فرط احترام سے میرے سامنے بات بھی نہ کرتے تھے۔ اُن کے دل میں اپنے بیٹے کی غیر معمولی عزت اور وقعت تھی اور یہ نہ صرف اُس کا اتنا تھا بلکہ وہ پہلا اجنبی شخص بھی تھا جس نے اُن کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اس دو گونہ اتفاق نے اُن کے دل میں میری جگہ اس قدر بلند بنا دی تھی کہ میں کئی مرتبہ کی کوشش کے باوجود کسی طرح اپنے ہبوط پر قادر نہ ہو سکا۔ انہوں نے میری آسائش کے لئے بہتر سے بہتر انتہام کیا اور مجھے نہایت اعلیٰ درجہ کی خوراک بہم پہنچائی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس پہاڑی کاؤں میں مجھے ان تکلفات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

صبح کے وقت مجھے معلوم ہوا کہ آس پاس کوہسار کا منظر نہایت دلکش ہے۔ جا بجا پرانی عمارتوں کے کھنڈ بھی نظر آتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ کبھی ان عمارتوں میں چھ ہزار سے زائد بدھ بھکشو آباد تھے، مگر اب انقلاب روزگار نے سب کو ایک مندر کے اور کچھ نہ چھوڑا تھا۔ پھر مجھے میرا شاگرد ایک مربع کمرے میں لے گیا۔ یہاں مندر کے تاریخی تحائف کا ایک حیرت انگیز خزانہ میری نظروں سے گزرا۔ میرے سوال پر اُس نے مجھے بتایا کہ کوئی شخص اس بیش بہا خزانے کے سرقے کا خیال دل میں بھی نہیں لاسکتا اور یہ اس ویرانے میں کامل طور پر محفوظ ہے۔

آفتاب ڈھل چکا تھا اور میں اپنے جاپانی شاگرد کے قلبی احساسات سے بالکل بے خبر بیٹھا ہوا سردی سے ٹھٹھہر رہا تھا۔

اُن کے گھر پر بلکہ تمام جنگل پر اُدا سی اور احسردگی سی چھا رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی موسم سرما کو گزرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ پالا بھی وہاں اس غضب کا پڑتا ہے کہ چھتوں تک برف کی تہ پہنچ جاتی ہے اور اُس کے سفید فرش پر جنگلی ہرنوں، سوروں اور کچھوں کے نقش رگزار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

شہر میں واپس آنے کے بعد کچھ عرصے تک کام کی کثرت اور اپنی مصروفیت کے باعث ہم دونوں کو کلج سحر باہر ملاقات کا موقع نہ ملا۔ آخر ایک دن میں نے اپنے طلبہ سے خواب کے موضوع پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ معلوم نہیں نوجوان طلبہ کے دلوں میں صبح کے سہانے وقت اور سہانے منظر نے کوئی خاص کیفیت پیدا کر دی یا وہ کسی افسون کے زیر اثر اپنی دلی کیفیات کے اظہار پر مجبور ہو گئے مگر جو کچھ انہوں نے لکھا وہ میرے لئے انتہائی حیرت اور دلچسپی کا موجب ہوا۔ بعض طلبہ نے اپنے بزرگوں کے خواب بیان کئے تھے، اور یہ خواب بھی جاپان کے عہد قدیم سے تعلق رکھتے تھے جس کو انہوں نے دوبارہ عالم خواب میں دیکھا تھا۔ انسانی جذبات کے ان مقولوں میں سے بعض اس قدر اثر بلکہ سحر آلود تھے کہ اُن کو پڑھ کر میری طبیعت میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ میں نے یو ہاراکو کہ میرے اس شاگرد کا نام یہی تھا شام کا وقت اپنے پاس گزارنے کی دعوت دی لیکن مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میری یہ دعوت کیا نتائج پیدا کرنے والی ہے۔

ہم دونوں دیر تک خواب کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی تو میرے تصور نے مجھے ایک دفعہ پھر جنگل میں اس مندر کے ایک بالائی کمرے میں تنہا پایا۔ کوہستانی ہواؤں کی وہی سائیں سائیں اور جنگلی درختوں کی ٹہنیوں کی وہی کرکڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس کے بعد میرے حلقے میں دفعۃً ایک واقعہ تازہ ہو گیا جس کو میں اپنا ایک پریشاں خواب سمجھ کر بالکل

فراموش کر چکا تھا۔

جنگل کے قیام کی آخری شب کو میرے میزبانوں نے کھانے پینے کا غیر معمولی اہتمام کیا تھا میں رات کے وقت سادہ غذا کھانے کا عادی ہوں۔ لیکن اس کے بجائے انہوں نے مجھے ازراہ تواضع بہ اصرار اس قدر پھیلی اور ہرن کا بھنا ہوا گوشت کھلا دیا کہ میں رات کو دیر تک نہ سو سکا۔ بیداری کے اُن طویل لمحوں میں میرا تصور برابر کام کرتا رہا اور میں اپنے جنگلی ماحول اور ارد گرد کی اُن دیران اور خوفناک گھائیوں سے ایک دم غافل نہ ہوا جو ہمارے اور اُس بے برگ و گیاہ کوہستان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں جس کی سفید برف پوش چوٹی تاروں بھری رات میں جھانکے سے ٹوہ زار فٹ کی بلندی پر جھللا رہی تھی۔

تقریباً دو بجے میں سویا۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں دفعۃً چونک کر اٹھ بیٹھا، یا میں نے ایک ہراس انگیز خواب دیکھا مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں نے کسی خوفناک چیز کے غرتانے کی آواز سنی ہے جس کی وجہ سے میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ اسی طرح مجھے کسی ایسی نہایت دہشت ناک چیز کے قرب کا بھی احساس ہوا جس کے بیان سے

الفاظ قاصر ہیں، لیکن میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دی کہ یہ سب کچھ میرے جسم اور بستر کی غیر معمولی گرمی کا نتیجہ ہے۔ میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا لیکن احساس خوف کی شدت کے باعث میں بستر سے مکل کر دیا سلامتی سے چرائے جلاسے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔

پھر میں نے صاف الفاظ میں ایک انسانی آواز سنی۔ یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتہائی دہشت کے درد و کرب میں بے دم ہو کر چلا رہی ہے۔ ”اچن، ہیا کو، کویشائی“ بھائی جلدی کرو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد دوبارہ ویسی ہی غرتے کی آواز سنائی دی جس کو سن کر میں جاگ اٹھا تھا۔ پھر میں نے رونے اور کہنے کی دبی دبی سی آواز سنی جس کے بعد دوبارہ بالکل خاموشی چھا گئی۔

میں اُس وقت تک بالکل دم بخود لیٹا ہوا تھا۔ اب مجھے لمبے سانس کھینچنے کا خیال آیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے حواس پر قابو پالیا پھر میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ غالباً میرے شاگرد کی بہن کے خواب میں رونے اور چلاسنے کی آواز تھی جو نیچے کی منزل میں سو رہی تھی۔

دوسرے دن صبح میں دیر سے اٹھا۔ سورج کی کرنیں میرے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں جگہ کے پندے کا ہے تھے اور کوہستانی ندیوں کا شور بہت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ رات کا واقعہ میرے ذہن سے بالکل اتر گیا اور آج معلوم نہیں میرے شاگرد کے قلبی حیات کے تصرف سے، یا کس طرح، مجھے اُس بات کی ایک بات پھر صاف یاد آگئی۔ میں نے محض برسبل تذکرہ اس واقعے کا ذکر کیا تھا لیکن جب میری زبان پر وہ الفاظ آئے جو اس رات میں نے سنے تھے ”اچن، ہیا کو، کویشائی“ تو میرے شاگرد کے چہرے پر جو تغیر نمودار ہوا وہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر کرسی سے نیچے گر پڑے گا۔ اُس کا چہرہ جو ہمیشہ زرد رہتا تھا اب بالکل سفید پڑ گیا تھا اور اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنا دایاں ہاتھ سہارا ڈھونڈنے کے لئے پھیلا دیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ جو متشنج معلوم ہوتا تھا اپنے ہاتھ میں لیا اور اُسے بستر پر لٹا ناچا لیکن اُس نے لیٹنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ بکھنٹ اٹھ بیٹھا اور نگاہیں گارڈ کریری طرف دیکھنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو میرے پیچھے کوئی نہایت ہی ہولناک چیز نظر آرہی ہے۔

میں اُس کے اس طرزِ عمل سے کچھ مضطرب سا ہو گیا چنانچہ میں نے مڑ کر اپنے پیچھے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر ہوسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اس لئے میں نے اُس سے کہا کہ تم اب رات ہمیں گزار لو۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے طرزِ عمل کے لئے معذرت کی میں نے شرمندگی سے کہا کہ آپ لوگ جس قدر تواضع اور مدارات کے ساتھ مجھ سے پیش آتے ہیں

میرادل ہی جانتا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس واقعے کو بیان کر کے متیں ناحق اذیت دی حالانکہ یہ ایک پریشان خواب تھا جس کو میں خود بھول چکا تھا۔

اُس نے کہا یہ پریشان خواب نہ تھا بلکہ سرے سے یہ خواب تھا ہی نہیں۔ پھر اُس نے جیسے یادداشت کی ایک سیاہ کتاب نکالی اور اُس میں سے خانی کا غذا کا ایک میڈر اسکور نکال کر مجھے دکھایا اس پہچن کے حروف میں کسی بچے کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہی فقرہ دیکھ کر میں تصویر حیرت بن گیا: ”اچن، ہیا کو، کروشیائی“

اس روز ناک التجا کو اپنے سامنے دیکھ کر خود میرا جسم نامعلوم طور پر سرد ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرادل غم و اندوہ کے ایک بے پایاں طوفان میں ڈوب گیا ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا ”آخر یہ کیا بات ہے؟“

پھر اُس نے درد بھری آواز سے خلاف معمول مجھے جاپانی زبان میں یہ واقعہ سنا شروع کیا، اور اُس کے بیان کے ابتدائی الفاظ ہی کو سن کر میں درد و غم کا پیکر عجم بن گیا۔

اُس نے کہا: ”آپ کو معلوم ہے میری ایک چھوٹی بہن ہے ان الفاظ کو سن کر مجھے وہ تیرہ چودہ سال کی شرمیلی لڑکی یاد آگئی جس کی ایک آدھ جھلک مجھے اپنے دوران قیام میں اُس پہاڑی مکان کے دروازوں کے پیچھے سو وقتاً تو قاتلاً نظر آتی تھی اس کے بعد اُس نے کہا ”وہ اب بالکل تنہا رہ گئی ہے“ پھر کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو گیا اُس وقت اُس کی نظر زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُس نے کہا ”گزشتہ سال اُس کی ایک سہیلی بھی تھی جو اُس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور وہ دونوں ایک دوسری کے ساتھ بہت خوش رہا کرتی تھیں۔ اس کا نام مکی تھا لیکن میں اُسے میری کہا کرتا تھا کیونکہ مجھے اس سے محبت تھی۔“

”اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور کچھ مدت کے وہ ہمارے گھر میں رہنے لگی تھی کیونکہ وہ میری بہن بیومی کی نہایت عزیز سہیلی تھی۔ میرے والدین اگرچہ غریب ہیں لیکن انہوں نے اس کی پرورش اور نگہداشت اپنی چچی کی طرح کی اور چونکہ وہ اُن کو بہت پسند تھی اس لئے وہ اُس کو آئندہ اپنی بہن بنا لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”وہ میری بہن کے مقابلہ میں بہت زیادہ ذہین تھی اور غیر ممالک کی ہر چیز سے گہری دلچسپی لیا کرتی تھی، مثلاً وہ انگریزی آداب معاشرت، انگریزی گفتگو اور پیانو وغیرہ بجانا بخوشی سیکھ لیتی، حالانکہ اس دورہ دراز پہاڑی گاؤں میں ایسی باتیں خواب و خیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔“

”پس آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب میں تعطیل کے زمانے میں اپنے گھر جاتا تھا تو ہم سب آپس میں بل کر کس قدر خوش

ہوتے ہو گئے۔ ان موقعوں پر وہ مجھ کو تمام نئی باتیں کہیں کالج سے سیکھ کر آیا کرتا تھا پوچھ لئے بغیر دم نہ لیتی تھی۔
اس ذہین لڑکی کے حالات سن کر میرا دل نہایت رنج محسوس کر رہا تھا۔ مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ اب اس دنیا
وہ ہمیشہ کے لئے مفقود ہو چکی ہے۔

میرے شاگرد نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ”آخری مرتبہ میری سے میری ملاقات ستمبر کے مہینے میں
ہوئی میری، فیومی اور میں، ہم تینوں سیر و تفریح کے لئے صبح کے وقت گھر سے نکلے۔ ہم نے پہاڑ کے واسن کا راستہ لیا۔
زلزلے میں یہ پہاڑی راستہ بالکل ویران ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی لے لیا تھا۔ پھر بڑی
گگندہ گگندہ کو چھوڑ کر ہم ندی کے کنارے کناے ہوئے۔ ہم ایک آبشار کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتے تھے جس سے بہت کم لوگ
واقف ہیں۔ صبح کا تمام وقت ہم نے وہاں دھوپ میں بیٹھ کر گزارا۔ کبھی کبھی لڑکیاں اُٹھ کر ریت پر چلنے کا لطف اٹھاتی
تھیں اور ہم سب مل کر خوشی سے گیت گاتے تھے۔ آخر جب سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپنے لگا تو ہم نے گھر واپس جا
کا ارادہ کیا۔ ہم ندی کے کنارے کناے واپس چلے آ رہے تھے اور ابھی بڑھکل چند سوگز کا فاصلہ طے کرنے پائے
تھے جب میری کو یاد آیا کہ وہ اپنے تصویر دار کارڈوں کا مجموعہ ایک چٹان کے پیچھے بھول آئی ہے۔ وہ اپنے کارڈ
لانے کے لئے بھاگتی ہوئی گئی اور ہم اُس کے انتظار میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اُس وقت جنگل منظر
نہایت سہانا معلوم ہوتا تھا۔ درختوں کی ٹہنیوں میں ٹھڈکیاں خوشی سے چچہا رہی تھیں اور ہمک ہمک کر ایک دوسری
کی طرف جاری تھیں۔

دفعۃً ہمیں ایک خوف زدہ چیخ سنائی دی اور ہم خطرے کا احساس کر کے واپس بھاگے۔ ہمارا خیال تھا کہ میری
کسی بندرہ وغیرہ سے ڈر گئی ہے۔ لیکن آبشار کے پاس پہنچنے پر وہ ہمیں کہیں نظر نہ آئی۔ تصویر دار کارڈ اُس پاس اس
طرح بکھرے تھے جیسے کسی نے انہیں زور سے زمین پر پٹک دیا ہو۔

اس کے بعد اُس نے اپنی یادداشت کے ورق دوبارہ الٹے اور اُس میں سے دو کیچڑ سے بھرے ہوئے کارڈ
بکال کر مجھے دکھائے جن پر بعض مشہور مغربی مصوروں کے ہاتھ کی تصویریں تھیں۔

پھر اُس نے کہا ”وہاں ہمیں اور کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس مقام سے باہر جانے کا دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا
نینوں طرف بلند اور دشوار گزار چٹانوں کی سنگلاخ دیواریں کھڑی تھیں ہم نے میری کو ہر طرف ڈھونڈا۔ ہم بار بار
بہ آواز بلند اُس کا نام لے کر اُسے پکارتے رہے لیکن گرتے ہوئے آبشار کے شور کے سوا جواب میں ہمیں کوئی دوسری آواز
سنائی نہ دی۔ صرف ایک دفعہ ہم نے ایک عجیب غریب آواز سنی جو جنگل کی ہوا میں ریل کے انجن کی سیٹی کی طرح

گوئجی۔ میں نے ایسی آواز اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی بہن کی آواز تھی یا رچھ کی۔
 ”تاریکی و مبدم چھا رہی تھی اور ہماری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں فیوٹی گھبرا کر رو رہی تھی اور میں اُسے نہ تنہا
 چھوڑ سکتا تھا اور نہ اکیلے گھر جانے کی اجازت دے سکتا تھا۔ اس ہولناک سلسلے نے اُس کے ہوش و حواس بالکل گم کر
 دیئے تھے۔

”ناچار ہم گھر کو واپس گئے جہاں ہماری والدہ نہایت بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ میں فیوٹی کو
 گھر میں پہنچانے کے بعد فوراً گاؤں کی طرف بھاگا اور لوگوں کو اطلاع دی۔ وہاں سے کئی لوگ میری مدد کے لئے
 چراغ ہاتھوں میں لے کر آئے۔ ہم وہ تمام رات اور پھر دوسرا تمام دن جنگلوں میں میری کو ڈھونڈتے رہے لیکن ہمیں
 اُس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میری کا اس طرح گم ہو جانا سب لوگوں کے لئے ایک ناقابلِ فہم راز تھا۔ چند دنوں کے بعد
 مجھے کلچ میں حاضر ہونا تھا لیکن روانگی سے قبل میں نے گرد و نواح کی تمام صحرائی آبادی میں پھر کر لوگوں کو اس بات
 پر آمادہ کیا کہ وہ حتی المقدور میری کی تلاش جاری رکھیں۔

”میری بہن کے خط مجھے باقاعدہ ملتے رہتے تھے لیکن اُن میں بجز حسرت و یاس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ آخر نومبر
 کے مہینے میں ایک دن مجھے ایک تار ملا کہ مجھے فوراً گھر کو روانہ ہو جانا چاہئے۔ دن بھر میں سخت مضطرب الحال رہا اور
 رات کو جب میں گھر پہنچا تو گھر والوں نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا یہ بوسیدہ ٹکڑا دیا جو میں نے ابھی آپ کو دکھایا ہے۔
 یہ کاغذ ایک شکاری کو پہاڑ کی بلندی پر اُس مقام سے دس میل کے فاصلے پر، جہاں ہم نے میری کو کھویا تھا، صنوبر
 کے کسی درخت کی شاخ میں لٹکا ہوا ملا تھا۔“

میرے شاگرد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرا خواب سن کر کیوں اس قدر افسردہ
 ہو گیا تھا۔

پھر اُس نے کہا ”میری کے متعلق سب سے آخری اطلاع جو ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ یہی ہے، بشرطیکہ
 وہ بشرطیکہ وہ۔۔۔۔۔“

اُس کی آواز بھڑا گئی اور وہ اپنا مافی الضمیر زبان سے ادا نہ کر سکا۔

اب مجھے اس ہولناک واقعے کا پوری طرح سے احساس ہو گیا۔ یہ لڑکی انسان سے کسی ادنیٰ ذریعے کے ذریعے
 کی گرفت میں اب تک کہیں زندہ موجود تھی اور اُس رات وہ کسی طرح بھاگ کر اپنی اُس تنہا جائے پناہ کی طرف آئی
 تھی لیکن اُس کے دروازے اُس کے لئے نکھل سکے اور وہ پھر اُسی بلا کے پنجے میں گرفتار ہو گئی۔ پہلے چہرے زرد

پڑ گئے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف خوف بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اُس کا منگیتر اور میں۔ اس واقعے کو بھی ایک مہینے کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن کسی نے اب تک اُس کی رہائی کے لئے کوئی کوشش نہ کی تھی۔

پھر میں نے کہا ”کیا اس معاملہ میں پولیس یا فوج کا محکمہ کوئی مدد نہیں دے سکتا؟“ اُس نے جواب دیا ”انسوس یہ ممکن نہیں آپ ان پہاڑوں سے واقف نہیں ہیں وہاں پولیس اور فوج کے پتوں کے دستے غائب ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ ان پہاڑوں سے بخوبی واقف ہیں وہ اپنی انتہائی کوشش ضرور کر چکے ہیں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اب آپ نے جو کچھ بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری ابھی تک زندہ ہے۔ میں علی الصباح گھر کو روانہ ہو جاؤں گا۔ اور تمام کوششیں نواح میں اس واقعے کی خبر پہنچا دوں گا۔“ میں نے اُس کے ارادے کی تائید کی اور پھر اس سے کہا کہ اگر میں کالج کے لڑکوں سے اس بات کا تذکرہ کروں تو میرا خیال ہے کہ بہت سے طلبہ تلاش میں مدد دینے کے لئے بخوشی آمادہ ہو جائیں گے۔ اُس نے کہا ”اگر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا تو خود پہاڑوں میں کھو جائیں گے۔ کیونکہ بارہا ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔“

صبح کو پھٹنے سے قبل میں اسے سٹیشن پر پہنچا آیا۔ ہم دونوں بھرے ہوئے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

ایک مہینے کے بعد وہ واپس آیا۔ وہ بہت دیر معلوم ہوتا تھا اور اُس کا چہرہ تازتِ آفتاب سے جلا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ دو پہاڑی رہنماؤں کی مدد سے دن رات پھر کرائس نے پہاڑوں کا ایک ایک گوشہ دیکھا ہے لیکن بجز مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس پر میرے دل میں ایک نیا خیال جاگزیں ہوا میں نے ارادہ کیا کہ موسم گرما کی تعطیل کا تمام زمانہ اُن پہاڑوں میں گزاروں گا اور پو بار ا کے گھر سے دُور دُور کے علاقے میں جستجو جاری رکھوں گا۔ میں نے اپنے شاگردوں میں سے دو کو اپنا ہمراہی منتخب کیا۔ ایک کا نام کاموری تھا۔ جو نباتیات سے گہرا شغف رکھنے کے باعث جاپان کے اُن عظیم الشان پہاڑوں کے چپے چپے پر پھر چکا تھا اور دوسرے شاگرد کا نام روکو مدھو تھا۔ وہ ایک پہاڑی گاؤں کا رہنے والا تھا اور اُس کا شمار اس سلسلہ کوہستان کے بہترین واقفوں میں کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے اپنے ساتھ ایک خیمہ بستر اور چند ضروری اشیاء رکھ لیں۔ اس کے علاوہ ہم نے تقریباً ایک دہائی کے اشیاء کی خدمات حاصل کیں جو ہمیں آس پاس کی خبریں اور کھانے پینے کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ پہاڑ پر ہمیں آئے

دن جو عجیب و غریب اور دلچسپ تجربے حاصل ہوتے رہے اُن کے بیان کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ کاموری پہاڑی جڑی بوٹیوں سے بے انتہا دلچسپی لیتا رہا اور روکو متشو نے اپنے شوق کے مطابق پہاڑوں کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی وہ پہاڑوں میں غائب ہو جاتا اور ہم اس کو ڈھونڈنے سکتے تھے تو وہ اپنی بندوبد کی آواز سے ہمیں اپنے متعلق اطلاع دیا کرتا تھا۔ ادھر سے میں اپنی بندوبد کے ساتھ جو ہمیں تازہ شکا بھی ہم پہنچایا کرتی تھی اُس کے اشارے کا جواب دیا کرتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت کاموری پیچھے خیمے میں رہا اور روکو متشو اور میں دونوں ایک طرف دُور نکل گئے۔ دو میل کے فاصلہ پر جاپان کا سب سے بڑا آبشار تھا جو دو ہزار فٹ بلند ہے۔ ہم اس کو دیکھنے کے لئے آگے جا رہے تھے کہ راستہ میں ہم ایک نہایت خوبصورت مقام پر پہنچے، جہاں مصفا پانی کے ایک چشمے کے کنارے ہم اپنا کھانا جس میں چاول، بھجے ہوئے تیتڑ اور کچھ آلوچے شامل تھے کھانے کے لئے بیٹھے جس وقت میں توشہ دان کھول رہا تھا روکو متشو کچھ فاصلہ پر زمین کو کھودنے لگا۔ دفعۃً اُس نے میری طرف متوجہ ہو کر دھیمی لیکن مضطرب آواز سے کہا ”جناب ذرا یہ دیکھیے“ اس کے بعد اُس نے معمولی سرخ فلالمین کا ایک ٹکڑا نکرا کر ہاتھ میں لے کر کہا ”یہ کسی عورت کے لینگے کا حصہ ہے“

میں نے حیرت سے اس ٹکڑے کو دیکھا اور پھر اُس سے پوچھا کیا تمہیں پورا یقین ہے؟“ اُس نے اثبات میں جواب دیا اور پھر چشمے کے کنارے انسانی پاؤں کے کچھ نشانات کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُسی وقت دوبارہ توشہ دان کو بند کر دیا اور پھر ہم دونوں نہایت احتیاط سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن اوپر کہیں نہ تو ہمیں کوئی نقش قدم نظر پڑا اور نہ کہیں کسی قسم کا دھواں وغیرہ دکھائی دیا۔ آخر ہم نے چلنا شروع کیا۔ تاہم مقدور ہم چٹانوں کی آڑ میں ہو کر چلتے تھے۔ قدم قدم پر ہمیں خطرے کا احساس تھا لیکن اُس دیرانے میں پہاڑی چٹانوں کی پھر پھر ہلٹ کے سوا اور کسی قسم کی آواز یا آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ آخر جب ہم ایک ذرا اگلے مقام پر پہنچے جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں کھڑی تھیں اور جو بلندی میں قد آدم سے بھی کم ہو گئی تو یکایک ہوا میں ایک سیٹی کی آواز گونجی اور اس کے بعد ایک گراؤ کی آواز سنائی دی۔ آخر جب ہم ایک ذرا اگلے مقام پر پہنچے آگ کے شرارے پیدا ہو گئے۔ میں اس قدر نزدیک تھا کہ اس طرح جس گیس کا اخراج ہوا اُس کی بو مجھے محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً اوپر نظر اٹھائی۔ ہم سے پچاس فٹ کی بلندی پر ایک جھکی ہوئی چٹان کے سائے میں ہیں ایک جھونپڑا دکھائی دیا جو کسی جنگلی جانور کے بھٹ سے مشابہ تھا اور جس پر درختوں کی سوکھی ٹہنیاں پڑی ہوئی تھیں۔

اس کے سامنے ہمیں انسانی صورت میں ایک ہولناک اور عظیم الجثہ پیکر استادہ نظر آیا۔ وہ عام انسانوں سے کمین زیادہ بلند قامت تھا اور اُس کے بڑے بڑے اور گندے گندے گندمی اعضا بغایت مکروہ اور بغایت گھناؤنے تھے۔ اُس کے ڈراؤنے چہرہ کے گرد جو دیوانگی اور غضبناکی کا محسوس تھا اُس کے لمبے لمبے مٹیالے بال لٹک رہے تھے۔ اُس کی کمر کے گرد ریچھ کی ایک کھال نیٹی ہوئی تھی اور اُس کی بن مانس کی سی برہنہ چھاتی کے گھنے گھنے بال اُس کی اس پوشش سے بالکل ملے جلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

وہ دانت پیس رہا تھا اور بھیڑیوں کی طرح غرار تھا۔ یکایک مجھے یاد آیا کہ یہی وہ آواز ہے جس نے مجھے جنگل کی اُس خوفناک رات میں اُس مندر کے اندر نیند سے چونکا دیا تھا اور وہاں بھی اُس وقت کھلی ہوا اور سوچ کی روشنی میں میرا جسم کانپ اٹھا۔

اُسی وقت جھونپڑے کے پست اور تاریک سے دروازے میں جو محض ایک موکھا سا تھا ہمیں ایک اور چہرہ دکھائی دیا۔ چہرے پر سوچ کی روشنی پڑ رہی تھی اور ایک زرد رُو اور مصیبت زدہ لڑکی صاف نظر آرہی تھی۔ اُس کی نظر پہاڑوں پر ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔ پھر دفعۃً اُس کی متحیر نگاہ ہم پر جم گئی۔ اس وقت اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی لیکن وہ وحشی درندہ اُس کی طرف مڑ کر غرض غضب سے غزایا اور وہ ڈر کر اندر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ایک لگڑ بگڑ کی طرح چیخنا، چلاتا اور شور مچانا، سیدھا ہماری طرف نیچے کو اترنے لگا۔ وہ اپنی انسانی مہیت کے باعث اور بھی زیادہ خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اب ہمارے لئے بجز فرار کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ میں نے گولی مار کر دائیں کندھے میں اُسے زخمی کیا۔

وہ چند قدم آگے بڑھا اور اس کے بعد بیچ ذناب کھانا ہوا اور زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا لڑھک کر نیچے پتھروں پر آ پڑا میں نے روکو منٹو سے چلا کر کہا کہ اگر وہ ذرا بھی جنبش کرے تو وہ بڑا پتھر گرا کر اُسے کچل دے گا۔ اس کے بعد خود میں نے جھونپڑے کا رخ کیا۔ اوپر نظر اٹھانے پر مجھے وہ خوفزدہ چہرہ بھٹ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ ”میں نے پکار کر کہا ”میری آؤ اب تم بالکل محفوظ ہو“ لیکن اُس نے دیوانوں کی طرح مجھ پر ایک ہراساں نگاہ ڈالی اور بھاگ کر چٹانوں میں چھپ گئی۔ اُس کے نحیف اور حسرت زدہ جسم پر چھٹیڑے لٹک رہے تھے۔ میں نے روکو منٹو سے چلا کر کہا اُس کے پیچھے بھاگو وہ مجھ سے ڈر رہی ہے۔

روکو منٹو چند حسیتوں میں اس ڈھلوان پہاڑی کو طے کر گیا اور میں واپس وہاں پہنچا جہاں وہ دیو قامت عمریت گرا ہوا تھا۔ وہ اب بھی غزایا اور دانت پدیتا تھا۔ تناسپ اعضا کے لحاظ سے بلاشبہ

وہ انسان تھا لیکن اعضا کے فوق الانسانی نشوونما اور اُس کی سادہ جیسی گردن کو دیکھ کر بے اختیار اتنی گھن آتی تھی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ کچھ دیر کے بعد لیٹے لیٹے اُس کا چہرہ اوپر کی طرف اٹھا تو اُس کی خوفناک آنکھوں، مہیب دانتوں اور اُس نفرت انگیز گڑھے کو دیکھ کر جاں ناک ہونی چاہئے تھی میں اپنے تحفظ کے لئے بالکل چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے ہوشی کی حالت سے بیدار ہو رہا ہے اور اب مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ گولی نے اُسے کچھ اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچایا بلکہ گرنے کے صدمے سے اُس کے حواس معطل ہو گئے ہیں۔ اُس نے ہاتھوں کے بل اٹھنا چاہا لیکن پھر درد سے کراہنے لگا۔ اس پر میں نے اپنی بندوبست اٹھائی جس کو دیکھ کر وہ خاموشی سے پھر زمین پر لیٹ گیا۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ دفعتاً لنگر کی طرح اچھل کر اٹھا اور زقندیں لگاتا اور جٹانوں کے۔ سیا بان کو پھاندتا ہوا نکل گیا اور پھر دو چار وحشیانہ جستوں میں کوہستان کی دشوار گزار چوٹیوں پر پہنچ کر کہیں غائب ہو گیا۔ اب کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

ادھر وہ بلائے مہیب نظروں سے غائب ہوئی اور اُدھر مجھے رو کو مٹسو ایک مشت استخوان کو ہاتھوں میں لئے آتا دکھائی دیا۔ میں بھاگ کر اُس کی طرف گیا۔ وہ بیہوش تھی اور اُس کا سر پیچھے کو لٹک گیا تھا۔ پچھے ہوئے کپڑوں میں سے اُس کے منحنی جسم پر جا بجا زخموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ اُس کی حالت اس قدر زار تھی کہ رو کو مٹسو جیسا سنگین دل پہاڑی لڑکا بھی اُس کو دیکھ کر آنسو بہاٹے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اُس بھٹ میں نظر ڈالی لیکن وہاں جانوروں کے پروں اور ہڈیوں کے انباروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انسانی ضروریات کی کوئی چیز مجھے وہاں نظر نہ آئی۔

میں نے میری کو رو کو مٹسو کی پیٹھ پر باندھ دیا اور چپے پر پہنچ کر ہم نے اُس کے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے ڈیئے جس کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اب ہمیں اس کے متعلق کوئی شبہ نہ رہا کیونکہ اُس نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیمی آوازیں یہ الفاظ گنگنائے ”آا کروشی! آا! میں یہ برداشت نہیں کر سکتی!“

وہاں سے روانہ ہو کر ہم سہ پہر کے تین بجے واپس اپنے خیمے میں پہنچے۔ کاموری کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ کئی لمحوں تک اسے اپنی نگاہ کا فریب سمجھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بھاگا ہوا گیا اور دُور پہنچ کر بندوق کے متواتر فائرول کے مقرر شدہ اشارے سو اپنے اُن بارہ مددگاروں کو کامیابی کی اطلاع دی۔ چنانچہ اُن بارہ میں سے چار غروب آفتاب کے قریب ہم سے آئے۔ اس اثنا میں ہم نے میری کو گرم شور بے اور بعض

محرمات کا استعمال کرایا، اور وہ گہری نیند سو گئی۔ رات بھر کا موری اور میں اُس کی خبر گیری کرتے رہے۔ خیمہ سے باہر جائے آدمی آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھے اُس دیوتاقت حیوان کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ آخر روکو منسو کے اس بیان پر سب نے اتفاق کیا کہ اُس کا تعلق کشتی گروں کی اُس عجیب و غریب قدیم نسل سے ہے جو پہاڑوں کے اُس پار بعض جنگلی علاقوں میں آباد ہے۔ وہاں کے باشندے بالعموم عظیم الجسامت اور عادات و اطوار میں بالکل وحشی ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان میں سے بھی کوئی فرد اپنی فوق العادہ وحشیانہ درندگی میں اتنی سبقت لے جاتا ہے کہ دوسرے لوگ اُس کی تند خوئی کے باعث اُسے آبادی میں رہنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ جب قید یا موت سے بچنا چاہیں تو تنہا بھاگ کر پہاڑوں کی طرف بھل آتے ہیں۔ ان کی خونخواری کے خوف سے کوئی شخص اُن کا ساتھ دینے کی جرات نہیں کر سکتا۔

پو پھٹ رہی تھی، جب مجھ پر کچھ غنودگی طاری تھی اور باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ اُس وقت میری دفعۃً اٹھ بیٹھی اور میری طرف درد انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اُس کی نظروں میں وحشت اور اُس کی آنکھوں میں دیوانوں کی سی چمک نظر آتی تھی۔ پھر کچھ دیر تک کھانسی ہی۔ اس کے بعد اُس کے منہ سے ذرا سا خون نکلا اور دوبارہ بستر پر گر کر وہ ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

گجروم ہم نے اُس کی ارتھی بنائی اور اُسے اٹھا کر دو دن تک پتھر لیے پہاڑی راستوں پر چلتے رہے آخر یو موٹو کے گرم چشموں کے پاس ٹھہر کر ہم نے ایک دن آرام کیا اور پھر دوبارہ اُس کو اٹھا کر جنگل میں اُسی مندر کی طرف اُس کے آخری مسکن کو روانہ ہوئے جہاں میں نے پہلے پہل اُس کی وہ یاس انگیز پکار سنی تھی جس کی طرف کوئی لطف نہ ہوا تھا۔ اب وہیں مندر کے قریب ایک بڑے درخت کے نیچے اُس کی قبر نظر آتی ہے جس کی لوح پر میری کال لفظ کندہ ہے۔

رقم زدہ پروفیسر ای۔ ای۔ سپیٹ

تلخیص و ترجمہ

از

حامد علی خاں

ان کاوشوں کا حاصل

ہر گل میں ہر شجر میں ترانگہ بُوسہ
سب مہر و ماہ تیرے ہی آئینہ دار ہیں
ہر مہر و ش نے حسنِ تیرے ہی لی زکوٰۃ
معضومہوں میں تیری ہی عصمت سے جلوہ زور
مانا کہ تُو ہے اول و آخر کا مبتدا
مانا اجارہ دار بقا ایک تُو ہی ہے
اپنے سوا ہر اک کو گھٹانے کی آرزو
محتاج بھی غلام بھی قیدی بھی ہوں ترا
کچھ تیرے سامنے نہیں یاد لائے دم زور
لیکن تیرے نتیجہ تڑپ کیوں ملی مجھے
میں صبح کن نکال سے ہوں ناکام جستجو
میرے نصیب کیوں تری تمثال ہو فقط
وہ جلوہ کیوں نہیں ہے کد تیرا گہلوں جے
ہر شے تیرے بغیر ہے کھوئے ہوئے قرا
ہر قطرہ موج بحر کا تجھ بن ہے مضطرب
ہر آتش تیر ہی جانب واد ہے
تُو پردہِ خفا میں ہو ہر چہ پگوشہ گیر

ہر گل ہر گہر میں تری آبر و سہی
تیری ضیا فرغِ نظر ہو بُوسہی
محتاج تیرے نور کا ہر ماہر و سہی
روئے ہلال و چشم ستارہ میں تُو سہی
اور منتہی بھی اول و آخر کا تُو سہی
اور نفی ماسوا کی تجھے آرزو سہی
اپنے سوا ہر اک کو مٹانے کی تُو سہی
میں بستہ رس بھی ترا مٹو ہو سہی
میں خدہ نیند توں کچھ بھی کچھ ہے سو تُو سہی
وہر سکون روح مری مائے وہو سہی
عالم کے ذرے ذرے میں تیری تُو سہی
ہر بزمِ کافر و غ تر عکسِ تُو سہی
ہر آنہ میں عکس ترا ہو تُو سہی
چرچا ترا تلاش تری کو ہو تُو سہی
ہر ذرہ زمین کو تری جستجو سہی
تیری تلاش ہی میں ہر اک آہو سہی
سب تجھ پہ مرٹیں یہ تجھے آرزو سہی

ان کاوشوں کا حاصل ملے راز داں بتا

وہر حجاب کیا ہے؟ یہ ستر نہاں بتا

غزل

وہ دل نہیں کہس دل سو جفا کیجئے اُس سے جو اُس نے کیا ورنہ سو کیجئے اُس سے
پھرتے ہو اب آوارہ و افسردہ و تنہا کہتے نہ تھے سب کم ہی ملا کیجئے اُس سے
اس روح کو اس تن سے جدا کیجئے اول گر چاہئے، پھر مجھ کو جدا کیجئے اُس سے
کیوں حضرت دل ہمت پروا نہ بھی دیکھی؟ وہ جل گیا اب آپ جلا کیجئے اُس سے
ہو گا نہ وہ مائل بہ وفا ذکر و فاسے اپنی سی نہ بے سود کہا کیجئے اُس سے
دشمن ہی سود دشمن ہی، عجب ہے دوست سود دشمن اب اس سے گلہ کیجئے یا کیجئے اُس سے؟
جس بے سرو ساں سہی کسی نے نہ وفا کی لازم نہیں اب آپ دعا کیجئے اُس سے

بُت خانے میں دل ہار گئے حضرت اعظ

وہ آپ کا اللہ؟ دعا کیجئے اُس سے

حامد علی خاں

پھول پتیاں

زندگی کے دن جوں جوں گزرتے جاتے ہیں جوشے مجھے روز بروز زیادہ عزیز ہوتی جاتی ہے وہ دنیا کی انفت و ملاحیت اور زراکت ہی نہ کہ اُس کا عقل و ہنر اور اُس کے علم کی عظمت۔ نہیں بلکہ ننھے ننھے بچوں کے قہقہے اور دوستوں کی دوستی اور باہمی گفت و شنید ایک گھر کے آرام دہ کمرے میں اور حسین پھولوں کے منظر اور موسیقی کے نغمے!

کیا حاصل ہے اس تاروں بھرے آسمان اور گردش کرتے ہوئے سیاروں کا اور آفرینش کی اس تمام محنت و مشقت کا جو ازل سے آج تک ہوتی رہی ہے اگر وہ انسان کو اس قابل نہ بنا سکے کہ وہ آزادی اور خوشی سے اپنے دائرہ زندگی میں حیرت بن کر عمر بسر کرے!

انسان کی زندگی! انسان ایک شیشہ بٹوریں ہے۔ زندگی پانی ہے اس کمزور برتن کے اندر پڑا ہوا گناہ موت لٹاتا ہے۔ موت اس شیشے کو توڑ دیتی ہے پھر پانی بہ جاتا ہے۔ بس یہ ہے خاتمہ!

میں خوشی کے ساتھ میل بھر چلا۔ وہ سارا رستہ بولتی رہی لیکن اُس کی گفتگو سے میری قابلیت میں کچھ اضافہ نہ ہوا۔ میں غم کے ساتھ میل بھر چلا اور اُس نے ایک لفظ نہ سے نہ نکالا لیکن کیا کمزور کہ میں نے کیا کچھ نہ سیکھا جب غم یوں بیکر ہوتا تھا۔

محبت اُسے ملی تھی اُن جھونپڑیوں میں جہاں مفلس رہتے ہیں اُس کے روزمرہ کے سبق دینے والے بچھل اور ندی کا تھے اور وہ خاموشی جو تاروں بھرے آسمان میں ہو اور وہ نیند جو دور تنہا کوہ ساروں میں میسر آئے۔

کیسے شیریں ہیں وہ خیال جو فناعت کی رنگ دہ میں بے ہوش ہوں ایک تلخ دل شاہی تاج سے زیادہ بیش بہا، کیسی سہانی ہیں وہ راتیں جو بے فکری کے خواب میں بسر ہوں۔ ایک مفلس کا گھر زور و حشمت کے غصے سے بھری نگاہوں کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ ایسی شیریں فناعت کی فضا ایسے دل و دماغ ایسی نیند اور ایسی برکت!

عقل اکثر اُس وقت ہمارے قریب ہوتی ہے جب ہم جھکیں نہ کہ جب ہم اٹریں۔

اپنے خیالوں کا نگہبان بن کیونکہ خیال آسمانوں میں سناں دیتے ہیں۔

(ترجمہ)

بشیر احمد بیکیم

قبر کا بھید

یہ ہے حضرت قبر کا بھید چھپائے ہوئے!

کوئی بھید نہ تھا جسے انسان نے کھول کے رکھ نہ دینا چاہا۔ کوئی بات نہ تھی جس کی کنہ اُس نے دریافت نہ کی۔ کوئی خیال نہ تھا جو اُس کے دہم میں نہ آیا۔ کوئی فورتہ تک نہیں جس کو اُس نے ہزار بچڑے کر کے اُسکے اندر کی دنیا باہر نہ کر دی! یوں تو اُس نے لَا إِلَهَ إِلَّا مَا عَلَّمْنَا سُنْ کر ظاہر سر نیاز جھکا دیا لیکن لَيْسَ بِلَا نَسَانِ الْاَلَامَا سَعٰی کے ارشاد پر اُس نے سرِ طغیان و جوش کو پھراٹھایا اور کرنی نہ کرنی سب کرنی چاہی! پہاڑ اکھاڑ کر رکھ دیئے زمین کے پیٹ میں ملاخیں گاڑ دیں آسمان کی فضا میں ہوائی بھوت اڑائیے، اونچے سے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر جا دھکا، گہرے سے گہرے سمندر کی تہ تک جا پہنچا، بڑے سے بڑے لق و دق صحرا کی تنہائیوں میں خلل انداز ہو گیا۔ یہ انسان ضعیف البینا! یہ تو خیر درست تھا مناسب تھا اور اتھا شاید مقرر تھا لیکن اُس نے نادرست کو درست نامناسب کو مناسب اور نارو کو رور کر دینا چاہا اور غیر مقررہ کو مقرر بلکہ مستور کو منظر کر دینے کی ٹھان لی۔ دنیا ڈرگئی سم گئی دیک کے پھڑپھڑی تائے تائے میں سرگوشیاں ہونے لگیں، کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک کھلبلی پڑ گئی کہ خدا کی خدا کی آشکار ہو چلی، لپٹی ہوئی کھولی گئی، پھپی ہوئی پائی گئی، جانی گئی پہچانی گئی!

دفتر و فتر کے محافظ بڑھے پکے دوڑے کہ اس ڈاکو کو روکیں پکڑیں باندھ لیں لیکن یہ بادی چوریہ زمین آسمان کا تانبا بھیل روکے کب رکتا تھا باندھتے کب بندھتا تھا اچھلا پھانڈا کو دا دوڑا اور کہیں کا کہیں نکل گیا! خدا جو ہمہ تن نیکی ہے جسے دنیا جہان کی ہبہ و مدد نظر ہے اُس نے اس سرفراز و سرکش کو سرزنش اور عقوبت کا چاب لگایا اور محض دوڑانے کی خاطر خوب دوڑایا بھگا یا کہ اُس کے حواس ٹھکانے نہ رہیں اور یہ وقت سے پہلے اُن دیکھی چیزیں دیکھنے اُن کرنے کام کرنے کے تیغے نہ پڑا ہے۔ لیکن اس وعدہ نا وفا پر اب اعتبار کیا سوتا نیکی کے سردار نے بُری بھیدی بھیا تک سی ہستیوں کو ابھارا کہ وہ اُس بھید کو جس کا ابھی بھید بنے رہنا ہی سب کے لئے مفید و مناسب ہے، اپنے سر بہر طرف میں چھپائے رکھیں!

اے انسان! تو بھی ابھی موت کا راز چھپا ہی رہنے ہے تاکہ تجھ پر زندگی کے صمیم معنی آشکار ہوں!

مقبرہ زبیدہ

خلیفہ جعفر بن منصور کی بیٹی اور حلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ کا مقبرہ مدینہ بغداد کے اُس مشہور حقے میں واقع ہے جو دجلہ کے دائیں کنارے پر آباد ہے اور "الکرخ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس حصے کو مدینۃ المنصور بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ خلیفہ منصور کے عہد میں دارالعاصلہ رہ چکا ہے۔ مقبرہ بغدادریلوے کے اسٹیشن سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے قرب وجوار میں بہت سے اولیا و علما کے مزار بھی ہیں، جن میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں:-

حضرت الشیخ الکرخی - حضرت منصور ابن صلح - حضرت عون و حضرت بہلول -
مزار وزارت الاوقاف کی حفاظت میں ہے اور اُس کی موجودہ حالت اچھی ہے۔

ہارون کی عمر اُس وقت انیس برس کی تھی جب اُس نے شہزادی زبیدہ سے شادی کی جو ایک نہایت دانشمند اور فیاض خاتون تھی، اور جو ہارون کی وفات کے بعد تیس سال تک زندہ رہی۔ اُس کی فیاضی کی زندہ شہادت وہ نہریں، تالاب، پُل اور مہماں سرائیں ہیں جن کو اُس نے اپنی جیب خاص سے لاکھوں روپے خرچ کر کے تعمیر کرایا۔ حجاز میں ملکہ زبیدہ کے قابل ذکر و رو کی یادگاریں اب تک باقی ہیں (صفحہ ۷)۔ یہ دیکھ کر کہ پانی کی قلت کی وجہ سے اہل مکہ کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس نے وہ مشہور نغمہ تعمیر کرائی جو آج تک اس شہر کے رہنے والوں کے لئے بے اندازہ رحمت و برکت کا موجب ہو رہی ہے۔

زبیدہ کی طبیعت میں فطرت نے ایجاد و اختراع کا مادہ بھی ودیعت کر رکھا تھا چنانچہ معاشرت اور آرائش میں اُس نے کئی نئی باتیں رائج کیں۔ آرام کرسی، طلائی جھومر، مرصع جوتے اور زرنگار کمر بند اسی کے ایجاد ہیں +

منصور احمد

پریم نالچ

جھن من جھن من جھن جھنکار

ناچیں کودیں گانے گائیں اپنے اپنے من کی سنائیں

پیار کریں آباہم پیار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار

گانے گانا یہ کب تک؟ ہنسنا ہنسنا یہ کب تک؟

کب تک الفت کب تک پیار؟

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار

بستی دنیا کی دو دن مستی دنیا کی دو دن

اس مستی سے ہول بیدار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار!

زنگیں پھولوں سے کھیلیں سیمیں جھولوں سے کھیلیں

دل ہو الفت کی چہکار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار!

تن من دھن سے منہ موڑیں رشتہ دنیا سے توڑیں

ہو کر عشرت سے بیزار

پیار کریں آباہم پیار

جھن من جھن من جھن جھنکار

جھن من جھن من جھن جھنکار

پریمی

ناکام فاتح

شام کی خاموشی میں جب رات کے دھندلے دھندلے سائے گرے ہو چلے تھے محنت کش سپاہی چند ساعتوں کے لئے اپنے درشت کام کی کوفت سے آزاد ہو کر گھر میں داخل ہوا۔

اُس کی بیوی اپنا شام کا کھانا پکانے میں مصروف تھی ریل لکڑیوں کے دھوئیں سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور اُس کا اترا ہوا زرد چہرہ جس پر گہری سوچ بچار اور آئے دن کی ناکامیوں نے کئی خط کھینچ دیئے تھے دھوئیں کی کثیف تاریکی میں دھندلا سا نظر آتا تھا۔

سپاہی نے اپنی وردی اتار دی اور چراغ روشن کرنے کے بعد ایک لکڑی کی چوکی چولے کے نزدیک سے گا کر آگ تلپنے کے لئے بیٹھ گیا۔

اُس کے بیٹے کا زخمی پاؤں ابھی تک اچھا نہیں ہوا تھا۔ غریب لڑکے کی جوتیاں پھٹ گئی تھیں اور ٹھوکر پر کھا کھا کر یہ زخم پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کا دوسرا لڑکا مہینوں کی بیماری کے بعد اچھا ہوا تھا۔ لیکن سردی آگئی اور اُسے گرم کپڑا تک میسر نہ ہوا اور اب اُسے کھانسی ہو رہی تھی۔ اُس کی ننھی بچی اپنی تمام جسمانی تکلیفوں کو بھول کر صرف ایک لکڑی کی گڑیا کے لئے کس قدر آرزو مند تھی۔ لیکن ہفتے گزر گئے اور ابھی تک وہ لکڑی کا بے حقیقت سا کھلونا بھی گھر میں نہ آ سکا تھا۔

اُس سے کم رتبہ سپاہی بہت اور نا اہل، اُس کے مقابلے میں کتنی ترقی حاصل کر چکے تھے لیکن وہ اپنے افسر کے سنگدلانہ مشاغل کی دُپٹیوں میں کوئی حصہ نہ لینے کا مجرم تھا اور ابھی تک وہیں اُس کے بے جا عتاب کی سختیاں جھیل رہا تھا۔ اُس کے افسر کی رائے اُس کی نسبت ہمیشہ سے یہی تھی کہ یہ بوسے جذبات کا رقیق القلب غلام سپاہی بننے کے بجائے کسی گوشہ عزلت میں پڑے سسکیاں بھرتا ہوا زیادہ موزوں معلوم ہوتا۔

مگر آج ان سب باتوں کا خیال ہمیشہ کی طرح اُس کی روح کا سولہاں نہیں بن رہا تھا۔ جب درد کا دریا ہاتھ لگ جائے تو اذیت آدھی بھی نہیں رہتی۔ اسی طرح اُس کے خوشگوار مستقبل نے آج ماضی کی تلخیوں کے نقوش اُس کے دل پر دھندلے کر دیئے تھے۔

اپنی بیوی کے افسردہ انداز سے اُس کی تمام رکھائیوں کی احتیاجوں کا اندازہ لگاتے ہوئے اُس نے کہا

”میرے دل میں بھی کئی آرزوئیں ہیں۔“ اور پھر اپنی جیب کو ٹٹول کر اُس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ آخر اُن نے قاتل کا سراغ پایا تھا اور سرکار سے دس ہزار کا مقرر شدہ انعام حاصل کر لینے میں چند گھنٹے ہی تو باقی رہ گئے تھے۔ اور اب اُسے اپنے عہدے کی ترقی یقینی تو نہیں لیکن ایک حد تک لازمی امر ضرور معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے خیال کیا ”کیا تقدیر کی رسائی اسی کو نہیں کہتے؟ بڑے بڑے سرخ رسان جس راز کا پتہ نہ چلا سکے، اس وقت وہ میری جیب کے اندر محفوظ پڑا ہے۔“ اتفاق قاتل جس نے سرکار کو بھی پریشان کر دیا تھا کس صفائی سے اب تک لوگوں کو اپنے فریب میں مبتلا کئے رہا بلکہ الٹا اس واقعہ کے بعد اُس نے بعض حلقوں میں ایک خاص وقعت حاصل کر لی۔ وہ مہینے بھر سے اسی شہر میں فروکش ہے اور آج کے بعد سب سے پہلا جہاز جو یہاں سے روانہ ہوگا اُن میں بیوی سہا کے بھانے کسی غیر ملک کو نکل جانے والا ہے جہاں وہ فالوئج کی زد سے باہر ہوگا۔ آزاد، اور اپنے سفاکانہ جرم کے باوجود مدتوں پھر اُس دنیا کی فضا میں سانس لیتا ہے گا جسے ایک بار اُس کا گناہ اُس کے لئے حرام کر چکا ہے۔

لیکن کل جب اُس کا سفر سفر آخرت میں تبدیل ہو چکا ہوگا اُس وقت کون ہے جو میری عقل و دانش کی داو دیئے بغیر رہ سکے گا۔ پراسرار راز جس قدر آسانی سے مجھے حاصل ہو گیا اتنا ہی حقیقت میں اُس کا حصول دشوار تھا۔ اور یہ سب قدرت کا کوئی کرشمہ ہے ورنہ میں کون ہوں؟ ایک غریب اور بے وسیلہ سپاہی!“ اُس کی نظر بار بار اپنی جیب کی طرف اٹھتی تھی اور وہ خیال کرتا ”اس کاغذ کے پرچے کو دیکھ لینے کے بعد بھی قاتل کے جرم میں کسی شبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے؟“

اُس نے جلد جلد اپنا سادہ سا کھانا ختم کر لیا۔ گزشتہ رات جو کمائی وہ بچوں کو سنار دیا تھا ابھی وہ انجام کو نہیں پہنچی تھی اور اب بچے باقی ماندہ کمائی سننے کے لئے صبر کر رہے تھے۔ لیکن وہ اُن سے چھپ کر گھر سے نکل گیا۔ بیوی کے تفسا پر کئی بار اصل بات اُس کے ہونٹوں تک آتے آتے رک گئی تھی۔ قاتل کا سراغ۔ دس ہزار۔ شہرت۔ اور ترقی۔ کئی الفاظ اُس کی زبان تک آئے اور وہیں رک گئے۔ خدا انخواستہ اگر وہ ناکام رہا تو اس امید کے منقطع ہونے کے بعد اُس کی بیوی جیتے جی مرجائے گی۔ اگرچہ ناکامی کا اس معاملے میں بالکل ہی احتمال نہ تھا لیکن پھر بھی وہ ابھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

قصر نما عمارتوں کے سایوں میں سے گزرتا ہوا اب وہ جلد جلد کو تو الی شہر کے مکان کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ رکاوٹوں کا اور سڑک سو دائیں ہاتھ مڑ کر اُس نے بے تابی سے ایک وسیع جنگل کے بورڈ کو پڑھا۔ مکان کے

بیرونی حصہ میں کوئی دھیمی سی سرخ روشنی جل رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے اُس پر ایک عجیب ہیبت سی طاری ہو گئی۔ یہی قاتل کی قیام گاہ تھی۔ اور یہی مکان گزشتہ چند ساعتوں سے ایک غریب سپاہی کی امید کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پھر اُس نے آہستہ سے اپنی جیب کو ٹٹولا۔۔۔ دس ہزار۔۔۔ اور اُس نے اپنی مسکراہٹ کو زیر لب چھپاتے ہوئے کہا ”اب مجھے زیادہ دیر نہ کرنی چاہئے۔ وقت تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔“ پھر وہ شاہراہ کی طرف مڑنے لگا لیکن کسی نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہہ دیا ”پہلے ایک نظر اپنے شکار کو دیکھ تولو“ اُس نے کہا میں اپنی زندگی کے کئی قیمتی حقے انہیں بے حاصل باتوں میں کھو چکا ہوں اور آج مجھے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے۔“ لیکن کسی کمرے سے کلاک نے گھنٹہ بجا کر کہہ دیا۔۔۔ ”وقت ابھی کافی پڑا ہے۔“ مکان کی کھڑکیوں میں سے روشنی باہر جھانک جھانک کر اُسے دعوت دینے لگی ”آؤ آخر ایک نظر دیکھ لینے میں کون سی دیر ہو جائے گی۔“ ایک زبردست خواہش ہو بے تابی سے کچھ ہی کم تھی اُس کی روح پر غالب آ گئی۔

پھاٹک کھلا ہوا تھا اور اب روشنی کو چھوڑ کر وہ تاریکی کی طرف بڑھا۔ مکان کے عقب میں تاریکی تھی اور وہاں صحن کے ایک تنگ سے گلی جیسے حصہ میں نیم کے بڑے بڑے درختوں نے سیاہی کو اور بھی گہرا کر دیا تھا لیکن کمروں کی کئی کھڑکیاں ادھر کو کھلتی تھیں۔ اُس نے کان لگا کر کچھ سنا اور لپک کر اُس طرف کو بڑھا جدھر سے دھیمی دھیمی آوازیں اور کسی بچے کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی میں ایک چھوٹا سا شگاف تھا جس سے دُکری کا اندرونی حصہ باہر نظر آ سکتا تھا۔ اُس نے دیوار کے ساتھ لگ کر اندر کی طرف جھانکا بجلی کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں کمرے کا بیش قیمت سامان اُس کی نگاہ کے سامنے تھا اور اس کے بعد رے پہلے اُسے کمرے کے وسط میں ایک نوے نظر آئی جس کا چہرہ حزن کی ایک چھپی ہوئی جھلک کے باوجود بھی دکھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اُس کے بالکل فرج جسم کا ایک دراز قیامت شخص بیٹھا تھا۔ اُس کا بشوہ پر عزم تھا لیکن اُس کے چہرے سے اطمینان کی ایک گہرے آثار کے باوجود سپاہی نے جرم کا پیغام پڑھ لیا۔ یہی قاتل تھا اور وہ اُس کی بیوی تھی۔ ایک پھر اُس کی جس کے گھنگھریالے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا ہوا تھا فرش پر اپنی چینی کی گڑیا کو تھپکا تھپکا کر کھلا رہی تھی۔ اور اُس کا باپ اپنی انگلیوں سے آہستہ آہستہ اُس کے بالوں کو چھیڑ رہا تھا۔ اور ایک لڑکا جس کا چہرہ معصوم تھا اپنے زعم میں اپنی بہن کی گڑیا کو جگا دینے کے لئے تالیاں بجا بجا کر شرارت سے ہنس رہا تھا۔

کسی ناگمانی جذبے سے مغلوب ہو کر سپاہی نے اپنی آنکھیں اُدھر سے پھیر لیں۔ عالم خیال میں اُس نے مسلمانوں کے ایک دستے کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ قاتل کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”تمہیں ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا“۔ اور اُس کی بیوی کا رنگ اب کاغذ کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ خوف کی ایک ہلکی سی چیخ اُس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اور اُس کا بیٹا سہم کر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا رہا تھا۔ اُس کی بیٹی کی گڑیا فریش پر اوندھے منہ گری تھی اور وہ روتے ہوئے اُس کے کوٹ کا دامن اپنی طرف کھینچ کر کہہ رہی تھی ”ابا میں تم کو نہ جانے دوں گی“۔ یہ تمام واقعہ گزر گیا اور اب وہ خود دس ہزار روپیہ کا چاک لے کر خوشی خوشی اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ اُس کے عمدے میں ترقی ہو چکی تھی۔ سرکاری اُس کی توقیر بڑھ گئی تھی۔ ہر طرف عوام میں اس واقعے کے چرچے تھے اور اب وہ اپنے اسرے کے جو رجحان سے آزاد تھا۔ اُس کی بیوی کے دل پر اُس کی اس دانشمندانہ کارروائی کا اثر امیر اثر تھا اور اُس کے بچے اس واقعہ کو ہمیشہ ناز سے بیان کیا کرتے۔

اُس نے جست بھر کر وہاں سے نکل جانا چاہا۔ کیونکہ اب دیر ہوئی جا رہی تھی اور اُسے بہت جلد کو تو ال شہر سے ملنا تھا۔ لیکن پھر اُسے اپنے پاؤں تاریکی میں کھڑکی کے نیچے جھے ہوئے محسوس ہوئے اور دفعۃً پھر ایک نظارہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کوئی قاتل پھانسی کے پھندے میں تڑپ تڑپ کر جان لے رہا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی لڑکی جس کے گھونگر یا بے بالوں میں سرخ فینٹہ بندھا ہوا تھا عالم مایوسی میں اپنی ماں کے بازوؤں میں گری ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ اور ایک یتیم لڑکا جس کی آنکھیں شدتِ خوف و ہراس سے پھرائی جا رہی تھیں لوگوں کی قہر آلود نظروں کا شکار ہو رہا تھا وہ اسے جھڑک جھڑک کر کہہ رہے تھے۔ تیرا باپ قاتل تھا اور تُو خدا جانے کیا ہوگا؟ اور کوئی ناشاد عورت حسرت و حرمان کی تصویر بنی ہوئی اپنے سیاہ خانے میں درد و کرب کی راتیں بسر کر رہی تھی۔

بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک خیال اُس کے دل و دماغ پر محیط ہوتا گیا۔ لیکن پھر اُس کے اپنے ہی دل کی آواز نے لکار کر کہا ”بزدل تجھے سپاہی کس نے بنایا تھا وہ قاتل ہے اور اُس کے لئے اپنے جرم کی سزا پانا ضرور ہے“

پھر عالمِ تصور میں اُسے اپنے بیٹے کا زخمی پاؤں نظر آیا۔ اُس کا پنجہ پھٹے ہوئے جوتے سے باہر نکل کر لہو لہان ہو رہا تھا اور درد کی تکلیف سے اُس کے رخساروں پر آنسو بہ رہے تھے۔ اور اُس کا چھوٹا لڑکا نحیف و ناتوان۔ اُسے کس قدر کھانسی تھی! اپنے بچے کی شدید کھانسی کی آواز پھر اُس کے دل پر ضربیں لگانے لگی۔ اور اُس کی ننھی بچی اپنے برف کے سے سرد ہاتھوں کے ساتھ اُس کے شانوں کو ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی ”آج بھی تم میری گڑیا نہیں لائے“ اور اُس کی زرد روہی چرائے کی دھیمی روشنی میں جھکی ہوئی اپنے بوسیدہ لباس کو پوند لگا رہی تھی

سیلی لکڑیوں کے دھوئیں نے ابھی تک اُس کی آنکھوں کو سرخ کر رکھا تھا۔

اُس نے فیصلہ کن لہجے میں اپنے دل سے کہا کچھ بھی ہو اب مجھے فوراً کو تو ال سے ملنا چاہئے لیکن ایک بار پھر کسی مفنا طبعی طاقت نے اُس کی آنکھوں کو کھڑکی کے شکاف سے لگا دیا۔ چھوٹی بچی اب گڑیا کو چھوڑ کر ننھے ننھے بازو اپنے باپ کی گردن کے گرد حائل کئے ہوئے تھی اور اُسے چوم چوم کر کہہ رہی تھی۔ ”ابا میں تمہاری بیٹی ہوں“ اور اُس کا بیٹا اُس کے زانو پر سر رکھے اب مسکرا رہا تھا۔ وہ قاتل تھا لیکن جب وہ نظر بھر کر اپنے بچوں کو دیکھتا تو محبت اور کی شاعروں کے مانند اُس کی آنکھوں میں جگمگا اٹھتی۔ اور کون تھا جو اس نور کی موجودگی میں اُس کے لہا کی تاریکی کو ان آنکھوں میں ڈھونڈ لیتا؟

ایک لمحہ کے لئے پھر وہ ساکت و صامت کھڑا رہ گیا۔ پھر اُس کا سر جکڑنے لگا اور اُس نے محسوس کیا۔ اُس کی ہیئت کسی خبیث روح کے پیکر میں تبدیل ہو گئی ہے جو اپنے گھناؤنے چہرے میں لمبے لمبے تیز دانتوں کو چھپائے ہوئے بچوں کی معصوم مسرتوں کو تہہ وبالا کرنے کے لئے کسی کو نہیں چھپی کھڑی ہو۔

بچے اُس کے آگے اپنے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہے تھے ”ہماری خوشیاں ہمیں کوئے ڈال کیا تیرے بچوں کے س اس شے کی کمی ہے جو تو ہم سے چھینے لیتا ہے؟“

لیکن وہ اُن کی معصوم تمنائوں کو روندے ڈالتا تھا اور جب وہ ننھے بچوں کے دل توڑ چکنے کے بعد اُن کی تمام خوشیوں کو سمیٹ کر اپنے گھر میں داخل ہوا تو اُس کی بیوی اُسے ملامت آمیز نظروں سے گھور رہی تھی۔ ”ہٹو تمہیں روکس نے بنایا تھا۔ تمہیں اپنے بچوں کا خیال بھی نہ آیا۔ جاؤ میں یہ ظلم کی کمائی اپنے بچوں پر صرف نہ کروں گی“ اور اب اس کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا اور اُس کے کانوں میں بچوں کی آہ وزاری اب تک حشر برپا کر رہی تھی۔

پھر وہ اپنے مستقبل کے تعلق سبکھے بھول گیا۔ بچوں کی خوشیوں کے مقابلے میں ساری دنیا اُسے پیچ نظر آنے لگی۔ اُس نے کہا وہ قاتل ہے تو ہوا کرے۔ بچوں کی مسرت اسی کے دم سے وابستہ ہے اور میں کون ہوں جو چاندنی چاندھلیوں کے عوض میں اس بیش بہا شے کو تباہ کرنے پر تلا کھڑا ہوں؟ وہ سپاہی تھا لیکن جوش جذبات سے اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔

دوسرے لمحے میں وہ صحن کی دیوار سے باہر تھا۔ سائے کی اوٹ میں اُس نے بے صبری سے اپنی جیب ہاتھ ڈالا۔ وہ کاغذ ہے وہ اتنی احتیاط سے کٹی تھیں کہ اندر چھپا کر لایا تھا، بچوں کی مسرت کے مقابلے میں اُس حقیقت ہی کیا تھی اوہ حقارت کے انداز سے مسکرایا۔ اُسے خوف معلوم ہونے لگا کہ تاریکی میں کو تو ال کا ہاتھ

بڑھ کر اُس سے یہ کاغذ چھین لے جائے۔ اُس نے حیب سے دیا سلائی نکالی اور آہستہ سے رگڑ کر کاغذ کو آگ لکھا دی۔ پھر ایک بار عظیم اُسے اپنے سینے پر سے اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے کہا ”بچوں کی خوشیوں کی حفاظت مجھ پر لازم تھی۔ اور اسی لئے یہ کاغذ خدائے قدیر نے صرف میرے سپرد کیا تھا۔“

مکان کے اندر بے بچوں کے قہقروں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے کہا ”اب وہ مجھ سے خوش ہیں۔“ عالم تصور میں پھر اک بار اُسے وہ چھوٹی سی لڑکی نظر آئی جس کے گھونگریالے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا ہوا تھا۔ وہ سکرادی تھی اور کہہ رہی تھی ”میاں سپاہی تم نے بہت اچھا کام کیا۔“

چاند ب نکل آیا تھا اُس کے پاس روپیہ تھا نہ شہرت اور نہ ترقی۔ لیکن ایک فلاح کے انداز میں بے پایاں مسرت کا ہیجان دل میں لئے ہوئے وہ گھر کی جانب جا رہا تھا تاکہ اگر اُس کے بچے ابھی تک جاگ رہے ہوں تو وہ باقی ماندہ کمائی انہیں کچ ہی سناے۔

زب

خدا کا صرف ایک ہی نام ہے خدا! نیکی کا صرف ایک ہی بدلہ ہے نیکی! کسی کو دوست بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے خود دوست بن جانا!

دوستی روح کی بقا کی طرح اتنی اچھی اور پیاری شے ہے کہ اُس کا یقین نہیں آتا!

جو میری سنتا ہے جو میری سمجھ لیتا ہے وہ میرا ہو جاتا ہے میرا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!

ہم دنیا میں یوں اکیلے گھومتے رہتے ہیں، دوست جیسے کہ ہم چاہتے ہیں محض ٹپنے ہیں اور کمائیاں لیکن ایک عظیم الشان امید ہر لحظہ با وفادار کا جی لگانے رکھتی ہے کہ کہیں اور عالمگیر طاقت کے دوسرے عالموں میں اب اس گھڑی ہی ایسی رو صیں ہیں کام کرنے دیکھ بھرنے بہت دکھانے والی جو ہم سے محبت کر سکتی ہیں اور جن سے ہم محبت کر سکتے ہیں۔

گلچیں

نذرانہٴ رُوح

عفوِ تقصیر کرانے کے لئے آیا ہے تیری درگاہ میں اک بے کس و بے بس مجبور
نذر کرنے کے لئے لختِ جگر لایا ہے ارمغانِ رُوح کا کر لے مرے مولا منظور

دل میں ہے اک نگہِ لطف کی حسرتِ باقی رخِ انور کی ضیا سے ہو یہ سینہ معمور
جامِ وحدت کا مجھے بھی ہو عطا لے ساقی دل کے پردہ سے ہوتا رہی غفلت کا فور

پانی ہو ہو کے بہ ذوقِ شہادت میں جگر لطفِ امرت کا دکھا زہرِ لہا ہل میں مجھے
وہ تصور ہو عطا چشمِ بصیرت کو مگر نقشِ باطل نظر آئے نہ کوئی دل میں مجھے

نگہِ شوق میں ہر ذرہ ہو رشکِ خورشید جزو میں کل کا تماشا نظر آجائے مجھے
پیش خمیہ ہو امیدِ دل کامری ہر امید یعنی ہر قطرہ میں دریا نظر آجائے مجھے

اندرِ حیاتِ شرما

تجلیات

آنکھوں سے دل میں روح میں دل سے سما گیا
 ہر آرزو کو فتنہ محشر بنا گیا
 جلوہ تو اُس کا دیکھ لیا چشم شوق نے
 ہر سمت دیکھتا ہوں اُسی کے جمال کو
 آیا نہ تھا زباں پہ ابھی حرفِ مدعا
 آتے ہی اُن کے دُور ہوئیں کلفتیں تمام
 آغوش انتظار ابھی وا ہے اور وہ
 اس دلر با ادائے محبت سے پُوچھئے
 ہمدم جو پھر کہوں تو کہوں کس امید پر
 ہر زخمِ دل کا پھوٹ کے ناسور ہو گیا
 وہ! اور وعدہ ہائے وفادارم غلط!!!
 کیا جانے کس لئے مجھے اتنا وہ بھا گیا
 آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جاؤ و جگا گیا
 پروا نہیں ہے اس کی اگر دل گیا گیا
 اتنا مری نگاہ میں کوئی سما گیا
 وہ مدعائے دل مری نظروں سے پا گیا
 جاتے ہی اُن کے زیریت کا سارا مزا گیا
 آغوش انتظار میں آیا چلا گیا
 مجھ سے یہ بار بار نہ کہئے کہ کیا گیا
 سو بار اُن سے حالِ منت کا کہا گیا
 یہ موسم بہار عجب گل کھلا گیا
 قاصد بنا گیا! مجھے قاصد بنا گیا!!

اکبر ملول رہتے ہو کس کے فراق میں

اکبر

یہ کون راہ موت کی تہم کو بتا گیا

مس پندرہ

میں پہاڑ پر اس لئے تو نہیں آیا تھا کہ ہسپتال میں پڑے پڑے اپنا تمام وقت گزار دوں! "انہ کمار نے شکوہ کے انداز میں کہا۔

ڈاکٹر نے جواب دیا "بے شک نہایت افسوس کا مقام ہے لیکن مجبوری کا کیا علاج۔ اور وہ ہسپتال نہیں نرسنگ ووم ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ نام ہسپتال سے زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے۔"

"ہسپتال کا نام کچھ بھی رکھ لو۔ مجھے تو اس کے خیال سے وہی ایتھر اور آئڈو فارم کی بو کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن کیا ہمیں ہوٹل میں میرا علاج نہیں ہو سکتا؟"

"ہو تو سکتا ہے لیکن ہوٹل کے دیگر مہمان ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہر وقت آنے جانے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور مریض کے لئے بھی یہاں اُس قدر سہولت میسر نہ ہوا شکل ہے۔"

"نرسیں؟" آپ نے مجھے جنگ کا زمانہ یاد دلادیا جب میں طالب علم تھا۔ لیکن اگر نرس کھنا ہی ہے تو خدا کے لئے مجھے کسی یورپین مسینہ کے حوالے نہ کر دینا۔ اول تو ہر منٹ وہ چاہے گی کہ میں اُس کی آواؤں کی تعریف کروں۔ اس پر کہیں ہندوستان میں دگکا فناد ہو گیا تو یہ کہہ کر مجھے چھوڑ کے چلے گی کہ "ہم کالا آدمی کا علاج نہیں کرتا میں صاف کہے دیتا ہوں ڈاکٹر صاحب کہ مجھ میں اس وقت ناز اٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "آپ بے فکر ہیں آپ کو ناز برداری کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہاں زیادہ تر نرسیں یورپین ہیں لیکن میں نے چند روز ہوئے سنا تھا کہ ایک ہندوستانی خاتون نرسنگ کا امتحان پاس کرنے کے بعد عشق کی غرض سے آئی ہوئی ہے اور گوا بھی اسے زیادہ تجربہ نہیں تاہم اپنا کام خوب ہوشیاری اور دل دہی سے کرتی؟ اگر ممکن ہو سکا تو میں اُسے آپ کے لئے مقرر کرادوں گا۔"

"وہ حسین تو نہیں ہے؟"

"نہیں اس قدر حسین نہیں کہ آپ کو اندیشہ ہو۔ اور غالباً کسی معزز خاندان سے ہے یہ کام فقط شوقیہ

سیکھ رہی ہے۔"

"خیر تو اُن سے کہہ دینا کہ اگر یہ شرائط پوری نہیں ہو سکتیں تو میں وہاں رہ کر علاج نہیں کراؤں گا!"

ڈاکٹر نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا ”بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ امید ہے انتظام ہو جائے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر رابنسن کو اس نوجوان لکھتی کی باتوں پر ہنسی کو روکنے میں نہایت مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ اور اس کے خیال میں ان امیر لوگوں کو جو صدی بچوں کی طرح ہوتے ہیں کبھی کبھی اس بات کا احساس ہونے کی ضرورت تھی کہ روپے سے دنیا کی ہر ایک چیز نہیں خریدی جاسکتی بلکہ اصلیت میں وہ تمام اشیاء جو حقیقی معنوں میں قابل حصول مرقی ہیں روپے کے عوض نہیں ملتیں۔ سورنہ جس نرسنگ میں انہیں لگا کر رکھے جانے کا خیال تھا وہ قصبہ راج پور سے اوپر کی جانب ایک خوبصورت علیحدہ پہاڑی پر چونکہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کھولا گیا تھا اس کی یوزمین بالکل ایک ایسے مستول آدمی کو اپنے یہاں رکھنے کے لئے ملک کا کو نہ چھان مارتی اور کہیں سے اس کے مزاج کے مطابق ہندستانی نرس ڈھونڈ نکالتی۔

بچ پوچھئے تو اندکمار کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ طالب علمی کے تھکسوں سے فراغت پاکر تین چار سال میں ہی سخت محنت کر کے اس نے ثابت کر دیا تھا کہ مرحوم باپ کی کثیر جائداد اور تجارت کا کاروبار سنبھالنے کی اُش غیر معمولی قابلیت تھی۔ اور خود مختار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ موسم گرما پہاڑ پر بسر کر کے کچھ آرام لینے کی فکر میں گھر واپس ہوا تھا۔ اب اسے مشیت کسے یا اتفاق ڈیرہ دون میں آئے دوسری دن ہوئے تھے اور آگے منصوری جانے کا خیال تھا کہ صبح کے وقت خود موٹر چلاتے ہوئے چند بے فکرے نوجوانوں کی موٹر کے ساتھ دوڑ ہو گئی چونکہ رستے سے واقفیت نہ تھی جونہی اس کی موٹر ان سے آگے نکلی ایک بہت ٹیڑھے موٹر پر چھوٹا سا پل سامنے آگیا۔ جبکہ اس قدر تیز تھی کہ موٹر رک نہ سکتی تھی جب تکلا توڑ کر نالے میں اونڈھی ہو گئی۔ دوسری موٹر والے بیوش اندکمار کو اٹھا کر ہوٹل میں لئے ڈاکٹر رابنسن سول سرجن کو بلایا۔ دوپیلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ سر میں کئی جگہ چوٹیں تھیں تمام بدن کی کوئی جگہ خالی نہ تھی جہاں چوٹ زخم یا کم از کم خراش نہ ہو کئی گھنٹے کے بعد بیوش آئے پر ڈاکٹر سے مندرجہ بالا گفتگو ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر نے احتیاطاً اندکمار کو ایک خواب آور دوا پلا دی اور خواب کی حالت میں ہی اسے موٹر میں رکھ کر نرسنگ ہوم پہنچا دیا گیا۔ اس لئے جب شام کے قریب وہ بیدار ہوا تو بالائی منزل کے ایک نہایت صاف سحرے ہوادار کمرے میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں روپلی کناروں والے گلابی اور نفیشتی بادلوں میں سے چھن کر اس کے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ اور بارش کے بعد دھلے ہوئے سبزہ کا سماں۔ اور دور پہاڑیوں کے سیاہ داموں پر چھوٹے بڑے روٹی کے سفید گالوں کی استراحت کا نظارہ پیش نظر تھا۔

وہ دیر تک خاموشی سے بے حس و حرکت پڑا ہوا اس منظر کا لطف اٹھاتا رہا پھر نینگ کی یا سنی کی جانب نظر

اٹھائی تو دیکھا کہ اس طرف بھی ایک بہت بڑی کھڑکی ہے جس کے پٹ کھلے ہیں اور سامنے کے پہاڑوں پر بے شمار روشنیاں کپور تھلہ کی کوٹھی کے بڑے لمپ سے لے کر لنڈور بازار تک تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد ٹمٹاتی ہوئی ظاہر ہوتی جا رہی ہیں۔ گویا منصوری کی پہاڑی حسینہ اپنے شاہ لہو و لہب کے لئے جھپکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ آہستہ آہستہ خوابِ ناز سے بیدار ہو رہی ہے۔

ایک تختِ سُفل کے یہاں کی روشنیاں گلابی ریشم کے اوندھے کنول سے مشابہ شیڈوں میں ارد گرد کے سفید ستاروں کے درمیان بہت سے سرخیوں کی طرح خون آشام دلوں کا سرخ رنگ لئے ہوئے چمکیں اور اندکار کے لکے لکے جمع شدہ غبار اُس کے منہ سے انگریزی کے اُس پر معنی لفظ کی شکل میں پھوٹ نکلا جس سے بہتر ہال شدہ آرزوؤں کے بے ساختہ اظہار کے لئے اردو زبان میں کوئی ایک لفظ نہیں ہے۔

”ڈیم!“

اب باوجود اس کے کہ یہ لفظ ایک خاص کیفیتِ قلب کے اظہار کے واسطے انگریزی زبان میں بھی لا جواب ہے اہل زبان اسے فصیح نہیں کہتے۔ یہاں تک کہ مستورات کی موجودگی میں اُسے منہ سے نکالنا سخت معیوب خیال کیا جاتا ہے یہ وجہ تھی کہ اندکار جو اپنے آپ کو کمرہ میں اکیلا سمجھے ہوئے تھا گھبرا کر عجوب سا ہو گیا جب کچھ آہٹ ہوئی اور کمرے کی دیوار کی جانب دھندلی تاریکی میں سے ایک صورت زس کے لباس میں اُگر اُس کی آنکھوں اور منصوری کے نظار کے درمیان حائل ہو گئی۔ اور پوچھا

”آپ بیدار ہو گئے کیا؟ اب مزاج کیسا ہے؟“

منصوری دیر رک کر اندکار نے بھی سوال ہی کیا ”جو کچھ میں کہہ رہا تھا کیا تم نے سنا؟“

جواب ملا ”ہاں سنا تو۔۔۔۔۔“

”امید ہے تمہیں سُن کر بہت صدمہ نہیں ہوا ہو گا کیونکہ وہ مزاج ہی کی کیفیت تو تھی جو میرے منہ سے نکلی۔“

”خیر کوئی حرج نہیں۔ اب مجھے آپ کا ٹیسٹریچر لینا ہے۔ لیکن پہلے یہ بتائیے کہ کوئی اور کام ایسا تو نہیں جو

آپ چاہتے ہوں میں پہلے کر لوں؟“

”ہے تو سہی“ آندکار نے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سوفا پر بٹھا کر سامنے کی سرخ روشنیوں والی عمارت کے اندر بال روم میں پہنچا دو۔ اُسی کی جھلک نے میری طبیعت کو زیادہ خراب کر دیا ہے کیونکہ میں نے اسے طالبِ علمی کی بندشوں کے زمانہ میں دیکھا تھا آزادی سے دیکھنے کی آرزو تھی۔ لیکن یہ آرزو اب غالباً کبھی پوری ہو سکے گی۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ اب میرا صحت پا جانا محال ہے۔ جب ڈاکٹر بھی اس قدر تسلیم کرتا ہے کہ میری حالت خطرناک ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کی کوئی امید نہیں۔ مجھ سے زیادہ بد نصیب بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔“

”آپ کا خیال غلط ہے۔ دنیا میں بہت سی ایسی ہستیاں موجود ہیں جنہیں امراض سے اتنی فرمت ہی نہیں کہ اپنی بد نصیبی پر غور کر سکیں۔“

”ہونگی۔۔۔ لیکن میرے خیال میں ایسا کوئی نہیں ہوگا جس کے ساتھ قسمت نے اس قدر تم ظریفی کا برتاؤ کیا ہو جیسا میرے ساتھ کیا ہے۔ میری جگہ اگر کوئی غیر بھی ہوتا تو مجھے اُس کی حالت پر رونا آتا۔“

”لیکن اگر ہمیں اس نرسنگ ہوم میں ہی کسی کی حالت آپ سے زیادہ خراب ہو۔ اور آپ بھی اسے تسلیم کر لیں تو —————؟“

”ناممکن ہے میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا کوئی نہ ہوگا۔“

”مجھے یہاں کے ضوابط شرط لگانے کی اجازت نہیں دیتے۔ ورنہ جیت لینے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔“
 ”تو کیا کوئی خاص کہیں مد نظر ہے؟ — دیے تو غالباً مجھے بھی یہاں کے لوگ ”کیس“ ہی کہتے ہوں گے اور مجھے

اس لفظ سے سخت نفرت ہے۔ گویا کسی بے جان چیز کا ذکر ہو رہا ہے — اور مجھے اس سے بہتر کوئی نام رکھوانے کا حق بھی کیا ہے۔ مُردوں سے بدزہنوں — مر جاتا تو اچھا رہتا۔ چھٹکا راہو جاتا۔ اب خدا جانے کب تک اسی طرح پڑا رہوں گا۔ — اور نتیجہ پھر وہی۔ صحت تو ہونے سے رہی۔ علاج کرنے سے کیا حاصل —!“

نرس نے دوبارہ اُس کے خیالات کو پلٹنے کی کوشش کی ”سُنئے تو۔ ایک خاص کیس مدِ نظر ہے اور وہ بھی بہت عجیب۔“

”مرد ہے یا عورت؟“

”عورت ہے — عورت بھی کیا نوجوان لڑکی ہے۔ اُس کے حالات آپ نہیں گے تو اپنی نکالیف بھول جائیں گے۔“

اتنے میں دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔ نرس نے جلدی سے یہ کہہ کر باقی کل بتاؤں گی، ”بجلی کا لپ جواز کیا

نے نظائے کا لطف اٹھانے کے لئے اب تک جلائے نہیں دیا تھا روشن کر دیا۔ دروازہ کھلا۔ ایک اور نرس اور ڈاکٹر اندر آ گئے۔ اور یہ نرس دروازے کے پاس ڈاکٹر سے کچھ گفتگو کر کے چلی گئی۔

دُکڑنے نبض دیکھی تھرا بیڑ لگایا۔۔۔ حرارت بڑھنے لگی تھی۔۔۔ اور مرہم ٹپی کو جہاں جہاں ضرورت

تھی درست کر کے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

”فدا مید ہے آپ کو جلدی صحت ہو جائے گی۔ آپ کے قوی مضبوط ہیں اور یہاں کی آب و ہوا نہایت چھی ہے۔“
اندکار نے جھنجھلا کر کہا ”اجی چھوڑو بھی ڈاکٹر صاحب۔ مجھے دھوکا دینے سے کیا حاصل! صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہفتہ عشرہ کا ممان ہوں۔۔۔۔۔؟“

”واہ صاحب آپ بہت کیوں ہائے دیتے ہیں؟ آپ ایسے نوجوان تو جنگِ عظیم میں تین لکھ مرتبہ دیکھا کر زندہ ہو ہو گئے ہیں۔ اور آپ کے تو کوئی زیادہ خطرناک چوٹ بھی نہیں آئی۔ اعضائے رئیسہ صحیح و سالم ہیں۔ بس چار پانچ روز کی بات ہے۔ جہاں زخم درست ہونا شروع ہوئے طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اور ابھی تو پہلا دن ہے۔ رات میں غالباً بخار بڑھ جائے گا اور زخموں میں مدد بھی محسوس ہوگا۔ اگر ابھی سے آپ گھبرا گئے تو بیماری کیسے کٹے گی۔۔۔۔۔؟“
غرض اسی طرح کی چن باتیں کر کے ڈاکٹر چلا گیا اور اندکار نے بخار کی حدت اور درد اور بے چینی کی وجہ سے رات آنکھوں میں کاٹی۔ صرف صبح کے وقت ایک دو گھڑی کے لئے بشکل اُس کی آنکھ لگی۔

دن کافی نکل چکا تھا کہ اندکار جاگا اور سب سے پہلے اُس کی نظر سامنے کے پہاڑوں پر پڑی جہاں سیلی سیلی دُھوپ ہرے ہرے لہلہاتے پتے بزمے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ فزط مسرت سے اُچھل کر پتنگ پر بیٹھ جائے کو تھا کہ بجلی کے شرانے کی طرح درد کی ایک لہر سر کی طرف سے اٹھی اور پاؤں کی طرف سے نکل گئی۔ اور گزشتہ رات کا خیال آنے سے اُس کی تمام اُنگ پر پانی پھر گیا۔

اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور رات کے واقعات ایک ایک کے اُس کے خیال میں گزرنے لگے وہ موڑوں کی دوڑ۔ پل کا سامنے آ جانا۔ بے خبری۔ ہوٹل کا کمرہ اور ڈاکٹر۔۔۔۔۔ زرننگ ہوم۔ شام اور۔۔۔۔۔ نرس۔۔۔۔۔ ہاں نرس۔ حسین تو نہ تھی۔ لیکن اُس نے اس کی صورت ہی کب دیکھی تھی۔۔۔۔۔ صرف اندھیرے میں۔ آسمان کے مقابل۔۔۔۔۔ چہرے کے خطوط بُرے نہ تھے لیکن ہندوستانی تھی۔۔۔۔۔ غالباً کالی ہوگی۔ اور کالی بھی وہ جسے پنجابی شاہ کالی کہتے ہیں۔۔۔۔۔ مدراس یا ممبئی کی رہنے والی۔۔۔۔۔ گو معلوم ہوتا ہے تعلیم یافتہ تھی۔ اور ہمدرد۔۔۔۔۔ ہاں ہمدرد ضرور تھی۔۔۔۔۔ وہ کسی لڑکی کا ذکر بھی تو کر رہی تھی جو بہت بیمار ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے بھی زیادہ۔۔۔۔۔ شاید یورپین نرس اتنی ہمدرد نہ ہوتی۔ وہ تو یہ چاہتی کہ میں اُس کے حق کی تعریف کروں۔۔۔۔۔ کسی نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ نرس کھڑی تھی۔ وہی؟ ہاں

غالباً وہی ————— لیکن یہ کالی تو نہ تھی ————— اور اکھیں ————— اُن کتنی بڑی بڑی! اور ان میں —————
 ”آج مزاج کیسا ہے؟“ نرس کی آواز آئی۔

”بہت بُرا۔۔۔۔۔“

”کیوں؟ کیا تکلیف ہے؟“

”یہی کہ میں اُن پہاڑوں پر جانے کے ناقابل ہوں۔“ اور اُس نے آنکھ سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”اِس کا وقت بھی آجائے گا۔ آپ کو اتنا بے صبر نہیں ہونا چاہئے۔“

اِس گفتگو کے بعد ڈاکٹر آگیا۔ مرہم پٹی ہوئی۔ خوراک دی گئی وغیرہ۔۔۔۔۔ اور جب سب چلے گئے تو اندکمار نے نرس سے پوچھا۔

”نرس تمہارا نام کیا ہے؟“

”مجھے یہاں نرس بللاکتے ہیں۔“

”وطن۔۔۔۔۔؟“

”گجرات“

”گجرات؟“ اندکمار نے حیرانی سے کہا۔ ”کاٹھیاوار؟“

”نہیں تو۔ گجرات پنجاب۔“

”اچھا۔۔۔۔۔! جیہی۔۔۔۔۔“

”جیہی کیا؟“

”کچھ نہیں۔“ جلدی سے بات ٹال کر اندکمار نے کہا۔ ”تم کل کسی لڑکی کا ذکر بھی تو کر ہی تھیں جو اسی زرسنگ ہوم

میں ہے۔ اور مجھ سے زیادہ بیمار ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں کر رہی تھی۔۔۔۔۔ لیکن میں مریضوں کا حال ایک دوسرے سے کہنے کی اجازت نہیں۔ اور

ممکن ہے اُس کے متعلق سُن کر آپ کی طبیعت پر اثر ہو اور ٹیپر سچر بڑھ جائے۔۔۔۔۔“

”واہ! کسی عورت کا حال سننے سے میرا ٹیپر سچر بڑھ جائے۔ وہ جنت کی عورت بھی ہو تو یہ ممکن نہیں۔ اُس کا نام کیا ہے؟“

”صورت تو واقعی ایسی ہے کہ حوروں کی بھی نہ ہوگی۔ لیکن نام یا پتہ کسی کو معلوم نہیں۔ اور ہوتا بھی تو زرسنگ ہوم

میں مریضوں کو اُن کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا۔ مگر رے کے نمبر پر مریض کا نام ہوتا ہے۔“

”یعنی؟“

”یعنی اُس کا نام مس پندرہ ہے۔ کیونکہ وہ پندرہ نمبر کے کمرے میں ہے۔“

”اور میں؟“

”آپ نمبر آٹھ یا سٹراٹھ ہیں۔“

”اچھا تو اُس کا نام یا تہ کسی کو معلوم نہیں؟ کیوں؟“

”یہ بھی ایک افسانہ ہے۔ وہ کل آپ کے آنے سے پہلے یہاں لائی گئی تھی۔ ڈیرہ دون کے ٹیشن پر اکیلی ریل سے اتری اور اترتے ہی مہوش ہو کر گر گئی۔ لباس سے کسی معزز اور امیر گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ صرف ایک بیگ ساتھ تھا۔ اب تک اُسے پورا ہوش نہیں آیا اور سبکی بھکی باتیں کرتی ہے۔“

”ہندو ہے یا مسلمان؟“

”یہ بھی کسی کو علم نہیں بے حد کمزور ہے اور جب کبھی آنکھیں کھولتی ہے۔ سخت خوف زدہ معلوم ہوتی ہے۔“

”آخر بات کیا ہے؟“

”کچھ پتہ نہیں۔ اب آپ زیادہ گفتگو نہ کریں۔ سر میں درد ہو جائے گا۔ ڈاکٹر منع کر گیا ہے۔ سونے کی کوشش کیجیے۔ رات بھی آپ بہت کم سوئے ہیں۔ اور جن حالات کا آج شام کو پتہ چلے گا کل آپ کو بتاؤں گی۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر یا کسی دوسری سہک میں مس پندرہ کی نسبت دریافت نہ کیجئے گا۔ ورنہ اول تو بیٹرن مجھ سے ناراض ہوگی کہ میں نے ایک مریض کا حال دوسرے سے کہا۔ اور ایک بے اور بھی ہے جو پھر کبھی بتاؤں گی۔“

”اندکمار نے سر کے اشارے سے اچھا کہا۔ اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے منتظر خیالات کے ہجوم میں، جیسے مس پندرہ کی کمائی اور اس کی بے بسی کے ساتھ نرس بھلا کے رازدارانہ انداز اور بڑی بڑی پراسرار آنکھوں کا دھندلا سا تصور بھی وقتاً فوقتاً سینما کے نظاروں کی طرح پرے سے پراتا اور غائب ہو جاتا۔“

تیسرے روز جب ڈاکٹر اگر چلا گیا تو اندکمار رات کی تکالیف کے بعد حسبِ معمول اپنی بھینبی پر تافتافت اور قسمت سے گلا کرنے میں مشغول تھا کہ نرس بھلا نے کہا

”رات سے وہ پورے ہوش میں ہے۔“

”کون ہوش میں ہے؟“

”مس پندرہ“

”تو میں کیا کروں۔۔۔!“

”اچھا مجھے تو خیال تھا کہ شاید آپ کی وجہ سے اس کی جان بچ جائے۔ لیکن آپ کو کسی کی تکلیف یا راحت کا احساس ہی نہیں۔“

”میری وجہ سے؟“

”ہاں آپ کی وجہ سے۔ گزشتہ رات میں اُس کے پاس تقریباً ایک گھنٹے تک بیٹھی رہی۔ وہ کسی سے بے حد خوفزدہ ہے اور اس خوف کے باعث ہی اپنا نام پتہ یا حالات نہیں بتاتی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ اُس نے سٹیشن پر اترنے کے پہلے ایک نہر ملی دوائی کھالی تھی گویا خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ جن اتفاق سے بیہوش ہو گئی اور یہاں پہنچے ہی اُس کا علاج شروع ہو گیا۔ میں سمجھے تھی کہ اگر کوئی آپ ایسا با اثر نوجوان جو تھوڑے بہت خطرے سے نہ گھبراتا ہو اُس کی امداد پر تیار ہو جائے تو ممکن ہے اُس کی جان بچ سکے ورنہ یقینی امر ہے کہ ہر وقت روتے رہنے۔ ذرا اسی آہٹ پر اچھل پڑنے اور دروازے کی طرف اس طرح دیکھنے سے گویا موت کا پیام آیا چاہتا ہے وہ گھل گھل کر چند روز میں ختم ہو جائے گی۔“

”لیکن میں تو اپنی جان سے بیزار اور خدا جانے کتنے دنوں کا خود مہمان ہوں۔ میں اُس کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”یہ آپ کا وہم ہے۔ اگر آپ کوشش کریں تو ہفتہ عشرہ میں بھلے چنگے ہو سکتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر آپ کسی کے لئے

خطرے میں نہ پڑنا چاہیں تو دوسری بات ہے۔۔۔۔۔۔“

”نہیں جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں اُس کے لئے تیار ہوں لیکن یہ صحت پانے تک وہ یہاں کیوں پڑی ہے گی؟“

”اس کی میں نہ دیکھ رہی ہوں میں اسے سمجھا بھجا کر راضی کر لوں گی کیونکہ اُس کے زندہ رہنے کا غالباً فقط یہی ایک ذریعہ ہے۔

اس کے بعد اندکار کے چند عزیز آگئے اور یہ گفتگو میں ختم ہو گئی۔ لیکن شام کو رخصت ہونے سے پہلے اُس نے بھلائے مسکرا کر مس پندرہ کی امداد پر تیار ہو جانے کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مسکرانے میں اُس کے ہونٹوں کے دونوں طرف کچھ فاصلے پر دو چھوٹے چھوٹے گہرے گڑھے پیدا ہو گئے۔ جو رات میں نیم خواب کی حالت میں بار بار اندکار کی آنکھوں کے سامنے آجاتے۔ وہ حیران تھا کہ کیوں۔۔۔۔۔۔

اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ مس پندرہ اور اندکار کے درمیان نامزد و پیام کا سلسلہ زس بھلا کی وساطت سے جاری رہا اور آخر میں ایک فداانہ کار نے ایک تحریر بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی جس کا جواب نہایت خوبصورت گول گول دف میں لکھا ہوا اُسے ملا۔ لیکن مس پندرہ نے بہت بہت شکریہ پر ہی اکتفا کی تھی۔ اپنا نام پتہ اور مزید حالات

”نہیں تو۔۔۔۔۔ اس میں اور کسی کا قصور نہیں۔ اور میں جانتی ہوں کہ قصور قابل معافی نہیں لیکن پہلے تو صرف آپ کی توجہ اپنی تکالیف اور بد قسمتی کی طرف سے ہٹانے کے لئے میں نے مس پندرہ کا ذکر چھپڑا تھا۔ لیکن بعد میں آپ کے سوالات۔ اور اپنے پہلے جھوٹ کو قائم رکھنے کی ضرورت نے مجھے مزید جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ معاملہ بہت دور پہنچ گیا۔ یہی وہ دوسری وجہ تھی جس کے لئے میں نے کسی اور سے مس پندرہ کی نسبت دریافت نہ کرنے کی آپ سے درخواست کی تھی۔“

”اور وہ خط؟“

”میرا لکھا ہوا تھا۔“

کچھ عرصے تک تو اندکار چپ چاپ سوچتا رہا پھر یک لحظہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اور کہا ”تو گویا تم نے میری جان بچائی؟ اکیلی تم نے۔۔۔۔۔ کیوں؟“

نرس بملانے آنکھیں نیچی کر لیں اور کچھ جواب نہ دیا۔ اندکار نے تھوڑے وقفے کے بعد پھر کہا ”اچھا تو اب اس میری جان بچانے کے قصور کی سزا کیا ہونا چاہئے؟“

اُسی طرح آنکھیں نیچی کئے ہوئے بملانے جواب دیا ”جو آپ کا دل چاہے“

”سزا یہ ہے۔۔۔۔۔“ اندکار نے مسکرا کر اُس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اٹھاتے ہوئے اُس کا چہرہ اپنے مقابل

کر کے کہا ”۔۔۔۔۔ کہ تم مستقل طور پر میری تیمارداری اپنے ذمے لے لو۔۔۔۔۔“

بملانے ایک دفعہ آنکھیں اٹھا کر پھر اندکار کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں سے کچھ دُور دونوں طرف وہی گونگھٹے پیدا

ہو گئے جن کے اندکار خواب دیکھا کرتا تھا۔ آنکھیں نیچی ہو گئیں اور بملانے آہستہ سے کہا

”جس طرح آپ کی مرضی۔۔۔۔۔“

اس سے تقریباً ایک ماہ بعد مسٹر اور مسز اندکار منصور پرپٹنفل کے بال روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

اور چاروں طرف بجلی کی قفتیاں گلابی ریشم کے اونڈھے کنول سے مشابہ شیدوں میں سینکڑوں خون آشام دلوں کا رنگ لئے ہوئے آویزاں تھیں +

عطاء الرحمن

داستانِ دل

زندہ انہیں کے دم سے ہے نام و نشانِ دل
ناز و نیاز میں بھی یہ ہے پاسِ حُسن و عشق
معنائے حن، خوبی و نیکی ہے بالیقین
ہے عشق کیا طلب ہے فقط نیک و خوب کی
تہذیبِ جس کے ساتھ ہو اخلاقِ جس کے پاس
سیرِ مجاز چھوڑ! فریبِ نظر ہے یہ
اللہ سے عاشقِ ان حقیقی کی تہ ہیں
موت اُن کی، زندگی ہی۔ فنا اُن کی ہے بقا
باغِ خلیل، آتشِ نمرود بن گئی

جذباتِ حُسن و عشق ہیں روح و روانِ دل
ایک آستانِ دل ہے تو اکِ پاسبانِ دل
اس کے سوا کہے تو غلط ہے بیانِ دل
جو اس سے سخر ہیں وہ ہیں شمنانِ دل
وہ عشقِ پاک صاف ہی شایانِ شانِ دل
اُٹھ! باہم معرفت پہ لگا نردبانِ دل
دیتے ہیں سنس کے جانِ دم امتحانِ دل
ہے رشکِ عیش اُن کو غمِ جدانِ دل
تھی ایک یہ کرامتِ سوزِ نہانِ دل

یہ ذکر اگرچہ لائقِ تفصیل ہے مگر
تھوڑا ہے وقت اور بڑی داستانِ دل

زندہ رہا تو بھی کبھی احسن سناؤں گا

بن کر زبانِ حال سے میں ترجمانِ دل

احسن
مارہروی

غزل

عجب کیا ہو جو سن لے اب کوئی دم میں خد میری
 کہ تیری ضد سے ٹکرائی ہے برسوں التجا میری
 توجہ کے کبھی قابل نہ ہوگی التجا میری
 کہ تعلیم تغافل اُن کو دیتی ہے وفا میری
 توقع کچھ اگر رکھوں سراسر ہے خطا میری
 کہ اُن کے روبرو میں کیا ہوں اور کیا التجا میری
 بہانہ چاہئے تجھ کو نہ مجھ کو عذر کی حجت
 مُسَلَّم ہے زمانے میں کہ تم تیرا خطا میری
 عبت احباب مجھ سے کرتے ہیں انہما میری
 نہ تُو نے کی کمی کوئی نہ میں ثابت ہوا قاصر
 نہ مجموعہ تم تو میرا دعا اک حرفِ باطل ہے
 ترے نازِ بلا انگیز سے فریاد کرتا ہوں
 کبھی تو گوشہ ابرو کو جنبش کی اجازت دے
 کہ تیری ضد سے ٹکرائی ہے برسوں التجا میری
 کہ تعلیم تغافل اُن کو دیتی ہے وفا میری
 کہ اُن کے روبرو میں کیا ہوں اور کیا التجا میری
 مُسَلَّم ہے زمانے میں کہ تم تیرا خطا میری
 نہ وہ میرا مرض سمجھیں نہ وہ جانیں وفا میری
 رہیں دستِ گریباں ہی جفا تیری وفا میری
 اگر سمجھو تو پھر میری خموشی ہو صدا میری
 تری ایک ایک ادا اوفتنہ پکیر ہو قضا میری
 بہت اندوہ گیں رہتی ہو جانِ مُبْتَلا میری

یہی بہتر ہے اپنے کام سب تقدیر پر چھوڑوں
 کہ وحشت ہو چکی اب کوششوں کی انتہا میری

افکارِ رعنا

ملتے ہی آنکھ جامِ محبت پلا دیا
 جاں کیا تھی جانِ ڈال دی اُس میں خیال نے
 کس دل سے دُورِ دعائیں نشا طِ خیال کو
 قدرت کی بخششوں کا بھلا کیا شمار ہو
 یوں رنگ لائی میسری پشیمانی گناہ
 رکھ دی جہاں بسیں وہیں کعبہ بنا دیا
 یہ تم نے اک نظر میں مجھے کیا دکھا دیا
 دل کیا تھا آرزو نے اُسے دل بنا دیا
 دنیا کو میرے واسطے جنت بنا دیا
 سب کچھ دیا کہ اک دل بے مدعا دیا
 رکھ دی جہاں بسیں وہیں کعبہ بنا دیا

اظہارِ دردِ دل سے سوا دردِ دل ہو

رعنا غضب کیا کہ یہ پردہ اٹھا دیا
 ملکِ سلطانہ رعنا

غزل

نہ چھیڑو، کیا ستم کرتے ہو۔ اک سبل کے ٹکڑے ہیں
 بہت رونا مجھے آتا ہے غنچوں کے بتسم پر
 جسے شیشہ سمجھتے ہو، یہ میرے دل کے ٹکڑے ہیں
 وہ اُس کے دل کے ٹکڑے ہیں میرے دل کے ٹکڑے ہیں
 فقط۔ کھلنے ہی کی ہو دیر ساری کھل کے ٹکڑے ہیں
 فدا ہے گل پہ بلبل ہیں تم سے ہونٹوں پر مڑا ہوں

مزا دیتی ہے کیا کیا۔ روز کی یہ چارہ نہ رمانی

مرے زخموں کے پھل ہے دامنِ قاتل کے ٹکڑے ہیں
 آغا شاعرِ دہلوی

محفلِ ادب

اختلافاتِ السنہ

یہ تپہ لگنا بہت دشوار ہے کہ ابتدائے تمدن میں ایک ہی زبان بولی جاتی تھی یا کئی۔ جن اقوام کا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی ابوالبشر کی اولاد سے ہیں۔ خواہ وہ یہود و نصاریٰ و اہل اسلام کے خیال کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام ہوں یا مجوسیوں کے قول کے مطابق ”مہ آباد“ یا ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق ”سومیسو منو“۔ یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ابتدا میں ایک ہی زبان تھی جس سے دیگر السنہ مشتق ہوئی ہیں۔ لیکن وہ ابتدائی زبان کن سی تھی اور اس کی ہیئت کدائی کیا تھی؟ اس کے جواب میں قومیں مختلف الٹا رہیں۔ ہر قوم اپنے خیالی مورث اعلیٰ کی زبان کو تمام دیگر السنہ کا ماخذ قرار دیتی ہے۔ کوئی ”سریانی“ کو، کوئی ”آرامی“ کو، کوئی ”سنسکرت“ کو اور کوئی ”استادی“ زبان کو ام اللسنہ قرار دیتا ہے۔ ساسانی مجوسیوں کا قول ہے کہ ”مہ آباد“ نے جس کی زبان استادی تھی، اپنے شاگردوں کو مختلف زبانوں کی تعلیم دے کر مختلف ممالک میں بھیجا۔ اس طرح مختلف قطعاتِ ارض میں مختلف زبانیں بولی جانے لگیں۔ اگر یہ واقعہ سچ بھی ہو تو وہ اختلافِ زبان کی وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس سے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مختلف قطعاتِ ارض پہلے سے آباد تھے۔ اور ہر جگہ کی زبان الگ الگ تھی۔ اس لئے ہر ملک کے لوگوں کو انہیں کی زبان میں اصولِ مذہب کی تعلیم دینے کے لئے ”مہ آباد“ نے اپنے شاگردوں کو مختلف زبانیں سکھائیں۔ دورِ حاضر کے دانشورانِ فرنگ کا خیال ہے کہ انسان کسی فردِ واحد کی اولاد نہیں ہے، بلکہ اُس نے جسمِ حیوانی سے رقتہ رقتہ ترقی کر کے اور ارتقا کے بے شمار درج طے کرنے کے بعد، جائِ انسانی زیب تن کیا ہے۔ لہذا اُن کا خیال ہے کہ ابتدائے تمدن ہی میں دُور دراز ممالک کے وحشی انسان مختلف زبانیں بولتے ہوئے تھے۔ بہر حال اگر یہ مسئلہ غیر فیصلہ ہی چھوڑ دیا جائے کہ ابتداً انسان کی زبان ایک تھی یا متعدد، تو بھی یہ امر مسلم ہے کہ اُس وقت آج کل کی طرح لاکھوں زبانیں نہیں بولی جاتی تھیں۔

علمی لحاظ سے اختلافِ السنہ کی سبب بڑی وجہ متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جزائی خصائص کا اختلاف ہے۔ جب مادرِ وطن میں اُس کے تمام فرزندوں کے لئے کافی جگہ اور گنجائش باقی نہیں رہی تو فاضل آبادی دوسرے ملکوں

میں ہجرت کرنے لگی۔ مثلاً آریاؤں کا قدیم وطن وسط ایشیا تھا، لیکن عمران و آبادی کی کثرت نے انہیں وطن کو خیر باد کہہ کر دوسرے ملکوں میں جا بسنے پر مجبور کیا۔ ان کا اکثر و بیشتر حصہ مغرب کی جانب تلاش معاش میں چل کر تمام یورپ پر چھا گیا۔ کچھ لوگ جنوب کی طرف روانہ ہو کر ایران اور ہندوستان میں آئے۔ یہی حال دوسری نسلوں کا ہوا۔ الغرض مرکزی وطن سے ہجرت مختلف قطعات زمین کی آبادی کا باعث ہوئی۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح دور دور ملکوں کے درمیان رسل و ترسیل اور حمل و نقل کے ذرائع موجود نہ تھے۔ اس لئے ایک ہی نسل کے لوگوں کے جو مختلف بلاد میں جا بسے تھے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے۔ متفرق ممالک کی آب و ہوا اور دیگر جغرافیہ خصوصاً کے زیر اثر نہ صرف مختلف قوموں کے عادات و خصائل، میلانات و رجحانات، ضروریات و خصوصیات سم و رواج ہی ایک دوسرے سے متاثر ہو گئے بلکہ ان کے قد و قامت جسمانی ساخت، آلات گویائی کی بناوٹ، منہ، زبان، ناک، دانتوں، بھونٹوں اور صوتی نلیوں وغیرہ کی ہیئت اور ساخت میں بھی فرق پیدا ہوتا گیا۔ لہذا ان کے لب و لہجہ، آواز و اصوات، مخارج و تلفظ، طرز ادا، اسلوب بیان وغیرہ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔ مثلاً پہاڑی علاقوں کے لوگوں کی آوازیں، نشوونما، میدانی قطعات کے باشندوں کی آوازیں، مواری، سلامت اور روانی، مزی کے پہنے والوں کی زبان میں نرمی اور لہجہ معتدل آب و ہوا میں زندگی بسر کرنے والوں کی بولی میں شیرینی اور صلاوت پیدا ہو گئی۔ یہ قول و لہجہ کا تغیر ہوا، ایسی ہی تبدیلیاں مخارج اور تلفظ میں بھی رونما ہوئیں۔ مختلف مرزبوم کی آب و ہوا کے زیر اثر بعض قوموں کے آلات گویائی کی ساخت میں کچھ ایسا بھگ اکڑا کہ بعض آوازوں کے بولنے سے قاصر ہو گئے۔ مثلاً پ۔ چ۔ ژ۔ ڈ۔ گ وغیرہ کا تلفظ عربوں کے لئے نامکن ہے۔ اسی طرح انگریز، ع، غ، خ، ق وغیرہ کا تلفظ نہیں کر سکتے۔ بھ، پھ، تھ، دھ، کھ، اور ٹ، ڈ، گ وغیرہ خاص ہندی الفصل اصوات ہیں۔ جن کے ادا کرنے سے دنیا کی اکثر قومیں معذور ہیں۔ اس اختلاف تلفظ کی وجہ سے ایک ہی لفظ نے مختلف ممالک میں پہنچ کر مختلف شکل اختیار کر لیں، مثلاً ایران کی دختر ہندوستان میں اگر ”دوتہر“ اور انگلستان میں پہنچ کر ”ڈاٹر“ بن گئی۔ ”باپ“ کو لاطینی میں ”پاٹر“ فارسی میں ”پدر“ سنسکرت میں ”پتر“ اور انگریزی میں ”فادر“ کہتے ہیں۔ اسی طرح گائے کو فارسی میں ”گاؤ“ سنسکرت میں ”گاو“ اور انگریزی میں ”کاو“ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں یہ ایک ہی لفظ تھا۔ لیکن مختلف مرزبوم کی آب و ہوا نے تلفظ اور لب و لہجہ میں تفریق پیدا کر دی۔ پس ایک ہی لفظ کا تلفظ مختلف قوموں میں جا کر مختلف ہو گیا۔ علاوہ بریں ایک ہی ملک میں بھی کسی زبان کے الفاظ بمبرور زمانہ سمجھے اور شنستہ ہوتے اور تراش خراش پاتے رہتے ہیں۔ اس لئے زبان کی ہیئت بتدیج بدلتی رہتی ہے۔ الزبتھ کے عہد کی انگریزی اور موجودہ انگریزی یا سترہویں صدی کے اواخر کے پہنچنے اور ترقی کی بار دو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ زبان کے اختلاف کی ایک بڑی وجہ نئے الفاظ کی توضیح و تفسیر ہے۔

مادرِ وطن میں جگہ کی قلت اور ذریعہ معاش کی تنگی کے باعث ایک نسل کے لوگ ابتدائے تمدن ہی میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ چونکہ اُس وقت اُن کی ضروریات نہایت سادہ اور معلومات محدود تھیں، اس لئے اُن کے الفاظ کا ذخیرہ بھی نہایت قلیل تھا۔ لیکن جوں جوں تمدن بڑھتا گیا اور ضروریات اور احتیاجات میں اضافہ اور معلومات و خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی، مختلف ملکوں میں اشیاء کے لئے نئے نئے نام اور دائرے طلب کے لئے نئے نئے اسالیب بیان گھڑے گئے۔ چونکہ اُس وقت سلسلہ مواصلت و نامہ و پیام منقطع تھا اس لئے ہر جگہ کی بولی اور اسلوب بیان جداگانہ ہوتا گیا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک ملک کی بعض بنائی، حیوانی اور جمادی پیداواریں دوسرے ملک کی پیداواروں سے متماثل ہوتی ہیں۔ اس لئے کسی ملک کی مخصوص چیزوں کے لئے جو نام وہاں مقرر ہوئے وہ دوسرے ملک کی زبان میں ناپ تھے جس طرح مختلف ممالک کے باشندے وہاں کی آب و ہوا اور ملکی خصوصیات کے زیر اثر بر لحاظِ قد و قامت، خط و خال، جسمانی ساخت، صورتِ شکل، ایک دوسرے سے نہیں ملتے، اُسی طرح مختلف قوموں کے خیالات و افکار مذاق اور پسند بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ قوم نے اپنے افکار و اراکے اظہار کے لئے اپنے مذاق کے مطابق ایک علیحدہ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان اختیار کیا۔ بہر کیف مذکورہ بالا تمام وجوہات کی بنا پر ہزاروں زبانیں معرضِ وجود میں آئیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ دورِ حاضر میں حمل و نقل کی سہولت اور تجارت کی ترقی کے باعث مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور تبادلہ خیالات کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ آپس میں کاروبار چلانے اور لین دین جاری رکھنے کے لئے ایسے وسائل کی ضرورت پڑتی ہے جنہیں سب سمجھ سکیں۔ لہذا مختلف زبانوں کے باہمی تضاد و ممانعت پر اثر و تاثر کا عمل شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اول اول بعض کاروباری اور بول چال کی زبان ہوتی ہے لیکن تدریجاً مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور اُس کا دامن علمی و ادبی جوہر ریزوں سے بھرے لگتا ہے۔ آخرش اُس کا بھی شمار دنیا کی اہم علمی زبانوں میں ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اردو اسی قسم کی ایک زبان ہے جو مختلف السنہ کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوئی ہے واضح ہے کہ یہی زبانوں کے اختلافات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ آئے دن نئی زبانیں ظور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ الغرض تمدن کی ترقی، عمران اور آبادی کی فراوانی، معاملات و معاشرت کی پیچیدگی کے باعث ریلج مسکوں کا ہر حصہ آباد ہو گیا ہے۔ بہرہ مند اور زمانہ صرف زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان پیش تنگی اور نگار نگاری بھی پیدا ہوتی گئی۔ ”اردو“

ایک ہندی غزل

جس کو اکیلے میں آ کر دھیان تیرا رہ کے شائے
چپکے بیٹھا روئے، آنسو پونچھے اور رہ جائے
مگھم بات پہلی ایسی بس ہی بوجھے جس کو بھائے
بھیند نہ پاتے تو گھبرائے، پھیر جو پاتے تو گھبرائے

مجھ ساتیں بنانے والا اس کے ہنسنے روکے والے
 ۱ ساری کمانی بے چینی کی، اتھے پر لکھ دیتی ہے
 ۱ اس کے منہ کو سمجھنے کو نہ پوچھو اس بھی جس ہر اس بھی
 چپے چپے کی چابت کیونکر جب اس میں یہ کھڑکا
 ایک نہ سننے والے سے کتنا پتھر سے بھرا نا ہے
 چھپر کے پوچھو، پوچھ کے سمجھو، سن کے نہ ایسی بات ڈ
 ہائے کی چوٹ نہ سننے والا کھوٹ بھی کہتے درز تبا
 آرزو ایسے یوں بہتیرے، ہنس مکھ پتھر کوئی نہیں

جب وہ بلائیں، اسے کیا کہئے، جائے تو نہ بھٹکارہ جائے
 ایسی بات کہ گھٹنے گھٹنے منہ تک آئے اور وہ جائے
 منہ سے نکالے تو پھپھٹائے جی میں رکھے تو پھپھٹائے
 اپنی ہتی ایک کے اور جگ ہتی کا بھر م کھل جائے
 بات بھی وہ جو ڈرتے ڈرتے ہوئے ادھوری تنہا کٹے
 آس لگا کر کہنے والا اپنا سامنے لے کر رہ جائے
 جیسے بے بس سانپ چوٹیل پلٹے کھا کھا کر رہ جائے
 چین سمجھ لے بے چینی کو، ہائے کرے اور منتہا جائے
 ”نیرنگ خیال“

مصوری اور اسلام

دنیا کی تمام قوموں کے تشکیلی فنون کی ابتدا جبریت سے ہوئی ہے اور ان کا نشو و نما ان کے مذاہب کے ساتھ
 بالکل نہیں تو ایک ہی حد تک ابتر رہا ہے شوقِ مجوسے مجبور ہو کر انسان نے مختلف آب و ہوا میں مختلف تخیلات کے مطابق مختلف
 قسم کی ایسی تشکیلی اختراع کیں جن کو وہ پیکر ایزدی کا موقع سمجھ کر ان کے سامنے سر نہایت خرم کرے اور اپنے بنانے والے اور اس کے قوانین و
 مظاہر کی طرف رجوعِ ہیبت اور محبت کے جذبات اس کے سینے میں متعلیٰ ہوتے ہیں ان کا انداز اپنی بندگی کے اعتراف ہو کر ہے۔ وحشی اقوام
 کے فنی کا بنانے اس خیال کے اسی طرح حال میں جس طرح کہ پرانے تمدنوں کے قدیم آثار رہا ہے پاس مصر چین۔ ہندوستان۔ یونان کی
 مثالیں ایک طرف اور افریقہ کی وحشی اقوام کے تراشے ہوئے بت دوسری طرف اس قول کی تائید کے لئے موجود ہیں۔ انسانی
 تخیل نے ذاتِ ایزدی کو ہندوستان میں اگر چہاردست شیو یا تری مورتی کی صورت میں پیش کیا تو یونان میں انسانی جن کے انتہائی
 امکانات کی صورت میں جس کی مثالیں اپالو، زہرو اور بے شمار دوسرے مجسمے ہیں۔ آج دیکھنے اور غور کرنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان
 مجسموں میں جس درجہ بے تابی اور جیس سائی میں جس درجہ انہماک ایک فن میں پایا جاتا تھا اسی درجہ اس کی اختراع کردہ اشکال واقعی نظر
 ہوتی تھیں ذاتِ خداوندی کی، اس کے جلال، اس کی رحمت اس کی عظمت کی انسان کی صورت میں اوتار ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں
 لیکن ان پتھروں کی صورت میں اوتار ضرور ہو جاتے تھے اور سجدل کا جو ملامت ہندوستان کی پیشانی میں مضمر تھا وہ نہ یونان کو نصیب تھا نہ مصر کو
 اور یہی وجہ ہے کہ جس پائے کی تشکیلی ہندوستان نے تراشی ہیں کسی دوسرے ملک سے ممکن نہ ہوئیں اور تخیل کی جو جرات اس میں پیدا
 کہیں اور پیدا نہیں لیکن شوقِ سجدہ سے جو تخلیق صورتِ ابتر اس کی علت و رہنما انسان کے مذہبی دلوں سے ہوتے ہیں اور ان میں

ذہنی عنصر کی رہبری سے حصولِ حق اور رجالِ آفرینی کا دانشہ دخلِ معدوم یا کالعدم ہوتا ہے۔ ان کا مسلک حسنِ آفرینی نہ تھا اور وہ حسن کے لذتِ حسن کی خاطر متلاشی تھے۔ اس کے معنی یہ سرگزشتیں کہ ہم کو ان کے کارناموں میں اکثر انتہائی حق کے نمونے نہیں ملتے بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ دانشہ اس عنصر کے متلاشی تھے برخلاف ان اقوام کے جب ہم مسلمانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الہ کے متولے اپنی اہمیت کی توحید میں تباہ آذر سے دستِ دگریاں ہوئے اور یہ نہ سمجھے کہ ”نا تو بت، نہیں تو پتھر“ یا نہ ملنے تو پتھر نہیں تو بت۔ اسلام میں مباح یعنی بحکمِ قرآن یا بحکمِ حدیث تصویر کشی یا شکل تراشی ممنوع ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ولولہ توحید کا اقتضاء شروع شروع لازمی طور پر یہ تھا کہ انسان اپنی شبیہ بنانے سے کنارہ کش رہے۔ چنانچہ ان کی حسنِ آفرینی کی امنگ جو فطرتِ انسانی کا ایک لازمی عنصر ہے، ایک عرصہ تک فنِ نقاشی، خوشنویسی، خطاطی اور اسی قسم کی دوسری صنعتوں میں ظہور پذیر ہوئی جن میں وہ دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، فلمی کتابوں کے بے شمار نمونے فارس و ترک کی قالینوں کے ڈزائن مثال کے طور پر اس قول کے شاہد ہیں مزید برآں یہی وجہ ہے کہ جو کامیابی فنِ تعمیر میں مسلمانوں نے حاصل کی وہ شاید کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوئی کیونکہ بڑے پیمانے پر چل کر ان کی حسنِ آفرینی کی امنگ کا بھی ایک جولا بگاہ تھا۔ مابہ الامتیار مسلمانوں کی مصوری اور دوسری اقوام کی مصوری میں یہ رہا کہ مسلمان پہلی وہ قوم تھے جس نے جمالیات کو آرٹ میں معیارِ اول اور معیارِ آخر قرار دیا اور نہایت دانشہ اور پورے احساس کے ساتھ حسنِ آفرینی میں سرگرداں ہوئے تصویر میں اپنی چمک نہ بھانا ممکن تھی اس لئے انہوں نے حسن پرستی اپنا مسلک بنالیا۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے فنی نقاد و نظریں سے خالص جمالیاتی نقطہ نظر کے بانی ہیں یہی ان کا تغہ امتیاز ہے اور یہی فن کی رو سے ان کے وجود کا کفارہ ہو لیکن اس کل کی بات کو خود ہندوستان کے اکثر تنگ نظر نقاد زبان پر لائے گزر کر کرتے ہیں اور آج وہ دنیا کے لئے ایک بھولا ہوا خواب ہیں اور اس سے زیادہ نہیں +

”جامعہ“

جاؤ میدانِ زندگی میں سرگرم عمل ہو جاؤ

اے میرے بڑا بڑا امیر باپ کے تحت جگر ہو۔ اس کی آنکھوں کا نور اور سرور ہو، عیش کرو خوشی کی زندگی بسر کرو مٹھا باپ کا دل مردہ ہو چکا ہے۔ سفید بالوں کی سپیدی نے اس کے جذبات کی گنگھوہر گٹھا کو روشن کر دیا ہے۔ آہ! یہ دل جو کبھی عیش و عشرت کی جولا بگاہ تھا آج اس میں خاک اڑ رہی ہے، تم مجھے نہ چھیڑو۔ میرا خون سرد ہو چکا ہے اور تمہارا خون گرم ہے، جاؤ تم زندگی کی سردی میں اپنے خون کی گرمی کو آزاؤ۔ یہ تمہارا وقت ہے۔ میں تمہیں نہیں روکتا جاؤ میدانِ زندگی میں سرگرم عمل ہو جاؤ۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں اسی میں خوش ہوں۔ وہ وقت اب خوابِ خیال ہو گیا جب ہم غم میں بس کر نکلا کرتے تھے۔ لوگوں کی اٹھلیاں ہماری طرف اٹھا کرتی تھیں دزدیدہ بچا ہوں سے کسی کا دیکھنا اور دیکھ دیکھ

کر مسکرا ناول میں ایک قیامت برپا کر دیتا تھا۔ اب مجھے پھولوں سے نفرت تھی، خوشبو سے نفرت ہے۔ دوستوں کی محفل سے نفرت ہے۔ بلکہ مجھے خود اپنے سے بھی نفرت ہے۔

اب میں اپنے باقی دن سادگی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ جاؤ۔ جاؤ۔ مجھے نہ متاؤ۔

”ادبی دنیا“

باجا

پڑوس میں کسی بچے نے باجا بجایا۔

بچے نے اپنی ماں سے کہا۔ ”ماں! مجھے بھی ویسا ہی ایک باجا دے“

غریب ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے اپنے دل کے ٹکڑے کو چھاتی سے لگا کر کہا۔ ”گیت نہ سنو گے بیٹا؟“
بچے نے کہہ نہ ماں! مجھے بھی ویسا ہی ایک باجا لائے۔ میں بجائوں تب تو گا۔“

ماں نے کہا۔ ”وہ تو امیروں کا باجا ہے“

بچے نے ”داؤں“ ”اول“ ”کر کے“ کہا۔ ”نہ ماں! مجھے تو وہی باجا دے میں ”ٹھاکل“ جی کے ”منڈل“ میں بجائوں گا۔“
وہ زمین پر لوٹ کر رونے لگا۔ غریبی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ایک ایک بچہ جیسے سوتے سے چونک کر بول اٹھا۔ ”ماں! ماں! ”میلا“ باجا دیکھے گی؟“
وہ دوڑ کر سامنے سے ایک اسم کی گٹھلی اٹھا لایا۔ پتھر پر گھسنے کے بعد پھونکتے ہی اُس کی روح بیدار ہو گئی دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی اور ساری فضا گونج اٹھی۔

”اب گاؤں ماں! میرے اس باجے پر گاؤ“ یہ کتنا ہوا بچہ اور زور سے گٹھلی میں اپنی جان ڈالنے لگا۔
ماتا کی ماری ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلکنے لگے۔ وہ محبت آمیز نظروں سے اپنے بچے کو دیکھتی رہی ماس کے دل میں نہ جانے کتنے گہنوں کے بھاؤ رس برسا ہے تمہے لیکن اس باجے سے وہ اپنی آواز کیلے ملائے!
مہارتھی

دوست

دوست! ہماری روح کا آئینہ ہے۔ وہ ہماری آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ہے۔ بچا دوست خدا کی نعمت ہے۔

جس کو ایک بچہ دوست مل گیا اُس کے سامنے تمام دنیا کی نعمتیں کچھ بھی نہیں۔

بحر حیات کے تھپیڑے کھائی ہوئی روح دوستی کی آغوش میں لیٹ کر جنت کی خوشی حاصل کرتی ہے۔ باپ کے دروازے سے دھڑکتا ہے جو بچے کو امتا کی ماری ماں کی گود جتنی پیاری لگتی ہے، جیٹھ کی دوپہر میں سفر کرنے والے مسافر کو درخت کا سایہ جتنا ظرا دت بخش ہوتا ہے اتنی ہاں اتنی ہی راحت دوست کی دوستی میں ملتی ہے۔

دوست مال ہے۔ دوست باپ ہے۔ دوست بھائی ہے۔ دوست بہن ہے۔ دوست استاد ہے۔ دوست کارٹھ مالگیر ہے لیکن دیکھو دوست دوست میں فرق ہے۔ اس سے بھی زیادہ فرق ہے جتنا دوست اور دشمن میں ہو سکتا ہے۔ بچہ دوست خدا ہے تو جھوٹا دوست شیطان ہے۔

میدان جنگ میں تلوار کا زخم کھانا ایک بات ہے لیکن بستر میں سے سوئی یا کانٹے کا چبھنا بالکل دوسری بات ہے۔ دوست کی چوٹ دشمن کی چوٹ سے زیادہ تکلیف دہوتی ہے۔ آہ مت پوچھو اُس شخص کی بد قسمتی کو جس نے کسی جھوٹے دوست سے دوستی کی۔

دوست کی چوٹ میں بھی ایک قسم کی لذت ہے۔ جان لے دوست کی چوٹ کھا کر بھی اگر تُو نہ سنبھل سکا تو اُلے! تیرا دوست کھانا فضول ہے۔

سنگرت

دیک

اے دیکتے ہونے دیکو تم کس کو تلاش کرتے ہو۔ تم ضرور آنکھیں ہو۔ رات ات بھر جاگ کے صبح کر دینے والے کسی وقت زندہ کی۔ یا کسی مجبور الم، ناکام تمنا عاشق کی!

میں نے باغ میں جا کر دیکھا کہ پھول اپنی خوشبو سے کسی کا خیر مقدم کر رہا ہو۔ درختوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی کوئل پیچم میں کسی کو پکار رہی ہے اور اب میں دیکھتا ہوں کہ اس گھر کے اندھیرے کونے میں دیک کسی کو تلاش کر رہا ہے۔

دیک نے جو کچھ کیا وہ صرف تیاگ (دفا) کے لئے جل کر دنیا کو روشن کرنے کے لئے!

دیک تیاگ کی مورتی ہے۔ یہ بہت سے پتنگے اُس کے پاس درس فنا پڑھ رہے ہیں۔

اے محبت کے دیوانے دنیا میں تو ہی اکیلا تکلیف میں نہیں ہو دیکھ دل میں محبت کی آگ روشن کرنے کی وجہ سے مٹی کے

دیک کو بھی جلنا پڑتا ہے۔

اے دل اگر تو یوں ہی رہ رہ کر کھجے گا تو پھر کسی کو کس طرح پائے گا۔ سنیسی رعاش کے بچے میں جو مزہ ہے وہ اس جلنے

والے دیک کے پوچھ۔

پتھر محسن ہے یا پتھر کا گیت؟ یہ مٹی کا ہے زبان دیک بھی کسی دل گذار شاعری کر رہا ہے! ہندی

تبصرہ

خلمکہ سرور منشی درگاسہائے صاحب سرور جہاں بادی کا مجموعہ کلام ہے جسے قاضی محمد غوث صاحب فصیحہ آبادی نے ترتیب دے کر شائقین سرور پر خصوصاً اور دوسرے ذوق رکھنے والوں پر عموماً بڑا احسان کیا ہے۔ یہ مجموعہ سرور کے تقریباً جملہ مضامین نظم اور ایک مضمون شریعتی ہے جو صنفی، کاغذ اچھا اور لکھائی چھپائی معمولی ہو۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے مقرر کی گئی ہے۔

سادگی، روانی، خلوص، درو اور جوش سرور کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ دورِ گزشتہ کی جھوٹی شاعری سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہاں کہ ہر خیال اصیلت اور احساس پر مبنی ہے۔ اُن کے کلام میں انتخاب مضامین کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ نو حید و فلسفہ، وطنیت، قومیت، جذبات، اخلاقیات، مظاہر قدرت، فطرت، غرض کون سا موضوع ہے جس پر انہوں نے نہیں لکھا۔ اگر لنگا اور جہاں جیسی عظیم الشان شہر اُن کی آنکھوں میں بسی ہوئی ہیں تو ”بیچھوٹی“ جیسی حقیر اور نظر انداز ہو جانے والی مخلوق کو بھی نہیں ٹھوٹے۔ اگر وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہیں تو بیچ اور بلال کے کھیل سے بھی غافل نہیں ہیں۔

انہوں نے ایک طویل نظم ”جناحی“ کے عنوان سے لکھی ہے۔ ذرا اس کے پہلے ہی دو شعروں کی دل کشی اور روانی ملاحظہ ہو۔

دھیمی دھیمی بننے والی ایک نہر دل نشیں آج چھوٹی سی اک نازک خام و نازیں
تشنگی شوق لنگاہیں بھجانے کے لئے جا رہی ہے اپنی مستی کو مٹانے کے لئے

اُن کے اشعار میں ہندی اور ایرانی دونوں رنگ جھلکتے ہیں۔ یہ امتزاج صرف الفاظ و تراکیب تک محدود نہیں بلکہ اس حد سے گزر کر اساسات اور مناظر تک پہنچتا ہے اور بعض مقامات پر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اسی نظم میں

یہ وہ جہاں ہے کہ راہ دھاسی جیس نے تڑوں برج کی اک پاک امن نازیں نے مدتوں
بنی لئے کی جہاں میں اڑا کر سر پر خاک اپنے اشکوں سے کیا ہو دہنِ ماحل کو پاک
یہ وہ جہاں جہاں اک بانو پر دل نشیں اگرہ میں مجھ آسائش ہے جو زیریں
رخ سے آہستہ اُلٹ کر چادر آ رہی اں دیکھتی تھی مسکرا کر نظر آبِ رواں

حسن کے داخلی اور معنوی پہلو کی بجائے اس کے خارجی اور مادی پہلو پر اُن کی نظر بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی شاعری کے انداز میں اُن کا کلام بھی زلف و رخ اور نقاب اور آئینہ کے ذکر سے پُر ہے۔ مثال کے طور پر ”عروسِ بزمِ گال“ سے چند شعر بیان کر دیتے ہیں۔

اودی اودی اب گھٹاؤں کا وہ آئینہ ہے کہاں ہلکی پھلکی اب کہاں ہے وہ نقابِ شبنمیں
آسمان پر اب کہاں وہ لکڑی ابرسیاہ دوشِ نازک پر کہاں اب آہ زلفِ عنبریں
اب کہاں آنکھوں میں ڈیرے وہ شوق کے سرخ سرخ اب وہ مستانِ بگھاہیں ہیں چشمِ سرگمیں
ہلکی ہلکی آہ وہ شاہان کی جھڑپاں اب کہاں ابھرے سینے پر پسینے کے وہ چھینٹے اب نہیں

نیگلوں اکھوں میں سرمے کے وہ ڈورے اب کہاں سرنگوں اودی گھٹا سے اب کہاں چرخ بریں
سرور کے اُن شعروں میں جو مشہور و مقبول ہیں ضرور کوئی سحر ہے جو ہر خاص عام کے دل کو یکساں طور پر پوہ لیتا ہے۔ کون
شخص ہے جس نے اُن کے اِن اشعار کو کئی کئی بار نہیں پڑھا — یاکم از کم نہیں سنا!

نہ وہ کیتکی کی پھمن رہی نہ وہ موتیہ کی ادا رہی نہ وہ نسترن نہ بسن ابھی نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی
نہ گلوں کے اب ہیں وہ نقشے نہ وہ بلبلوں کے ہیں چھپے نہ غزل سراوہ کوئی ہے نہ وہ قمریوں کی صدا رہی
کسی مستیغ اب کا ہے عبث انتظار بوجا کد گزر گئی شب آدمی دل بے قرار بوجا
یہ نیم ٹھنڈی ٹھنڈی بیہوا کے سر جھونکے تجھے دے رہے ہیں لوری میں غمگاہ بوجا

غرض سرور کا کلام واقعی ایک محکمہ ہے جو پڑھنے والے پر ایک کیف سرور کی سی حالت طاری کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود جیسا کہ
حضرت جوش ملیح آبادی نے تنقید میں لکھا اس میں اکثر و بیشتر خامیاں موجود ہیں۔ مگر ان کی اس رائے سے بھی ہمیں اتفاق ہے کہ سرور کے
سے شاعر کم پیدا ہو کر رہے ہیں۔ لئے کا پتہ یہ ہر قاضی محمد غوث صاحب فقہ، آڈیٹر انجمنائے اتحادی، سنگاپور کی ضلع میڈک (علاقہ جدید آباد کن)
فرست الید مصنفہ اشفاق احمد صاحبہ ادبی۔ اس کتاب میں ہاتھ کے خطوط کے ذریعہ سے انسان کی سیرت اور زندگی
کے گزشتہ موجودہ اور آئندہ حالات دریافت کرنے کے طریقے لکھے ہیں۔ فرست الید ایک قدیم علم ہے جس کی ابتدا حضرت مسیح سے تین
ہزار برس پہلے ملکہ چین میں ہوئی۔ جناب مصنف نے پہلے اسی صفحات میں چند دلائل اور مبسوط مضامین میں قوانین فطرت، تشریع الابدان
اور نفسیات کی رُو سے ثابت کیا ہے کہ گویہ علم قیافہ ہی سے تعلق رکھتا ہے لیکن پھر بھی اس سے بڑی حد تک معرفت نفس حاصل ہوتی ہے
اور اُن لوگوں کی سیرت معلوم ہوتی ہے جن سے انسان کو اپنی زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔ اس سے آگے خاص فنی ابواب شروع ہوتے ہیں
جنہیں ایسے آسان اور سہل پر لے کر لکھا گیا ہے کہ محض ایک دفعہ پڑھ جانے سے ہر شخص بلا تکلف آتھ دیکھنے لگتا ہے۔ مزید آسانی
پیدا کرنے کے لئے جابجا نقشے بھی دیئے ہیں حجم ساٹھ تین موصفات کے قریب ہے اور کتاب مجلد ہے قیمت درج نہیں کی گئی
پتہ، اشفاق احمد صاحب زبیدی، کوچہ پنڈت، دہلی

گلدستہ کشیدہ کاری، رسالہ "ہمالیوں" کی تقطیع پر چالیس صفحات کا مترع ہے جس میں کئی قسم کے پھولوں پتوں اور ہلالوں کے نقشے
دیئے گئے ہیں۔ تمام نقشے نہایت خوبصورت اور صاف ہیں۔ جو ہمیں کشیدہ کاری کا شوق رکھتی ہیں انہیں یہ کتاب ضرور منگانی چاہیے۔
قیمت درج نہیں ہے۔ مینجوری کشیدہ ڈپوشنل سے منگائیے۔

سالنامہ نیرنگ خیال اس دفعہ تقریباً دو سو صفحات پر مضمین اور دو درجن چھوٹی بڑی سرنگ ایک رنگ تصاویر
مشتمل ہے۔ بعض چیزیں اس میں بہت اچھی ہیں مثلاً مرزا فرحت الدبیگ صاحب ہومی کا مضمون "پرانی اور نئی تہذیب کی محک"
نورانی محمد صاحبان کا ڈراما "ہمد خانہ آفتاب" اور جناب حنیف ہاشمی کا مضمون "مضامین کس طرح لکھے جاتے ہیں" حضرت جوش ملیح آبادی کی
نظم "فرشتے کی سیر" اور حضرت رزو مکھنوی کی ایک ہندی غزل قابلِ تکریم۔ ہم کارپردازان نیرنگ خیال کو ایک اچھا پرچہ مرتب کرنے پر مبارکباد
دیتے ہیں۔ اس پرچے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہو۔ مینجوری نیرنگ خیال، بارود خانہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

تصاویر

ہندی خاتون کی تصویر میاں سر محمد شفیع صاحب بالقاب کے گول مکے کی زینت ہے یہ تصویر بمبئی کی ایک نوجوان خاتون میں منجولابھنڈا کر کے سو کا رتو فلم کا ایک لاویز نقش ہے جسے انہوں نے بمبئی کی ایک نمائش میں پیش کیا۔ ہم اپنے مختصر میاں صاحب کی اس نوازش کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ تصویر ہمیں ہمایوں میں شائع کرنے کے لئے مرحمت فرمائی۔

میاں عبدالعزیز حضرت اعجاز دہلوی کا قول ہے کہ اگر ہایوں صف کا کسی غرض سے ظہور میں آتا کہ فلک پیائے کے مضمون بنیا کے سامنے پیش کرے تو اس کی ہی اک ادبی خدمت اس کی ہستی کی اہمیت کو کافی تھی۔ آج ہایوں کو اس بات کا غور حاصل ہے کہ وہ اپنے اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہے کہ اس کا فلک پیائے ہم ہایوں میں جو عموماً زمین پر مضقہ ہوتی ہے عبدالعزیز بن کر نفس نفس موجود ہے۔ میاں صاحب نے اپنے لئے ڈیجیٹل شہر بہتر بندوبست۔ ممبر علیحدہ و غیر سب کچھ ہوں اور ہر ہم ہایوں میں فلک پیائے کا شکار ہو چکی پر تازہ سن، وغیرہ بنتے رہیں لیکن حق تہ ہے کہ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اسے وہ سب میں ہر دلعزیز نہیں بلکہ حقیقت میں ہوں عربیوں اور سن متعین مگر شہر کی تصویریں کتاب چائیلڈ ان آسٹینڈیٹ بننے کی گئی ہیں۔ پہلی تصویر مشانت اور فرامست کا مجسمہ ہے اور اس کی پشتی سے ذہنی امارت اسی طرح جھلک رہی ہے جس طرح غریبوں کے بچوں کے چہروں سے عسرت نمایاں ہو کر تھی ہے۔ دوسرا بچہ مسرت کا فواد معلوم ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی اور خوشی ہم معنی الفاظ ہیں۔ اسے کوئی غم نہیں ہے۔

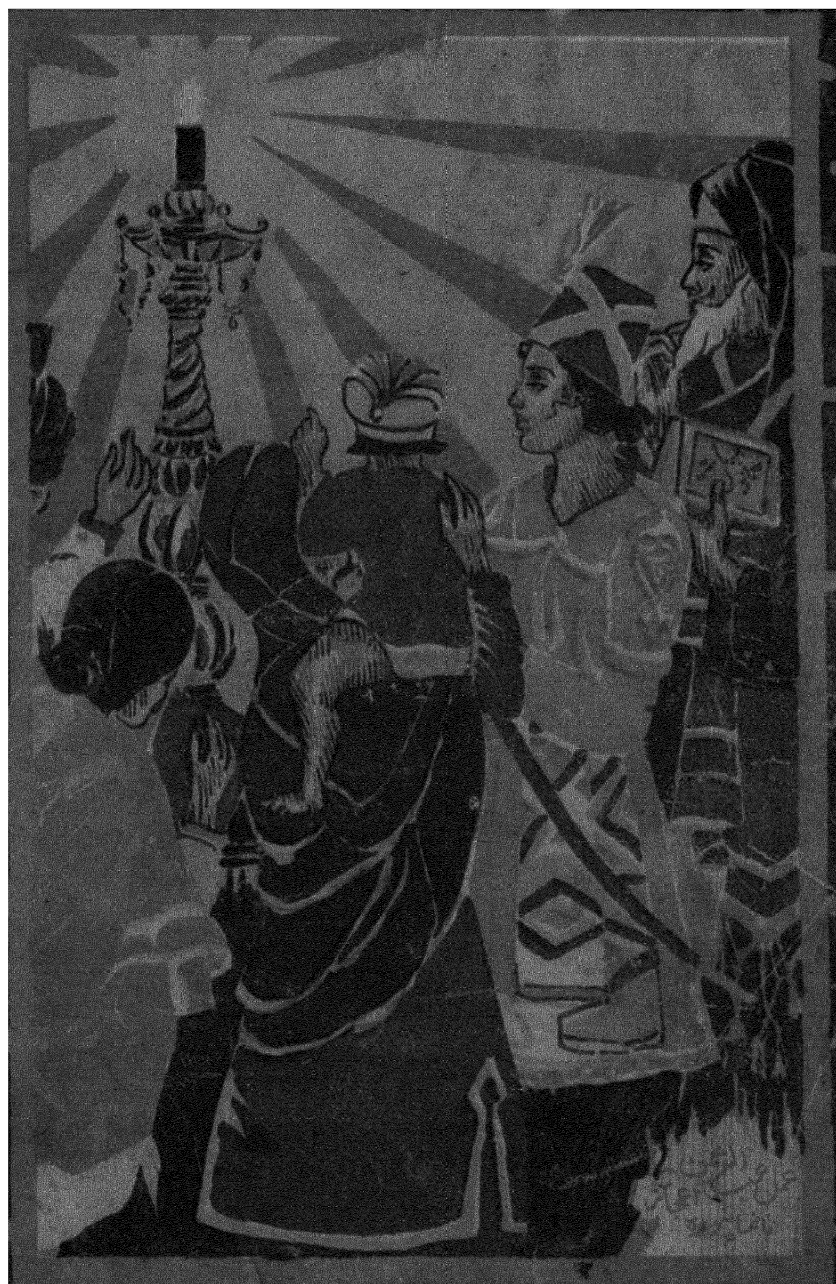
سمندر کی چڑیاں نگارہ کرنے والی آنکھ کے لئے سمندر کے ان پرندوں کی اڑان ایک ختم مچنے والا سورج ہے۔ مصور مرثا آفرین گزشتہ نے یہاں انہیں ایک کشتی کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دکھایا ہے۔ پرندوں کی وضعوں اور حالتوں میں ایک غیر معمولی متنوع ہے لیکن کسی وضع اور کسی حالت میں بھی مصور کے ہاتھ سے لطافت کا دامن نہیں چھوٹا۔

وہ جس نے ڈال رکھا ہے زمانے کو تحیر میں۔ یہ تصویر سی ایم کیو آچر ڈس کی بنائی ہوئی ہے جو انہوں نے رائل اکاڈمی کی ایک سوچا بیسویں نمائش میں پیش کی۔ یہ مصور کے فن کا کمال ہے کہ اس نے حیر کی ایک کمال نمنا پیدا کرنے کے لئے سامنے آئینہ رکھ کر اپنے موضوع کے دھندل رخ دکھائے۔

عالم خیال میں۔ سیونج کوپر کی مصوری کا ایک شرافت منہ ہے۔ یہ تصویر رائل اکاڈمی کی ایک سو اٹھائیسویں نمائش میں پیش کی گئی تھی۔ ہمارے ذرا وانی اور نقوش کی جوں کا زبرد ہم قابل دید ہے۔

قبر کا بھید غریب کے راز کی حفاظت کر رہا ہے۔ ریج بلکیم برگ (پیرس) کے عجائب خانے میں رکھا ہوا سفر فاس کے دیو کا نقش ہے جس میں ہر صفائی مقبرہ زبیرہ کی تصویر کے لئے ہم یہاں محمد اکبر صاحب کے ممنون ہیں، جو ایک عرصے تک لہور اور بغداد میں اقامت پذیر رہے ہیں یہ علامت اسلامی فن تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

مسورق۔ یہاں عبدالرحمن صاحب اعجاز ناندوی کی محنت کاوش کا نتیجہ ہے۔ ہم ان کے فلک لند میں کہ انہوں نے تھیکہ خلیل معین میں اس قدر اچھا نقشہ بنا کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی سہول اور بہرہ وصال اور ایک ایسی خوبصورت جو کسی متاع کی ایک بڑی خوبی سمجھی جاسکتی ہے +



جبریل ذہبی ۱۳۶۳

اٹھو! ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیابانِ عِلْمِ اَفْصَحِ زَیْبِ حَبِیْطِ مِیَانِ شَہَادَتِ حَمَیْوُنِ

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد بی، اے (آکسن) بیہرٹریٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر۔ منصور احمد

فہرست مضامین

بابت ماہ فروری ۱۹۳۰ء

تصویر: سرا کی پری

مشہور مصور جان میک ورٹر کی یہ تصویر ۱۸۹۸ء میں رائل اکیڈمی کی ایکسپوزیشن میں پیش کی گئی

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	چند باتیں	ج	۱۸۲
۲	بہار اور آندھی (نظم)	بشیر احمد	۱۸۳
۳	جہاں نما		۱۸۴
۴	سرا کی پری (نظم)	منصور احمد	۱۸۶
	تصویر: سرا کی پری		
۵	بھو اچھوتی	جناب محی لوی محمد حسین صاحب ادیب ایم اے، بی ای ڈی	۱۸۸
۶	بیزار محبت (نظم)	حضرت آزاد انصاری مدظلہ العالی	۲۰۸
۷	صاحب بہادر	جناب مرزا فرحت الدیگ صاحب دہلوی	۲۱۰
۸	غزل	جناب پروفیسر رگھوپت سہائے صاحب فرق بی اے	۲۲۰
۹	پجاری سے	”پاپی“	۲۲۱
۱۰	دنیا نے اسلام اور آزادی نسواں	جناب پروفیسر غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم اے	۲۲۲
۱۱	سرور عشق (نظم)	جناب خجہ عبدالسمیع صاحب پال انصاری ایم اے کیل سیکلوٹ	۲۲۷
۱۲	الماس (افسانہ)	جناب خادم حسین خاں صاحب بٹالوی	۲۲۸
۱۳	حسن خوابیدہ (نظم)	جناب سید علی حسنین صاحب زبیر اردو لوی	۲۳۶
۱۴	محبت کا انجام (ڈراما)	جناب سید معین الحق صاحب حق	۲۳۷
۱۵	مختل ادب		۲۴۸
۱۶	نئی کتابیں		۲۵۲

چند باتیں

جی چاہتا ہے کہ آپ کے جو آج ہمایوں کو پڑھ رہے ہیں چند باتیں کروں اور آپ سے یا کسی اور سے جو بھی ہمایوں کو پڑھا کر کے کبھی نہ کبھی چند باتیں کیا کروں! خشک و عطر سے، نرمے مضمونوں سے، جی گھبرا جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی باتیں بھی کیا کروں۔ ہمیشہ یہی محسوس نہ کروں کہ کسی علمی مجلس میں، قابل نکتہ چینیوں کے سامنے کھڑا نظر بریا تخریر میں، اُن کے اور اپنے علم و فضل کی داد دے رہا ہوں۔ فضائیں قابلیت کا سماں ہے، ہوا میں علمیت کی بو ہے، لیکن عام انسانیت و مہاکے کو نے میں بیٹھی ہے یا چپکے سے اپنے گھر کو چل دی ہے۔ انجمن آرائیاں تو آج کل ہوتی ہی رہتی ہیں خواہ ہم انہیں چاہیں نہ چاہیں لیکن اس سے یہ بھی نہ ہو جائے کہ دوستوں میں مل بیٹھنے، دل سے دل کی باتیں ہونے کا دستور ہی اٹھ جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ہمایوں کی شان و شوکت سے بھی کچھ الگ ہی الگ ہیں آپ سے جو آج ہمایوں کو پڑھ رہے ہیں چند باتیں کروں، گو یا آپ یہیں آ گئے یا میں بے تکلفی سے آپ کے ہاں چلا گیا!

کل جب میں "المنظر" سے نکل کر، سامنے کے اس جنت رنگ بونے کے سبزہ زاروں میں سے گزرتا ہوا پرکے اُن سرکاری ہنگاموں کو پیچھے چھوڑ کر نہ کنا سے جا پہنچا تو اُور مسیوں نہ جانے بونے تو مجھے خیالوں کے جھرمٹ میں، ایک اس خیال نے بھی پہلی بار سر نہ کالاکہ اپنے ہمایوں کے پڑھنے والے سے کبھی نہ کبھی چند باتیں کیوں نہ کیا کروں؟ کیوں نہ اُسے بھی اپنے دوستوں کے حلقے میں شامل کر لوں؟ کیوں نہ زندگی کے نالاب میں روزمرہ کی باتوں کا ننھا سا سنگریزہ پھینک کر اس حلقے کے دائرے کو زیادہ ہی زیادہ وسیع کرتا جاؤں؟ کتنے دنوں تک یوں جا پہنچوں! وحدت کو کثرت میں کھو دوں کہ وحدت شاید کچھ سمجھ میں آجائے! اب آج صبح نیند سے جاگا، مشرق کی روشنی دھیرے دھیرے آئی، روح میں کسی وجود نے حرکت کی، کسی اُن دیکھنے نے کان میں کچھ کہا، میں اُٹھ بیٹھا، منہ ہاتھ دھویا، ہاتھ پاؤں اٹھائے پھیلائے، پھر دن بھر کے اوقات کی تقسیم کی کہ یہ کچھ کر لیا تو بہت ہے۔ پھر کمرے سے نکلا، بھئی کو گود میں لیا، نیچے باغ میں گیا اور مٹر پھولوں کی دور ویہ مسکراہٹ کے بچوں نیچ ہم دونوں نے اک زندگی بسر کی۔ پھر دھیان آیا کہ ابھی دوا ایک گھنٹے میں گھنٹی بجنے والی ہے کہ میرے "ساتوں" میں کا ایک آج آئے گا کہ نہ آئے گا۔ اب اوپر آیا ہوں تو اسی شیریں انتظار میں گھڑیاں گزر رہی ہیں! سو باقی لے دوست پھر!

ب

بہارِ آندھی

(پیشکشِ نجاتِ مسز سرجنی نید و صاحبہ)

کننے لگی سروِ جنی گاندھی سے ایک دن
 اے اس زمیں پہ حق کی محبت کے دیوتا
 اے تو کہ تیری رُوح کو سیج کی تلاش ہے
 سب پھول میرے تیرے پتھڑوں سے جھڑ گئے
 پروا نہیں ہے تجھ کو کہ ناشاد ہوں سبھی
 پر دیسی باغبان کو چین سے نکال دیں
 کہنتی ہوں تجھ سے میں مے پیارے مہاتما!
 کم مایہ نوجواں ابھی ہندوستان کے ہیں
 آہستہ رکھ قدم ابھی اس باغ میں ذرا
 بولے حضور اے مری نید و شرمیتی!
 مجھ پر مگر مٹھاس کا تیری اثر نہیں
 جادو تو نو نہالوں پہ اپنا یہ آتما
 یعنی بہارِ پریم کی آندھی سے ایک دن
 دشمنِ مسرتوں کے مشقت کے دیوتا
 اے تو کہ تیرے آگے خوشی پاش پاش ہے!
 جتنے درخت تھے تے دم سے اکھڑ گئے
 تجھ کو فقط یہ دھن ہے کہ آزاد ہوں سبھی
 دیسی زمیں میں دیں کی ہی کھا دال دیں
 سُن لے مری بھی میرے دُلا رے مہاتما!
 نازک سے پھول پھل ابھی اس گلستاں کے ہیں
 سُن لے ذرا مری مرے پیارے مہاتما!
 تو شاعری کی جان ہے لذتِ مٹھاس کی
 عورت کے حُسن کا مری آنکھوں میں گھرنیں
 آندھی ہوں میں لحاظ مجھے کیا بہار کا؟

آ اور اے سروِ جنی پھولوں سے کھیل تو!

جا اور گاندھی اپنے اصدالوں سے کھیل تو! بشیر احمد

جہاں نما

موسیو کلینشو

موسیو کلینشو جن کا انتقال گزشتہ نومبر میں ہوا فرانس کے ایک بہت بڑے سیاسی مدبر تھے۔ انہوں نے کئی سال سے عزت گزینی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ اُن کا انتقال بھی ایک سادہ اور تنہا مکان میں ہوا جہاں اُن کا رفیق صرف ان کا شو فرینکو پر ابنت تھا جو زمانہ جنگ میں بارہا انہیں میدان کارزار تک لے گیا تھا۔

زندگی کے چند آخری عرفانی لمحوں کے درمیان انہوں نے کہا: ”میں اپنے بستر مرگ کے آس پاس عورتوں کو نہیں دیکھنا چاہتا۔“ ہاں نہ عورتوں کو اور نہ آنسوؤں کو! میں مردوں کے روبرو مرنے چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اُس نرس کو بھی جو نہایت توجہ سے اُن کی تیمارداری کرتی رہی تھی اپنے پاس سے ہٹا دیا۔

موسیو کلینشو کا آخری اور نیک دلانہ عمل یہ تھا کہ انہوں نے اپنے وفادار خدمت گزار اور شو فر کے ہاتھوں کو بردہ اخبار کے نمائندوں کو وہ عموماً نہیں ملا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ارجنٹائن کا ایک جریدہ نگار اُن سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ جریدہ نگار نے پوچھا: آپ سیاسی زندگی کو اس قدر خشک مزاجی سے کس طرح نباہ رہے ہیں؟ کلینشو اس سوال کو سن کر خوش ہوئے اور کہا ”سیج نویر ہے کہ میں اپنے والد کی مصائب کو یاد کر کے اس زندگی پر قابو پا لیتا ہوں۔ جب میں کسی سے برسرِ پیکار ہوتا ہوں، یا جب کبھی میں اپنے جمہوری خیالات کو کمزور ہوتے دیکھتا ہوں تو انہیں یاد دلایا ہوں۔ بس یہ کافی ہوتا ہے۔“ میں ایک غیر رو نما ہو جاتا ہے اور میں کچھ اور ہی ہو جاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں وہی ہوں۔“

”میرا آپ خیمین کلینشو ڈاکٹر تھا جیسا کہ میں بھی اس کے بعد ہوا۔ ایک دن وہ لوگوں کے مصائب کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ غم سے وہ مڑھال ہو گیا۔ اُس نے اپنا دفتر بند کر دیا اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر نائٹیز چلا گیا۔ اُس نے اپنی زندگی زراعت اور جمہوری خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دی۔ ۱۹۱۷ء کے شہنشاہیت پرستوں میں، پبولین ثالث جیسے شخص کے عہد میں جس نے مجلس شوریٰ کو منتشر کر کے خود شہنشاہیت کا تاج زیب سکر لیا، صرف اس بنا پر کہ اُس نے ایک خانگی گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ فرانس کی بہتری کی آخری امید اب صرف جمہوریت

وہ ربطِ عشق، جس کو ضبطِ عرضِ حالتِ دل تھا
اُسے بیزارِ عرضِ حالتِ دل دیکھتے جاؤ
وہ ضبطِ شوق، جو کل تک دلِ شیدا کو مشکل تھا
اُسے خوئے دلِ شیدا میں دُخل دیکھتے جاؤ

وہ امیرِ وفا، جو باعثِ تسکینِ نہاں تھی
اُسے شکلِ بلائے یاسِ نازل دیکھتے جاؤ
وہ ارمانِ لقا، جس کی بدولتِ زینتِ آس تھی
اُسے مہلکِ بسانِ ستمِ قاتل دیکھتے جاؤ

وہ شوقِ وصل، جو اک دن علاجِ غم میں کوشاں تھا
اُسے فکرِ علاجِ غم سے غافل دیکھتے جاؤ
وہ دردِ ہجر، جو اک دن ضرورتِ مندِ دریاں تھا
اُسے سوئے سکونِ تامِ مائل دیکھتے جاؤ

وہ نظریں، جو کبھی اکے بے وفا سے لڑکے نازاں تھیں
اب اُن کو اپنی بدبختی کا قاتل دیکھتے جاؤ
وہ آنکھیں، جو کبھی پروانہٴ رخسارِ نابال تھیں
اب اُن کو گریہٴ حسرت میں شاغل دیکھتے جاؤ

وہ الفت جس کے انتہا کام پر دنیا کو حیرت تھی
اب اُس کو مثلِ رنگِ خامِ زائل دیکھتے جاؤ
وہ بدبختِ محبت جس کی فطرت ہی محبت تھی
اب اُس کو صبرِ کر لینے کے قابل دیکھتے جاؤ

وہ آزادِ حریف جو آج تک آزادِ ناقص تھا

اُسے نازانِ آزادیِ کامل دیکھتے جاؤ

حکیم آزادِ ناقص

ہندوستانی آدمی۔ سامان بھی کچھ واجبی ہی واجب تھا۔ لباس کے ساتھ پان دان اور لوٹا صاف ظاہر کرتا تھا۔ کہ اول نمبر کا فداست پرست آدمی ہے۔ انگریزی جانتا ہوں۔ انگریزوں کے ساتھ مدتوں رہا ہوں۔ انگریزی کپڑے بھی پہنتا تھا۔ مگر وہ زمانہ گیا۔ اب تو کچھ اپنے ہی ملک کے لباس میں آرام آتا ہے۔ سیکنڈ کلاس میں بیٹھ ٹوپی اتاری شہروانی اتاری۔ جوتا اتارا جرابیں اتاریں۔ بچھو نا بچھایا۔ پان دان کھول کر پان کھایا۔ بچھو نے پریسیٹ۔ تکینگی گھٹنوں میں دبا۔ آرام سے لوٹ ماری۔

اس زمانہ میں بعض ایڈیٹروں کے تقاضے نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھیں پنسل اور کاغذ سر ہانے رکھ لیا تھا کہ کچھ سوچہ جائے گا تو کچھ لوں گا۔ مگر گاڑی کے چکروں میں کچھ ایسا مڑا آیا کہ آٹھ لگ گئی۔ نیند تو ایسی مزے کی آئی تھی کہ شاید بیدنی ہی میں جا کر آٹھ کھلتی۔ مگر کیا کروں ایک صاحب ہمار کی کرفت آواز نے نیند میں خلل ڈال دیا۔ آنکھیں تو میں نے نہیں کھولیں۔ ہاں راجی بھی آنکھوں سے گاڑی کا رنگ دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ فام جوان سے آدمی۔ نہایت عمدہ سوٹ پہنے۔ منہ میں سگار دباے قلیوں سے انگریزی لہجہ کی اردو میں لڑ رہے ہیں۔ لڑائی ایک ٹین کے لوٹے پر تھی۔ قلی کہتے تھے کہ حضور کا ہے۔ صاحب کہتے تھے کہ ہمارا نہیں ہونا سکٹا قلیوں کو شاید یہ ڈرتا کہ چوری کا الزام نہ لگ جائے۔ ورنہ اُن کو جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ لوٹا اٹھا کر چلتے بننے۔ گھر میں کام آتا۔ میں سمجھ گیا کہ ان ہمارے ہندوستانی بھائی کو انگریزیت کا نیا شوق چڑایا ہے۔ گھر سے لوٹا ساتھ کر دیا ہوگا۔ یہاں سوٹ پہن کر لوٹا ساتھ رکھتے شرم آتی ہے۔ اس لئے اس کی ملکیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ گھڑی گھڑی اُن کا ہاتھ مچھو پر جاتا اور خالی آتا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ مچھیں پہلی دفعہ منڈائی گئی ہیں۔ رہ رہ کر ٹائی درست کرتے۔ کوٹ اور واسکٹ کی سلوٹیں نکالتے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ سوٹ پہننے کی عادت نہیں ہے۔ ہاتھ میں موٹی سی انگریزی آداب مجلس کی کتاب تھی۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ عالم ہو کر یہ کہیں اس پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔ بکسوں کی زیادتی بنا رہی تھی کہ سفر کرنے کے عادی نہیں۔ اس لئے بے ضرورت سامان سمیٹ لائے ہیں۔ ان خیالات کا دل میں آتا تھا کہ میں چٹ اٹھ بیٹھا۔ سوچا کہ چلو اللہ نے مفت کا ایک مضمون دیا۔ خدا کرے کچھ عرصہ ساتھ ہے مزا آجائے گا۔ سب سے پہلے تو میں نے قلیوں کو سمجھایا کہ بیوقوفوں کہیں صاحب لوگوں کے پاس لوٹا ہوتا ہے جو ان کے پاس ہوگا۔ چلو۔ ہٹو۔ لوٹا پولیس میں سے دو۔ کوئی دوسرا مسافر چھوڑ گیا ہوگا صاحب ییشن کر سکرائے اور تھینک یو سے میری عقل رسا کی داد دی۔ اس کے بعد نہایت فراخ دلی سے قلیوں کو انعام دیا۔ بے ترتیب سامان کو بے وجہ ٹول ڈال کر اور۔ ترتیب کر دیا بندھا ہوا بستر ایک بیٹ پر

رکھا اس سے بچکے لٹکا کر بیٹھے۔ اور اپنی کتاب ”آداب مجالس“ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر لمبی تانی۔ لیکن کن انجکیوں سے اُن کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتے تھے کہ سو گیا یا جاگتا ہے۔ میں پہلے سنان کو دھوکا دینے کے لئے تیار تھا کہ ان کا اصلی رنگ دیکھوں۔ آہستہ آہستہ خزانے لینے شروع کئے۔ وہ سمجھ کر چلو یہ تو سو گیا۔ اب اپنا کام کرو۔ چپکے سے ٹفن باسکٹ کھولا۔ چھری، کانٹے اور چھچھکالے۔ کتاب کو دیکھ کر اسی موافق سامنے جمائے۔ اب تھوڑی دیر کتاب پڑھتے اور تھوڑی دیر خالی ٹھہری کانٹے چلاتے کبھی کبھی ایکٹروں کی طرح شکر یہ کے طور پر ادھر ادھر گردن بھی جھکاتے۔ غرض اسی طرح کوئی دو گھنٹے گزار دیئے۔ میں نے کروٹ لی اور انہوں نے آہستہ سے سب سامان ٹفن باسکٹ میں رکھ دیا۔ اسٹیشن آیا۔ گاڑی نے کھانے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کھانے کے ٹکٹ کے روپے دے دیئے۔ انہوں نے صاحب بہادر سے بھی دریافت کیا۔ پہلے تو انہوں نے داغ پر زور ڈالا کہ سبق پڑھ کر مل کروں یا نہ کروں۔ پھر شاید خیال آیا کہ کمیں اوروں کے سامنے ہنک نہ ہو جائے۔ نہایت ڈانٹ کر ”نو“ (نہیں) کہہ دیا۔ گاڑی نے مجھے لاکر ٹکٹ دے دیا۔ اور ہمارے دوست اپنی کتاب کے سر پرے میں اٹھا ہاتھ منہ دھویا کپڑے پہنے۔ ذرا بھلا آدمی بنا۔ پان کھایا۔ صاحب سے انگریزی میں پوچھا ”آپ تو پان نہ کھاتے ہو گئے؟“ کہا ”نہیں۔ اس سے دانت خراب ہوتے ہیں۔“ میں نے پوچھا ”شاید ولایت کا قصہ ہے؟“ کہنے لگے ”نہیں۔“ اس وقت تو صرف بمبئی تک جا رہا ہوں۔ میں نے کہا ”بمبئی میں کچھ عرصہ تک قیام رہے گا۔“ فرمایا ”نہیں صرف چار دن“ اس کے بعد ذرا کھلے اور خود سوال شروع کئے۔ پہلا ہی سوال مطلب کا تھا۔ کہنے لگے ”بمبئی بہت بُری جگہ ہے۔ کھانا اچھا نہیں ملتا۔ کوئی ہوٹل اچھا نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”یہ تو نہ فرمائیے۔ تلج محل ہوٹل کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں آرام نہیں ملتا یا کھانا اچھا نہیں ملتا۔ ہاں خرچ ضرور زیادہ ہوتا ہے۔“ کہنے لگے ”اوہ خرچ کی ہمیں پروا نہیں ہم اینگلو انڈینز کو پسند نہیں کرتے۔ ہم ایسی جگہ ٹھہرنا چاہتے ہیں جہاں سب ہندوستانی ہوں یا سب یورپین۔“ بھلا ایسا موقع ملے اور میں ہاتھ سے جاسے بول۔ میں نے کہا ”ایسٹرن ہوٹل میں ٹھہریئے۔ وہاں آپ کو آرام بھی ملے گا اینگلو انڈینز بھی نظر نہ آئیں گے۔“ میرا مطلب دوسرا یہ تھا۔ میں خود اسی ہوٹل میں ٹھہر رہا تھا۔ سمجھا کہ یہ شیر سا تھیرا تو میرا مضمون پورا ہو جائے گا۔ وہ بھلا اس بیتر سے کو کیا سمجھتے چٹ راضی ہو گئے۔ پھر میری ذات کے متعلق انہوں نے سوالات کی بھرمار شروع کی۔ کیا نام ہے، کہاں پڑھا ہے، کہاں تک پڑھا ہے، کہاں توکر ہو، کیسا تنخواہ ملتی ہے، کتنے بچے ہیں، کیوں بمبئی جا رہے ہو، کب تک رہو گے، کب واپس آؤ گے، انگریزوں میں رہنے سننے کا اتفاق ہوا ہے، انگریزی آدابِ فلٹر سے واقف ہو، تم خود کس ہوٹل میں ٹھہرو گے، غرض ہزاروں سوال

کر ڈالے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ باوجود ہندوستانی لباس کے میں انگریزی طرز معاشرت سے بے بہرہ نہیں ہوں اور ایسٹرن ہوٹل میں ٹھہر رہا ہوں تو اُن کے چہرہ پر ذرا ایشاشت سی آگئی۔ سمجھے ہو گئے کہ چلو کتاب کے مضمون پر عمل کرنے میں کچھ تو اس سے مدد ملے گی۔

دوسرے اسٹیشن پر میں تو اتر کھانا کھانے چلا گیا اور ہمارے صاحب بہادر نے معلوم نہیں کیونکر اسٹیشن پر سے پوریاں اور مٹھائی خریدی اور خوب تن تازہ کرشب خوابی کے کپڑے پہن بستر بچھا روشنی گل کر سو گئے۔ ان کا بھانڈا نہ پھوٹتا اگر حرام میں زکامی اور مٹھائی کے پتے پڑے ہوئے مجھے نہ ملتے۔ پتے دیکھ کر میں نے دو نتیجے نکالے۔ اول یہ کہ انہوں نے جو کچھ بھی کھایا حرام میں کھایا تاکہ کوئی یہ دیکھ کر تعجب نہ کرے کہ ایک صاحب بہادر مٹھے پوریاں کھا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یا تو گھبراہٹ میں یہ پتے باہر پھینکنے بھول گئے۔ یا انہوں نے پھینکے تھے اور وہ ہوا کے زور سے پھولٹے اندر گھس آئے۔ خیر معلوم ہو گیا کہ مبدئی میں اچھی کٹے گی۔

دوسرے دن صبح ساڑھے چھ بجے مبدئی پہنچ گئے۔ یہ تو اسباب سمٹولنے میں ہے اور میں کرایہ کی موٹر لے لیٹرن ہوٹل پہنچا۔ بیسیوں دفعہ وہاں ٹھہرا ہوں۔ سب سے ملاقات ہے۔ مینجر صاحب سے ملاقات کیا دوستی ہے۔ پہلے انہی سے ملا۔ اور کہا ایک صاحب آتے ہیں میرے کمرے کے برابر ہی اُن کو کمرہ دینا۔ اور ذرا ادھر ادھر جائیں تو عجب کو اطلاع کر دیا کرنا۔ اس وقت تو بس اتنا ہی سن لو۔ باقی پھر کہوں گا۔ خیر میں تو ان سے یہ کہ نہ تیسری منزل کے کمرہ نمبر ۳ میں جا رہا۔ اوپر سے دیکھا تو صاحب بہادر کی لدی ہندی دو موٹریں نیچے دروازہ کے سامنے آکر ٹھہریں۔ اسباب چلنا شروع ہوا۔ تھوڑی دیر میں آگے آگے مینجر صاحب اور پیچھے پیچھے ہمارے دوست آئے۔ کمرہ نمبر ۳ کھولا گیا اور اس میں انہوں نے قیام فرمایا۔ مینجر صاحب ان سے فارغ ہو میرے پاس آئے اور کہنے لگے "یکیا بات ہے جو آپ نے کہا تھا بجنسہ وہی انہوں نے کہا۔ آتے ہی پوچھا کہ ابھی جو صاحب آئے ہیں وہ کون سے کمرے میں ٹھہرے ہیں" میں نے کہا "کمرہ نمبر ۳ میں" انہوں نے فرمایا "ہمیں ان کے برابر والا کمرہ دو اور جب وہ میز پر آئیں ہم کو اطلاع دیا کرو" میں نے مینجر صاحب سے کہا "ذرا تم نیچے جاؤ ابھی میں آکر سارا قصہ بیان کرتا ہوں۔ اور اُن میرے کمرے کے سامنے جو ہندوستانی پچانا ہے اُس کا لوٹا اٹھو اور صاحب کو لوٹوں سے بڑی نفرت ہے۔ اسٹیشن پر فلیوں سے لڑائی ہوتے ہوئے رہ گئی" بجائے مینجر پریشان تھے کہ یہ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ کچھ بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں میں نے جا کر اُن کو سب کچھ سمجھا دیا۔ کہنے لگے "بھئی ذرا دیکھنا ایسی کوئی بات نہ ہو کہ ہوٹل بدنام ہو جائے۔ لطف تو ضرور آئے گا۔ مگر یہ ہو پار کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا آپ خاطر جمع

رکھئے۔ بٹلروں سے کہہ دیجئے کہ میں جو مانگوں وہ مجھ کو بلا عذر لا دیا کریں۔ اس میں آپ کا کیا نقصان ہے اور آپ کے ہوٹل کی کیا بدنامی ہے۔ میں شکر کی بجائے اگر کافی میں نمک ڈال کر پیتا ہوں تو آپ کو واسطہ۔ آپ کو اپنی رقم سے کام معلوم نہ تھا ہے کہ میرے اتنا کتنے پر کچھ سمجھ گئے۔ اور خود بھی صاحب بہادر کے آداب مجلس کی عملی تعلیم کا لطف اٹھانے پر تیار ہو گئے۔

ہاتھ منہ دھو کپڑے بدل میں نیچے اترا۔ اور دوسری منزل میں جو کھانے کا کمرہ ہے اُس میں داخل ہوا۔ جتنے بٹلر تھے وہ مجھے پہچانتے تھے۔ دیکھ کر ذرا مسکرائے میں سمجھ گیا کہ منیجر صاحب نے ضروری ہدایتیں دے دی ہیں سڑک کے رخ جو میز بھی ہوئی تھی میں اُس پر جا بیٹھا۔ میرے سامنے ایک بڑا آئینہ تھا۔ پیچھے دو میزیں اور تین میز تھیں۔ ہاتھ پر سڑک تھی۔ اور بائیں طرف اور بہت سی میزیں کرسیاں اور سامان کا کمرہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صاحب بہادر کو بھی میرے میز پر پہنچ جانے کی اطلاع ہوئی۔ وہ نئے سوٹ میں ٹوپی اتارے سگاری پیتے بڑے ٹھٹھا سے کمرے میں داخل ہوئے۔ رادھ اُدر دیکھا اور کچھ دل میں سوچ کر میری پشت کی جانب جو میز پر بھی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس طرح بیٹھنا چاہتے ہیں کہ وہ مجھ کو دیکھ سکیں کہ میں کس طرح کھانا کھاتا ہوں اور میں اُن کو نہ دیکھ سکوں۔ لیکن شاید اُن کو اس کا خیال نہ رہا کہ میرے سامنے یہ بڑا آئینہ لگا ہوا ہے اور اُن کے سب حرکات مجھ کو اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزرے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ان کے کوٹ کے کالر میں پیچھے کی طرف ایک پرچہ پن سے لگا ہوا ہے۔ بہت غور کیا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ کیا تھا۔ اتنے میں بٹلر نے پوچھ کی رکابی، شکر اور دودھ سلنے لا رکھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ منیجر صاحب کو بلاؤ وہ دروازہ ہی تک گیا ہو گا کہ منیجر صاحب خود مسکراتے ہوئے آئے اور میرے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے آہستہ سے اُن سے کہا ”سٹر ذرا چپکے سے یہ تو دیکھ آؤ کہ ہمارے صاحب کے کالر پر یہ کاغذ کیا لگا ہوا ہے“ وہ میرے پاس سے اٹھ صاحب کے پاس پہنچے اور پہلو میں کھڑے ہو کر پوچھا ”آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ اگر کسی انتظام کی ضرورت ہو تو کر دیا جائے“ صاحب نے فرمایا ”نہیں سب ٹھیک ہے“ یہ باتیں کرتے کرتے منیجر صاحب نے اس کاغذ پر بھی نظر ڈال لی۔ مگر کچھ چہ می کم میں ہو گئے۔ وہاں سے ٹہلنے ہوئے میرے پاس آئے۔ اور وہی سوال مجھ سے کیا۔ میں نے بھی وہی جواب دیا۔ اور آہستہ سے پوچھا ”آپ نے کاغذ

سے پورج کو بس دلیہ سمجھے۔ فرق یہ ہے کہ دلیہ کو دودھ اور شکر ملا کر پکاتے ہیں۔ پورج میں شکر اور دودھ کھانے والا اپنے صوب خواہش ملا لیتا ہے۔

دیکھا، کما "ہاں دیکھا" اس میں کیا لکھا ہے "ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کیا معنی ہیں" میں نے کہا "آپ نہ سمجھے ہوں میں تو سمجھ گیا۔ صاحب نے نئے سوٹ بنوائے ہیں اور اپنی کتاب دیکھ کر ہر سوٹ پر اس کے پہننے کا وقت لکھ دیا ہے۔ یہ ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک پہننے کا سوٹ ہے۔ گھبراہٹ میں کاغذ نکالے بغیر سوٹ پہن آئے چلو ان کی صاحبیت کا کچھ تو رنگ معلوم ہو گیا۔ اب دیکھو دوسرا تماشا دکھاتا ہوں۔ صاحب بہادر اس وقت اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ میں نے اپنی رکابی اس طرح رکھی کہ وہ دیکھ سکیں کہ میں پورج کس طرح کھاتا ہوں۔ میں نے نمک کا چمچا بھرا رکابی تک لایا اور اس طرح الٹا کہ نمک بجائے رکابی کے میرے نیچے میں گرا۔ اس طرح دو تین نیچے بھر دھڑکڑائے۔ بعد میں سرکہ کی بوتل لی۔ اس کے منہ پر انگلی رکھ کر اس طرح الٹی گویا سرکہ ملا لیا۔ صاحب اخبار کی آڑ سے میرے ان حرکات کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد رکابی میں نے ذرا سرکہ کر لپٹے سامنے کر لی اور جلدی جلدی شکر کے دو تین چمچے ڈال دیوہ اندیل چمچے سے ملا پھر رکابی ذرا ان کی طرف کر کے کھانا شروع کیا۔ وہ پورج کھانے کی ترکیب سمجھ گئے۔ نہایت ٹپٹپٹا سے دل کھول کر نمک اور سرکہ ملا یا اور چمچ سے کھانا شروع کیا۔ میجر صاحب اور بٹلروں کو مہنسی آئی۔ بچاروں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور ایک ایک کر کے سب سرک گئے۔ اس کے بعد میں نے جو چیز کھائی ذرا سلیقہ سے کھائی اور صاحب نے بھی ہو بہو نقل اتاری۔ یہ ہیں۔ میں نے اس لئے کیا کہ کہیں کھٹک نہ جائیں اور مزہ اکر رہو جائے۔

اس کے بعد میں جے جے اسپتال میں ڈاکٹر ڈگن سے ملنے کا وقت دریافت کرنے کے لئے چلا گیا۔ پھر پھر کر کوئی ایک بجے واپس آیا۔ دیکھا کہ صاحب بہادر اپنے کمرے میں برج رہے ہیں۔ شاید ان کو میرے آنے کا ہی انتظار تھا۔ کیونکہ ادھر میں کھانے کے کمرے میں آیا اور ادھر وہ بھی آ پہنچے۔ لنچ شروع ہوا۔ پہلے تو صمیم صمیم کارروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں نے ٹوس اٹھایا چھری سے اس پر کھن ملا۔ رائی کی بوتل میں چھری ال تھوڑی سی رائی نکالی اور ذرا پہلو بدل اس طرح ہاتھ چلایا گویا ٹوس پر رائی مل رہا ہوں۔ بہلا نقل راہ عقل۔ انہوں نے بھی کچھ انتظار کر کے پوری نقل اتاری۔ ادھر میں نے ٹوس منہ میں رکھا اور ادھر انہوں نے اپنے ٹوس پر منہ مارا۔ خبر نہیں بچائے کے حلق پر کیا گزری۔ ہاں آئینہ میں یہ ضرور دیکھا کہ ایک دفعہ ہی ان کے چہرے کی حالت کچھ بدل سی گئی۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ منہ سے نوالہ نکال کر پھینک دیں مگر میں ایک دفعہ ہی ان کی طرف مڑ گیا۔ اب بچائے کو نہ نوالہ اگلنے بنتی ہے نہ نگلنے۔ آخر کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار ہی لیا۔ اس کے بعد میں نے

لے نیچے رومال جیا اچو کوڑا کپڑا ہوتا ہے جو کھاتے وقت گود میں پھیلا لیتے ہیں تاکہ کھانا گرنے سے کپڑے خراب نہ ہوں۔

اُن سے باتیں شروع کیں۔ باتیں کرتا جاتا اور توُس کھاتا جاتا۔ انہوں نے بھی ڈرتے ڈرتے توُس کا دوسرا کھوٹا منہ میں رکھا اور سوڈے کے سہائے نیچے اتارا۔ خدا خدا کر کے توُس ختم ہوا میں نے بھی اس سے زیادہ کارروائی کرنی مناسب نہ سمجھی۔ نیکپن بسپٹ میز پر ڈالا اور اُٹھ کھڑا ہوا تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اپنے کمرے میں آگئے۔ اور حمام میں جا کر کلیاں کرنی شروع کیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہزاروں ہی کلیاں کر ڈالیں جب کہیں جا کر کچھ ٹھنڈک پڑی۔ مجھے افسوس بھی ہوا، اور مہنسی بھی آئی۔ افسوس تو اس لئے ہوا کہ بیٹھے بٹھائے ایک غریب کا مہہ چلنی کر دیا۔ اور مہنسی اس بات پر آئی کہ اس بیوقوف کو صاحب بننے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر لچ بھی خاصہ مزے سے گزر گیا۔

سہ پہر کو میں ڈاکٹر ڈگن سے ملا۔ تمام کیفیت بیان کی۔ اپنے مدراس جانے کا ذکر کیا۔ وہاں والوں کی رائے ظاہر کی کہ کس طرح کئی گھنٹے آنکھوں کا امتحان کرنے کے بعد مجھے صاف جواب دے دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں ایسی کہیں کہ میرے دل کو لگ گئیں۔ کہنے لگے میں کسی کی برائی نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ آنکھوں کا زیادہ دیر تک امتحان کرنا کچھ مفید نہیں ہوتا۔ مریض کی آنکھیں گھورتے گھورتے پتھر جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد صحیح نتیجہ نکالنا دشوار ہوتا ہے۔ اب رہی تمہاری حالت تو اس کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ آنکھوں کا تم کو کوئی مرض نہیں ہے۔ صرف صحیح نمبر کی عینک کی ضرورت ہے۔ ولایت جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ مگر یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں کر سکتا ہوں اس سے زیادہ کی وہاں بھی تم کو توقع نہ رکھنی چاہئے۔ یورپ والوں کی یہ کیفیت ہے کہ بچپن ہی سے آنکھوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ذرا کچھ فرق آیا اور آنکھ کے ماہر فن کے پاس پہنچے۔ علاج کیا۔ عینک لی چلو چھٹی ہوئی۔ ہمارے ہاں لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب آنکھیں بالکل تباہ ہو جاتی ہیں اُس وقت علاج کا خیال آتا ہے۔ خیال آنے اور اُس پر عمل کرنے میں بھی برسوں گزر جاتے ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے ڈاکٹر کے پاس آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج ہی اچھے ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ جتنے رنگ رنگ کے مریض ہمارے دیکھنے میں آتے ہیں ویسے ولایت کے ڈاکٹروں کو برسوں میں بھی نہیں ملتے۔ اور جتنے آپریشن ہم ایک مہینے میں کر لیتے ہیں وہاں کے ماہرین فن کو سال بھر میں بھی نہیں کرنے پڑتے۔ اس لئے یہ خیال تو بے کار ہے کہ ولایت جا کر تم یہاں سے کچھ زیادہ فائدہ حاصل کر سکو گے۔ ہاں اپنے اطمینان کے لئے جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ“ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اندھا کیا چاہے دو آنکھیں جب یہیں مجھ کو آرام ہو جاتا ہے تو پھر میں کوئی دیوانہ ہوا ہوں کہ خواہ مخواہ روپیہ خرچ کر کے جرمنی یا فرانس جاؤں۔ اچھا اب آپ عینک کے نمبر نکالتے“ اس میرے شیر نے دس

منٹ میں نمبر بھال میرے حوالہ کئے۔ اس کے بعد کچھ سوچ کر کہا: "خیر ٹھہرو۔ میں دوا ڈال کر بھی نمبر دیکھ لیتا ہوں۔ اگر تھوڑی بہت کچھ غلطی ہوئی ہے تو وہ بھی نکل جائے گی" یہ کہہ میری آنکھوں میں انہوں نے دوا ڈالی۔ اور دوسرے روز سہ پہر کو آنے کی ہدایت کی۔ یہاں سے نکل میں پھرتا پھرتا شام کو ہوٹل پہنچا۔ دوا پڑنے سے ذرا آنکھ میں پردہ سا آگیا تھا۔ اس لئے رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے ہی میں کھایا۔ صاحب بہادر نے بھی میری تقلید کی۔ دوسرے دن بھی میں کھانے کے کمرے میں نہیں گیا۔ مگر چونکہ ہمارے صاحب ان دو وقت کے کھانوں سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے ناشتا اور لانچ کھانے کے کمرے ہی میں جا کر کھایا۔ مینج صاحب میری خیریت پوچھنے آئے۔ ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ صاحب نے کل کا سبق پوری طرح دہرایا۔ ہاں اس روز توس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سہ پہر تک میری آنکھیں صاف ہو گئیں۔ میں نے جا کر ڈاکٹر ڈگن کو دکھائیں۔ معائنہ کے بعد انہوں نے کہا کہ "میرے پہلے اور اب کے نمبروں میں فرق نہیں ہے۔ آپ شوق سے انہی نمبروں کی عینک خرید لیجئے بہت دنوں کام دے گی مگر جب ترجائے تو مجھ سے آکر ضرور ملئے۔ کہیں اتارے ہوئے نمبروں کی عینک نہ لگائے پھرئے۔ آنکھیں سنیا ناس ہو جائیں گی" وہاں سے نمبرے میں دفنایم دستور کی دوکان پر پہنچا۔ نمبر دئے۔ انہوں نے دوسرے روز عینک دینے کا وعدہ کیا۔ اور میں چوپاٹی۔ پالو بندر اور ہارنہی روڈ کی سیر کرتا ہوا رات کو کوئی ساڑھے سات بجے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ چونکہ میرے قیام کا یہ آخری دن تھا۔ اس لئے مجھے شرارت سوجھی۔ کھانے کے کمرے میں جسٹس الماری تھی اس میں سلفر ٹر کی بوتل خبر نہیں کیوں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ صاحب کو آج یہ پلا دو۔

رات کو کھانے کے لئے کمروں میں سے ہم دونوں ساتھ نکلے۔ میں نے صاحب سے پوچھا "میرے کچھ پینے کا بھی شوق ہے۔" کہنے لگے۔ "ہاں پیتا ہوں مگر کم۔ زیادہ پینا صحت کو مضر ہے" میں سمجھ گیا کہ یہ پیتے پلاتے نہیں۔ صرف انگریزی کپڑوں کی لالچ رکھنے کے لئے پینے کے دعوے دار ہو گئے ہیں۔ خیر نیچے آکر وہی اپنی اپنی نشستوں پر دونوں بیٹھ گئے۔ کھانا شروع ہوا میں نے بٹلر کو آواز دی۔ کہ سلفر ٹر کا ایک پگ لاؤ، وہ بچارا گھبراہٹ میں کہیں اس بھلے آدمی کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ سیدھا مینج صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ سمجھ گئے کہ کچھ تماشا ہونے والا ہے۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے بٹلر دونوں کمرے میں آئے۔

۱۷ سلفر ٹر زنا دخن کی دوا ہے۔ شاہترہ چراغ اور چند اور تلخ ادویات کے عرق میں گندہک کو حل کر کے بنائی گئی ہے ایسی تلخ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔

ٹبلر نے الماری کھول سلفر بٹری کی بوتل سے ایک پگ نکال میرے گلاس میں لا ڈالا۔ میں نے سوڈا منگو کر گلاس بھر لیا۔ اور کھانا شروع کیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گلاس اٹھا مانہ تک لے جاتا۔ اور پھر گلدان کی آڑ میں رکھ دیتا کہ کہیں صاحب یہ نہ دیکھ لیں کہ بھرے کا بھرا گلاس ہے۔ میرے دلچسپا بھی انہوں نے بھی سلفر بٹری کا ایک پگ لے کر اُس میں سوڈا ملوایا۔ اس کے بعد جو ایک گھونٹ لیا تو قیامت آگئی۔ میرے ہاں تو برا بگھونٹ پگھونٹ چل رہا تھا۔ وہ بھلا ہاتھ روک کر کیوں اپنی ہتک کرتے۔ کسی نہ کسی طرح پتے ہی گئے۔ بٹری ایک قسم کی شراب بھی ہوتی ہے۔ سمجھے ہونگے کہ جس بٹری کا ذکر اُن کی کتاب آداب مجلس میں ہے شاید وہ یہی ہوگی۔ غرض گلاس ختم کرنا مشکل ہو گیا۔ بڑا گھونٹ لیں تو صلت سے اتنا مشکل۔ چھوٹے گھونٹ لیں تو گلاس کا ختم ہونا دشوار۔ آخر بصد خرابی بصرہ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد گلاس ختم ہوا۔ مگر صاحب بہادر کی طبیعت کچھ ایسی بگڑ گئی کہ میٹھا کھائے بغیر میز پر سے اٹھ گئے۔ کمرہ میں جا کر اُن پر کیا گدڑی یہ تو خدا کو معلوم ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ دوسرے دن بیچائے نے دو وقت کا غٹھ کیا۔ میں دوسرے دن دوپہر کو دنشاکئی دوکان پر گیا اور عینک لے آیا۔ ایسی ٹھیک بیٹھی کہ دل خوش ہو گیا۔ اب گھر چلنے کی سوجھی اور شام ہی کو روانہ ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔

جب دوسروں کی ہنسی اڑائی تو اپنی بیوقوفی کو کیوں چھپاؤں۔ ایک مسلمان بھائی نے مجھے بھی بیوقوف بنایا اور خوب بنایا۔ دنشاکئی دوکان سے میں ٹریم میں سوار ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ ایک بھلے آدمی ٹریم میں داخل ہوئے۔ اُن کی شکل اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ چھریا بدن۔ سفید رنگت۔ میانہ تہ بھورے بال۔ سر پر نرکی ٹوپی۔ جسم پر خاکی کوٹ پتلون۔ کوٹ کے اوپر بغیر ہاتھوں کی کیپ دار برساتی۔ جب ٹریم میں وہ میرے پاس سے گزرنے لگے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری شیروانی کی جیب میں سے روپوں کا بٹوا کچھ خود بخود اُپر کو اٹھا چلا آ رہا ہے۔ میں نے ایک دفعہ ہی جیب پر ہاتھ ڈالا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بٹوا جیب سے آدھا باہر آ گیا۔ خیر بیٹے کو اندر کیا اور اُن صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا کہ آپ تیز ضرور ہیں۔ مگر میں آپ سے بھی کچھ زیادہ تیز ہوں۔ انہوں نے شرار گردن نیچے کر لی۔ تھوڑی دیر میں ٹریم ٹھہری۔ دو آدمی اندر آئے اور انھوں ہی آنکھوں میں ان صاحب سے ان کی کچھ باتیں ہو گئیں۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھتا تھا مگر ہاں بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہ دونوں ان حضرت کے ساتھی تھے۔ خیر یہاں سے چل کر ٹریم کو انور ڈمار کٹ پر رکی۔ ترکی ٹوپی والے صاحب پہلے اتر گئے۔ اور اُن کے دونوں بار بھی اترنے کو ایک ساتھ بڑھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں دروازہ میں پھنس گئے۔ مجھے اترنے کی جلدی تھی۔ میں ان دونوں کو چیر کر نیچے اتر گیا۔ جو صاحب پہلے نیچے اترے تھے اُن کو دیکھ کر میں

مسکرایا کہ جناب ہر شخص کی حیب میں سے بٹوا نکالنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر بجائے شرمندہ ہونے کے وہ بھی مسکر لئے اور ایک طرف کو چل گئے۔ اب جو حیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو بٹوا غائب۔ اس وقت ان لوگوں کی ترکیب سمجھ میں آئی کہ ایک صاحب نے نیچے اتر کر مجھے مطمئن کر دیا۔ دو نے اس طرح راستہ روکا کہ مجھے ان کو دونوں ہاتھوں سے ہٹانا پڑا۔ ان میں سے ایک نے اس کشمکش میں بٹوا غائب کر دیا۔ غنیمت یہ ہوا کہ جتنے روپے میں لے کر گیا تھا وہ عینک والے کو دے آیا تھا۔ شاید پانچ روپے کا ایک نوٹ اور کچھ آنے رہ گئے تھے۔ ہاں ڈاکٹر ڈگن نے عینک کے جو نمبر دیئے تھے وہ بٹوے کے ساتھ گئے۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے مَنْ خَصَّكَ ضِحْكًا (جو دوسروں پر ہنستا ہے اس پر دوسرے ہنستے ہیں) بہر حال میں ہوٹل میں سے جا کر اور روپے لایا۔ دوسرا بٹوا خریدا۔ دنشاکے ہاں جا کر نمبروں کی نقل لی۔ لیکن اس کا ردوائی نے کچھ ایسا کھسیا کر دیا کہ پھر اپنے صاحب ہاں کو بھی بھول گیا۔ سات بجے کمرے ہی میں کھانا منگا کر کھا لیا۔ اور ساڑھے آٹھ بجے کے میل سے روانہ ہو گیا۔ بلا سے روپے گئے تو گئے ایک مزے دار مضمون تول گیا۔ ہاں یہ کہنے دیتا ہوں کہ پڑھنے والے حضرات! اہ! کم حتی المقدرا اس کو فرضی قصہ سمجھنے کی کوشش کریں تو زیادہ مناسب ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

میرادل

میرادل ایک موسیقی نواز پرندے کی مانند ہے جس کا نشیمن ایک شاداب اور سرسبز شلخ پر ہے۔
میرادل ایک سیب کے درخت کی طرح ہے جس کی ٹہنیاں پھلوں کے بوجھ سے جھکی پڑتی ہیں۔
میرادل ایک قوسِ قزح کی مثال ہے جو خاموش سمندر کے پانی سے کھیلتی رہتی ہے۔
میرادل ان تمام چیزوں سے زیادہ سرور ہے کیونکہ میرا محبوب میرے پاس آ گیا ہے۔

مختصر عابدی

(سی۔ جی۔ روزنیٹی)

غزل

ملیں عدم کی حدوں سے حدیں زمانے کی
 یہ جذب کیا ہے کہ تصویر خانہ دل میں
 جو آنکھ والے ہیں دنیا کی سیر کیا دیکھیں
 یہ کس کی زلفِ سیہ تا بکے کرشمے ہیں
 در ایسے وقت میں نہ اُن شش جہت کے کھلے
 فلک نہ ٹوٹ پڑے سر پہ دیکھ او غافل
 ہمیں سے دامنِ محشر کی کورد بتی ہے
 وہ چند دُکھ ہوئے تنکے پون لکھا تھے مگر
 جو تیرے دیکھنے والے ہیں اُن کی نظروں میں
 بیانِ حالِ پریشاں میں تیرا نام آیا
 کرشمے سارے دلِ خوں شدہ کے ہیں ہدم
 ہوئی ہے پردے میں حنِ چین کی پردہ دری
 اب اہلِ درد کو تیری یاد آتی ہے

وہ بے نیاز کہ جذبِ نہاں اپنے فراق
 نثار کرتے ہیں دلچسپیاں زمانے کی
 فراق گور کھ پوری

پنجاری سے

پنجاری جی

مجھ پانی کے من میں بھی تپسیا کی بڑی اچھیا ہے پر مہاراج مُورنی کو ٹی بڑی من موہنی
سی ہو۔ مہاراج جی جس طرح تم ماتھا ٹیکنے کے بلی وان ہو، گٹو ہو کہ ناگ ہو، تمہارا
ماتھا جھک جاتا ہے اسی طرح مہاراج جی یہ پانی بھی پریم کی پوجا پاٹ میں چوکس ہے
پر ماتھا نگر میں پریت کی جیسا بہتی ہے اور یہ کرشن جی کا چیلاین دیکھے بھلے اشنان
کا دھنی ہے۔ مہاراج جی اس ندی میں جو بہہ گیا سو جی گیا۔

پنجاری جی

تم ملیچھوں کی کتھا پر نہ جاؤ۔ وہ جو سُلا کتا ہے
سچ کہہ دوں اے بنین گرتو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بُت ہو گئے پرانے

انت جھوٹ ہے۔ مہاراج جی بُت پرانے اچھے پر تپسیا نئی بھلی۔ مہاراج! میں
سو قی مورتیوں کو جگاتا ہوں کہ شور ہو۔ تم جاگتی مورتیوں کو سُلا تے ہو کہ شانتی ہو۔ تم
مہاراج، کاشی جی چل کے جاؤ گے یا جل کے پنچو گے مگر اس پانی پاس کاشی جی چل
کے آئے! مہاراج! میری مانو، گلے ملو، ملاؤ اور بنو

پانی



دنیاۓ اسلام اور آزادی نسواں

(اس مضمون کی اکثر تفصیلات فرانسیسی مجلہ "اسلامیات" سے ماخوذ ہیں)

گزشتہ پچاس سال کے اندر دنیا کی اطراف و جانب میں جو سیاسی اور معاشرتی انقلابات ظہور پذیر ہوئے ہیں ان کا مطالعہ تاریخ عالم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نہایت بصیرت افروز ہے۔ ان انقلابات کا مرکز کمرہ ارض کا کوئی خاص خطہ نہ تھا بلکہ ہر ملک نے بقدر استطاعت اس میں حصہ لیا اور ہر قوم بقدر امکان اس میں شریک ہوئی۔ اس عالمگیر جدوجہد کا مطمح نظر کسی خاص ملک و قوم کی آزادی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی آزادی تھا، جس کے وسیع اثر نے عورتوں کو جو ایک مدتِ مدید سے مردوں کی محکوم ہو چکی تھیں ان کے دوش بدوش لاکھڑا کر دیا۔ عورتوں نے اپنی پیہم مساعی سے وہ اقتصادی و معاشرتی اقتدار حاصل کیا جس کے فقدان نے ایک عرصے سے انہیں سر اٹھانے نہ دیا تھا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ طبقہ نسواں کی یہ آزادی اور مردوں کے مقابلے میں حریفانہ پیش قدمی مفید ہے یا مضر لیکن یہ بات مسلم ہے کہ آج یہ چیز مغربی تہذیب کی نمایاں شان سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کا اثر رفتہ رفتہ مشرقی اقوام اور بالخصوص دنیاۓ اسلام پر پڑ رہا ہے۔ ترکی، افغانستان، عرب، اور بالخصوص روس کی عورتیں نہایت سرعت کے ساتھ اس آزادی کو قبول کر رہی ہیں، اور قرآن و شریعت کے احکام کے باوجود بڑی جرأت و بے باکی کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو رہی ہیں۔

اس آزادی میں سب سے اہم اور قابل غور شے پرئے کا اٹھ جانا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ قرآن کی رو سے پرئے کا صحیح مضمون کیا ہے؛ اننا تسلیم ہے کہ مسلمان عورتیں (جیسا کہ لفظ مستورات سے ظاہر ہے) صدیوں سے بالکل خلوت میں زندگی بسر کرتی رہی ہیں، اور انہیں خانگی امور کے علاوہ تمام قومی اور معاشرتی مہمات سے محروم رکھا گیا ہے۔ سوائے کرو، نرکمان، اور دیگر خانہ بدوش اقوام کی عورتوں کے جن کا بے پردہ ہونا ان کی خاص طرز زندگی اور معاشرت کا لازمی نتیجہ تھا دنیاۓ اسلام میں عورتیں ہر جگہ محبوب و مستور رہی ہیں۔ ان متذکرہ بالا امور کو پیش نظر رکھتے ہو موجودہ انقلاب کی اہمیت بہت کچھ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں مختلف ممالک اسلامیہ کی عورتوں کا ذکر کرتے ہیں اور سب سے پہلے ایران کو لیتے ہیں۔

ایرانی عورتوں کی موجودہ حالت تقریباً وہی ہے جو آج سے چند صدیاں پیشتر تھی۔ انہوں نے جب کبھی سیاسی یا معاشرتی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی، تو وہ کوشش مردوں کی شدید مخالفت کے باعث کامیاب نہ ہو سکی۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر طہران میں عورتوں کی ایک مختصر سی جماعت نے مغربی تعلیم حاصل کر کے حقوق نسواں کے لئے جدوجہد شروع کی، چنانچہ ۱۹۲۱ء میں ”عالم نسواں“ کے نام سے چند پڑھنی لکھی عورتوں کی سرپرستی میں ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ کیونکہ اُس کے اغراض و مقاصد شعائر اسلام کے خلاف سمجھے گئے، مگر اس کے فوراً بعد ایک اور رسالے کا اجرا ہوا جس کا نام ”زبان نسواں“ تھا۔

اس رسالے کی بانیہ صدیقہ دولت آبادی تھی، جو اپنے آزادانہ خیالات کے باعث ایران بھر میں مشہور ہے۔ اُس نے جس ایشیاء و خدویت کے ساتھ اپنی زندگی اور اپنے محدود وسائل کو اپنی ایرانی بہنوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کیا وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ یہ عورت نہایت عالی نسب تھی۔ اس کا والد اصفہان کا مجتہد تھا اور اس کے دو بھائی ”مجلس“ کے ممبر تھے۔ وہ اپنے ہفتہ وار اخبار کی ادارت کے فرائض خود ہی انجام دیتی تھی۔ اس رسالے میں تعلیمی و تدریسی مسائل کے علاوہ ایران کے سیاسی حالات و امور پر بھی بحث ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اخبار بھی حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا۔

صدیقہ کے خیالات کی نشر و اشاعت کا ذریعہ محض اخبار ہی نہ تھا۔ اُس نے طہران میں خواتین ایران کی ایک انجمن بھی قائم کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ایران کی عورتوں کو یورپ کے طرز پر تعلیم حاصل کرنے کی رغبت دلائی جائے۔ چنانچہ وہ اس غرض سے ۱۹۲۳ء میں پیرس پہنچی اور وہاں سے امریکہ چلی گئی، اور واشنگٹن میں اُس نے ایرانی خواتین کی طرف سے زنانہ ”مجلس بین الاقوامی“ میں شرکت کر کے نمائندگی کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ واپسی پر وہ پیرس پہنچی اور وہاں ۱۹۲۴ء تک مطالعہ میں مشغول رہی۔ چنانچہ اُس نے جب دوبارہ ایران کی زمین پر قدم رکھا تو وہاں کی حکومت نے اُسے زنانہ مدارس کی افسر معائنہ مقرر کر دیا۔ اس کی ابتدائی کوششیں تمام تر اس امر میں صرف ہوئیں کہ عورتوں کو آزادی کے جائز حقوق مل جائیں۔

ترکی اور افغانستان کے مقابلے میں ایران میں تبدیلی لباس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ اس ملک میں مختلف طبقوں کے لوگوں کا لباس جدہ اگانہ تھا۔ سوداگروں کی پوشاک کی وضع پیشہ وروں سے علیحدہ تھی۔ غرض ہر قبیلے اور گروہ کا لباس ایک امتیازی خصوصیت رکھتا تھا۔

گزشتہ ستمبر میں رضا شاہ نے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے نمائندوں کو بلا کر اعلان کیا کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں

میں جا کر تبدیلی لباس کی تلقین کریں۔ اور لوگوں کو ایرانی لباس چھوڑ کر انگریزی لباس زیب تن کرنے پر اکسائیں لیکن سر پر انگریزی ٹوپی کی جگہ کلاہ پہلوی کا استعمال کیا جائے۔ اس اعلان نے اہل ایران پر بہت گہرا اثر کیا، اور لباس میں یک گونہ تغیر ہو گیا۔ چنانچہ مجلہ ”ایران“ کے نامہ نگار مقیم اصفہان نے لکھا کہ اس شہر کے چار ہزار اساتذہ اور تلامذہ نے انگریزی لباس پہن لیا ہے۔ اسی سلسلے میں مازندران کے حاکم کا وہ اعلان بھی دیکھنے کے قابل ہے جو اُس نے وہاں کے درزیوں کے نام جاری کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ انگریزی سوٹ کے علاوہ کوئی اور کپڑا تیار نہ کریں، اور کلاہ پہلوی کے علاوہ کوئی ٹوپی نہ بنائیں۔ ہاں علماء کو اپنا قدیم مقدس لباس پہننے کا حق بدستور حاصل ہو گا۔

یہ حالات ایسے نہ تھے کہ ان سے پردے کے مسئلہ پر اثر نہ پڑتا۔ چنانچہ کلاہ پہلوی کو زیب سر کرنے کے لئے جو کوشش ہو رہی تھی اُس کے دوش بدوش یہ مسئلہ بھی معرض بحث میں آ گیا، اور عورت کے حقوق آزادی پر بحث کا بازار گرم ہوا۔ حکومت کو دینی زبان میں اس بات کا اعلان کرنا پڑا کہ عورتوں کو ہر جگہ بے پردہ آنے جانے کی اجازت ہے۔

یہاں یہ بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ گذشتہ سال ساہن ملکہ ثریا کا دوران سفر میں طہران سے ہو کر وطن جانے کا بھی بے حد اثر ہوا۔ اس کو بے پردہ دیکھنے پر بے شمار ایرانی عورتوں نے اپنا نقاب اتار کھینکا اور اپنے خاوندوں کے ساتھ ہر جگہ گھومنے لگیں۔ چونکہ سرکاری طور پر پولیس کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ کوئی عورت بازار میں نقاب اوڑھے ہوئے نہ گزرے اس لئے بہت سے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن سے حکومت کو حکم دینا پڑا۔ مگر اس تردید کے باوجود عورتوں کی ایک کثیر تعداد بازاروں میں آزادی سے گردش کرتی نظر آتی رہی۔ گذشتہ ستمبر سے حصول آزادی کے لئے جو جدوجہد ایرانی عورتوں نے کی وہ بہت کچھ قابل غور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت نے ان کی مساعی کو کامیاب بنانے میں بہت مدد دی، اور یہی وجہ ہے کہ یہ زبردست انقلاب اتنی قلیل مدت میں ظہور پذیر ہوا۔ آج انہیں حق حاصل ہے کہ وہ تھیٹر، سنیما اور قہوہ خانوں میں بے پردہ آئیں اور سیر گاہوں میں آزادانہ پھریں۔ عورتوں کی اس مکمل آزادی کی ابتدا اُس روز سے ہوئی جب کہ طہران کی پولیس کا افسر اعلیٰ اپنی بیوی سمیت شہر کے ایک قہوہ خانے میں جلوہ افروز ہوا۔ ایران کے خاص ترقی یافتہ حلقوں میں اس بات کو محسوس کیا گیا کہ عورتوں میں رسم پردہ کے ارتفاع کے لئے سرکاری قانون کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ تہذیب کے اخبار ”نواذ“ نے مفصلہ ذیل شذرہ لکھ کر حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

”جو قوم ترقی کی راہ میں دوسروں سے آگے بڑھتی ہے، صرف وہی تاریخی غفلت کی مستحق ہوا کرتی ہے۔ اس مسئلہ پر یعنی پردہ، تمام قوم کے افراد متفق ہیں اور اُن کا اجتماع اور ہم آہنگ ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اب اس بارے میں کسی زائد بحث و تجویس کی ضرورت نہیں۔ یہ چیز ہماری عورتوں سے جمالت کے پردے کو دور کرنے کی، اور مستقبل قریب میں وہ جمع درخشاں نمودار ہوگی جس کا نام آزادی مستورات ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں اب چون و چرا کی گنجائش نہیں۔“

۱۹۲۹ء کو مسٹر پطریٹن نے طفلس کے اخبار ”زار یہ و سٹو کہ“ میں اس پر حسب ذیل نوٹ لکھا۔

”زیادہ کی یہ رائے مبالغہ آمیز ہے اور حکومت ایران کے صحیح منشا اور مفاد کے خلاف ہے حکومت

ایران کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایرانیوں کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کی جائے، اور مغربی تہذیب سے ضرر

اُن چیزوں کو اخذ کر لیا جائے جو مفید ہوں اور جن سے ایرانی تمدن کے بنیادی اصولوں میں بھی فتنے آئے

مسٹر پطریٹن نے یہ بھی لکھا کہ تبریز، شیراز، افغانستان، اور ترکی، میں جو معاشرتی اصلاحات نہایت سرعت کے

ساتھ ظہور پذیر ہوئی ہیں وہ ایرانیوں کے صحیح مفاد کے خلاف ہیں۔ چنانچہ وہاں کی گورنمنٹ اُن کے بعض قبیح

نتائج سے واقف ہو چکی ہے۔ اس لئے ایرانی حکومت کے نزدیک جو کام بالذریعہ اور خوش اسلوبی سے کیا جائے وہ نہایت موثر ہوگا۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں جب ”افغانی جرگہ“ نے چند اصلاحات عورتوں کے بارے میں رائج کیں تو حکومت ایران

کو بھی فی الفور انگریزی لباس اختیار کرنے کا حکم دینا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی عورتوں کو بھی چند رعایات دی گئیں۔

مگر دسمبر میں افغانستان میں چند ایسے انقلابات رونما ہوئے جن سے حکومت ایران کو اعلان کرنا پڑا کہ جہاں تک پردے

کا تعلق ہے یہ چیز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ ملک کی طرف سے عمل میں آئی چاہتے چنانچہ عوام الناس کے

خیالات کی تبدیلی سب سے اہم چیز خیال کی گئی۔

ایران کی عورتیں بے پردہ ہونے سے پہلے بھی بازاروں میں نقاب اوڑھے ہوئے نکلتی تھیں۔ فرق صرف

ان تھا کہ مردوں اور عورتوں کے لئے دو علیحدہ راستے مقرر تھے اور اس تقسیم راہ کے لئے پولیس متعین ہوتی تھی، مگر

آبادی کے بڑھنے اور لوگوں کی کثرت ہجوم نے اس کو ناقابل عمل بنا دیا۔ ایک اور بھی دقت تھی اور وہ یہ کہ بعض عورتیں

اپنے خاوند بھائی یا دیگر قریبی رشتہ داروں کے ہمراہ آیا جاکر تھیں۔ اُن کو روکنے کا پولیس کو کوئی حق نہ تھا۔ بعض

لوگوں نے اعتراض کیا کہ ایک بانقاب عورت کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کا ساتھی کوئی اقربا سے ہے

یا غیر مرد۔ چنانچہ اسی سلسلے میں بہت سی شکایات پولیس کے پاس پہنچیں۔ جن سے بسا اوقات اغماض کیا گیا۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں اور مردوں کو مشترکہ سیرگاہوں میں چلنے پھرنے کا موقع مل گیا۔ عورتوں نے قدیم نقاب کے بدلے ایک نہایت باریک سیاہ ریشمی نقاب استعمال کرنا شروع کیا، جو بعض کے نزدیک ایک بے پردہ چہرے سے بھی زیادہ جاذبِ نظر تھا۔ اور وہ بازاروں میں نوجوان ملازموں کے ہمراہ خرید و فروخت کے لئے نکلنے لگیں۔ اس چیز کو ملک کی بوڑھی عورتوں نے نہایت حقارت کی نظر سے دیکھا اور فتویٰ دیا کہ یہ نوجوان بے پردہ عورتیں خدا سے نہیں ڈرتیں (از خدا نمی ترسند) مگر اس صریح مخالفت کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ ملک کی چند تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ عورتیں بالکل بے پردہ پھرنے لگیں۔ انہوں نے ایک ”زنانہ کلب“ قائم کیا اور مفتے میں ایک روز باہر بے پردہ آنے کے لئے عہد باندھا۔ آج ایسی عورتوں کی ایک کثیر تعداد ملک میں موجود ہے جو ہٹلوں، فتوہ خانوں اور سیرگاہوں میں انگریزی لباس پہنے ہوئے بے پردہ نظر آتی ہیں۔

عورتوں کی آزادی میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے مختلف اخبارات اور رسائل کے مدیر تھے لیکن وہاں کے شعرا کی سعی و کوشش بھی کسی حالت میں کم نہیں۔ سب سے اہم کام ایران کے ملک الشعراء اور ایک اور نوجوان شاعر ”شہریاری“ کا ہے۔ ملک الشعراء کی غزلیں گراموفون ریکارڈوں میں بھر کر سنی گئیں۔ ”شہریاری“ نے اپنی ایک نظم ”جریۃ ماہید“ میں شائع کرائی، جس کا یہ اثر ہوا کہ چند روز میں اس کے اشعار سچے سچے کی زبان پر جاری ہو گئے، اور گلی گلی میں اسی کا چرچا ہونے لگا۔

حقوق نسواں کی جدوجہد کے علاوہ اس وقت ایران کی عورتوں کی تعلیمی حالت میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ گذشتہ مئی میں اخبار ”ایران“ کی اطلاع کے مطابق خاص طهران میں پرائمری مدارس میں لڑکیوں کی تعداد ۶۴۴ تھی اور ثانوی مدارس میں ۳۴۴ علاوہ بریں بعض نوجوان لڑکیوں نے امتحان پاس کر کے سند بھی حاصل کر لی ہے۔

غلام مصطفیٰ

سرورِ عشق

بزمِ جہاں ہے مے کدہ جم مرے لئے ہے دورِ جامِ گردشِ پیہم مرے لئے
 چھیڑا ہے کس کے حن نے تارِ ربابِ عشق رقصاں ہی ایک نغمہ پیہم مرے لئے
 تیری نگاہِ لطف ہے موجِ مئے نشاط اب ہو گئی حرام مئے غم مرے لئے
 ہے دستِ شوق زلفِ مغبر میں شانہ کش نغمت کدہ ہے مخفا عالم مرے لئے
 ہے کائنات تیری ضیا سے حسیں، کہ تو ہے آفتابِ عالم مرے لئے
 ہر گل میں تیرا رنگِ تبسم ہے موجِ زن آئینہ جمال ہے بنم مرے لئے
 راحت سے ہم کنار ہوں پہنائے کائنات گلپوش و زرنگار ہی ہر دم مرے لئے
 تو ہم کنار ہے، تو خزاں بھی بہار ہے کیا ہو گا پھر بہار کا موسم مرے لئے!

غرقِ سرورِ عشق ہوں شام و سحر اثر

ہے اُس کی یادِ عشرتِ پیہم مرے لئے

اثرِ صہبائی

الماس

ہال مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ مگر وہ سب سے علیحدہ — دور کرنے میں — ایک صوفے پر فحاشی بیٹھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے اپنے چاروں طرف خیالات کا ایک نہایت بیز حلقہ بنا لیا ہے جس نے باقی دنیا سے اس کا تعلق بالکل قطع کر دیا ہے۔ گفتگو کی بھنبھناہٹ، لوچدار بلند قہقہوں اور نوجوان پارسی عورتوں کے دلچسپ قدموں کی آواز اُس کے کونے کی خاموشی اور سکون میں مغل نہیں ہو سکتی تھی۔ آگ تاپتے ہوئے کبھی کبھی ہلچل بدلنا یا وہ پرسکون اور مطمئن تبسم جو اُس کے لبوں پر کھیل رہا تھا بس یہ دو چیزیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کو نے میں بھی کوئی جان دار شے موجود ہے۔ — اُس کا نام الماس تھا۔

ہال کے دوسرے کونے میں ایک خوبصورت ریشمیں پردہ لٹک رہا تھا اور اُس کے ساتھ ”معصومیت“ وہ شہرہ آفاق تصویر رکھی تھی جس نے تمام ممبئی میں تھلکہ مچا دیا تھا۔ تصویر کے گرد مذاحوں نے نصف اثرہ باندھ رکھا تھا۔ اور اُن کے درمیان ایک بلند قامت، چوڑے شانوں والا، نوجوان شخص زبان سے، ہاتھ سے اشاروں سے بچوں کے سے جوش کے ساتھ تصویر کے مختلف پہلوؤں پر تقریر کر رہا تھا۔ یہ اُس کی تصویر کشی کا سب سے آخری اور سب سے بہتر نمونہ تھا۔ — اُس کا نام سہراب تھا۔

سہراب کو معلوم تھا کہ وہ مشہور ہے اور اُس کی مصوری ایک زمانے سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ وہ میسوں کر کے — یہ خیال کر کے کہ دنیا اُس کی تصویروں کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے بچوں کی طرح خوش ہوتا تھا۔ اخباروں میں اپنا نام پڑھ پڑھ کر وہ جوش مسرت سے بے خود سا ہو جاتا تھا۔ ”معصومیت“ کی تکمیل کے بعد جب اُس نے اُس کو ہندوستان کی سب سے بڑی نمائش میں بھیجا تو ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اسی کامیابی کی خوشی میں سہراب نے آج رات اپنے اجاب کو ڈزیر بدھ کیا تھا۔

الماس اپنے کینج عافیت میں سے سہراب کو نہایت اطمینان اور سکون سے ٹٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُس کی بیوی تھی لیکن عمر میں اس سے برسوں بڑی تھی۔ اُس کے بال اب کہیں کہیں سے چاندی کی طرح چکنے لگ چکے تھے مگر اُس نے یکوشش نہ کی تھی کہ اُن کو سیاہ کر دے۔ اُس نے اپنی صاف اور سادہ ساڑھی ایسی بے پروائی سے باندھ

رکھی تھی گویا وہ عمر کے موجودہ اثرات سے بالکل بے خبر ہے۔ اور اگر اُس کو خبر بھی ہے کہ وہ بوڑھی ہوتی جا رہی ہے تو اُس کی یہ خواہش نہیں کہ وہ اس حقیقت کو چھپائے اور اپنے جسم میں مصنوعی جوانی کی کیفیت پیدا کر کے صرف زمانہ کو نہیں بلکہ نفس کو بھی دھوکا دے۔ لیکن وہ حسین تھی اور اُس کے خدو خال نہایت متناسب و خوبصورت تھے بعض وقت اُس کی عمر کا اندازہ دشوار ہو جاتا تھا۔

الماس اپنے گرد و پیش کے ہنگامے سے بالکل بے خبر تھی۔ وہ سب کچھ دیکھتی اور سنتی تھی مگر ان تمام نیکیوں اور دلفریبیوں میں اپنے لئے کوئی دلچسپی نہ پا کر سب سے علیحدہ بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھتی تھی۔

سہراب نیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اُس کے پاس سے گزرا۔ نوجوان فیروزہ اُس کے ساتھ تھی۔ الماس آج تم کیسی ہو؟ سہراب نے گزرتے ہوئے پوچھا۔ بہت اچھی طرح، الماس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اور جب تک سہراب اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا اُس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔

سطحی نظر میں الماس اور سہراب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ تصویر تھی سنجیدگی اور متانت کی اُس کی ہر حرکت اور ہر بات سے جن میں بلند بینی اور حسن مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا صاف معلوم ہوتا تھا کہ الماس کسی نہایت اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری طرف نوجوانی کی دلفریبیوں میں سرشار شوریدہ سہراب تھا، جس کے لئے زندگی گویا نام نہان عیش و مسرت کا۔ اُس کی طبیعت میں ابھی تک لڑکپن موجود تھا۔

لیکن باوجود اس بُعد المشرقین کے اُن دونوں میں ایک قسم کی مشابہت بھی پائی جاتی تھی۔ الماس کی آنکھوں کی چمک — شابہ انزل کی وہ چمک اور نور تھا جس میں وہ دونوں برابر کے شریک تھے۔

سہراب خوش تھا، الماس مطمئن تھی۔ اُس کی تسکین قلب اسی میں تھی کہ وہ خاموشی سے سہراب کو، اُس سہراب کو جس کو اُس نے خود تعمیر کیا تھا، خود بنایا تھا، جو اُس کی اپنی تخلیق تھا چپ چاپ گوشہ عزلت میں سے دیکھتی ہے۔ اُن لوگوں میں سے جو سہراب کو جانتے تھے الماس اور صرف الماس ہی تھی جو اُس کی تصویروں کی سب سے کم داد دیا کرتی تھی۔ سہراب اپنی تصویروں کے متعلق مبالغہ آمیز کلمات سن کر خوش ہوا کرتا تھا۔ لیکن الماس وہی کچھ کہا کرتی تھی — اُس کی رنگ آمیزیوں کی اُسی قدر تعریف کیا کرتی تھی جس کا سہراب اہل تھا۔ اس لئے کہ سہراب کی — اُس سہراب کی جس کے قلم کی ہر جنبش الماس سے لی گئی تھی — تعریف کرنا الماس کے لئے ایسا ہی تھا جیسا وہ خود اپنی تعریف کرے۔

الماس آج سہراب کے کمال کو دیکھ کر نشہ کامیابی سے محمور ہو رہی تھی لیکن آج سے آٹھ سال پیشتر جب اُس

نے سہراب سے شادی کی تھی تو وہ یہ سوچ کر کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کس قدر خطرناک طریق عمل اختیار کر رہی ہے خود بخود کانپ اٹھا کرتی تھی۔ اُس وقت اُس نے اپنی تمام حیات اور جذبات کو سہراب سے پوشیدہ رکھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ اُس کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ایک نوجوان مرد کی آئندہ زندگی کو اپنے ہاتھ میں لے کر موم کی طرح جس شکل میں چاہے تبدیل کر دے۔ کیا محبت اور عشق کے اصول اُس کو اس بات کی اجازت دیتے تھے کہ وہ اپنے محبوب کو اُس روش حیات پر جس پر کہ اُس کی اپنی خواہش ہو چلنے کے لئے کہے۔

بہر حال اُس نے ہر آنے والی ناکامی کو نظر انداز کر کے وہ کیا جو وہ چاہتی تھی۔ اور سہراب بد مہوشی اور بے خبری کے عالم میں، الماس کی محبت کے زبردست اثر کے ماتحت، اُس کی خواہش کے مطابق بنتا گیا، بدلتا گیا اور آہستہ آہستہ اُس نے وہی شکل اختیار کر لی جو الماس کی ایک دیرینہ آرزو تھی: ————— سہراب فرامرز جی بمبئی کا مشہور ترین مصوّر۔

الماس بمبئی کے ایک اعلیٰ پارسی خاندان میں سے تھی۔ وہ ایک بہت بڑی جائیداد کی تنہا مالک تھی بہت سے امیر اور دولت مند نوجوانوں نے اس کے حصول کی کوشش کی لیکن الماس کی بے توجہی نے سب کو بائوس کر دیا اور عین اُس وقت جب وہ اپنے نیا زکلیشوں کے مطالبات سے آزاد ہو چکی تھی اُس نے اچانک سہراب جیسے مفلس اور بے زرخیز شخص کے ساتھ جو عمر میں اُس سے چھ سال چھوٹا تھا شادی کر کے ایک عالم کو ورطہ شہر میں ڈال دیا۔ جس طرح آج رات بہت سے لوگ، جو سہراب کے ہاں جمع تھے، حیران ہو رہے تھے کہ یہ ساکنی پاکہ طبیعت والی عورت جو کونے میں ایک سائے کے مانند بیٹھی تھی کون ہے اسی طرح آج سے آٹھ سال پیشینہ بھی لوگ متعجب تھے کہ الماس ————— بمبئی کی وہ حسین ترین عورت ————— آزاد اور دولت مند الماس سہراب جیسے بے مایہ اور قلم شخص کے ساتھ کیوں شادی کر رہی ہے۔ لیکن الماس خوب جانتی تھی کہ وہ کیوں اُس سے شادی کر رہی ہے۔ اور آج کی رات اُسی ڈر لے کا جس کی ابتدا الماس نے آٹھ سال پہلے کی تھی آخری سین تھا۔

آٹھ سال کے اس طویل عرصے میں الماس نے اپنی دولت، اپنا حسن، اپنا شباب، اپنی محبت سب کچھ سہراب کے لئے قربان کر دیا تھا۔ اس لئے قربان کر دیا تھا کہ سہراب کو ایک کامیاب مصوّر بنا سکے۔ اور اس مقصد کے لئے اُس نے اپنی روح سہراب میں پھونک دی۔ ————— اپنا خون حیات اُس کو دے دیا۔ چنانچہ سہراب ہ خوش باش نوجوان بنے اندر الماس کی روح، الماس کا حسن، الماس کی مصوری، الماس کے جذبات لئے پھرتا تھا۔ اور وہ عورت

میں لے لیا۔ فیروزہ کے تمام جسم میں کیپڑی سی دوڑ گئی۔ اُس کا ہاتھ الماس کے ساتھ مس ہوتے ہی شل ہو گیا۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ ابھی کوئی ایسی زبردست ضرب لگائی جائے گی جو اُس کو کچل دے گی۔ لیکن الماس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور جب وہ بولی تو اُس کی زبان لٹکھڑا رہی تھی۔

”فیروزہ میں ہتھاری شکر گزار ہوں۔ ایسی چیز جو میں مدت سے کھو چکی تھی مجھے آج واپس مل گئی ہے“ اور پھر سہراب کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی ”تم دونوں خوش رہو گے“ الماس کی آواز سسنان خاموشی میں بن سنے ڈوب گئی۔ سہراب نے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اُس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ اُس نے اُس انسانی پیکر کو جو سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی موجودگی کو بھی بھول چکا تھا۔

مگر فیروزہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ ان چند الفاظ میں اُس نے اپنی زندگی کا فیصلہ سن لیا تھا۔ ایک خے اب کسی حالت میں اُس نے الماس کی سیڑھیاں اترنے کی آمہٹ سنی۔ الماس اُن کی زندگیوں میں سے بالکل نکل گئی تھی۔

”تم دونوں اکٹھے خوش رہو گے“ کی آواز فیروزہ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اُس نے خود کو مجبور کر کے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا مگر وہ دیکھنے سے پہلے ہی سمجھ چکی تھی بلکہ وہ مدت سے جانتی تھی لیکن اس کو حقیقت خیال کرتے ہوئے خوف کھاتی تھی۔

اُس نے الماس جیسی عظیم الشان عورت کا منقہ بلکہ کرنا چاہا تھا جو سہراب کی رگ رگ میں سرایت کر گئی تھی، جو اُس کی روح پر حاوی ہو گئی تھی، جس نے سہراب کو خرید لیا تھا۔ فیروزہ نے اس جنگ میں شکست کھائی تھی اور یہ اُس کی سزا تھی کہ اس راز کا خوفناک انکشاف اُس کی عین نظروں کے سامنے ہو۔ وہ سہراب کو برباد ہوتا دیکھے۔ اُس کے حسن کو پامال ہوتا، اُس کے شباب کو لٹتا اُس سے اُن تمام خوبیوں کو جن کا وہ آج تک مرکز تھا چھنتا ہوا دیکھے۔

وہ اُس پر جھک گئی، ایک فوری ناقابل ضبط جذبہ کے ماتحت جھک گئی، اگرچہ وہ جانتی تھی کہ خرم ہستی کے اس خاکستر کو مشتعل کرنا اُس کے لئے غیر ممکن ہے۔

فیروزہ کو معلوم ہو گیا کہ اس کی فتح کس قدر لا حاصل تھی۔ اس پکیا رجعت میں وہ نہیں بلکہ الماس کامیاب ہی تھی۔ وہ سہراب کو اصل سہراب کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اور اکیسے جان چیز کو چھوڑ گئی تھی اور فیروزہ کو یقین تھا کہ سہراب کی یہ رکھ بھی جو باقی رہ گئی ہے ہر جگہ کے پھول کی طرح اپنے سوج الماس کا نقاب کرے گی۔

خادم ہالوئی

(ماخوذ)

حسن خوابیدہ

مے خواب میں محو اک حسینہ
آنکھیں کچھ کچھ کھلی ہوئی ہیں
رقصاں ہونٹوں پہ ہے بنسم
دیکھو سوتے میں اس کا ہنسنا
دیکھو دیکھو وہ شرم آئی
جنبش ہونے لگی لبوں کو
ہونٹوں سے وہ حرفِ آہ نکلا
اے کاش فقط مجھے بتا دے
یہ پھول سا جسم کانپ اٹھا کیوں
سینے پر ہاتھ کیوں یہ آیا
تخیل نے خواب کیا دکھایا

اب پھر خاموش سو رہی ہے
اب بند ہیں آنسوؤں کی ہیں
گردِ بائیں طرف جولی ہے
بھولا بچہ کب ایسے سوئے

سوچیں سے میٹھی نیند سوناں
زیبا کی نیند تجھ پتہ راں

زیبا
(رودلوی)

انجامِ محبت

یہ ڈراما برنرڈ شا کی کتاب "مزخرفات" سے ماخوذ ہے

(مبئی) کا ایک خوشنما حقہ۔ ایک خاتون اپنی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی خادمہ سے بال کندھا رہی ہے۔

رات زیادہ گزر چکی ہے کمرے میں متعدد بجلی کے قمقمے روشن ہیں۔ سنگھار میز کے مخالف سمت والی دیوار

کے قریب ایک چوبی چیز رکھی ہے، جو کتا بوں کی الماری کے مشابہ ہے، اسی کے قریب مردانہ جوتوں کی ایک

قطار لگی ہوئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاتون شادی شدہ ہے۔ سامنے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے،

اور اس کے عین اوپر ایک خوبصورت گھنٹہ لٹک رہا ہے۔ دروازہ سے ملا ہوا ایک ستون نما پتھر پر اس کی دیوار

کا مجسمہ رکھا ہے۔ سنگھار میز پر ایک پنکھا پڑا ہوا ہے۔ دروازے کے قریب ہی کھونچی پر ایک کپڑے کا تسمہ لٹک

رہا ہے۔ کمرے کا جملہ سامان ایک ایسا اثر پیدا کر رہا ہے، جس میں معاشرتی اولوالعزمی کے ساتھ ساتھ کم مائیگی کا

عنصر بھی غالب ہے۔ مکمل خاموشی طاری ہے، صرف خاتون کے بال ٹوٹنے سے کبھی کبھی چٹ چٹ کی آواز آتی

ہے۔ گھنٹے نے گیارہ بجائے

خاتون :- کیوں سوسن بھلا گھنٹے نے کب بجائے؟

سوسن :- بیگم صاحبہ! گیارہ بجے تھے۔

خاتون :- افوہ! گیارہ بج گئے! ذرا میرا بستر کرو تو سو رہوں۔ آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔

(سوسن کتابوں کی الماری کی طرف جاتی ہے، اور ایک ٹبن کو دباتی ہے، الماری کا بالائی حصہ نیچے آ

پڑتا ہے، اور ایک پلنگ کا ہم شکل بن جاتا ہے۔ دور بادل کی گج سنائی دیتی ہے)

سوسن (کانپ کر، اُٹ آج کی رات کس قدر ڈراؤنی ہے۔ خدا معلوم غریب جہاز والوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ میرا اتنا بھی

تنگ گھر نہیں آیا۔ خدا کرے بخیر بیت ہو۔ بیگم بستر تیار ہے۔

خاتون :- شاہا! سوسن تو بڑے کام کی لڑکی ہے، (اُٹھ کر بستر کی طرف بڑھتی ہے)۔

سوسن :- کیا بیگم تبدیل لباس نہ کریں گی؟

خاتون :- نہیں، سوسن، آج نہیں (دروازے کی طرف دیکھ کر) (ان حالات میں نہیں

سوسن، بے اختیار سی کے ساتھ خاتون سے پٹ جاتی ہے، میری پیاری بیگم۔ خدا معلوم آج میرا دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پھر کبھی اپنی پیاری بیگم کو زندہ نہ دیکھ سکوں گی۔ اس فضا میں قتل کی بو آ رہی ہے۔

خاتون: ہاں سوسن، آج خدا خیر ہی کرے، ابھی میں کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی کہ یکایک میں نے فرشتوں کے نغمے سنے۔ خدا معلوم وہ کیا گائے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص کو بلا ہے ہیں۔ مگر میرا نام تو فیروزہ ہے۔ وہ تو کوئی دوسرا نام لے رہے تھے۔

سوسن: فیروزہ نہیں مسز سہراب کہو، یہ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے (پھر اپنی مالکہ سے چپٹ جاتی ہے)

خاتون: اچھا سوسن، اب سو رہو۔ اور اگر مجھے زندہ پاؤ تو صبح ۷ بجے جگا دینا۔

سوسن چلی جاتی ہے۔ فیروزہ روشنی گل کرتی ہے۔ فرشتوں کی آواز پھر کرتی ہے۔ اُن کا نغمہ اس قدر دلکش ہے کہ فیروزہ بہترین گوش بن جاتی ہے۔ کچھ دیر بیٹھی سنتی رہتی ہے، پھر اسی محویت کے عالم میں جوتے اتارے بغیر لیٹ جاتی ہے۔ اور ان نغموں کی شیریں ہم آہنگی اُسے تھپک تھپک کر میٹھی نیند سلا دیتی ہے۔ ایک سفید روشنی اُس کے چہرے پر پڑ کر اُس کے حسین خدو خال کو منور کر دیتی ہے۔ بادل پھر گر جتا ہے۔ ایک سرخ شعلہ دروازہ پر پڑتی ہے۔ یکایک دروازہ آہستگی کے ساتھ کھلتا ہے اور ایک شخص سیاہ لبادہ پہنے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ اُس کے لرزتے ہوئے ہاتھ میں ایک چوڑے پھل کا خنجر چمک رہا ہے اور اُس کی آنکھوں میں ایک غیر فطری روشنی ہے۔ وہ آہستہ قدموں سے فیروزہ کے پلنگ کی طرف بڑھتا ہے۔ خنجر والا ہاتھ فیروزہ کی طرف اٹھتا ہے، اور قریب ہے کہ اُس کے قلب میں پیوست ہو جائے، فیروزہ کو اتفاقاً چھینک آ جاتی ہے۔ قاتل گھبرا کر پلنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکتا ہے۔

قاتل: (پلنگ کے نیچے سے آہستہ آہستہ نکل کر) اُف اب مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ پلنگ کے نیچے لیٹا ہوا اپنے دل کی نزع خیز دھڑکن کو سن سکا رہوں۔ (فیروزہ کی طرف دیکھتا ہے) سنیں، وہ تو بے خبر سو رہی ہے۔ (ایک بار خنجر اٹھاتا ہے۔ فرشتے پھر گاتے ہیں۔ قاتل چھپ جاتا ہے) اُف یہ کیا ہوا؟ کیا اس چھینک کی آواز فلک کے نیلے گنبد کو چیر کر جنت کے نیم وادروں تک پہنچ گئی ہے؟

فیروزہ: (یکایک اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے) میرے مالک! (قوس قزح کے تمام رنگ کیجے بعد دیگرے سہراب کے چہرے پر دوڑنے لگتے ہیں) کیوں؟ کیوں؟ تمہارا رنگ کیوں اڑا جا رہا ہے؟ اور میں؟ تم خنجر سے یہاں کیا کر رہے تھے؟

ہر مرز بن..... ن..... نہیں، میں ڈرتا تو نہیں، مگر پھر بھی —

سہراب :- پھر بھی اگر زہر مرہل جائے تو

فیروزہ :- فوری امید سے متاثر ہو کر زہر مرہ؟

ہر مرز :- (لپٹ کر) زہر مرہ! خدا کے لئے جلد بتاؤ کہ وہ کونسا زہر مرہ ہے۔

سہراب :- اس زہر کا بہترین بدر فرجونا ہے۔

ہر مرز :- چونا؟ — مذاق کرتے ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ میں اپنی جیب میں چونے کی ڈلیاں ڈالے پھرتا ہوں؟

سہراب :- مگر چھت کا پلاسٹر تو ہے۔

(سب چھت کی طرف جوتے پھینکتے ہیں۔ پلاسٹر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نیچے گرتے ہیں۔ ہر مرز بوجھ کی

سے انہیں شک ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونے کی تلخی اور بد مزگی زندگی کی محبت پر غالب آ جاتی ہے)

فیروزہ :- ایک بڑا سا لکڑا اٹھا کر (لوہر مرز پر سے بڑا ٹکڑا ہے) (اُس کے منہ میں ٹھونس دیتی ہے)

ہر مرز :- ٹھٹھرو۔ ٹھٹھرو۔ خدا کے لئے ٹھٹھرو۔

فیروزہ :- ٹھٹھرو نہیں۔ ٹھٹھرا تمہارے لئے موت ہے! ایک اوڑھ لکڑا اٹھونے کی کوشش کرتی ہے)

ہر مرز (مستقل مزاجی سے) میں موت کو اس مصیبت پر ترجیح دیتا ہوں۔

فیروزہ :- تمہیں میری جان کی قسم کھاؤ۔

ہر مرز :- ناممکن۔ اگر ایسا ہی ہے تو پانی میں چونا ڈال کر دو۔ پلاسٹر کو ختم کرو۔ میں اور نہیں کھا سکتا۔

سہراب :- فیروزہ! میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے — تمہارا مجسمہ اوکر کس دن کام آئے گا۔

(سہراب چھت کر مجسمہ اٹھا رہا ہے۔ ہر مرز مجسمہ کی پشت پر سے کچھ حصہ چباتا ہے، حالت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔)

ہر مرز :- نہیں، فیروزہ! تمہارا مجسمہ بھی نہیں، مجھے مرنے دو۔

سہراب :- مجسمہ اُس کے منہ میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے! کھاؤ! کھاؤ! ہر مرز! دل پر چکر کے کھاؤ! تمہاری زندگی اسی پر ٹھٹھرو

ہر مرز :- بے کار! بالکل بے کار! حلق سے تو اترتا ہی نہیں۔ پانی! اسے پانی لاؤ۔ میرے والد (سر پیٹنے لگتا ہے)

(فیروزہ گھنٹی بجاتی ہے، سوسن داخل ہوتی ہے)

سوسن :- آہ! آہ! پیاری بیگم، میں ایک دفعہ پھر تمہیں زندہ دیکھ رہی ہوں! (سہراب کو دیکھتی ہے اور چیخ کر کھانسنے

کی کوشش کرتی ہے۔)

سہراب:- (سوسن کا دامن پکڑ کر) باولی ہوتی ہے دیکھتی نہیں ہرمز کا کیا حال ہو رہا ہے۔
سوسن:- (متروک ہو کر) واقعی؟ تو پھر کیا کروں؟

فیروزہ:- (مجسمہ کے رومے فوراً کسی برتن میں حل کر کے لائے۔ کتے کی چال جا اور بی کی چال آئے ہرمز کی زندگی تیری جلدی پر غصہ کر۔
سوسن (پچکا کر) مگر بیگم تمہارا خوبصورت مجسمہ

ہرمز:- ہشت، دیر نہ کر، دیکھ میں مر رہا ہوں۔ (اسے دروازہ سے باہر کھیل دیتا ہے) پانی، پانی، اُف! میرا صحت خشک ہو گیا۔ میرا جسم پھنکا جا رہا ہے۔ (دیوانگی کے ساتھ سوڈے کی بوتل کی طرف دوڑتا ہے۔)
سہراب:- پاگل! بھولا جا رہا ہے اُس میں زہر ہے۔

ہرمز:- پانی! پانی! اُف! ابلتے لائے پھر بوتل کی طرف بڑھتا ہے۔ سہراب کتے کی کوشش کرتا ہے کشتی ہوتی ہے۔
جدوجہد میں بوتل کا سوڈا گر جاتا ہے۔ ہرمز سہراب کو پیٹ دیتا ہے، اور بوتل اٹھا کر اپنے منہ میں لٹ لیتا ہے، خالی! آہ خالی!
(ایک چیخ کے ساتھ گر جاتا ہے۔ سوڈے کی بوتل ہاتھ میں ہے۔ بچوں کی طرح روتا ہے۔ فیروزہ دوسری سوڈے کی بوتل کھولتی ہے)
ہرمز:- شکریہ! پیاری فیروزہ شکریہ! پیتا ہے گیس نکلنے سے سرسری کی آواز آتی ہے۔ ہرمز اٹھ کر چیخے لگتا ہے) مدد کرو! مدد!
اُف! پلاسٹر الہا رہا ہے۔ اسے میرا پیٹ پھٹا جاتا ہے۔ ہائے (کرب کی حالت میں بستر پر لٹنے لگتا ہے)
سہراب:- جلدی کرو فیروزہ، قسم کھاں ہے؟ (دونوں اُسے کمبلوں میں لپیٹتے ہیں، اور پیٹ کے قریب کس کے
قسم باندھ دیتے ہیں) کیوں ٹھیک بندھ گیا نا؟

فیروزہ:- (تردد سے) ہرمز کیا حال ہے؟

ہرمز:- خطہ گزر گیا۔ سوڈا کام کر رہا ہے۔

فیروزہ اور سہراب:- اللہ تیرا شکر!

(سوسن بالٹی لئے ہوتے داخل ہوتی ہے)

سہراب:- بچ گئے۔ لو پیو۔

(سہراب بالٹی کا کنارہ ہرمز کے منہ سے لگا دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اُس کا پینہ بلند کرتا جاتا ہے۔ ہرمز گھبرا

کر پیتا ہے۔ کبھی کبھی پینہ لگتا ہے تو سوسن کمر ٹھونکتی ہے، فیروزہ آہستہ آہستہ قسم ڈھیلا کرتی جاتی ہے۔ آخر ہرمز مطمئن ہو

کر کہتا ہے اور عورتوں کی گود میں گر جاتا ہے۔ سہراب بالٹی کو ہرمز کے منہ میں جھانسا ہے)

ہرمز: یہ سینی میں کس قدر آرام آرہا ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام جسم میں ایک حسرت بخش سنناٹا ڈور رہی ہے میں ہوتا ہوں۔

فیروزہ
سوسن
سہراب

:- (سرگوشی میں) سونے دوا

روہ سوتا ہے۔ سرمدی گیتوں کی آواز بھر آتی ہے۔ مالک مکان، ایک بازاری آدمی میلہ کھیلا پا جا رہے پہننے ہوئے داخل ہوتا

ہے۔ تمام نغمے ساکت ہو جاتے ہیں،

مالک مکان :- ہے! ہے! یہ کیا ہے؟ کیا شور مچا رکھا ہے؟ بھلا نیند کیسے آئے؟ (فرش اور چھت کی طرف دیکھتا ہے)
ارے یہ چھت کا کیا حال ہو گیا؟

سہراب :- خاموش رہو! کیا سمع خراشی کر رہے ہو۔ دیکھتے نہیں، کہ کمرے میں ایک مریض ہے؟
مالک مکان :- اگر اس غول میں نہیں جگا تو ہمارے بولنے سے کیسے جگے گا؟

فیروزہ :- نامعقول، شمدے، دیکھتا نہیں کہ نیر آلفظ کان کے پرے پھاٹے ڈال رہا ہے چل دفع ہو۔

مالک مکان :- اے باپ سے! یہ توجہ دے آدمی کی شکل نہیں (چلا تا ہے) پلس! پلس! خون! (نیلی روشنی کی)
ایک شعلہ دروازہ پر پڑتی ہے۔ کواڑ کھلتے ہیں۔ سپاہی برآمد ہوتا ہے۔ بادل گر جتا ہے) سپاہی! سپاہی! خون!
اے ان تینوں نے اس مانس کا خون کر دیا۔

سپاہی :- (ناراض ہو کر) سپاہی! اے سپاہی کیا؟ بد تمیز کہیں کا۔

سہراب :- حولد ار صاحب

سپاہی :- (بہت جھک کر) جناب عالی؟

سہراب (بہت ادب سے) میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں، کہ ایک گھنٹہ قبل میرے عزیز دوست پر سونے مضمی کا ایک
شدید دورہ ہوا۔ چونکہ اُس وقت کوئی اور چیز موجود نہ تھی، اور تکلیف بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے
اس شخص کی چھت کا کچھ حصہ کھالیا۔ (دہر مزی طرف اشارہ کر کے) نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

سپاہی :- چھت زہر آلود تھی۔ (والد خوب چالاک کی۔) مالک مکان کی گردن پکڑ لیتا ہے، میں تم کو قتلِ عمد کے الزام میں فدا کرتا ہوں۔
مالک مکان :- (رو بفلک) ہے پریشور! برٹش راج میں بھی اب ایسا ہونے لگ گیا۔ بھلا حولد ار جی مجھے کیا پتہ تھا کہ
یہ میری چھت کھا لیوے گا؟

سپاہی :- ہاں! واقعی۔ واردات بہت پیچیدہ معلوم ہوتی ہے۔ دہر مزی کا بازو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے مگر کامیابی
نہیں ہوتی، اے یہ تو بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔

مالک مکان :- (ہر مزکی ٹانگ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے) اور بھاری کتا ہو گیا ہے ۔
 سہراب :- (بستر کی طرف بھاگتے ہوئے) کیوں؟ کیوں؟ خیریت تو ہے؟
 فیروزہ :- سوسن ذرا بھاگ کر ڈاکٹر کو تو بلاؤ، سہراب! سہراب! دیکھو ابھی تو جان باقی ہے نا؟ جگلنے کی کوشش
 کرو۔ بلاؤ۔ جلدی کرو۔

سپاہی :- (دوبارہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، مگر پسینہ پسینہ ہو کر رہ جاتا ہے) پناہ بخدا ایہ آدمی ہے یا پتھر!
 (فیروزہ چیخ کر ہر مز کے جسم کی طرف بڑھتی ہے)
 فیروزہ :- داتھی! اپلا سٹرگ وپے میں سرایت کر چکا ہے حوالدار کا کنا ٹھیک ہے، یہ تو پتھر سے زیادہ بھاری ہے!
 (ہر مز کے مردہ جسم پر گر پڑتی ہے) سہراب چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر ہچکیاں لیتا ہے۔ سوسن اور
 ڈاکٹر داخل ہوتے ہیں)

سوسن :- بیگم ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔

سپاہی :- جناب ایک شخص کو زہر مار دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر :- کیا کہا؟ میرے علاقہ میں قانون کی خلاف ورزی کر کے کسی دوسرے شخص سے زہر خریدا گیا۔

سپاہی :- (فیروزہ کو آہستگی سے اٹھا کر) واقعہ تو اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے! بیگم ذرا اٹھو تو۔

ڈاکٹر :- وقت ضائع نہ کرو، مریض کو بیدار رکھنا چاہیے۔ شدید اور مستقل حرکت نہایت ضروری ہے۔

(فیروزہ کو سپاہی کے ہاتھوں میں سے چھین لیتا ہے) اور بری طرح چکڑ دیتا ہے)

سہراب :- ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ وہ مریض نہیں ہے۔

ڈاکٹر :- اچھا تم ہو۔ تو پہلے سے کیوں نہ کہا؟

(سہراب کو پکڑ کر کمرے میں دوڑانے لگتا ہے)

مالک مکان :- نہیں! نہیں! وہ نہیں!

ڈاکٹر :- تو تم ہو۔

(مالک مکان کو پکڑ کر زور زور سے ہلاتا ہے) مالک مکان! رکنے کی کوشش کرتا ہے دونوں گرتے ہیں سپاہی

دونوں کو علیحدہ کرتا ہے)

سپاہی :- اچھا! اٹھانے چلو! اب میرے پیچھے پیچھے آؤ۔

(بادل گر جاتا ہے)

فیروزہ :- کیا اس لرزہ خیز طوفان میں؟

(کھڑکیوں پر موٹے موٹے قطرے گرتے ہیں۔)

سوسن :- بارش ہو رہی ہے۔

(اندھیا چلتا ہے، بجلی چمکتی ہے)

سہراب :- اس وقت تو باہر نکلنا خطرہ سے خالی نہیں۔

سپاہی (سیٹی بجاتے ہوئے) اگر تم فوراً نہ چلے تو

(سیٹی بجاتا ہے۔) یکایک آسمانی توپیں چلنے لگتی ہیں۔ شدید روشنی نظر آتی ہے اور بجلی کرے میں اُتل

ہو کر سپاہی کی بچڑی پر گرتی ہے۔ وہاں سے ڈاکٹر کی واسکٹ کی طرف جاتی ہے، باقی ماندہ مالک مکان

کے بھڑے اور ناہموار جسم میں جذب ہو جاتی ہے۔ سوسن، سہراب، اور فیروزہ، خوف و ہراس سے تمام منظر کو

دیکھتے ہیں۔ بجلی کے تینوں شکلاتر پٹے ہیں، تلملاتے ہیں، پھر مردہ ہو کر غالیچ پر گر جاتے ہیں۔ کچھ دیگر گور جاتی ہے)

فیروزہ :- زندگی کے ہدیان خیر بخار کے بعد تینوں آرام سے سو رہے ہیں۔ سوسن، دیکھو کتنا کوڑا ہو گیا ہے، ذرا فرش صاف کر دو۔

(سوسن پکھا اٹھا کر آہستہ آہستہ جھلتی ہے۔ تینوں جسم اڑا کر دیوار کے قریب ہو رہے ہیں)

سوسن :- کیوں، بیگم؟ ٹھیک ہے، یا جھاڑو سے سمیٹ کر باہر پھینک دوں؟

فیروزہ :- نہیں! اس وقت تو رہنے دو۔ صبح کو دیکھا جائے گا، جاؤ سو رہو۔

(سوسن جاتی ہے)

فیروزہ :- سہراب، اپنے دوست کی آخری رسم ادا کرو۔ وہ خود اپنی یادگار بن گیا ہے۔ آؤ اسے ستون پر نصب

کر دیں۔ گو جسم بہت بھاری ہے، مگر محبت اور دوستی بہت کچھ کر سکتے ہیں؟

(کوشش کر کے اُسے اٹھاتے ہیں اور ستون پر پکھڑا کر دیتے ہیں)

فیروزہ :- (ستون کے دائیں طرف دو زانو ہو کر) پیارے ہرمز! خدا کو سونپا۔

سہراب :- (عجبہ کے باتیں جانب جھک کر) ہرمز میرا قصور معاف کرنا! الوداع۔

(فرشتے لگاتے ہیں، ہرمز کا عجبہ دونوں ہاتھوں کو جنبش دیتا ہے، اور بے جان چہرہ آسمان کی طرف اٹھاتا

معین الحق حقی

ہے پردہ گر جاتا ہے)

مخملِ ادب

فرشتے کی سیر

مشتاق تھا جو اک مدت سے اس دنیا کے نظائے کا
پھر موج ہوا میں ہلکا سا اک شور سنائی دیتا ہے
جب خوب نظر جم جاتی ہے انسان نظر آتے ہیں اُسے
انسان کا انسان دشمن ہوا اک ایک کو کھائے جاتا ہے
اُس تارے سے بھی ناواقف جس تارے میں یہ رہتا ہے
نولاد گلایا جاتا ہے تلواریں ڈھالی جاتی ہیں
درس امن و امان کا دینے کو توپوں کے دھانے کھلتے ہیں
اس خون کے پیلے سے حیوان کو مطلب ہے فقط خور و پزی
و جد آتا ہے خونی انسان کو حلقے میں تڑپتی لاشوں کے
ایوانِ طرب کی قبروں پر بنیادیں قائم ہوتی ہیں
تاریک نظر آتی ہے اُسے گردوں پر جسیں انسانوں کی
فطرت ہی میں ہے خود اس کا جواب آئین جہاں پر غور کرو
تھی معترضانہ اُس کی روش خوبی کا خزانہ پائے سکا
گرنے کا تصور کرتے ہو ہر کام پہ ٹھوکر کھا ڈنگے
اب منظرِ عالم روشن ہے اب بزمِ جہاں نورانی ہے
موتی کی طرح ہر آنسو میں متابِ بستمِ غلطاں ہے
پڑ مردہ ولی کے سینے میں بتیاب میں غنچے کھلنے کو
اُتنی ہی مددِ نیکی سے نزدیک تر آتی جاتی ہے

اک پاک فرشتے نے آکر در کھولا اک تارے کا
پہلے تو اسے کچھ دھندلا سا اک اغ دکھائی دیتا ہے
اول تو یہ دھبوں کی طرح میدان نظر آتے ہیں اُسے
کیا دیکھتا ہے وہ دنیا میں نفرت کا نشان لہراتا ہے
”انسان“ یہ کیسی ہستی ہے کیا کرتا ہے کیا کہتا ہے
دنیا میں طرب کی تدبیریں کیا خوب نکالی جاتی ہیں
قوموں پر فلاکت لانے کو شاہوں کے خزانے کھلتے ہیں
برگیا نہ ہے نقلِ انسانی کو نبین کی دل آویزی سے
سنجیدہ ترین افراد میں بھی انداز ہیں بیاں و باشوں کے
فاتح کو تبسم آتا ہے جب سپا تو ہیں روتی ہیں
معصوم فرشتہ روتا ہے تقدیر پر ان نادانوں کی
اک امر ہے لیکن غور طلب اے نوعِ بشر کے چارہ گرد
عیبوں پر فرشتے کی تھی نظروہ عیب سے باہر جانا نہ سکا
قانون یہ ہے اس دنیا کا جو ڈھونڈو گے سو پاؤ گے
دیکھو تو فرشتے نے اس کے تحقیق کی دل میں ٹھانی ہو
اس مرتبہ وہ کیا دیکھتا ہے ہر ذرۂ عالم تاباں ہے
اس جنگ و جدل کے حیلے سے بے چین ہیں قیاس طے کو
جتنی بھی یہ دنیا اپنی شرارت سے بڑھاتی جاتی ہے

فطرت کا نظام تعمیری ہے گرم عمل طوفانوں میں
ہر موج تباہی کے اندر جبروت حیات انساں ہے
ہر چیز میں ہے سرگرم پیش خورشید عروج انسانی
ہر ذرہ خاکی رکھتا ہے اک خاص مقام اس عالم میں
مصرف ہیں سارے نقص یہاں انساں کے مکمل کرنے میں
زہر آب کے دل میں خواہش ہر تریاق کا دریا بننے کی
تلواریں رکھی رہ جائیں گی پُر بول عجاب خانوں میں
قلعوں کے یگنبد سر فلک آئینہ کی طرح بہ جائیں گے
پستی کے دھوئیں سچکیلے مینار ابھرتے آتے ہیں
درہل وہ روح عالم کی ہمت شکنی کا مجرم ہے
پرواز کو بازو پھیلائے اور باہر فلک سے دمی یہ ندا

سینے سے اندھیری راتوں کے ٹپتی ہے ضیا انساں میں
ہر نقص کی بزم ظلمت میں تکمیل کا شعلہ لرزاں ہے
بادل کی گرج ہو یا نغمے شب ہو کہ صبح نورانی
ہر حلقہ اپنی خدمت پر مامور ہے زلف برہم میں
سرگرم ہے روح جنگِ جہل تیغوں کے معطل کرنے میں
دھن سادگی، امروز کو ہے گلہ کا رمی فدا بننے کی
رہ جائیں گے قتل و غارت کے اذکار فقط افسانوں
مٹ جائیں گے نقشِ ظلمت کے آثار ضیاء رہ جائیں گے
دیکھو وہ فلک سے طیارے غاروں میں اتارے آتے ہیں
کہتا ہے حوادث کو جو براہم در نہیں ہے ظالم ہے
المختصر ان ہنگاموں کو جب خوب فرشتہ دیکھ چکا

انساں کو خبر دو فطرت کے ارمان نکلنے والے ہیں
لوہے کی جبین سے چاندی کے فوارے چلنے والے ہیں

”نیزنگ خیال“

ترجمہ

یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم و فنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں
کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے۔ اور زندہ اقوام کی سعی و کوشش کے نتائج کو اپنے اندر جذب کر کے
اپنے علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے۔ چنانچہ قدامتِ عرب کے اپنی ترقی کے زمانے میں یہی کیا کہ دوسری اقوام کے علمی
خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کر لیا اور ان کے جواہر ریزوں کو اپنی زبان کے نقش و نگار میں برتا۔ یہی باعث ہے
کہ علوم قدیمہ میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس سے عربی کا خزانہ خالی ہو۔

یہاں نزدیک ترجمے کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا
جائے ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے پہلے پنچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے

کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔

اس تعریف کی رُو سے یہ امر بلاشبہ شک ثابت ہوتا ہے کہ ترجمے میں مترجم پر مصنف کے خیالات کی پابندی فرض ہوتی ہے، اس کے الفاظ و محاورات اور اس کے اسلوب بیان کی تقلید فرض نہیں ہوتی۔ اگر ان باتوں کی پابندی ضروری ہوتی تو اصل زبان میں کیا برائی تھی کہ رحمت ترجمہ گوارا فرمائی جاتی۔

مترجم اور مصنف میں کچھ فرق نہیں، دونوں کی حدیں ایک مقام پر جا ملتی ہیں۔ کامیاب اور قابل تقلید مترجم وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں مصنف بننے اور تصنیف کرنے کی صلاحیت مضمر ہوتی ہے اور ترجمے کی گونا گوں مرداریوں سے وہی شخص عمدہ برا ہو سکتا ہے، جس نے انداز بیان پر اس سے بڑی قدرت حاصل کر لی ہو کہ جس مطلب کو جس پہلو سے چاہے ادا کر جائے۔ بہترین مترجم وہی بزرگ ثابت ہوئے ہیں جن میں یہ قوت بوجہ انم موجود تھی، لیکن جن لوگوں میں یہ قوت کم تھی وہ کامیابی اور شہرت کے میدان میں اسی قدر پیچھے رہ گئے جس قدر اس قوت میں کمی تھی۔ جو لوگ مصنف کے انداز بیان کی تقلید سے انحراف کرنے اور ترجمے میں تعارف سے کام لینے کی قوت نہیں رکھتے ان کی ادبی زندگی محض عارضی اور چند روزہ ہوتی ہے، بلکہ مرنے سے پہلے ہی ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حیاتِ بادی اور شہرتِ سرمدی ان ہی بزرگوں کا حصہ ہے جو منظرِ عام پر جلوہ گر ہونے سے پہلے کمالاتِ صوری و معنوی سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور شب و روز کی متواتر اور جا لکا ہ محنت سے اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کر لیتے ہیں جو ادائے فرض کے لئے ضروری اور لازمی ہوتی ہے۔

”اردو“

خداے محبت کے حضور میں

جس طرح زمین کو متور کرنے کے لئے سورج کی کرنیں ہوا کی ہزاروں چادروں کو چیرتی ہوئی اُس تک پہنچ جاتی ہیں اسی طرح اے میرے مہرِ درخشاں مجھے آجا کر کرنے کے لئے تیری محبت کی نورانی موجیں میری سینکڑوں لہری کشتیوں کے پردوں کو چھلنی کرتی ہوئی میری روح تک آگئی ہیں۔

مجھے تیری محبت نے دی جائے۔ اور حوادثِ زمانہ کے سپرد کر دیا جائے۔
مجھے تیری محبت نے دی جائے۔ اور ہزار ہا روحِ فرسا و افحات سے دوچار کر دیا جائے۔
مجھے تیری محبت نے دی جائے۔ اور مصائب کے طوفان میں اپنی تنگ نایا جائے۔ میں ذرا دیر کے لئے

آنکھیں بند کر کے تمام پریشانیوں کو سرتوں میں تبدیل کر سکتا ہوں۔ میں دل پر صرف ایک دفعہ اپنا کانپتا ہوا ماتھ رکھ کر شاہد کے تمام خوفناک اثرات کو فراموش کر سکتا ہوں اور کر لوں گا۔

میرے سینے کو تلوار کی تیز دھار سے چاک کر کے اس میں سے تمام چیزیں نکال لی جائیں اور ہر چیز کی بجائے تیری تمنائیں بھردی جائیں۔ میں اپنی ان چیزوں کو کبھی واپس لینے کی خواہش نہ کروں گا۔ میری رگ رگ کو نوکِ نشتر سے کھول کر اس میں سے تمام خون نکال لیا جائے اور اس کی بجائے تیری شرابِ محبت کی موجیں دوڑادی جائیں میں لہو کی ایک بوند بھی کبھی کسی سے نہیں مانگوں گا۔ میری آنکھوں کے پردوں پر تیری تصویریں کھینچ کر قائم کر دی جائیں۔ میری زبان کے ہر حصہ پر تیرا نام کھدوا دیا جائے میں پھر دنیا کے رنگیں سے نگیں منظر کو بھی دیکھنے کی نمانہ کروں گا۔ میں پھر دنیا کے شیریں سے شیریں گفتگو کرنے والے سے بھی بولنے کا آرزو مند نہ ہوں گا۔

”علی گڑھ میگزین“

پشتو کی تشبیہیں

ادھر بار ہے اور ادھر غیر ہے ————— یہ گل ہے اور وہ خار ہے
 ادھر حبیب ہے اور ادھر قریب ہے ————— یہ گنج ہے اور وہ مار ہے
 ادھر عشق ہے اور ادھر عقل ہے ————— یہ غم ہے اور وہ غم خوار ہے
 ادھر بحر ہے اور ادھر وصال ہے ————— یہ خزاں ہے اور وہ بہار ہے
 ادھر طاعت ہے اور ادھر معصیت ہے ————— یہ نور ہے اور وہ نار ہے
 ادھر عالم ہے اور ادھر جاہل ہے ————— یہ خفتہ ہے اور وہ میدار ہے
 ادھر رحمت ہے اور ادھر جانناں ہے ————— وہ طبیب ہے اور یہ بیمار ہے

دیوان عبدالرحمان

نئی کتابیں

مطلع انوار۔ یہ منشی ہماراج بہادر صاحب برق دہلوی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں چودھری جگت ہلال صاحب وال کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں مصنف کے حالات اور ان کے کلام کے محاسن سے روشناس کرایا ہے اس کے بعد حضرت اصغر گونڈوی کا دیباچہ ہے جس میں کلام برق کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے نظمیں تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ تمام کتاب اڑھائی سو صفحات پر ختم ہوئی ہے مصنف کی تصویر بھی شامل کتاب ہے، کتابت طباعت کاغذ اور سرورق عمدہ ہیں قیمت ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے۔

مطلع انوار میں صرف وہ نظمیں درج ہیں جن کا تعلق مظاہر قدرت، اخلاقیات، قومیت اور تاریخ سے ہے۔ اس کے علاوہ ایسی نظمیں بھی ہیں جو دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ غزلیں اس مجموعہ میں شامل نہیں۔

حضرت برق کی زبان دہلی کی کھسالی زبان ہے۔ ان کی لائے بیان میں صفائی اور بندش میں جتنی ہے تشبیہات استعارات ان کی خصوصیت ہے اور وہ جس بات کو لکھتے ہیں محسوس کر کے لکھتے ہیں ”حسن فطرت“، ”جلوہ بحر“، ”مٹھی کا چراغ“، ”کرک شتاب“، ”گنگا جی“، ”جوش بہار“ وغیرہ ایسی تابان و درخشاں نظمیں ہیں کہ مجموعہ حقیقت میں مطلع انوار بن گیا ہے۔ ذوق ادب رکھنے والوں کو اس کی پوری قدر کرنی چاہئے۔ لئے کا پتہ: منیجر آریہ بک ڈپو، منیٹرک، دہلی۔

ہندی اردو مال۔ پنڈت ہری ہر صاحب شامتری، پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کلج، حیدر آباد دکن کی تالیف ہے، جسے ہندی اردو کی پہلی کتاب کہنا چاہئے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو جاننے والے اس کو پڑھ کر خود بخود ہندی سیکھ لیں۔ یوں تو ہندی کی متعدد کتابیں طبع ہو چکی ہیں لیکن اب تک اس انداز کی کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی۔ اسے حروف بجل سے لے کر چھوٹی چھوٹی کمانیوں تک ایسے پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ ہندی الفاظ کی پہچان، تلفظ اور معانی بغیر کسی دقت کے سمجھ میں آ جاتے ہیں، اور انسان چند روز میں معمولی ہندی پڑھ لکھ سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب اس سلسلہ کی اوکنا میں بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لئے جو حضرات بلا استاد ہندی سیکھنا چاہیں ہم ان سے یہی کہیں گے کہ انہیں پروفیسر صاحب کی کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب کے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہندی اردو مال کی قیمت چھ آنے ہے۔

شرح اللہ۔ اسی صفحہ کا یہ رسالہ مولانا مولوی احمد علی صاحب نے تحریر فرمایا جو اور اسے شعبہ تالیف اشاعت انجمن خدام اللہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ فاضل مولف نے اس میں حضرت ابی العزیز کے اسرار الحسنی کی شرح فرمائی ہے شرح مختصر اور جامع ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے انسان کو خدا تعالیٰ کی سچی اور اسی پہچان حاصل ہوتی ہے۔ دو آنے۔ کھٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔

محبت کا انتقام (نامک) - - - - - عمر
قوس قزح رکمانیاں - - - - - عمر
آزیری محبٹریٹا (پرلطف کا طری) - - - - - عمر
زہر بلا آب حیات (ناول) - - - - - عمر
راج سنگھ (ناول) - - - - - عمر
سنگیت مہاجرات (نامک) - - - - - عمر
چشم و چراغ (تازہ تصنیف رکمانیاں) - - - - - عمر
صبح وطن رکمانیاں - - - - - عمر

بچوں کیلئے دلچسپ کہانیاں آسان عبارت میں

پارس با تصویر جلد اول رکمانیاں - - - - - ۱۶
اربت (با تصویر رکمانیاں) - - - - - ۸
پارس حصہ دوم (۴) - - - - - ۱۹
دنا کے عجائبات (با تصویر) - - - - - ۸
پارس حصہ چہارم (۴) - - - - - ۱۴
بچوں کیلئے ہتھوپیش - - - - - ۱۰
شاہزادہ ساگر - - - - - ۸
بچوں کیلئے مہاجرات (با تصویر) - - - - - ۱۴
پھول ولی (ناول) - - - - - ۸
ہارنشی کی پیاری باتیں (با تصویر) - - - - - ۶
بچوں کیلئے رامائن (با تصویر) - - - - - ۸
بتم و سہراب (ناول) - - - - - ۸

آنکھوں کے سامنے پیش کیا ہے کیا عجیب شخص ہے۔ ہر شخص سے نیکی کرتا ہے
ہر جگہ نیکی کرتا ہے اور پھر اپنا احسان نہیں سمجھتا۔ سوچتا ہے میں نے اپنا فرض ادا
کیا ایسے صاف دل کا آدمی جب اپنے ساتھ دنیا کا ظالمانہ سلوک دیکھتا ہے
تو کیا کرتا ہے۔ یہ حصہ کتاب کی جان ہے۔ پڑھ کر دیکھئے۔ آپ خوش ہو گئے
کر آپ نے اس کتاب کو پڑھا و قیمت - - - - - عمر
یہ دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے جس پر پنجاب گورنمنٹ
بہارستان نے اسے سات سو روپیہ انعام دیا و قیمت - - - - - عمر

دیگر تصنیفات مہاشہ مدرش جی

تہذیب کے تازیانے (دیباچہ) - - - - - ۱۲
چند رکمانیاں - - - - - عمر
قوم پرست (دلکش ناول) - - - - - عمر
بگینا و مجرم (ناول) - - - - - عمر
من کی موج (اعلیٰ کہانیاں) - - - - - ۱۲
گلدستہ سخن (انتخاب نظم) - - - - - ۸
سدا بہار پھول (کہانیاں) - - - - - ۱۲
قدرت کے کھیل (ناول) - - - - - عمر
خوش انجام (ناول) - - - - - ۴
چنگیاں تفریحی - - - - - ۶

عرض حال

مولانا محمد عبدالحمید صاحب خرمیر سے محترم بزرگ دوست تھے۔ آپ کے بیش بہا مضامین میں نے تو ہمارے شریک کے نام سے سات جلدوں میں
شائع کئے ہیں۔ جن دونوں مولانا مرحوم انگلستان تشریف لے گئے آپ کی غیر غاضبی میں ہندوستان کے اکثر مطابع نے ان کی پہلی تصنیفات کو
بلا اجازت چھاپنا شروع کر دیا گو یہ بھی ایک بڑا بھاری اخلاقی اور قانونی جرم تھا مگر اس پر مزید غصہ یہ کیا کہ غلط فہمی اور چھاپائی کا کچھ خیال نہ کیا گیا غلط
سلوک چھاپ کر روئے جوتے شروع کر دیئے۔ مجھے کتابوں کو اس طرح غارت ہوتے دیکھ کر سخت رنج ہوا۔ اس لئے میں نے بلا اجازت ان کتابوں کو چھاپنا
شروع کیا ہے اور قیمت بھی ہموار رکھی ہے۔ اب جبکہ آپ کو یہ کتابیں عمدہ صورت میں اور بازاری مطابع کے نرخ پر ہی ملیں گی تو رومی غلام کتابوں کے
خرید سے احتراز فرمائیں۔
(آپ کا دعا گو۔ سید مبارک علی شاہ گیلانی بولوی خاص مرنگلا بٹو)

دکن دارالعلوم - دکن دارالعلوم علیہ السلام نے اعلیٰ مضامین کے قابل بدین علم نمبر
ملک العرب ورجینا - اسلامی جوش، جن فتن، تصنیفیں ملتی جاگتی تصویریں - - - - - ۱۰
حسن انجلینا - روم درس کی راہی، کامیاب محبت کا بیان - - - - - ۱۰
مصور مہربان - عشق و محبت کا دردناک انجام - - - - - ۱۰
دلچسپ ہر دو حصہ - مولانا شریک سب سے پہلی تصنیف - - - - - ۱۰
جوبی قسمت - رینڈ کے لئے بلبلن، ناول کا دلکش ترجمہ - - - - - عمر
فراق و سرور - حنفیہ و سیرت (درمطبع) - - - - - ۸

فراق و سرور - حنفیہ و سیرت (درمطبع) - - - - - ۸

دیگر تصانیف مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرم مرحوم

تاریخ سوانح عمری اور لکچر وغیرہ

فتح اندلس - اسپن پر عربوں کا حملہ - - - - -	عمر
رومتہ الکبریٰ - روم پر گاتھ لوگوں کا حملہ - - - - -	عمر
مفتوح فاتح - ایک نہایت دلچسپ تاریخی ناول - - - - -	عمر
خلیائنا - ارض طرابلس الغرب پر صحابہ کا حملہ - - - - -	عمر
فلور فلور نڈرا - ہسپانیہ کے عہد خلافت کے واقعات - - - - -	عمر
قیس و لبنی - مشہور عاشق عرب اور اس کی معشوقہ لبنی - - - - -	عمر
لعبت چین - عہد صحابہ کا تاریخی ناول - - - - -	عمر
مقدس نازنین - ایک حسینہ کا پوپ بن جانا - - - - -	عمر
ماہ ملک - عورتوں کا عروج اور فتوحات - - - - -	عمر
یوسف نجمہ کامل - جگ بیتی نہیں آپ مٹی - - - - -	عمر
ایام عرب - جاہلیت عرب کی مکمل تصویر پر دو حصہ - - - - -	عمر
جویائے حق - حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بطور ناول حصہ اول و دوم ۱۲۱۲ء کامل - - - - -	عمر
زوال بغدادیہ سنیوں کی نا اتفاقی کا عبرتناک نتیجہ بغداد کی تباہی - - - - -	عمر
شوقین ملکہ - دوسری صلیبی لڑائی - - - - -	عمر
طاہرہ - نہایت دلچسپ تازہ ناول - - - - -	عمر
مینا بازار - مولانا کا سب سے اچھا ناول - - - - -	عمر
نیکی کا پھل - نہایت دلچسپ آخری تصنیف - - - - -	عمر
الفانسو - ایک عاشقانہ ناول - - - - -	عمر
بابک خرمی - سلطنت عباسیہ کے حالات ہر دو جلد - - - - -	عمر
جنید بغدادی - حضرت جنید کے حالات - - - - -	عمر
ابوبکر شبلی - حضرت شبلی کے حالات - - - - -	عمر
حسن بن صباح - بانی فرقہ باطنیہ کے حالات - - - - -	عمر
خواجہ معین الدین - خواجہ امیری کے حالات - - - - -	عمر
ملکہ ز فوہیہ - سلف کی ایک عربی نژاد ملکہ - - - - -	عمر
سکینہ بنت حنین - جناب سکینہ بنت امام حسینؑ کے حالات - - - - -	عمر
خرقہ العین - ایران کی مشہور مجتہد زادی کے حالات - - - - -	عمر
ولادت سرور عالم - مولانا شریف مصطفیٰ علامہ ابو القریح ابن جوزی کا ترجمہ نشر کا نظم کا نظم میں - - - - -	عمر
سفر نامہ امام شافعی - امام محدث کے سفر کے حالات - - - - -	عمر
سیر سیدی دینی برکتیں - - - - -	عمر
قانون وراثت اسلام پر مولانا کا ایک لکچر - - - - -	عمر
ہندوستان کی موسیقی - - - - -	عمر
شامی اثنین - حضرت صدیق اکبرؓ کے حالات - - - - -	عمر
ذمی التورین - حضرت عثمانؓ کے حالات - - - - -	عمر
ابوالحسنین - حضرت علیؓ کے حالات - - - - -	عمر

تاریخی ناول

عزیزہ مصر - عہد بنی طولوں کا تاریخی ناول - - - - -

تصانیف مصوٰر غم علامہ راشد الخیری دہلوی

سمرنا کا چاند - پہلی بار چھپتے ہی اتنی جلدی ختم ہوئی کہ چھ ماہ کے اندر سمرنا کا چاند - - - - -	عمر
اب بھر تھوڑی سی جلدیں باقی ہیں جلد طلب فرمائیے - یہ کتاب تربیت نسلوں کے لئے ایک سبق آموز اضافہ ہے و قیمت - - - - -	عمر
آفتاب دمشق - عہد صدیقی کا اسلام - ایک حسینہ کا اسلام پر شیدا ہو کر مسلمان ہونا - یہ کیا جاننا اور تفصیل کے لکھنا - - - - -	عمر
پرسے گئے جانے پہنچے اسلام سے مرتابی ذکر نا جوش اسلامی - - - - -	عمر
اسلامی، عدل اسلامی کا نوٹہ آپ کو اس کتاب کے مطالعے سے ملے گا - دوبارہ چھپی ہے لکھائی چھپائی سرورق نہایت دیدہ زیب و قیمت - - - - -	عمر
محبوبہ خداوند - - - - -	عمر
یاسمین شام - - - - -	عمر
صبح زندگی - - - - -	عمر
شام زندگی - - - - -	عمر
شب زندگی - - - - -	عمر
نوحہ زندگی - - - - -	عمر

بنت الوقت	۸	جوہر قدامت	۸	ماہ عجم	۸	منازل السارہ	۸
مراب مغرب	۸	طوفان حیات	۸	سجود	۱۰	گوہر مقصود	۶
سات درجوں کے اعانے	۶	موودہ	۸	سوکن کا جلاپا	۶	دور شوار	۱۰
الہ ہدایتی بول بنت رسول کی تلاوت	۱۲	شب زندگی حصہ دوم	۸	جوہر عصمت	۶	فسانہ سعید	۱۰
عروس کر بلا	۸	تائید غیبی	۸	رواد قفس	۶	امت کی مائیں	۸
انگوٹھی کا راز	۸	ارکھوں کی افشا	۱۲				

نامور مصنفین کی مقبول تصنیفات

سیرت النعمان مصنف علامہ شبلی نعمانی مرحوم بیسی یہ کتاب علامہ کر وروں حنفی مذہب مسلمانوں کو امام غلام اور ان کے نامور و متاثرہ گروں کے حالات و مسائل سے آگاہ کیا۔ ویسے ہی یہ کتاب مختلف مطابع نے چھاپ کر بیسی ردی کر دی تھی کہ دیکھ کر دماغ پریشان ہو جاتا تھا۔ ہم نے اسکی نہایت عزیز سے صحت کی اور اس پر حاشیہ بھی تحریر کیے۔ اور دو قسم کے کاغذ پر چھپوائی، قیمت قسم اول دو روپے و عاشر قسم دوم (۸ روپے) مستقبل اسلام پر وفیر و امیری جو بہت عرصہ تک اسلامی دنیا میں رہا۔ اور سیاسی و مذہبی مصلحت سے مستفید ہو کر ایک مکرر ادارہ تصنیف مغربی تمدن اور شرقی ممالک شائع کی۔ اس کا مشرف و مصائبی نے (علیگ) سولت نیلی جتھری و ہزارم کی گرفتاری نے نہایت مقبول ترجمہ فرمایا، اور حاشیہ بھی لکھے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسلام کی آئندہ حالت مغربی نقطہ نظر سے دیکھنا ہوتا تو اس کو ملحوظ فرمائیے۔ آجکل اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت

ذکر فتح اندلس اس کتاب نایاب تھی اور حالات قابل مطالعہ تھے۔ اس نے ترجمہ کر دیا، اور اس میں عربی کو بھی منسلک کر دیا، واقعی قابل و مؤثر ترجمہ ہے قیمت صرف بارہ آنے (۱۲ روپے) عربی صرف و نسخہ میں اردو کتاب، خیال کی تشریح اور توضیح جو کہ حسنیہ مصنف نے اس کتاب میں فرمائی۔ بڑی بڑی کتابوں میں بھی کیا جانی جاوے گی۔ قیمت

ملنے کا پتہ منیجر گیلانی الیکٹریکس کبڈ پوسپتال وڈلہو

تصنیفات احمد حسین خان صاحب ایڈیٹر رسالہ شباب لاهور

۱۵۔ یہ فاضل مصنف کے بہترین ناولوں میں سے ایک اعلیٰ پایہ کا درد انگیز ہوشربا اور نتیجہ خیز افسانہ ہے۔ یہ ناول مستورات کو خاص شوق سے پڑھنا چاہئے تاکہ معلوم ہو کہ وہ لڑکیاں جو خود سر جو جاتی ہیں اور ناقصت انڈیا

میں۔ اور والدین کے حکم سے باہر جاتی ہیں اپنی زندگی برباد کرتی ہیں ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ شمع سحر ۱۲۲۔ ایک انگریزی ناول کا قابل قدر اور ترجمہ مترجم کے کوشش

۱۲۳۔ شمع سحر ۱۲۴۔ کر کے قصہ کو لکھنے کے مذاق کے مطابق بنا دیا ہے۔ اس کتاب انگلستان کے ایک مشہور مصنف ناولٹ کی تصنیف ہے اس کتاب کی خوبی کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی

کی فہرست میں شامل ہے جس پر یہ کتاب ہے اسی پایہ کا یہ ترجمہ ہے۔ پڑھنے سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اور پختہ تصنیف معلوم ہوتی ہے ۱۲۵۔

۱۲۶۔ قابل دید عجیب غریب ناول ہے۔ خصوصاً اگر عورت کی

پیری بانو ۱۲۷۔ محبت، ایثار، ایمان داری، امانت کا تذکرہ نہایت مؤثر

پیرا میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت - - - - - ۱۲۸۔ ایک لڑکے کا باپ فوت ہو جاتا ہے ماں دوسرا نکاح

اپنی بیٹی ۱۲۹۔ کر لیتی ہے۔ بچے کو اس موقع پر چونتیس روز تک بغیر برداشت

کرتی پڑتی ہیں انکو پڑھکر بدن کے روٹنے لگتے ہوتے ہیں آخر میں خداوند تعالیٰ

کے فضل سے کامیاب لائق گرجو بیٹ بن جاتا ہے۔ نہایت مزیدار لکھا ہے۔

قیمت صرف بارہ آنہ - - - - - ۱۳۰۔ بچوں کو زیور پہنانا گویا بچہ کی جان ضائع کرنا ہے۔

آئینہ روزگار ۱۳۱۔ چور چوری کس طرح سیکھتا ہے اور مال کو کس طرح

اڑاتا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے کہیں کہیں عیاشی کے بد نتائج بھی معلوم

ہوتے جاتے ہیں۔ یہ مصنف کا پہلا ناول ہے جس میں فساد اور ناول کا مزہ

آتا ہے۔ واقعی آئینہ روزگار ہے۔ قیمت صرف - - - - - ۱۳۲۔ ایک عورت کا آگ میں غسل کر کے دوبارہ ارسال

مازنین حسین ۱۳۳۔ ایک زندہ رہنا اور بعد غسل آفتاب سے ہی زندگی

کا ختم ہونا نہایت رقت خیز اور حیران کرنے والا بیان ہے۔ پڑھیں اور

متعجب ہوں۔ وحشیانہ زندگی اور وحشیوں کے رسم و رواج بھی اس

سے معلوم ہو جائیں گے یہ نہایت ہی دلچسپ اور قابل دید کتاب ہے۔

قیمت صرف نو آنے۔ - - - - - ۱۳۴۔

سیرۃ احمدی ۱۳۵۔ یعنی حضور سرور عالم رحمۃ اللعالمین کی سوانح عمری اس

کتاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری کے علاوہ ازواج اور اولاد کا تذکرہ بھی ہے۔ حضور کے طبعی عادات و حالات حضور

کی تعلیم اور اس کی فطرت نبوت اور معجزات اور انکی فطرتی تکمیل ازواج طلاق

غلامی اسلام مذہب سیف نہ تھا نہ ہے، ان عنوانات پر تفصیلاً بحث کی

ہے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ نہایت دیدہ زیب کتابت اور طبعیت

البتہ کاغذ و طرح کا لگایا گیا ہے۔ قیمت درجہ اول سے درجہ دوم عام

عاشقان حضور کے قابل مطالعہ و جلد طبعیہ نامور سے ایڈیشن کا اظہار کیا جائے۔

نظیر سیم ۱۳۶۔ اپنے رنگ کا بے نظیر ناول ہے جس میں ایک بیباک

۱۳۷۔ وفاداری اور زندگی کی بیوفائی دکھائی گئی ہے۔ شوہر کی جانی

دے دینے والی سے عورت مر جاتی ہے۔ آخر میں زندگی کے مظالم سے شوہر

تنگ آکر مجنون ہو جاتا ہے اور بیوی کی قبر کی تلاش میں قبرستان جاتا ہے۔

۱۳۸۔ وہاں ایک نقاب پوش عورت کو پاتا ہے جو دراصل اس کی بیوی ہو جانی

کے بعد اسے بیوی کیونکر زندہ مل گئی؟ یہ راز کتاب پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ عمر

۱۳۹۔ یہ ایک اسم با سنی ناول ہے جس میں گردش زمانہ علی و اقبال

۱۴۰۔ اور دوبار کے دلکش سین اور ایک جان نثار شہر کی وفاداری

اور متقل حراچی کو ایسے پیرا میں بیان کیا گیا ہے کہ حسرت کی زندہ تصویر لکھو

کے روبرو دھڑکتی ہے۔ ایسے ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔ قیمت عمر

۱۴۱۔ عورت کی کیا دی اور مکاری کی داستان۔ عورت کی بیوفائی۔ دوستوں

سوز ۱۴۲۔ کی مہنگی، خود غرضی اور خود کامی کے نتائج، رنج اور اندوہ کا فساد،

درد و غم کی کہانی، زمانہ کی ناسعدت، دنیا کے نشیب و فراز، دوستوں پر ہر

کا انجام، بیوفائی اور بے مہری کی داستان، عورت کی کروت، اور اس کا کفر

کے دار ضبط و تحمل کی کامیابی بہت ہی دلچسپ اور دلکش انداز میں دکھائی گئی

ہے اس کو پڑھکر انسان سموت ہو جاتا ہے۔ قیمت - - - - - ۱۴۳۔

گیتی ۱۴۴۔ بڑی صحبت کا انجام، جہنمی اور بدعاشی کے نتائج، شراب خانہ

گیتی ۱۴۵۔ خراب کی کروت، ایک رئیس کی تباہی۔ یورپین تہذیب کے

تباہ کن کرشمے۔ ایک مظلوم عورت کی کامیابی، بیوفادار چلن شوہر کی بد کرداریوں

کا انجام شروع سے آخر تک سوز و گداز اور درد و اندوہ سے معمور ہے۔

قیمت صرف بارہ آنے۔ - - - - - ۱۴۶۔

سادهو کی کرتوت { فقیری کے لباس میں عیاشی، قزاقی، ظلم و
استہکام نظارہ قابل یہ ناول قیمت ۸۰/-
گلبکن { ایک غریب کا اتفاق لاٹری میں دولت پاکر دولت مند ہو
اپنی لڑکی کی نسبت اپنے بھتیجے سے کر کے اس سے بھر جانا نتیجہ کے لئے
ناول دیکھو سر غفرانی کا بہت ہی دلچسپ ناول ہے قیمت ۱۲/-
مکافات عمل { ایک سنی خیر اور پُرور فناء، محبت کی باتیں
عشق کے چوچھے، دھمال و فراق کی داستان
راز و نیاز کی باتیں اور محبت کی کرشمہ سازیاں بچی کی جدوجہد کی سنا
قابل دید ناول ہے قیمت ایک روپیہ
پارہ دل { ایک دگلا ذرا فناء، گردش تقدیر کے کرشمے، بدانی او
نامزدی کی داستان جن و عشق کو منہ بہ منبت ہی لست
اور جگہ دو زمانہ ہے قیمت ایک روپیہ
درد { کو پری بانو کے بعد یہ سب بہتر ناول ہے اسکو پڑھ کر ان بہ
تن درو و سوزین جاتا ہے پڑھ کر دیکھئے قیمت ایک روپیہ چار آنہ
وہ عورت جس نے کر کے دکھایا { کیا کر کے دکھایا قابل دید
ایک عجیب غریب ناول ہے اس کو پڑھ کر دیکھئے قیمت ۱۲/-

واہ { سر غفرانی کے ناولوں میں سب سے بہتر ناول ہے انکیٹر
محمود صاحب ہندوستان کے شرلاک ہومر کے کارٹے
جو جاب سٹرٹا مکس صاحب بہادر پٹی انسپکٹر جنرل پولیس
کے ایام سے لکھا گیا ہے اور انہی کے نام نامی پر محض ہے
قیمت ایک روپیہ چار آنہ
سرخ حرف { بعض کا خیال ہے کہ یہ فلسفی ناول جو مرزا
سوز و گداز ہے بہترین تصنیف ہے
اور یہ بالکل بیچ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دیوانہ
شوہر نے عبرت خیز انتقام کس طرح لیا نتیجہ خیز اور قابل دید
ناول ہے قیمت صرف بارہ آنہ
المیں و جمیلیہ { شیطان کے انسانوں سے ہتھکنڈے لائق دید
اور قابل عبرت ناول قیمت صرف ۱۳/-
اسرار امیرتسرا { منایت دلربا قیمت صرف ۹/-
کوہ شملہ { یہ ناول بھی دیکھنے کے لائق ہے اس پڑھ کر دنیا کے
تغیبات و فزائسان خوب سمجھ سکتا ہے قیمت ۸/-
تصویر رسوائی { منی سردار سکیم کی ہونوائی منایت دلچسپ ناول
قیمت آٹھ آنہ

تصنیفات عظیم الشان نویسنہ نیشی پریم چند صاحبی لکھنوی

منشی صاحب کے افسانے اور ناول ہمیشہ اصلاح خلق پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا مقصد شرفائے جذبات کا برانگیختہ کرنا ہوتا ہے ان کتابوں
میں فطرت کا دلچسپ مطالعہ نازک ترین جذبات و احساسات کا بیان ہے زندگی کے معمول کو نہایت خوبی سے سمجھایا ہے یہ غیر ممکن ہے کہ
منشی صاحب کی تصنیف آپ پڑھیں اور ان کی جاودہ بانی اور سرنگاری کے قابل نہ ہو جائیں پڑھ کر دیکھئے۔

جنہیں پڑھ کر بند و ستانی زندگی کی کاپاپٹ ہو جاتی ہے جیسے
بے نظیر نقض ہیں دیے ہی بے مثل انتہا سے چھپے ہیں

قیمت حصہ اول ۴/- حصہ دوم دو روپیہ

منشی صاحب کے تازہ افسانوں کا مجموعہ جن

خاک پروانہ { کی شہرت و قبول کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے
کہ چینی زبان میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں قیمت ۸/-

پریم سنجی حصہ اول دوم { ادیب فطرت نگار کی سب سے
اپنی اور سب سے زیادہ مقبول

تصنیف جو پہلا اورین تمام ہونے کے بعد کہیں سے دستیاب نہ ہو سکتی
تھی اب چھپ گئی ہے کا غلطاعت کتابت قابل دید و حصہ اول ۴/-

منشی صاحب کے تیسرے نظیر

پریم تنبی حصہ اول دوم { افسانوں کا مجموعہ یہ وہ تصنیف ہے

مختلف افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ چنگی خیالات اور شگنی تحریر کا نمائندہ اعلیٰ نمونہ ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحہ۔ ٹائٹل رنگین۔ قیمت - - - - -

بازار حسن منشی صاحب کا پہلا ضخیم ناول اڑھویں ایک حین اور ناز و غر قاری کے بعد اس کے عزیزوں نے ایک ایسے غریب شخص سے بیاہ دیا جو کسی لحاظ سے اس کیلئے موزون نہ تھا۔ اس شادی کا کیسا اندوہناک نتیجہ ہوا وہ اسے پڑھ کر دیکھئے۔ قیمت حصہ اول عمر حصہ دوم - - - - -

چوگان ہستی ہندی میں منشی صاحب کا یہی ناول (رنگ بھومی) کے نام سے اس قدر مقبول ہوا کہ تمام پریس نے باتفاق رائے اسے طبع و ادب کی ادبی اور ادبی پریم چند صاحب کے بہترین ناول قرار دیا ہے۔ منشی پریم چند صاحب نے اس شاہکار کا خود اڑھویں ترجمہ کیا ہے۔ معاشرت کی صحیح مصوری اور کردار نگاری۔ نکتہ رسی اور فلسفیانہ غورو

نوع میں منشی صاحب کو یہ طوطی حاصل ہے اور اس ناول میں انکی یہ تمام خصوصیات اپنے پورے شباب پر ہیں۔ ابھی چھپکے تیار ہیں۔ ماہوسی سے بچنے کیلئے فوراً طلب کیجئے۔ قیمت حصہ اول عمر حصہ دوم - - - - -

رام چرچا ہمارے دوست پریم چند صاحب کی یوں تو اردو زبان کو اپنی زبان بنایا ہے۔ ان کی یہ کتاب خاص طور پر بچوں کے پڑھنے کے واسطے لکھی گئی ہے۔ اسکی زبان

خاص طور پر سلیس و سادہ ہے۔ طرز بیان ایسا ہے کہ رمان کے تمام واقعات ننھے ننھے بچے بھی اسے پڑھ کر ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ رام چرچا میں مرید اور پرشوتم سری رام چند راجی مہاراج کی لاثانی زندگی کے پورے حالات اور واقعات قلمبند کئے ہیں۔ پیدائش، شادی، وین باس،

سیاحی کا ہر جانا، انکا پر حملہ، اجودھیا میں واپسی، بھرتی ملاپ، سیاحی کا بن باس وغیرہ۔ تمام واقعات نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ بچوں کے علاوہ کم استعداد صاحب اور عورتوں کے لئے بھی اس کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ چھوٹی تقطیع حجم ۳۴۶ صفحات۔ سرور قی نگین

دستور، قیمت - - - - - (زمانہ کا ہنورا)

نرملہ ناول منشی صاحب کی تازہ تصنیف ہے جس میں ہندوستان کی معاشرتی زندگی پر تیز نگاہیں ڈالنی چاہیے۔ ایک کلیل صاحب اور انکی بیوی اور انکو ایک نہایت دلچسپ قصہ ہے۔ دیکھنا کھڑے نہ کئے کچھ سوچکر میں اور تیز کچھ دیکھنا آتا ہے جسکی بیان قصہ ہیت سے دلچسپ اور عبرت خیز ہے۔ ٹائٹل رنگین قیمت - - - - -

گوشہ عافیت اس ناول میں نہ فارسی ترکیبیں ہیں اور نہ عربی کے الفاظ اور روزمرہ کی بول چال میں اور انکیا ہے۔ قیمت حصہ اول عمر حصہ دوم - - - - -

سوز وطن محبت وطن کے تھتے۔ اس کیساتھ سیر دور ویش ایک نہایت خوب پریم چالیسی۔ اعلیٰ کمائیاں۔ ادبی دنیا میں قابل قدر اضافہ (ذہن پسند)

تصنیفات بابو تیرتھ رام صاحب فیروز پوری مشہور ناول نویس

سنبلستان جنگل کی پسندہ نہایت دلکش اور مقبول کمائیوں کا مجموعہ جن میں سے ہر ایک ایک سے تمہیں خراج حاصل کیجی ہے۔ ۱۶۰ صفحہ قیمت - - - - -

مصنوعی انسان اور دوسرے افسانے، نہایت دلچسپ اور مقبول اور بکھیل کمائیوں کا مجموعہ۔ قیمت - - - - -

فسانہ جنگل جنگل کی چیدہ اور پسندہ کمائیوں کا ترجمہ اے شروع کر کے باہل چھوڑ سکیں۔ ۱۳۵ صفحہ قیمت - - - - -

نقلی نواب بڑا دلچسپ اور قابل دید جاسوسی ناول ہے۔ اور نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ قیمت - - - - -

تصنیفات ماشہ سدرشن

آپ خوش ہوں گے آپ کو فخر ہوگا کہ مادہ ہند بھی ایسے مستحق پیدا کرنے لگی ہے۔ ان کی کتابیں عورت مرد، بچے سب کے پڑھنے کے لائق ہیں۔

فطرت نگار سدرشن صاحب دور حاضر کے بہترین قصہ نویسوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شہرت محتاج تعریف نہیں رہی۔ انکی کتابیں پڑھ کر

اکثر کا ترجمہ گجراتی، سندھی، اور مرہٹی زبانوں میں ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔
بنگان بتیسی پہلا حصہ یہ ۳۴ صفحات کی کتاب نہایت عمدہ شائع ہوئی ہے۔ اس حصہ میں بنگالی زبان کے بہترین کہانیاں لکھنے والے اصحاب کی ۳۰ کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ یہ کہانیاں اس قدر پُر لطف و پرستش اور دلچسپ ہیں کہ پڑھ کر پڑھ کر دل رقص کرنے لگتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اردو دان اصحاب کو معلوم ہو گا کہ فنِ قصہ نویسی کی بات اور نگہ کیوں نے اس فن کو کس قدر عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہ کتاب ہر ایک عورت مرد کے دیکھنے کی چیز ہے اور اس میں کوئی فقرہ یا سطر ایسی نہیں جو چال چلن پر ہانڈ ڈالنے والی ہو۔ جو اصحاب کہانیاں لکھنا سیکھنے کے خواہشمند ہوں ان کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ ضرور مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ غلط راستے پر چلیں۔ اور لکھنے کی عادت انہیں ایسی پڑ جائے کہ پھر بدنامی ناممکن ہو جائے۔ ذیل میں ان اصحاب کے اسمائے گرامی درج کرتے ہیں جن کی کہانیاں اس حصہ میں ترجمہ کر کے داخل کی گئی ہیں تاکہ ان کی اہمیت کا احساس لوگوں کو ہو سکے اور وہ کچھ اندازہ کتاب کی خوبیوں کا لگ سکیں۔

شاعر امین الدین قادری، بابو پریم ناتھ، کمار چٹرجی ایم اے بیرسٹر شریستی ان پورنا دیوی بی اے، بابو شریست چند چٹرجی، بابو شریست گھوشل ایم اے، بابو کیشو چند رگپتا، ایم اے بی ایل، بابو جلدھر سین، بابو امین الدین قادری، بابو سریندر پورن کرجی، شریستی زوہا دیوی، بابو سہن ناتھ سرکار، بابو کرکما رگھوش، قیمت

بنگان بتیسی دوسرا حصہ یہ اسی کتاب کا دوسرا حصہ ہے۔ اس کے ۳۶ صفحات ہیں اور اس میں ۹ کہانیاں ہیں ہم تو نہیں سمجھتے مگر لوگوں کا خیال ہے کہ اس حصہ کی کہانیاں پہلے حصہ کی کہانیوں سے بدرجہا افضل و برتر ہیں۔ ان میں فصاحت ہے۔ ان میں بے ساختہ پن ہے۔ ان میں جن جہ اور ان سب سے بڑھ کر ان میں تاثیر ہے جو نہایت زور دہی عنصر ہر ایک عمدہ اور مفید کتاب کا ہے۔ بہت عمدہ کتاب ہے۔ کہانیوں کی یہ کتاب کہانیوں کے ہر ایک شوقین کو پڑھنی چاہیے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔
گناہ کی مٹی یہ پورے ایک سو صفحے کا ناول ہے جسے فطرت نگار نے لکھا ہے۔ اس میں ایک آواز عورت کی مٹی کے حالات و سچ کئے گئے ہیں۔

اور بتایا گیا ہے کہ نیک جذبات ایسے سینوں میں بھی کر دیتے ہیں جہاں انسان کو گناہ کے سولے کسی دوسری شے کی توقع نہیں ہوتی۔ اور روشنی وہاں بھی اپنے جلوے دکھاتی ہے جہاں بظاہر سرسبز تاریکی کی حکومت بھی جاتی ہے اور کہ دنیا میں نیکی بھی تکلیف پاتی ہے۔ اگر وہ گناہ کے پیٹ سے پیدا ہو اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نیکی کرنا کیسا مشکل اور بدی کرنا کس قدر آسان ہے اور پھر لطف یہ کہ حسن و عشق کی داستان کے ساتھ معرفت کے لیے ایسے عقدے مصنف نے حل کئے ہیں کہ ان میں عشق و عشق کا اظہار ہے اس کتاب کا آغاز عشق مجازی سے ہوتا ہے۔ مگر آخر میں وہی عشق عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قیمت

وجہ سنگھ یہ بنگال کے مشہور ڈراماٹسٹ بابو ڈی۔ ایل رائے نے لکھا ہے۔ اس کا نامک ہے جسے فطرت نگار نے اردو جامہ پہنایا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ نفیس ہے۔ اور حجم ۲۰۸ صفحات ہے۔ اس میں سوتیلی ماں کی خصلت بدکا، باپ کی محبت کا، عورت کی جانا بازی کا اور شریفیت جذبات کا بیان ہے۔ پہلا ہی منظر اس قدر ہوشربا ہے کہ پڑھ کر طبیعت پر اثر ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ہر ایک منظر ایسا دلچسپ ہے کہ جب تک کہ کتاب ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو بھی نہیں چاہتا۔ یہ نامک بازار کی نانگوں کی وجہ نہیں ہے۔ اس میں انسانی دل کی گمانوں اور روحانی بندوبست کا بیان ہے۔

آپ نے اردو نامک بہت دیکھے ہوں گے مگر بنگالی دماغ نے نامک کیا بنا دیا ہے۔ یہ دیکھنا ہوتا ہے نگاہ دیکھتے۔ آپ جنگ رہ جائیں گے۔ قیمت اس کی ایک روپیہ ہے جو اس کی خوبیوں کے مقابلے میں کچھ نہیں۔
عورت کی محبت یہ ۳۴ صفحات کا نامک ہے کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ اس کے مصنف بھی وہی بابو ڈی۔ ایل رائے ہیں۔ اور مترجم فطرت نگار۔ مشن۔ لکھنے کو تو ایک نامک ہے۔ مگر سچ پوچھا جائے تو وہ غلط و چندہ ایک فقرہ ہے اور خوبی یہ کہ کجی اکتا نہیں۔ طبیعت کہانی میں پسینی رہتی ہے اور دل پر شرافت کا اثر ہو جاتا ہے۔ آپ نے اردو میں آج تک جتنے نامک دیکھے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو اس نامک کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ مٹی محبت کیا ہے۔ اور مٹی جذبات کیسے ہوتے ہیں۔ ایک نقد کی رائے ہے کہ شیکسپیر نے سنگ لیرس ایس کا کہہ کر بڑبڑائے ہیں جو کمال دکھایا ہے اس سے زیادہ کمال ڈی۔ ایل رائے کا ہے جنہوں نے لالہ سکندر لال جیسا محبت کا فرشتہ دنیا کی

رجسٹرڈ نمبر ای ۱۳۶۳

اٹھو ورنہ شش نہیں ہوگا پھر کبھی
دو روز مانہ چال قیامت کی حل گیا

(ہمایوں)

بِیَاكَارِ عَلَا فِضَائِیْ زُبَیْنِ جَسْتِ مِیَا مُحَمَّدِآ صَبَاُ هُمَا یُونِ

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

هُمَایُون

ایڈیٹر: بشیر احمد بی. اے (اسکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱۴
بابت ماہ مارچ ۱۹۳۰ء
نمبر ۱
تصویر: حرم — ایک زرّیں نقش

صفحہ	صاحبِ مضمون	مضمون	نمبر شمار
۲۵۴	ب	چند باتیں	۱
۲۵۶		جہاں نما	۲
۲۶۱	جناب لوی رحمن صاحب نی، بی، ایل، ایل بی، (علیگ)	ابوالفضل	۳
۲۶۸	جناب حامد علی خاں صاحب بی اے	غزل	۴
		تصویر: حرم — ایک زرّیں نقش	
۲۶۹	بشیر احمد	پردہ	۵
۲۷۸	جناب مولانا جلال الدین صاحب اکبر، بی اے آرز	خوابِ محبت (نظم)	۶
۲۷۹	جناب پروفیسر یارون خاں صاحب شروانی، ایم اے	مبادئی سیاسیات	۷
۲۸۵	جناب پروفیسر حامد احمد صاحب افسر میرٹھی	روح جذبات (نظم)	۸
۲۸۶	جناب روشن صدیقی	ترے لئے (نظم)	۹
۲۸۶	منصور احمد	کیڈور کا مصوّر	۱۰
۲۹۳	جناب محشر عابدی	ایک عزیزہ کی دائمی جدائی پر (نظم)	۱۱
۲۹۴	جناب لوی نسیم الدین صاحب رضوی امروہوی ایم اے (علیگ)	مسمرینم کا عمل (افسانہ)	۱۲
۳۰۳	جناب پنڈت رام رتن صاحب مضطر	دل (نظم)	۱۳
۳۰۴	حضرت ذوقی (علیگ)	شہرت (افسانہ)	۱۴
۳۱۷	جناب مولوی نذیر احمد صاحب ظفر	تاثرات	۱۵
۳۱۸		محفل ادب	۱۶
۳۲۴		تبصرو	۱۷

چند باتیں

پچھلے مہینے جو میں نے چند باتیں کیں تو میرے عزیز دوست کا خط آیا کہ اپنی باتوں کو قدرے بالاتر بناؤ۔ شخصی جو چیز ہو وہ تب تک ادب نہیں بنتی جب تک کہ وہ Universal مارگنی اسے شانہ بہ شانہ نہ ہو میں حیران ہوا کہ ابھی دو ایک دن پہلے ہی پنجاب کے ایک نوآباد شہر سے مجھے انہیں باتوں کے متعلق شکریہ کا خط آیا تھا اور اس کے علاوہ میرے ایک نہایت قابل نوجوان دوست نے انہیں بہت پسند کیا تھا اور اب یہ عزیز دوست یوں لکھتے ہیں: ”اب مجھے کچھ مایوسی سی ہوئی کہ لیجے میں نے تو اپنے دل کی اک کلی سی نرم مایوں میں پیش کرنی چاہی تھی لیکن بعض ارکان کو منظور نہ ہوئی۔ دوسرے دن پھر یاد آیا تو خیال کیا کہ محض ایک عزیز دوست نہیں اک بعد دل کا اشارہ اور اک قابل دماغ کی جڑ ہے۔ اس پر کم از کم غور کیا جائے لیکن خود پسندی نے زیادہ پیش نہ چلنے دی۔ خط جوں کا توں پڑا رہا نہ اس کا جواب دیا نہ اس پر عمل کیا۔“

چند روز کے بعد دماغ نے سوچا کہ اک قابل دوست کی رائے نایاب ہے، اگر مجھے اختلاف ہے تو تبادلہ خیالات کے بعد معاملہ صاف ہو سکتا ہے، ممکن ہے کچھ میں سمجھ لوں کچھ وہ مان لیں۔ ارادہ کیا کہ ان کو ضرور لکھوں گا کہ بھائی یہ بات ہے اور یوں ہے اب آپ کیا کہتے ہیں؟

اسی اوجھڑ میں تھا کہ ایک صبح حکام روہاری نوٹس بکس اٹھا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ ”رمضان کے عین بعد مجھے ”شبلی کی“ متغداد حیثیت“ پر ایک لکچر دینا ہے، طوعاً و کرہاً وعدہ کر چکا ہوں۔ اتفاق سے معارف نظر سے گذرا تو اس میں بھی دوسرے لکچروں کے ساتھ اس کا اعلان پایا۔ دل جو کچھ کھسکا ناہو کر میرے جانے بوجھے جی چڑا رہا تھا ایک عام اشتہار دیکھ کر گویا کانپ گیا کہ اب تو خواہ کچھ ہو یہ کام کرنا ہی پڑے گا پھر یہ بُری عادت اک عرصے سے سر پر بھوت کی طرح سوار ہے کہ جو کام کرنا ہو۔ بلکہ کرنا ہو یا دیر میں، اسے ابھی سے شروع کر دو شاید اس لئے کہ جو مصیبت ٹل جائے وہی اچھی۔ عرض نیچے اپنی لائبریری میں گیا اور شبلی کی جتنی کتابیں میں انہیں گھسیٹ کر الماریوں سے نکالا اور لادے لادے اوپر لے آیا اب شبلی

تو آگیا۔ باقی رہی مصنفہء حیثیت۔ اس کا کیا علاج کیا جائے۔ خیال آیا کہ بڑے بڑے لکچر دینے والے اور اُن سے شاید بڑے لکچر سننے والے ہونگے۔ اپنی عزت پہلے اپنے ہاتھ ہوتی ہے پھر دوسرے کے ہاتھ۔ بہتر ہے ابھی اس کا کچھ بندوبست کر لوں۔ سمجھ میں آگیا کہ تصنیف و تنقید کے متعلق کچھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ آج کل کے پتھون کوٹ پہننے والوں کے لئے انگریزی کتابیں تو قریب ہی ہوتی ہیں اور اردو کتابیں یا بالکل ناپید یا دور۔ ایک حد تک یہی حال میرا ہے ”مطالعہ ادب“ پر ایک انگریزی کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگا۔ اب شکر ہے کہ اس کے بعد چند ایسی اردو کتابوں اور رسالوں کی راہ بھی دیکھ لی ہے۔ کتاب کے آخری باب میں ادب کے تنقید و تخمینہ پر نظر دوڑا رہا تھا کہ اس عنوان پر پہنچا کہ ادب میں اعلیٰ معیار کا ثبوت کیا ہے اور معلوم ہوا کہ اعلیٰ ادب وہ ہے جس کا اثر عالمگیر اور پائدار ہو۔ بہترین تصنیفات وہ ہیں جو اخلاقی و دماغی کی زندگی کی ہمیشہ نشوونما پاتے رہنے والی کیفیتوں سے ”شانہ بر شانہ“ رہ سکیں، جن کا پیغام اور مفہوم صرف اپنے زمانے کے لئے نہ ہو بلکہ سب آئے والے زمانوں کے لئے ہو۔ اور یہ اس لئے کہ ہر ایسی تصنیف اپنی ترکیب و ترتیب میں انسانی فطرت اور تجربے کی اولین بنیادی اور یکساں یعنی تمام اُن خصوصیتوں سے مطابقت رکھتی ہے جو مقام و وقت سے آزاد ہیں اور پائدار ہیں۔ ہر ایسی عظیم الشان تصنیف میں مقامی اور وقتی چیزوں کو اس انداز سے مس کیا جاتا ہے ایسی بصیرت اور گرفت اور قوت سے اُن کو ادب کے کام میں لگایا جاتا ہے کہ نہ ٹکلی اور پائدار کے مفہوم کی جھلک اُن میں صاف طور پر نظر آنے لگتی ہے۔

میں کتاب کے سامنے ہی شرمیلے لگا۔ جس عزیز دوست کی تنقید سے میں بھاگا بھاگا پھر رہا تھا اُس نے مجھے کہاں کون سی کتاب کے صفحات میں کس طرح اُن پکڑا کہ ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ ابھی یہ مغلوبی پوری طرح بروے کار نہ آئی تھی کہ اک نقاد دوست نے ملاقاتی پیغام بھیجا لیکن اب میں کچھ تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ فوراً انہیں بلالیا اور بلاتے ہی کہا کہ جوری نمبر میں نے جو کچھ لکھا ہے اُس پر بے رحمی سے تنقید کر دو۔ اس کے لئے تو وہ بھی تیار نہ تھے۔ سر جھجکا کر بولے کہ اچھا ذرا پھر ایک غور کی نظر ڈال لوں تو سہی۔ دو روز کے بعد آئے ذبیحہ نے خود ہی کہا گردن حاضر ہے۔ جو کچھ گذری اس کے بیان کے لئے کم از کم آج تو نہ وقت ہے نہ گنجائش۔ لیکن چلتے وقت کہا کہ فروری نمبر کی ”چند باتیں“ البتہ مجھے بہت پسند آئیں۔ اب مجھے اک اور مصیبت پڑ گئی۔ میرے دماغ میں اک نئی جنگ ٹھن گئی۔ اُدھر عزیز فلسفی

دوست کی کچھ ناپسندیدگی (دھرتی تنقیدی دوست کی قطعی پسندیدگی) میں نے سمجھا اعتراف ہی خوب ہے۔ کہہ دیا کہ بھائی وہ دوسرے پیر بھائی تو یوں کہتے ہیں اب سوچ سمجھ لو۔ بولے نہیں میرا یوں ہی خیال ہے مگر آخر انہوں نے لکھا کیا ہے میں نے بتایا اُس کر جیسے کچھ سوچ میں پڑ گئے + کل آخری سرمائی ملاقات کے لئے آئے تو کہہ گئے کہ میری رائے تو وہی ہے شخصی و ذاتی کو بیچ سے نہ نکالو ورنہ باتیں باتیں نہ رہیں گی اور تصنع آجائے گا۔ میں نے کہا اچھا آپ دونوں کے درمیان میں ہو کر غور کروں گا۔ اصرار کرنے لگے کہ نہیں لکھے جائیے اسی طرح +

اب جو سوچتا ہوں تو کبھی یہ شک ہونے لگتا ہے کہ شاید عزیز دوست کا خیال ہو کہ اس بھلے آدمی سے بہت سے شخصی و ذاتی تعلقات ہیں اگر اس نے اُن کو ہمایوں میں بیان کرنا شروع کر دیا تو مشکل ہی پڑ جائے گی اور کبھی یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید نقاد دوست کا خیال ہو کہ اس گم سم آدمی سے علمی و ادبی تعلقات ہیں اگر یہ کتابی اکتسابی باتیں ہی ہمایوں میں لکھتا رہا تو ہماری باہمی ادبی زندگی میں کوئی نیا لطف پیدا نہ ہوگا! لیکن نہیں یہ شک شبہ محض اس لئے ہے کہ میں نے پچھلے چند سالوں میں فلسفے کی تقریباً سوائیں ابتدائی کتابیں پڑھ لی ہیں جن سے مجھے شک و شبہ کی بات میں کچھ شد بد ہونے لگی ہے + اُدھر بے محلف فلسفی دوست (دھرتی تنقیدی دوست) یہ ہے کہ دونوں وہی کہتے ہیں جو اُن کے جی میں ہے۔ اب اس علم و فضل کے تیر و تفنگ میں میری نیم جہالت حیران کھڑی ہے کہ جب میری ہی زبان کو کہنا ہے جو میرے ہی دل کے اندر ہے اُن چیزوں کے متعلق جو مجھ سے باہر ہیں تو جو چند باتیں میں نے آج کی ہیں اُن میں میں اور میرے عزیز دوست کا خط اور نو آباد شہر والے مدرس کا مکتوب اور قابل نو جوان دوست کی زبانی رائے اور شبلی اور اُس کی مصفاہ حیثیت اور تصنیف و تنقید کی وہ کتاب اور اس میں وہ مقامی کُلی کی بحث اور پھر میرے نقاد دوست سے وہ ملاقات اور گفتگو اور پھر میری یہ چند باتیں ان سب چیزوں کا مفہوم کہاں تک شخصی ہے اور کہاں تک کلی؟ اور کہاں تک یہ شخصیتیں کل کا جز ہیں اور کہاں تک میری ان باتوں میں جو عبارت میں انہیں کے بیان سے ادب ہے؟ میں حیران ہوں سو اسے دوست او لئے دوست مدد!

جہاں نما

ہندوستانی مدرسوں کے لئے نئے طریق تعلیم کی تجویز

پچھلے دنوں لاہور کے ایس پی ایس کے ہال میں پنڈت دتشنہ پرشاد صاحب نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے ہندوستانی مدرسوں کے لئے ایک نئے طریق تعلیم کی تجویز پیش کی۔ موجودہ طریق تعلیم کے متعلق انہوں نے کہا کہ اس کو وضع ہوئے اتنا ہی زمانہ گزرا ہے جتنا آج غدر کو گزر چکا ہے۔ اُس وقت تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو انگریزی زبان سکھائی جائے کیونکہ عدالت کی زبان کی تبدیلی کے باعث انگریزی جاننے والے حکمرانوں کی بڑی ضرورت تھی۔ اُس وقت سے آج تک بہت سی ماموریات کا تقرر عمل میں آیا کہ وہ تعلیم کا معیار بلند کرنے کی سفارش کریں لیکن حیرت کی بات ہے کہ مدرسوں کے اندرونی انتظامات اور اُن کے اُن درجوں میں جو ہنر کمیشن نے مقرر کئے تھے کوئی حقیقی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ملک معلم کے قابل توجہ الفاظ پر بھی کوئی التفات نہ کی گئی جو انہوں نے ۱۹۱۷ء کے دربار کی تقریر میں فرمائے تھے۔

سرٹیکل سیڈلر پانچ باتوں کو اس دور کی اہم خصوصیات بتاتے ہیں اور ان میں سے رسل و رسائل کے ذرائع پر سائنس کے اطلاق، دولت کے حصول کے طریقوں، آرام و آسائش اور جنگ، اور دوسرے مزدوروں کے اس مطالبہ پر کہ انہیں دولت میں زیادہ حصہ ملنا چاہئے خاص طور پر زور دیتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تعلیم صرف کتابوں کے پڑھنے تک محدود نہ ہو بلکہ وہ ایسے مواقع پیدا کرنے والی ہو جن سے علم عمل میں منتقل ہو سکے۔ اس کے بعد فاضل مقرر نے جرمنی کے طرز تعلیم پر ایک تبصرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ جرمن بچے چھ سال تک اپنے گھروں میں تعلیم پاتے ہیں۔ یتیم بچے اور غربا کے بچے کنڈرگارٹن سکولوں یا تربیت گاہوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں جن کا انتظام بلدیہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ چھ سے دس سال تک ہر لڑکے کے لئے تعلیم لازمی ہے۔ ان مدرسوں میں صفت تعلیم دی جاتی ہے اور غریب لڑکوں کو کھانا کپڑا اور لکھنے پڑھنے کی ضروریات بغیر کسی معاوضے کے مہیا کی جاتی ہیں۔ دس سال کی عمر میں، لڑکوں کو تین مختلف قسم کے مدرسوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ان میں سے دو تہائی چودہ برس کی عمر تک جو لازمی تعلیم کی عمر ہے تختائی مدرسوں میں شامل رہتے ہیں

جس کے بعد مدرسے کے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کر کے وہ جامعات میں داخل ہو سکتے ہیں، اور باقی وسطانی مدرسوں میں جاتے ہیں جہاں چھ سال کا نصاب ہے۔

چنانچہ چودہ سال کی عمر کے بعد ہر طالب علم آزاد ہوتا ہے کہ زندگی کے جس شعبے میں چاہے داخل ہو جائے، جس کام کو چاہے امید والی حیثیت سے کیجئے اور ساتھ ہی ساتھ تین سال تک کسی صنعتی و حرفتی مدرسے میں تعلیم بھی حاصل کرے۔ اس کے بعد ایک ماہر فن اُس کا امتحان لیتا ہے، اور اگر مصنف اُس کے کام سے مطمئن ہو جاتا ہے تو اسے فوراً روزگار مل جاتا ہے اور اس کا مشاہرہ مقرر ہو جاتا ہے۔ ہر دوکاندار لڑکا اور ہر کسان لڑکا چودہ سے سترہ سال کی عمر تک مجبور ہے کہ کوئی نہ کوئی ہنر سیکھے۔

انگلستان میں بھی ایک نیا طرزِ تعلیم طے پایا ہے۔ اس کے مطابق ہر بچے کو اپنی عمر کے دسویں یا گیارھویں سال تک ایک ابتدائی مدرسے میں حاضر ہونا پڑے گا اور پھر ان کو دوسرے مدرسوں میں بھیجا جائے گا۔ مرکزی مدارس جو ان کثیر التعداد بچوں کو پندرہ یا سولہ سال کی عمر تک تعلیم دیں گے، اور اعلیٰ مدارس جن میں اٹھارہ یا نینس سال کی عمر تک تعلیم دی جائے گی۔ مرکزی مدارس میں صنعتی و حرفتی تعلیم بھی دیتا کی جائے گی۔

اس کے بعد پنڈت صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی تجاویز بیان کیں، جن کا ماحصل یہ ہے کہ دس سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہو۔ دیہاتی مدرسوں میں زراعتی تعلیم کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ مدرسے مرکزی مدرسوں کے اصول پر چلائے جائیں اور بچوں کو چار فریٹیوں میں تعلیم کیا جائے۔ انصاف تعلیم چار سال پر مشتمل ہو (۱۱) عام (۱۲) زراعتی (۱۳) تجارتی اور (۱۴) صنعتی و حرفتی۔ اس طور پر چودہ سال کی عمر میں ان میں سے اکثر کام ہیں لگ جانا چاہیں گے لیکن ان کے لئے ایسے سامان بھی جیتا کر دینے چاہئیں کہ وہ زراعت تجارت اور صنعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ عہدہ بزمبئی کے کوئی سکولز بہتر منقسم کے زراعتی سکول ہیں۔ تجارتی مدارس انہیں اصولوں پر قائم ہونے چاہئیں جن اصولوں پر اس وقت انگلستان اور فرانس کے تجارتی مدارس چل رہے ہیں۔

نوفانی مدارس میں جن کی نسبت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا خیال ہے کہ یہ صرف امیروں کے لڑکوں کے لئے ہونگے۔ انصاف تعلیم چھ سال کا مقرر کیا جائے۔ انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہو لیکن اکثر مضامین میں ذریعہ تعلیم دیسی زبان ہونی چاہئے۔ لڑکیوں کے لئے لڑکوں کے نصاب تعلیم سے مختلف نصاب مقرر کیا جائے۔ تقریر کو مختصر کرتے ہوئے پنڈت صاحب نے کہا کہ موجودہ طریقہ تعلیم کی ناموزونیت بیان کرنے کے علاوہ

ابوالفضل

فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا

مغل شاہنشاہ اکبر کے عہد، یعنی ہندوستان میں سولہویں صدی عیسوی کے اخیر میں انتظام حکومت (Administration) کا علم خوب ترقی پا چکا تھا۔ ابوالفضل نے جو اس بادشاہ کا دوست اور وزیر تھا، اس معیت پر ایک عظیم الشان کتاب چھوڑی ہے، جس کا نام آئین اکبری، یعنی احوال حکومت اکبر بادشاہ ہے۔ دربار کی ترتیب، مختلف فوجی اور رسول عہدوں کے انتظامات، سرکاری محاصل متعین کرنے کے متعلق عمدہ رواجات، ہر قسم کی ترقیات کے متعلق فکر و غور، اعداد کا مسلسل استعمال، نظر کی وسعت، جس کے ذریعہ سے ایک وسیع اور مختلف العناصر حکومت کا متحد رکھنا ممکن ہوا، اور جم و آزادی کی روح جو تمام کتاب میں پائی جاتی ہے، یہ ایسی خصوصیات ہیں، جن کی وجہ سے یہ کتاب سیاسی علم کی ایک جمیل ترین یادگار بن گئی ہے اور دنیا بھر کے لٹریچر میں غیر امتیاز کھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بمقابلہ ان تصانیف کے جن کا ہم اب تک تذکرہ کر چکے ہیں، اس کتاب کا زمانہ بعد کا ہے لیکن اس دوران میں جو ترقی ہوئی وہ بہت زیادہ ہے۔ اگر ہم ان خیالات کا جو آئین اکبری میں پائے جاتے ہیں، مغرب کے مماثل خیالات سے مقابلہ کرنا چاہیں تو میرے خیال میں فرانس میں کولبرٹ (Colbert) کے انتظامات، اور جرمنی میں لائبنز (Leibniz) کے سیاسی خیالات کا ان سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں بڑے مصنف اکبر کے عہد سلطنت سے ایک صدی بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں +

شیخ ابوالفضل بمقام اگر ۱۵۵۵ھ (۱۵۷۵ء) میں بعد سلطنت اسلام شاہ پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ شیخ مبارک بھی ایک نہایت طباع اور مشہور عالم تھا۔ شیخ مبارک خود بھی سیاسیات و مذہب میں وسیع المشرب خیالات رکھتا تھا، جو اس نے اپنے دونوں بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کو بھی تعلیم کئے۔ اور جن کی وجہ سے بعض تنگ خیال مسلمان

اس سے قبل کرائے دور (Carra de Vaux) نے جس کی کتاب ”مکتبین اسلام“ - Le Pense
urs de l'Islam سے یہ مصنف ترجمہ کیا گیا ہے، امام اور دی صاحب کتاب احکام السلطانیہ، ابن خلدون اور الجاحظ و نظام الملک طوسی کا تذکرہ بحیثیت مکتبین سیاسی کیا ہے۔

اُن دونوں کو دہریہ یا ہندو، یا شمس پرست سمجھتے تھے۔ اُس وقت اسلام کے ہزار سال ختم ہو رہے تھے، مہدوی نبیؑ آلا پھیلے ہوئے تھے، اور چند مہدی ہندوستان کے مسلمانوں میں دعوائے مہدویت کر چکے تھے۔ شیخ مبارک نے بھی اس تحریک میں کچھ حصہ لیا تھا۔ اس کے باعث اُسے اسلام کے بعض ذی اقتدار علما کی زیادتیاں سہنی پڑیں، اور اُن کے اثر سے اُس کے اور اُس کے بیٹوں کے دلوں میں رواداری کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ابو الفضل نے نہایت محنت کے ساتھ تحصیلِ علم کی۔ بہت سے مشرقی طالبِ علموں کی طرح وہ بھی کم سنی ہی سے تیز تھا۔ اولاً فیضی کو جو ابو الفضل سے بڑا تھا، اکبر نے طلب کیا۔ ۹۸۱ھ میں ابو الفضل بحیثیت فیضی کے بھائی کے پیش ہوا اُس کی طبیعت جس وقت کہ وہ اکبر کی خدمت میں داخل ہوا، ایسی تھی جیسی کہ بعد خود اکبر نے اختیار کی۔ وہ لکھتا ہوا: ”میں اپنی راتیں تنہائی کی جگہوں میں اُن لوگوں کے ساتھ جو خلوصِ دل کے ساتھ صداقت کے جویا ہیں گذارتا

ہوں، اور اُن لوگوں کی صحبت اختیار کرتا ہوں، جن کے ہاتھ کشادہ اور دل و دماغ لالہ مال میں۔ اس طرح میری آنکھیں کھلتی ہیں، اور میں اُن لوگوں کی جو اپنے آپ کو عالم بتاتے ہیں، خود غرضی و طاعی کو پہچان لیتا ہوں۔ میرے دل کو کسی وقت قرار نہیں۔ وہ نیکدلانِ منگولیا، و فقراے لبنان کی طرف کھینچتا ہے۔ میں جوش کے ساتھ تبت کے لاماؤں اور پرمگال کے پادریوں سے ملاقاتیں کرتا، اور پارسیوں کے موبدوں اور زنداوشتا کے معسروں کے ساتھ بحثیں کرتا ہوں میں اپنے ملک کے علما سے تھک گیا ہوں“۔

اکبر ابو الفضل سے اُس وقت ملا جب کہ اول الذکر بہار و بنگال کی فتح سے واپس آیا تھا۔ اُس کے بعد فتح پور سکیری میں جمعہ کی شب میں وہ مجلس منعقد ہوئے لگیں، جن کا مورخ بدایونی نے ایسا زندہ موقع کھینچا ہے۔ ابو الفضل اکبر کی جماعت کا امام بن گیا۔ اُس نے پادشاہ کو آدابہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف دنیاوی مانرو ہی تصور کرے، بلکہ دینی حیثیت سے بھی اپنے آپ کو خلیفہ سمجھے، یعنی پادشاہی کو مذہبی اختیارات پر فوقیت دی جائے۔ جب اکبر نے یہ خیال ۹۸۶ھ میں جمعہ کے خطبہ کے وقت پیش کیا، تو ایک طوفان بپا ہو گیا۔ لیکن بظاہر اس کی کچھ تاہیدِ پبلک میں موجود تھی، چنانچہ سنیوں نے اُس کی تائید کی۔ انہوں نے ایک تحریر پر جسے شیخ مبارک نے تیار کیا تھا دستخط کر دیئے۔ اس تحریر میں امام عادل کو مجتہدوں یعنی شارحانِ قوانین نیز علما پر فوقیت دی گئی تھی۔

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی کامل رواداری کے اصول سلطنت میں نافذ ہو گئے۔ ۹۹۰ھ میں ان مجالس کے بعد دونوں بھائیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ فیضی ۹۸۵ھ میں ملک الشعرا مقرر ہو چکا تھا۔ اکبر

شاعری کا بہت زیادہ ولدا وہ نہ تھا، لیکن سرکاری طور پر اپنے دربار میں اُس کے لئے ایک محل و مرتبہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ فیضی کو مسلمانانِ ہند کے شعرا میں دوسرا درجہ اور امیر خسرو دہلوی کو اول درجہ حاصل ہے +

چند ادبی و علمی تصانیف مذہبی تالیفات کے بعد شائع ہوئیں۔ ابو الفضل، فیضی، اور بدایونی نے بعض شعر ہندی اور فارسی کتب کے تراجم کئے۔ فیضی نے جو بیک وقت شاعر و مہندس تھا، لیلہ اوتی کا، جو کہ علمِ ریاضیت میں ہے ترجمہ کیا۔ ابو الفضل نے کلیلہ و دمنہ کو فارسی میں لکھا۔ اُس نے ماہِ بھارت کے ترجمہ اور تاریخ الفنی کی ترتیب میں مدودی تاریخ الفنی ایک ہزار برس کی تاریخ ہے، اور ہزار سالہ میعاد کے خیال کو مدودی تحریک سے تعلق تھا شیخ مبارک نے سنہ ۱۰۰۰ میں بمصر ۹ سال وفات پائی۔ دو برس بعد فیضی کا بھی انتقال ہو گیا۔ ابو الفضل نے جو اپنے بھائی سے بڑی محبت رکھتا تھا، اپنے بھائی کی وفات سے پیشتر اُس کی منتشر نظموں کو یک جا کرنے کا وعدہ کیا تھا جسے باوجود گونا گوں مصروفیتوں کے جلد ہی پورا کر دیا +

فلسفی، متبحر عالم اور باتدبیر وزیر ہونے کے علاوہ ابو الفضل نے ایک فوجی خدمت بھی سرانجام دی۔ اُس نے دکن میں جا کر بحیثیت سپہ سالار جنگ میں حصہ لیا، اور کچھ کامیابی بھی حاصل کی۔ لیکن اکبر بغیر اس کے بمشکل رہ سکتا تھا۔ اکبر نے ابو الفضل کو دکن سے واپس بلایا۔ راستہ میں شاہزادہ سلیم نے، جو بعد میں جہانگیر کہلایا، اور ابو الفضل سے دلی بغض رکھتا تھا، اُسے قتل کر دیا۔ یہ سنہ ۱۰۱۰ء کا واقعہ ہے +

شیخ ابو الفضل کی شاندار تصنیف اکبر نامہ (یعنی اکبر کی کتاب) مسلمانوں کی تاریخِ ہند میں اہم ترین کتاب ہے۔ وہ نین حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پہلی جلد میں تیمور کے خاندان کے، سلاطینِ ہند، بابر و ہمایوں، اور سوری بادشاہوں کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں اکبر کے چھالیس برس کی تاریخ درج ہے تیسری جلد میں جو بجائے خود ایک بہت بڑی جلد ہے اور جس کا نام آئینِ اکبری ہے اکبر کے عہدِ سلطنت کے حالات ہیں جو تاریخی واقعات کے طریق پر نہیں لکھے گئے ہیں، بلکہ جن میں انتظاماتِ سلطنت اور انتظامی معلومات اور اعداد سے بحث کی گئی ہے +

یتیسری جلد پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ سب سے پہلی جلد میں بادشاہ کی ذات سے بحث کی گئی ہے، جس سے اُس کی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ انہیں اُس کے محل و دربار کے حالات درج ہیں۔ دوسرے حصے میں اُن عہدہ دارانِ سلطنت کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو فوجی اور رسولِ خدات پر منتقل تھے۔ نیز اُن اشخاص کا تذکرہ ہے، جن کی ادبی لیاقت یا موسیقی کی مہارت کو بادشاہ کی تلافی نے چار چاند لگا دیئے تھے، اور جن کی بدولت اُس کا سلطنت دہخشاں گئی پارتھا۔ آئینِ اکبری کے تیسرے حصے میں دیوانی و انتظامی محکموں، ایک جدید اور زیادہ مفید سنکی ایجاد اراضی کی پیمائش، اقسامِ اراضی کی تقسیم اور محاصلِ سلطنت کے اعداد و جداول کا تذکرہ ہے۔ چوتھے

حصہ میں ہندوؤں کے تمدنی حالات نیز ان کے فلسفہ اور شارشر کا تذکرہ ہے۔ اسی حصہ کے چند ابواب میں ہندوئوں کے حملہ آوروں، مشہور سیاحان ہند، نیز بعض مسلمان بزرگان دین اور ان کے مختلف طرائق کا بیان ہے۔ اخیر کے پانچویں حصہ میں اکبر کے وہ اخلاقی تجلے، امثال و خیالات و احکامات لکھے گئے ہیں۔ جو ابوالفضل ہر روز اس طرح جیسے کہ ایک شاگرد اپنے استاد کے ملفوظات کو جمع کرتا ہے، قلمبند کرتا رہا تھا۔ اس بڑی کتاب سے حسب ذیل اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

شاہی خزانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے۔

”دنیا جانتی ہے کہ عبادت الہی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آفاتِ زمانہ کو دور کیا جائے اور خلقِ اسد کی حالت اچھی بنائے گی کوشش کی جائے۔ یہ بات زراعت کی ترقی، شاہی محل کے انتظامات، سلطنت کے عدل و انصاف کی ترتیب، اور فوج کی تربیت سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ سب اس پر منحصر ہے کہ یہ بادشاہ ان تمام معاملات میں فائق و چسپی لیتا، اپنی رعایا کے ساتھ محبت رکھتا اور حاصلِ سلطنت اور اخراجاتِ ملکی کو دانشمندی کے ساتھ کام میں لاتا ہے۔“

ابوالفضل اس کے بعد اراضی کے محاصل سے، جو ان کے اقسام و حیثیت سے متعین ہوتے ہیں نیز سرکاری محاصل کے وصول کرنے والوں اور خزانچیوں سے بحث کرتا ہے۔ سکوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ نہایت فصیح عبارت میں سونے کی تعریف کرتا ہے۔ وہ اس کی خاصیتیں بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ دھات ”اصلِ غلیم اور محافظِ عدل“ کہلاتی ہے۔ چاندی اور تانبا اس کے معاون ہیں۔ ہمارا مصنف سونے کے صاف کرنے چاندی کو خالص بنانے، چاندی کو سونے سے جدا کرنے کا تذکرہ ایسے الفاظ میں کرتا ہے، جن الفاظ میں ایک اچھا ماہرِ کیمیا کر گیا وہ رائج الوقت سکوں کی کیفیت اور قدیم سکوں کی قیمتیں بتاتا ہے۔ وہ ماہرِ کیمیا کی طرح کچھ ذکرِ کالوں میں ”صاف“ کی اصل کے متعلق کرتا ہے، لیکن جدید علمائے کیمیا کی طرح وہ قیمتی دھاتوں اور جواہرات کے مخصوص اوزان کی جدولیں بھی پیش کرتا ہے۔

بعد ازاں وہ شاہی محلات اور ان کے اخراجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے پھر وہ سفر اور کپ کے حالات لکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں اُس کے آقا نے خود بہت کچھ کیا ہے، وہ لکھتا ہے: ”بادشا نے ”گلبارہ کا خیال ایجاد کیا، جو ایک شتم کی بارگاہ ہے، جو چاروں طرف سے گھری ہوئی ہے، اور جس میں مضبوط دروازے لگے ہوئے ہیں اور اگر مروج زمین اس سے گھر جاتی ہے۔ اُس نے اس میں حصے کر دیے ہیں۔ اخیر میں

شہساز لگتا ہے، جہاں بادشاہ اور دربار کے عمدہ دار بٹھتے ہیں۔ ابو الفضل فوجی کمپوں اور روشنی کے قواعد وائین بھی بیان کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس کی نظر سے نہیں بچتی۔ اس کے بعد ہی وہ شاہی مطبخ اور کھانوں کا ذکر لکھتا ہے مختلف اشیاء کے نرخ نامے دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے یہ قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مثلاً دیہات میں یا بارش یا دوسرے اسباب سے۔ وہ ایک جدول پھلوں کی قیمتوں ان کے اجناس اور خوبیوں کے لحاظ سے دیتا ہے۔ کچھ جدولیں ہیں جن میں شیریں و ترش و خشک ہونے کے لحاظ سے پھل تقسیم کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ پھلوں کو خدائے تعالیٰ کی بہترین نعمت قرار دیتا، اور ان کی پیداوار میں نہایت دلچسپی لیتا ہے بعض پورے ایران و توران کے اس ملک میں اگائے جاتے ہیں، اور درخت بھرت لگائے جاتے ہیں۔ خربوزے اور انگوٹھ عمدہ بافراط ہوتے ہیں۔ تربوز، سیب، بادام، پستہ، کیلا، بخوبی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ کابل، قندھار و کشمیر کے فتح ہونے کے بعد سے پھلوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہندوستان میں لائے جاتے ہیں ہر سال تاجروں کے گودام اور بازار ان چیزوں سے پھلتے ہیں +

پھلوں کے بعد عطریات و خوشبودار پھولوں کا ذکر ہے ان کی قیمتوں کی جدولیں دی ہیں۔ وہ ہر عطر کی تیاری کا حال لکھتا ہے۔ یہ بجائے خود علمِ کیمیا کی تاریخ کے لئے ایک دلچسپ تحریر ہے۔ وہ ان پھولوں کے حالات بھی بیان کرتا ہے جن سے یہ عطر تیار ہوتا ہے۔

بعد ازاں کپڑوں اور شالوں کا تذکرہ ہے۔ ہندوستان کے متعلق یہ باب بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ابو الفضل لکھتا ہے: ۱۔ بادشاہ نے اس شہر میں چار طرح ترقی بخشی ہے۔ اول ہر قسم کی شالوں میں ترقی دکھائی دیتی ہے۔ شال ایک جانور کا نام ہے اسی کے پشم سے شال تیار ہوتے ہیں۔ پشم کا قدتی رنگ سیاہ سفید و سرخ اور بیشتر خالص سیاہ اور کبھی کبھی بالکل سفید ہوتا ہے۔ اس قسم کے شال نہایت سبک و خوش رنگ و دل پسند ہوتے ہیں لوگ بالعموم اصلی رنگ تبدیل نہیں کرتے۔ بادشاہ نے انہیں رنگوں کا شروع کیا ہے۔ بادشاہ نے اور دوسرے کپڑے اس طرح بنوائے ہیں کہ ایک تھان میں پورا لباس بن جاتا ہے۔ فی الواقع اس قسم کی عملی تفصیل کا ایک ایسے شخص کی کتاب میں پایا جانا، جو ہمیشہ الہیات و دینیات کے اعلیٰ خیالات میں منہمک رہتا ہو، نہایت حیرت انگیز و قابلِ ستائش ہے۔ معلومات و ضوابط کی ہم رسانی اور انہیں ترقی دینے میں ابو الفضل ہمارے (فرانسیسی مدبر) کولبرٹ (Colbert) کو یاد دلاتا ہے۔ پارچہ جات کا باب مختلف قسم کے کپڑوں کی فرستوں اور نرخوں پر ختم ہوتا ہے +

یہ عجیب و غریب جامع علوم و فنون کتاب ابھی ختم ہونے سے بہت دور ہے۔ آگے چلے تو کتابت و مصوری کے متعلق معلومات ہیں۔ پھر بادشاہ کے کتب خانہ دفتر و تراجم کا تذکرہ ہے مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ کون کون سی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یہ تفصیل خاص طور پر دلچسپ ہے، وہ اُن کتابوں کے نام بھی بتاتا ہے، جو بادشاہ کو پسند تھیں۔ فنونِ صلح کے بعد فنونِ جنگ کا تذکرہ ہے بہت سے اصطلاحی مسائل اور فوجی انتظامات و اسلحہ بچائے خود اس بادشاہ اور اُس کے وزیر کے نزدیک کم توجہ کے مستحق نہیں۔ بلکہ اُس کے برخلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی توجہ اور انتظامی لیاقت نے اُن کی اہمیت کو دو بالاکر دیا ہے اور ترقی کی تلاش اور اس کا جذبہ جو اس مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا اظہار اس موقع پر کیا گیا ہے ایسے قوی ہیں جیسے کہ ہمارے زمانہ میں پائے جاتے ہیں اسلحہ خانہ کے متعلق لکھتا ہے:-

”اسلحہ خانوں کے کاروبار کو بادشاہ نے کمال توجہ سے ملاحظہ فرمایا ہے۔ اُس نے ہر قسم کے نئے طریقوں پر غور کیا اور اُن کے عملی امکانات کو مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً ایک زرہ جس پر تختیاں دھات کی جڑی ہوئی تھیں بادشاہ کے سامنے پیش ہوتی ہے۔ اُسے نشانہ کے طور پر رکھ کر امتحان کیا جاتا ہے، لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تمام فوج کے لئے اس قسم کی زرہیں کثیر تعداد میں تیار کرائی جاتی ہیں“ اس کے بعد ان اسلحہ کو شمار کر دیا گیا ہے جو کہ اُس زمانہ میں مستعمل تھے، اُن کی تعداد ۷۷ ہے، جو ایک بڑی تعداد ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی تفصیلی کیفیت بیان کی ہے اسی کتاب میں توپوں کی تعریف اس طرح عمدہ الفاظ میں کی گئی ہے:-

”توپیں سلطنت کی عظیم الشان عمارت کی حفاظت کے لئے بمنزلہ قفل، اور فتوحات کے دروازے کھولنے کے لئے عمدہ کنوئیاں ہیں“ ابو الفضل لکھتا ہے کہ بجز ترکی کے کوئی ملک نہیں ہے جہاں ہندوستان کے مقابلہ میں حفاظتِ ملکی کے لئے اتنی توپیں میاں کی گئی ہوں۔ اس باب میں بھی بادشاہ کے تصورات شامل تھے ”بعض توپیں ایسی ہیں جن سے بارہن کے گولے پھینکے جاسکتے ہیں۔ بادشاہ نے بعض ایسی ایجادیں کی ہیں جو دنیا کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔ ایک ایسی توپ بنوائی ہے، جو حسب ضرورت راستے میں باسانی اناہری چڑھائی جاسکتی ہے۔ ایک اور ایجاد یہ ہے کہ سترہ توپوں کو اس طرح یک جا کر دیا ہے کہ سب کی سب ایک ہی نیتیلہ سے چلائی جاسکتی ہیں۔ بعض ایسی توپیں بنوائی ہیں، جو ایک ہاتھی سے کھینچ سکتی ہیں۔ محاصروں اور بحری جنگوں کے لئے خاص قسم کی توپیں ہیں“

الغرض یہ غیر معمولی تصنیف زندگی، خیالات اور علم سے مالا مال ہے۔ اس میں زندگی کے تمام شعبوں پر نظر

ڈالی گئی ہے، معلومات کو خوب مرتب کیا گیا ہے اور ہر گھڑی بھڑکتے رہنے والی ترقی کا خیال اُس میں پایا جاتا ہے یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس پر مشرقی تمدن بجا طور پر فخر کر سکتا ہے جن لوگوں کے دماغوں کو یہ کتاب ہمارے روبرو پیش کرتی ہے وہ حکومت کے عملی فن و نیز فلسفہ مذہبی میں اپنے زمانہ سے بہت آگے تھے۔ یہ شعرا اور یہ اہل خیال مادی مسائل میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اگر اُن کے ذہن میں کوئی خیال آتا تھا، تو اُسے واقعات کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے تھے۔ وہ فصاحت کے ساتھ اپنے خیالات کو ظاہر کرتے تھے، لیکن اُن کی تائید اعداد و معلومات سے کی جاتی تھی۔ مغرب میں ہم لائبنز (Leibniz) کی تعریف کرتے ہیں کہ اُس نے اعداد اور اُن کے قواعد استعمال سے لوگوں کو روشناس کیا۔ ہم اس علم کو قطعاً جدید سمجھتے ہیں، حالانکہ اکبر کی گورنمنٹ میں اب سے تین سو برس پہلے یہ موجود تھا، اور انتظامِ سلطنت میں اس سے پورے طور پر کام لیا جاتا، اور اس کے پہلو بہ پہلو رولڈارک انصاف اور ہمدردی بنی نوع انسان کے اصول پر عملدرآمد ہوتا تھا۔

سید حسن برنی

ہندویت: ربانی صورت،

برہمیت: ربانی سیرت،

زرشتیت: ربانی شوہیت،

عیسائیت: ربانی اخلاقیات،

اسلام: ربانی تقویت،

اور دہریت: ربانی بغاوت ہے۔

دعویٰ صرف فضول نہیں مضربیں اور جھگڑے بھی اور چرچے بھی یہ صرف لاف حاصل نہیں تباہ کن ہیں۔
انسانیت میں جہاں ربانیت نہیں وہاں شیطنیت ہے۔

خدا کو کیس میں خوبصورت ہم کوں جو شبِ روز کی نعمتوں میں مجھے یوں اپنا آپ دکھا تا رہتا ہے۔

غزل

کیوں روتے ہو، بے حال ہو، گھبرائے ہوئے ہو
 کیا تم مری کیفیتِ دل پائے ہوئے ہو
 غنچے ہیں تو دلیگیں، گل ہیں تو دل افکار
 کیا خوش ہو کوئی تم ہی جو کلائے ہوئے ہو
 دیدار سے محروم ہیں آنکھیں، تو گلہ کیا؟
 اس راہ سے تم دل میں اُتر آئے ہوئے ہو
 ہے پھول کے چہرے پر عرق، اوس کہاں ہے؟
 پردے میں ہو تم اس پہ بھی شرائے ہوئے ہو
 قدموں میں جگہ دیتے ہو جس کو، قسم ہے
 اُس کو پرے عرش ہی پہنچائے ہوئے ہو

حامد علی خاں

روح جذبات

انہیں نصیب کہاں شان بے نیازی کی
کمال عشق میں نیز نگِ حسن ہوتا ہے
ہے سچ تو یہ کہ تہوں نے زمانہ سازی کی
ہوا ہے یوں بھی کہ محمود نے ایازی کی
کہ ایک یہ بھی ادا ہے جنوں نوازی کی
یہ کس نے شب کی خموشی میں نئے نوازی کی
میر دو ہفتہ کی کرنوں میں کانپ اٹھے نئے

بڑھاکے ریش تو مسجد کو کیا چلا افسر
یہ شکل اب کہیں ہوتی نہیں نمازی کی

حامد اللہ افسر

ترے لئے

دل ہے ہجوم زارِ تمنا ترے لئے
افتادگی ہے راہِ طلب میں نمازِ شوق
آباد کر رہا ہوں یہ دنیا ترے لئے
اٹھ اٹھ کے لاکھ بار گروں گاتے لئے
یہ کفر بھی مجھے ہے گوارا ترے لئے
کھاؤں گا بار بار یہ دھوکا ترے لئے
اے بے نیاز صورتِ معنی ترے لئے
میں ہو چکا خراب تمنا ترے لئے
دل ہے ہجوم زارِ تمنا ترے لئے
افتادگی ہے راہِ طلب میں نمازِ شوق
آباد کر رہا ہوں یہ دنیا ترے لئے
اٹھ اٹھ کے لاکھ بار گروں گاتے لئے
یہ کفر بھی مجھے ہے گوارا ترے لئے
کھاؤں گا بار بار یہ دھوکا ترے لئے
اے بے نیاز صورتِ معنی ترے لئے
میں ہو چکا خراب تمنا ترے لئے

ہم جو آج تک کسی سے گوارا نہ ہو سکا
کے دوست اور گروں گاتے لئے

روش صدیقی

کیڈور کا مصوّر

لڑکے کی آنکھیں اُن بھولوں کے قلوب کی طرح سیاہ تھیں جن کا ایک انبار وہ اٹھائے ہوئے تھا، اور وہ مشتاقانہ اُس سوار پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے گھوڑے کو شاہراہ پر اڑائے لئے جا رہا تھا۔ اُس نے کہا ”کیڈور! یہ شخص شہر کو جا رہا ہے، حیرت انگیز شہر کو!“ کیڈور نے اپنے بھائی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اُس کی بات نہیں سمجھی۔ اُس سڑک پر جو اُن کے گاؤں سے جنوب کی طرف جاتی تھی بہت سے قبضے آباد تھے جنہیں یہ پہاڑی لڑکی کافی بڑا سمجھتی تھی لیکن اُس نے اپنے بھائی کی طرح انہیں حیرت انگیز بھی خیال نہ کیا تھا۔

لڑکی نے کہا ”حیرت انگیز شہر؟ ٹیزیا نو، حیرت انگیز شہر کہاں ہے؟“ اُس نے متعجب ہو کر کہا ”کیوں، تمہیں معلوم نہیں؟ اور کیا سینٹ مارک کے عظیم الشان شہر وینس کے علاوہ بھی کسی شہر کو حیرت انگیز کہا جاسکتا ہے؟“

گروینس کے نام نے سیاہ چشم کیڈور پر کچھ زیادہ اثر نہ کیا۔ وہ عمر میں اپنے بھائی سے بڑی تھی اور اُس کی طرح موم ہونٹوں کے خواب نہ دیکھا کرتی تھی۔ اُس نے سنا تھا کہ شہر میں اکثر خوفناک واقعات رونما ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات لوگوں کو وہاں فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس اس پہاڑی علاقے میں کھانے پینے کا سامان کافی سے زیادہ تھا، اور اگرچہ کوئی بھی یہاں اتنا امیر نہ تھا جس کے قبضے میں خوبصورت محلات اور پر تکلف سازو سامان ہو لیکن بہت غریب بھی کوئی نہ تھا۔ اُس نے اپنے کندھوں کو ذرا سکڑ کر جواب دیا ”وینس! میں نہیں جانتی تم کیوں اسے حیرت انگیز کہتے ہو۔ گریزیانو جلا بہت دفعہ وہاں گیا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اس میں ہمارے کیڈور سے آدھا حسن بھی نہیں ہے۔ نہ وہاں پہاڑ ہیں اور نہ مرغزار جہاں پھول کھلتے ہوں۔ ٹیزیا نو کیا تم یہاں سے تنگ آ گئے ہو؟“

”آہ، نہیں! یہ نہیں! لیکن شہر میں مصوّر رہتے ہیں اور اگر میں وہاں جاسکوں تو میں اُن کے فن کا مطالعہ کروں اور بعض ایسی تصویریں بناؤں جن کی آنسو میرے دل میں ہے۔“

کیڈور نے ایک علی دیہاتی لڑکی تھی جس کا خیال تھا کہ اگر کسی کے پاس کھانے اور پہننے کے لئے کافی ہو تو اسے

مطلبن ہو جانا چاہئے۔ اسی لئے جب وہ لولی تو اُس کا لہجہ ملامت آمیز تھا اور ذرا تیز بھی۔

”یہ جو تم ہر وقت مصوری کی باتیں کرتے رہتے ہو اور اُن چیزوں کو دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے ہو جنہیں اُو کوئی بھی نہیں دیکھتا، تو لوگ کہتے ہیں جب تک تم یہ دن دہائے خواب دیکھنے نہ چھوڑو گے تم کوئی کام نہیں کر سکو گے اسی لئے والد تمہیں لوگی موچی کے پاس شاگرد کرانے کا دھبیان کر رہے ہیں۔ کم از کم وہ مہنہیں اپنے فن کا ماہر تو بن سکتا ہے اور یہ تمہارے لئے ہر وقت وین کے متعلق سوچنے دینے سے بدرجہا بہتر ہوگا“

ٹیزیا نے اپنے سر کو جنبش دی لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اُسے اپنے مقصد کے سامنے کسی دوسری بات کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اکثر راتوں کو جب گھر کے سب لوگ سو جاتے وہ اپنے بستر میں جاگ جاگ کر سوچا کرتا کہ کس طرح وہ اپنے باپ کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اُسے مصوری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر جانے کی اجازت دے دے۔ گاؤں میں سب جانتے تھے کہ وہ ننھتوں، پتھروں اور سہراؤں چیز پر جو اُس کے سامنے آ جاتی تصویریں بنانے میں گھنٹوں صرف کر دیا کرتا ہے، اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں کا نیک دل پادری اُس کے کام کی تعریف کیا کرتا ہے۔ لیکن اُس کی اُن کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی۔ کیڈور کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرح تصویریں بناتے تھے اور انہیں کوئی نہ پوچھتا تھا۔ آخر اسے کیوں شہر بھیجا جائے؟ صرف اس لئے کہ وہ ایک پہاڑ کا نقشہ کامیابی کے ساتھ اتار سکتا ہو یا جنگل کی تصویر کسی حد تک بنالیتا ہے؟ اُن کی اس بے توجہی کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی طرح بھی انہیں یہ سمجھانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا کہ رنگ ہی وہ چیز ہے جس نے اُس کی روح میں ایک آگ لگا رکھی ہے، اور سرے کے قلم سے اُس کا اظہار ناممکن ہے۔

نیچے سڑک پر ایک سیٹی کی آواز سنائی دی اور کیٹر بنانے دیکھا کہ اُس کا بھائی فرانسکو انہیں جلد اپنے

پاس بلارہا ہے۔

کیٹر بنانے کہا ”وہ شاید بارگوندھنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں“

اس کے بعد وہ دونوں گاؤں کی سڑک کی طرف دوڑ پڑے۔

کوہستان اطالیہ میں یہ جون کاروشن اور عطر بارمبینہ تھا، جب ڈولومی کی زرخیز وادی کے ٹیلے اور میدان لگا رنگ

پھولوں کا ایک گلدستہ بن جاتے ہیں۔ کل پھولوں کا میلہ آ رہا تھا، اسی لئے آج انہوں نے پھول پھننے میں کئی گھنٹے گزار دیے تھے

اور اب، کہ غروب ہوتا ہوا آفتاب چوٹوں کو اور غوانی رنگ سے رہا تھا وہ اپنی تاخت و تار لاج کو لے کر واپس جا رہے

تھے تاکہ اس سے اپنے عیش و مسرت کی تیاری میں مدد لیں۔

ذرا سی دیر میں وہ اپنے نوخیز ساتھیوں سے جا ملے، سب نے ہار بنا نے شروع کر دیے اور کل کے کھیلوں کے متعلق تجویزیں سوچنے لگے۔ کینڈور کا گاؤں اُن دنوں ذرائع آمد و رفت کی کمی کے باعث دنیا سے بہت دور تھا اور جب کبھی کوئی تیو ہارا آتا تھا تو وہاں کے باشندے اپنے سیدھے سادھے کھیلوں میں اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنے کہ وینس کے رہنے والے اپنے نئے نئے تماشوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوں۔ ہر طرف سے گیتوں اور مقبول کی آوازیں آتی تھیں اور مشتاق سامعین کے لئے جھوٹی بھی دلچسپ باتیں کہی جاتی تھیں۔

ایک لڑکی نے جس کی زبان اُس کی چالاک انگلیوں سے بھی تیز چلتی تھی کہا ”کچھ تم نے سنا، چکی والے کا لڑکا سالویٹر سنگ تراشی کا فن سیکھنے کے لئے وینس جا رہا ہے۔ جب سے اُس کا باپ امیر ہو گیا ہے اُس نے اُس سے اپنا کاروبار کرنے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ پہلے تو سالویٹر نے اس طرف دھیان ہی نہ کیا لیکن جب اُسے بتایا گیا کہ ایک سنگ تراش کسی بہت بڑے نواب کا مقرب بھی ہو سکتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اگر وہ ایک بڑا آدمی بن گیا اور ایک نفیس مکان میں رہنے لگا تو کیسی شان دار بات ہوگی! پھر ہم کہا کریں گے، ہاں، ہاں وہ ہمارے ہی گاؤں کا آدمی ہے!“

سیبستیا نو جس کا چچا برگیمو میں کسی وکیل کا منشی تھا اور جو شہر کی باتوں سے دوسرے بچوں کی بہ نسبت زیادہ واقف تھا بولا ”میں تو نہیں سمجھتا کہ اسے سنگ تراشی کا کچھ شوق ہو۔ میرے خیال میں صنّاع بننے کے لئے امیر باپ کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔“

بانونی لڑکی نے اپنے سر کو ہلایا۔ پھر بولی ”یہ سچ ہے، مگر روپیہ بھی نہ ہو اور استاد بھی نہ ملے تو بتاؤ کوئی کیسے کچھ کر

سکتا ہے؟“

کمیٹر نیل نے کہا ”سواب اگر ٹیز بانو نے مصوری سیکھنے کے لئے شہر جانے کا نام لیا تو میں اُس سے کہہ دوں گی کہ وہ اپنے امیر نہیں ہیں کہ تمہارا خرچ برداشت کر سکیں“ اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ تم لوگ سے ہو چکی کام سیکھے کا خیال کرو۔ اس پر سب کھلکھلا کر تہنیں پڑے، اور کسی نے کہا ”ٹیز بانو! اُس نے تو کبھی کسی سے ایک دفعہ بھی اصلاح نہیں لی۔ وہ تو بنیاد اٹھائے بغیر قلعے کے برج بنانے شروع کر دیتا ہے۔“

ٹیز بانو کا چہرہ سرخ ہو گیا یہ سچ تھا کہ اُسے کبھی استاد میسٹر نہ آیا لیکن اُسے یقین تھا کہ اگر اُسے موقع دیا جائے تو وہ اپنے آپ کو اس قابل ثابت کرے گا کہ اُس کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کی جائیں۔

اُس نے دل میں سوچا ”کاش مجھے کچھ رنگ مل جائیں! ممکن ہے پھر یہ لوگ مجھے وہی نہ سمجھیں کیونکہ مجھے یقین ہے

کہیں ان سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصویر بنا سکوں گا، اور پھر شاید میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے دینس جاسکوں۔ لیکن رنگ کم یاب اور بیش قیمت تھے، اور گو اُس کا باپ ایک آسودہ حال شخص تھا تاہم وہ ایک ایسے لوگ کے لئے رنگ خرید کر اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جسے کبھی ان کا استعمال نہ سکھایا گیا ہو۔

دوسرے دن انو جنرل مصوڑ کو راستے کے پتھروں پر کچھ دلغ نظر آئے، جو پھولوں کے روندے جانے سے دھال پڑ گئے تھے۔ یہ داغ ایسے صاف اور روشن تھے جیسے کسی مصوڑ نے انہیں بڑی احتیاط سے بنایا ہو۔ ان کو دیکھ کر اسے ایک خیال سوچھا۔ اُس نے یہ خیال کسی پر ظاہر نہ کیا۔ وہ اس میں اتنا غور کیا کہ سبزہ زار پر رنگ برنگ کے لباس پہن کر رقص کرنے والے دیہاتی بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ اور جیسے ہی اسے موقع ملا وہ چپکے سے اُن میں سے نکل کر پھولوں کے کھیتوں کی طرف چل دیا۔

کیٹرینا نے اُسے جلتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ حیران تھی کہ اس مسرت و انبساط کے مجمع میں سے کن سی چیز اُسے لے جا رہی ہے۔ جب اُس کی حیرت تفریح کی خواہش سے بڑھ گئی تو وہ بھی اُس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچی تو وہ ایک ایسی پہاڑی پر کھڑا تھا جسے پھولوں نے روشن کر رکھا تھا۔

وہ بولی ”ٹیزناؤ، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

لوگ کے نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں شک جھلک رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ گو میری بہن کو میری بلند پروازیوں پر اعتراض ہے پھر بھی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ میرے راز کو فاش نہیں کرے گی۔

اُس نے جواب دیا ”میں ایک رنگین تصویر بنا رہی ہوں۔“

ایک لمحہ کے لئے وہ کھڑی اُسے دیکھا کی۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ اسے بہکا رہا ہے وہ کہنے لگی ”ہاں، کیوں نہیں؟“

”رنگوں کے بغیر!“

لیکن اُس کا متین چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔

اُس کی آنکھیں ایک عجیب روشنی سے چمک رہی تھیں جب اُس نے کہا ”میں رنگوں کی جگہ پھولوں کو استعمال کروں گا۔ دیکھو، ان میں سب رنگ موجود ہیں، اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کام میں لائے جاسکتے ہیں۔ میں نے ان کے نشان راستے کے پتھروں پر دیکھے ہیں۔“

کیٹرینا نے بھائی کی طرح نیم ہوم خیالات میں کھو نہیں جایا کرتی تھی، اور کہیں رنگ کے ایک ڈبے کو دیکھ کر اُسے تصویریں نظر نہیں آیا کرتی تھیں، لیکن اُس نے سمجھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے ناممکن نہیں ہے، کیونکہ اُس نے خود

بھی پتھروں پر رنگ کے نشانات دیکھے تھے۔ اب اُسے یہ بھی خیال آیا کہ اُس کا بھائی ضرور ایک ہشیار اور زیرک لڑکا ہے کیونکہ عام لڑکوں کو یہ بات ذرا بھی نہیں سوجھی، اور اُس نے سوچا کہ شاید اُس کی دینس جانے کی خواہش کوئی بے سرو پا خیال نہیں ہے۔ اگر چکنی والے کے بیٹے سالویٹر کے لئے رنگ تراش بن جانا ایک شاندار بات ہو سکتی ہے تو کیا ٹیزیانو کا ایک مصور بن جانا شان دار نہیں، اور کیا کیڈورا اس پر غز نہیں کر سکتا؟ پادری کو اُس نے اکثر کہتے سنا کہ کوئی کام ایسا نہیں جس کی دھن انسان کو لگی ہوئی ہو اور پھر اُسے صبر، حوصلے اور استقلال سے کیا جائے اور ناکامی ہو، اور یہ کہ مدد ہمیشہ اُن کو ملتی ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے ٹیزیانو کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا، خواہ وہ اسی قدر کیوں نہ ہو کہ اُس کے راز کی حفاظت کی جائے اور اُس کے کام کے لئے ضروریات مہیا کی جائیں۔

سو مکتے ہوئے خطوں میں سے وہ رنگ رنگ کے پھول اکٹھے کرتے پھرے — سرخ، گلابی، نیلے، ارغوانی جیسے کوہستان کی شفق کا رنگ ہوتا ہے، اور پیلے اور سنہری جیسے وہ اکثر اپنے تصور میں دیکھا کرتا تھا۔ پھر وہ اُس پر اپنے پتھر کے بنے ہوئے مکان کی طرف اٹھ بھاگے جو اُن کے باپ کی ملکیت تھا یہ بالکل خالی رہتا تھا۔ اُن کے اپنے گھر کے لوگ بھی یہاں شاد و نادر ہی آیا کرتے تھے اور گاؤں کے رہنے والے تو اس میں کبھی داخل نہ ہوتے تھے۔ اور یہیں ہر دست اندازی سے محفوظ ہو کر اُسے وہ تصویر بنانی تھی جس کے متعلق دونوں بہن بھائیوں کو امید تھی کہ اُسے وینس لے جانے کا ایک فدیہ ثابت ہوگی۔

کیٹرینا پاس رہ کر تصویر کو بننے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی لیکن ٹیزیانو کو اس پر اعتراض تھا۔ اُس نے کہا ”جب تک پختہ نہ ہوئے میں نہیں چاہتا کہ تم بھی اسے دیکھو، کیونکہ اول اول اس کی شکل تصویر جیسی نہیں ہوگی“ چنانچہ وہ اسے کوسلے کے ایک کھڑے سے خاکہ بناتے ہوئے چھوڑ کر چلی گئی۔

کئی دن تک لوگوں سے چھپ چھپا کر وہ اس مکان میں جاتا رہا اور پھولوں کے رنگوں سے تصویر بناتا رہا۔ کیٹرینا پرندوں کی طرح اڑتی ہوئی نگاروں میں جاتی اور پھر ادھر ادھر نگاہ ڈال کر کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اُس کھڑکی میں سے پھول اپنے بھائی کے حوالے کر دیتی جس کے قریب بیٹھ کر وہ کام کر رہا تھا۔ اور اگرچہ پھول کی ہر شئی تصویر پر صرف ایک ننھا سا دھبنا کر خشک ہو جاتی، اور اگرچہ ٹیزیانو ایک ملہم غیبی کی سی تیزی کے ساتھ تصویر پر رنگوں کو پھیلاتا جاتا لیکن اُسے ایک مرتبہ بھی پھولوں کے انتظار میں ہاتھ روکنا نہ پڑا۔

تصویر اُس کے سحر آسا قلم کے نیچے بتدریج نمایاں ہوتی گئی اور اُس نے اپنے اور کیٹرینا نے اپنے راز کی خوب پاسداری کی۔ صرف ڈھوروں کے گٹے تمکنتی ہوئی چراگا ہوں میں چرتے ہوئے کبھی کبھی اس سسنان مکان تک جا پہنچتے

چنانچہ کسی کو بھی علم نہ ہو سکا کہ یہاں وہ لڑکا مصروفِ کار ہے جو اٹلی کے نام کو چار پانڈ لگائے گا۔ گاؤں کے لوگوں کو خواب و خیال بھی نہ تھا کہ یہ پھول جو کیٹرینا چن رہی ہے ایک غیر فانی کام میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ایک شام جب سوچ پہاڑ کی چوٹیوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا اور گھروں کو واپس جاتے ہوئے گڈریوں کی خوشی سے لبریز آوازیں بلند یوں سے نیچے گونج رہی تھیں ٹیزیانو نے اس مکان کے دروازے سے باہر قدم رکھا، اور بہن کو اپنے پاس بلا کر کہا

”کیٹرینا تصویر ختم ہو گئی! اور یہ میری بہترین تصویر ہے“

وہ خوشی سے اچھلتی ہوئی اندر گئی، لیکن جب وہ تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی تو مسرت اُس کے چہرے سے رخصت ہو گئی اور وہ احترام آمیز لہجے میں بولی ”اوہ ٹیزیانو، یہ تو مقدس مریم کی تصویر ہے!“ اُس نے کہا ”ہاں، مریم اور بچے کی، اور ایک میری طرح کا لڑکا تحفہ پیش کر رہا ہے۔ کیٹرینا یہی تصویر میرے دل میں تھی“

چند لمحوں کے لئے وہ تصویر کے حق میں ایسی محو ہوئی کہ اُسے اور کوئی بات یاد نہ رہی۔ پھر یہ خیال کر کے کہ گاؤں والوں کے لئے اس حیرت انگیز کارنامے کا علم اُس کے بھائی کے حق میں کیسے کیسے شاندار نتائج پیدا کرے گا وہ خبر کو پھیلانے کی خاطر باہر نکل آئی۔

اور جب وہ لوگ گئی کے گھر کے پاس سے جلد جلد گزر رہی تھی اُس نے کہا ”آؤ، دیکھو! ٹیزیانو نے ہمارے پچاٹے مکان کی دیوار پر مقدس مریم کی تصویر نگوں سے بنائی ہے“

کوئی خبر جب دیہاتیوں کی زبانوں پر چڑھ جاتی ہے تو بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں لوگوں کا ایک مجمع اس مکان کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں ٹیزیانو اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا باپ جو تمام دن پہاڑوں میں شکار کرتا پھر اُٹھا اب گھر واپس آ رہا تھا۔ جب اُس نے لوگوں کو اس جگہ جمع ہوتے دیکھا تو حیران ہو کر وہ بھی اسی طرف چل کھڑا ہوا۔ مگر اُس کے پہنچنے تک ہجوم اس قدر بڑھ چکا تھا کہ تصویر اُس کو نظر نہ آئی۔

ہر طرف سے یہی آوازیں آرہی تھیں ”اُس نے یہ تصویر کیسے بنائی!“ ”اُس نے یہ رنگ کہاں سے لئے!“ اور ہر شخص میں اتنا جوش بھرا ہوا تھا کہ اُس کے باپ کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیوں یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ پھر اُس نے ٹیزیانو کی آواز سنی۔ ”میں نے اس تصویر کو پھولوں کے دسی سے بنالیا ہے۔ کیٹرینا! بکوج جمع کرتی رہی اور میں کام کرتا رہا۔“

ہر طرف سے تعریف کا اظہار ہونے لگا، اور گاؤں کے پیشوائیک دل پادری نے پُر احترام انداز سے کہا
”پھولوں کے رس سے! مقدس ٹیزیا کو دکھیو!“

انٹونیو ویسیلی سکنے کے عالم میں کھڑا دیکھ رہا تھا، کیونکہ جو کچھ وہ سن رہا تھا اُس پر اُسے یقین نہ آتا تھا۔
ایک دیہاتی سے جو پاس ہی کھڑا تھا اُس نے پوچھا ”کیا میں پاگل ہو گیا ہوں یا پادری نے سچ مچ میرے بیٹے
کو ”مقدس“ کہا ہے؟“

اُس نے جواب دیا ”نہیں تم پاگل نہیں ہو۔“

اور جب انہوں نے سارا ماجرا اُس سے کہہ سنایا اور هجوم نے اُسے راستہ دیا تاکہ وہ بھی تصویر کو دیکھ سکے
تو وہ حیران رہ گیا۔

چلتی والے کا لڑکا سالو پٹر سنگ تراشی سیکھنے گیا یا نہیں، یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن ٹیزیا نو گیا، اور کیڈور
کا یہ لڑکا بعد میں وینس کا اعجوبہ بنا۔ وہاں سیکینی کی استادانہ اصلاح نے اُس کی رہنمائی کی، اور اُن موقوفوں کو جو اس
سے قبل تقریباً اسی سال تک مصروف کار رہے تھے اُس نے خوب چلایا اور ان سے وہ تصویریں بنائیں جن
کے شگفتہ رنگوں کی نظیر کبھی نہ مل سکی۔ اُس نے اپنے وطن کے لوگوں پر ثابت کر دیا کہ خیال پرستی کچھ بری چیز نہیں
کیونکہ خیال پرستی کے ساتھ جب محنت مل جاتی ہے تو اُس سے حیرت انگیز باتیں ظور پذیر ہوتی ہیں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کو لمبس بھی مغرب کے سفر کو روانہ نہ ہوا تھا۔ لیکن اُس کا باپ جو گاؤں کے
پادری سے ”مقدس ٹیزیا نو“ کے الفاظ سن کر اپنے آپ کو پاگل سمجھنے لگا تھا اگر آج پھر کو ہستان اطالیہ کی گلازاروادی
میں آئے تو اُسے یہاں کی فضا میں وہی الفاظ گونجتے ہوئے سنائی دیں جو اُس نے اُس شام پادری کی زبان
سے سنے تھے۔

جب گاؤں کے لوگ اس عالی پایہ مجسمہ کے پاس آکر کھڑے ہوتے ہیں جس کا رخ پھولوں کے اُن کھیتوں
کی طرف ہے جن میں سے کثیر بنا اپنے بھائی کے لئے رنگ رنگ کے پھول توڑ کر لاتی تھی تو وہ اُس کی طرف اشارہ
کر کے کہتے ہیں ”دیکھو، مقدس ٹیزیا نو کو دکھیو!“

منصور احمد

(ترجمہ)

ایک عزیزہ کی دائمی جدائی پر

ہزاروں آنروؤں کا شررُ حجاب کے گئی
 تمام دلوں سے سوئے ہوئے تھے جاگ اٹھے
 خیال اُس کا نہاں تھا دماغ اور دل میں
 ہم اُس کی یاد میں رہتے تھے مضطر اور بکل
 وہ زلیست ہی میں تھی اک سپکِ وفا پر
 ہم اپنے بخت کی خوش کامیوں پر نازاں تھے
 پھر اُس سے ملنے کا تھا انتظار برسوں سے
 ”کلی“ بہشت کی معصوم و نوشگفتہ ”کلی“
 دلوں کو خون کے آنسو بہت لاکے گئی
 وہ سارے جاگے ہوئے دلوں سے لٹاکے گئی
 وہ خود کو قیدِ خیالات سے چھڑاکے گئی
 وہ دامن اپنا اس آزار سے بچاکے گئی
 گئی جو زلیست سی، راہِ وفا دکھا کے گئی
 وہ بد نصیبی پنہاں پہسکرا کے گئی
 وہ انتظار کی دنیا ہی سب مٹا کے گئی
 کھلی، پہ دل کی نہ میرے کلی کھلا کے گئی

وہ خالی آئی نہ خالی مگر گئی محشر
 کہ اپنے دل میں محبت میہی بسا کے گئی

محشر عابدی

مسمریم کا عمل

حقیقتاً یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اکرام کے غیر معمولی واقعہ نے بحث و تمحیص کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ بلکہ حالات و واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر ایسا نہ ہوتا تو واقعی تعجب تھا جو لوگ اس معاملہ میں شریک تھے، ان کا خیال تھا کہ کم از کم موجودہ صورت میں، یا جس وقت تک کہ ہمیں تحقیق و تجربہ کے آئندہ مواقع حاصل نہ ہوں، اس واقعہ کو نظر عام پر نہ لانا چاہئے، اور ہم نے اسی کی کوشش بھی کی۔ لیکن اس کا یہ اثر ہوا کہ عام طور پر تحریف شدہ یا مبالغہ آمیز اطلاعات پھیل گئیں، جو کئی مختلف النوع ناخوشگوار غلط بیانیوں کا، اور اس لئے بہ کثرت بے اعتقادوں کا مصدر ثابت ہوئیں۔

لہذا اب یہ ضروری ہو گیا کہ ان واقعات کو ————— جہاں تک میں خود سمجھ سکا ہوں ————— بیان کروں۔ یہ واقعات مختصر طور پر حسب ذیل ہیں۔

گذشتہ تین سال سے میری توجہ مسمریم کے مضمون کی طرف متواتر منعطف کی جا رہی تھی، اور تقریباً نو مہینے ہوئے کہ بالکل اچانک طور پر میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب تک جس قدر تجربات کئے جا چکے ہیں، ان میں ایک نہایت اہم اور ناقابل تشریح فرو گذاشت ہو گئی ہے ————— یعنی یہ کہ آج تک کسی شخص پر حالت نزع میں اس کا عمل نہیں کیا گیا۔ اس میں کئی مسائل دریافت طلب تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ آیا مرض ایسی حالت میں اس مقناطیسی قوت سے اثر پذیر ہونے کی قابلیت رکھتا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ اگر رکھتا ہے تو اس کی حالت اس قابلیت کو گھٹایا بڑھا سکتی ہے؟ تیسرے یہ کہ مسمریم کا عمل کس حد تک یا کتنی حد تک موت کے آنے کو روک سکتا ہے؟ ان کے علاوہ اور کئی مسائل قابل غور تھے، لیکن میرے دماغ میں ان تین کی اہمیت سب سے زیادہ تھی ————— خصوصاً مؤخر الذکر کی، کیونکہ اس سے انتہائی اہم نتائج برآمد ہونے کی امید تھی۔

میں نے معمول کا انتخاب کرنے کے لئے اپنے گرد و پیش نظر ڈالی، تاکہ اُس کے ذریعہ سے میں ان مسائل کو حل کر سکوں۔ میرا ذہن صرف اکرام کی طرف منتقل ہوا، جو ”اخبار المشاہیر“ کا مشہور و معروف مرتب ہے، اور جس نے ابوالکلام کے فرضی نام سے حیات النور پاشا، اور رامائن، کا فارسی ترجمہ کیا ہے۔ اکرام، جو دراصل چاندنی چوک،

دہلی کا رہنے والا تھا، اپنے جسم کی انتہائی لاغری کی بنا پر مشہور تھا، اور اس وجہ سے بھی لوگ اُس کے چہرہ کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ اس کی سفید ڈاڑھی موٹھیں اس کے بالکل سیلہ سر کی ضد معلوم ہوتی تھیں، اور عام طور پر موخر الذکر کو مصنوعی بالوں کا خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی طبیعت انتہائی کمزور واقع ہوئی تھی، اس وجہ سے وہ سریزیم کے تجربات میں بہترین معمول کا کام نہ سکتا تھا۔ دو یا تین موقوفوں پر میں نے اس کو نہایت آسانی کے ساتھ سٹلدا یا تھا، لیکن اس کے لاعرجسم کی وجہ سے میں قدرتی طور پر جن دیگر نتائج کی توقع کئے ہوئے تھا، اُن میں مجھے مایوسی کا سنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی قوت ارادی جزئی یا کُلی طور پر کبھی میرے نالغ عمل نہ ہو سکی، اور غیبی معاملات میں تو اس کے ذریعہ سے میں کوئی قابلِ اعتماد بات نہ معلوم کر سکا میں نے اپنی اس ناکامی کا الزام ہمیشہ اُس کی صحت کی ابتر حالت پر دکھائی کرنا سنا سنی سے چند ماہ قبل اس کے علاج مرض کو لازمی طور پر دق متجویز کر چکے تھے، اور یہ اُس کی عادت ہو گئی تھی کہ وہ اپنی توت کے متعلق اس انداز میں گفتگو کرتا تھا، گویا کہ یہ معاملہ ناگزیر اور ناقابلِ امنوس تھا۔

جس وقت یہ خیالات، جن کا میں اوپر تذکرہ کر چکا ہوں، میرے دماغ میں پیدا ہوئے تو قدرتی طور پر مجھے اکرام کا خیال آیا۔ میں اس کے غیر مترنزل فلسفیانہ دماغ سے خوب واقف تھا، لہذا اس کی طرف سے کسی چون و چرا کا اندیشہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں اس کا کوئی عزیز بھی قریب نہ تھا جو مددِ اخلاقی کر سکتا۔ میں نے اس سے بے تکلف اس خیال کا تذکرہ کیا، اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ خود اُس کو بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، میں اس لئے کتنا ہوں کہ گو اس سے پیشتر بھی وہ میرے تجربات کے لئے اپنے جسم کو پیش کر چکا تھا لیکن اُس نے کبھی اس عمل سے دلچسپی کا اظہار نہ کیا تھا۔ اس کی بیماری اس قسم کی تھی کہ اس کی موت کے وقت کی بابت صحیح اندازہ کیا جاسکتا تھا، اور ہم نے آپس میں یہ طے کر لیا کہ اطباء موت کا جو وقت معین کریں، اس سے تقریباً چوبیس گھنٹے قبل وہ مجھے اطلاع دے دے۔

آج شاید سات مہینے سے زیادہ گزر چکے ہیں کہ مجھے خود اکرام کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رقعہ ملا:

”کمپی عزیز صاحب۔ بہتر ہے کہ آپ اس وقت تشریف لے آئیے۔ ڈاکٹر داور اور ڈاکٹر فریڈ کی بھی دلہ ہے

کہ میں کل نصف شب کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا، اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے وقت کا بہت صحیح اندازہ کیا ہے۔

”اکرام“

یہ رقعہ تحریر سے آدھ گھنٹہ بعد مجھے مل گیا، اور اس کے پندرہ منٹ بعد میں اکرام کے کمر میں تھا۔ میں نے تقریباً

دس روز سے اُسے نہیں دیکھا تھا، اور اس مختصر عرصہ نے اس میں جو خوفناک تبدیلی پیدا کر دی تھی، اسے دیکھ کر میں

بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کے چہرہ پر سیسے کا سازنگ غالب تھا، آنکھوں سے چمک قطعی مفقود ہو چکی تھی، دہلاپن اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ رخساروں کی ہڈیاں کھال سے باہر نکل آئی تھیں، اور نبض بہت خفیف محسوس ہوتی تھی۔ تاہم سخت حیرت ہے کہ اس کی دماغی قوت اور کسی حد تک جسمانی قوت، دونوں برقرار تھیں۔ اس کی زبان صاف تھی، وہ بغیر کسی کی مدد کے سکوں بخش دواؤں استعمال کر رہا تھا، اور جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا ہوں، ایک نوٹ بک پر نپل سے کچھ یادداشت لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ بستر پر چاروں طرف تکیوں میں دبا ہوا تھا۔ ڈاکٹر داور اور ڈاکٹر فرید دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اکرام سے مصافحہ کر کے میں ان دونوں حضرات کو علیحدہ لے گیا، اور ان سے مریض کی حالت مفصل حال معلوم کیا۔ اُس کا بایاں پھیپھڑا اٹھارہ مہینہ سے تقریباً ہڈی کی طرح سخت ہو چکا تھا، اور کسی کام کا نہ رہا تھا۔ دہانے کا بالائی حصہ بھی اگر بالکل نہیں تو تھوڑا بہت سخت ہو گیا تھا، درآخالیکہ پچلا حصہ صرف گلیٹیوں کا ایک مجموعہ رہ گیا تھا۔ جو ایک دوسرے میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں کئی بڑے بڑے سورخ پڑ چکے تھے، اور ایک موقع پر پسلیوں کے ساتھ مستقل پیوستگی پیدا ہو گئی تھی۔ دہانے شش کی یہ خرابیاں حال ہی میں ظاہر ہوئی تھیں، اور پھیپھڑوں کی سختی نے غیر معمولی سرعت کے ساتھ ترقی کی تھی، کیونکہ ایک مہینہ پیشتر اس کی کوئی علامت موجود نہ تھی، یہاں تک کہ پیوستگی کا حال صرف تین روز قبل ہی معلوم ہو سکا تھا۔ دق کے علاوہ مریض کو اور مرض بھی لاحق تھے، لیکن پھیپھڑوں کی سختی نے کسی صحیح تشخیص کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا۔ دونوں ڈاکٹروں کی یہی رائے تھی کہ اکرام اگلے دن (اتوار کو) آدھی رات کے قریب ختم ہو جائے گا۔ یہ واقعہ ہفتہ کے دن شام کے سات بجے کا ہے۔

داور اور فرید مجھ سے بات چیت کرنے کے لئے مریض کے بستر سے اٹھتے وقت اُسے ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ چکے تھے۔ ان کا ارادہ پھر آنے کا نہ تھا، لیکن میری درخواست پر انہوں نے اگلے روز رات کو دس بجے پھر مریض کو دیکھنا منظور کر لیا۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں آزادانہ طور پر اکرام سے اس کی موت کے متعلق، اور بالخصوص اپنے تجربہ کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ وہ اب تک نہ صرف قطعی رضامند تھا، بلکہ اس عمل کے کئے جانے کا خواہاں تھا، اور فوراً شروع کر دینے پر مجھ سے اصرار بھی کر رہا تھا۔ اس وقت ایک مرد اور ایک عورت تیمارداری کے لئے موجود تھے۔ لیکن میں نے اسے نامناسب سمجھا کہ اس قسم کا کام ایسے وقت شروع کر دوں، جب کہ کسی اچانک حادثہ کی صورت میں ان لوگوں کے علاوہ کوئی قابل اعتماد گواہ بھی موجود نہ ہو۔ اس لئے میں نے اپنے عمل کو آئندہ رات کے آٹھ بجے تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ وقتِ معینہ پر طب کے ایک طالب علم، حسن جمال، کی آمد نے جس سے میں بھی واقف تھا، میری پریشانیوں کا خاتمہ

کر دیا۔ دراصل میرا ارادہ تھا کہ دونوں ڈاکٹروں کا انتظار کروں، لیکن ایک تو اکرام کی پُر زور التھاؤں نے، اور دوسرے سیر کے اس یقین نے کہ مجھے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہیے، کیونکہ وہ نہایت سرعت کے ساتھ ختم ہو رہا تھا، مجھے اپنا عمل فوراً شروع کر دینے پر مجبور کر دیا۔

جمال نے نہایت مہربانی کے ساتھ میری اس خواہش کو منظور کر لیا، کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اس کو تحریر کرتا جائے، اور جو واقعات مجھے اب بیان کرنا ہیں، وہ زیادہ تر اسی کی یادداشت سے لے کر کہیں مختصر کر کے اور کہیں بلا تفسیر نقل کر دیئے گئے ہیں۔

آٹھ بجے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ میں نے مریض کا ہاتھ پکڑ کر اس سے درخواست کی کہ وہ جن جال سے وضاحت کے ساتھ یہ بیان کرے کہ آیا وہ (اکرام) اس بات پر قطعی آمادہ ہے کہ میں ایسی حالت میں اُس پر سمریزم کا عمل کروں۔

اُس نے نحیف لیکن قابل سماعت آواز میں جواب دیا: "ہاں میری خواہش ہے کہ مجھ پر سمریزم کا عمل کیا جائے" پھر فوراً ہی ان الفاظ کا اضافہ کیا: "مجھے خوف ہے کہ آپ نے بہت دیر کر دی"

اس گفتگو کے بعد میں نے اپنے وہ عمل شروع کئے، جن کو اس سے پہلے اکرام کے مطیع کرنے میں زیادہ موثر چکا تھا۔ میرے ہاتھ کے پہلے ہی ایک طرف دار نے، جو اس کی پیشانی کی طرف گیا گیا تھا، اس پر تین اثر کیا، لیکن اس کے بعد میرے تمام قوت صرف کرنے کے باوجود بھی اس پر کوئی اثر ظاہر نہ ہو سکا، یہاں تک کہ دس بج کر کچھ منٹ پر داؤ اور فریج بھی حسب وعدہ آ پہنچے میں نے چند الفاظ میں اُن سے اپنا طریق عمل بیان کیا، جو میں اختیار کرنے والا تھا، اور چونکہ انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور مریض کو موت کی تکالیف میں مبتلا بتایا، لہذا میں نے بلا پس دپیش اپنا عمل جاری رکھا البتہ کبھی کبھی ایک طرفہ عمل کو تھمتی عمل سے بدل دیتا تھا، اور اپنی نگاہ کو پورے طور سے مریض کی صرف داہنی آنکھ پر جمارکھا تھا۔

اب اس کی نبض غیر محسوس ہو چکی تھی، سانس خراشوں میں تبدیل ہو چکا تھا، اور آدھے منٹ کے وقفہ سے آ رہا تھا۔

پندرہ منٹ تک اُس کی اس حالت میں تقریباً کوئی تبدیلی نہ ہوئی، البتہ اس عرصہ کے بعد ایک قدرتی لیکن بہت گہرا سانس مرنے والے کے سینہ سے نکلا، اور خراشے کا سانس بند ہو گیا۔ یوں کتنا چاہیے کہ اس کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وقفوں میں البتہ کوئی کمی نہ ہوئی۔ مریض کے ہاتھ پاؤں اس وقت برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔

گیارہ بجے میں پانچ منٹ پر میں نے مسمریزم کے اثرات کی علامات دیکھیں۔ آنکھوں کی شفافیت اُس تکلیف اندرونی امتحان کی علامتوں سے تبدیل ہو گئی، جو سوائے مسمریزم کے عمل کے اور کہیں نہیں دیکھی جاتیں، اور جن میں غلطی کا مطلق احتمال نہیں۔ میرے چند فوری یک طرفہ واروں سے اُس کی آنکھوں کے پردے ہلنے لگے، جیسے کہ نیند کے ابتدائی لمحات میں ہلا کرتے ہیں، پھر چند اور واروں کے بعد میں نے انہیں بالکل بند کر دیا۔ بہر حال مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوا، اور میں برابر اپنی قوت ارادی کا پورا زور لگا کر عمل کرتا رہا، یہاں تک کہ معمول کے اعضا کو ظاہر آرام دہ حالت میں رکھ کر میں نے اُن کو بالکل سخت کر دیا۔ ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں، یہی کیفیت ہاتھوں کی تھی، جو بستر پر کمر سے ذرا فاصلے پر پڑے تھے۔ صرف سر ذرا سا اٹھا ہوا تھا۔

جس وقت میں نے اس عمل کو ختم کیا ہے، پوری آدھی رات گزر چکی تھی، اور میں نے حاضرین سے اکرام کی حالت کا اندازہ کرنے کی درخواست کی۔ چند تجربات کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ وہ غیر معمولی سکون کی حالت میں قطعی مسمریزم کے زیر اثر ہے۔ دونوں ڈاکٹر بے حد دلچسپی لینے لگے، یہاں تک کہ ڈاکٹر داور نے تو اسی وقت تمام رات مریض کے پاس رہنے کا تہیہ کر لیا، اور ڈاکٹر فرید علی الصباح آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا جن جمال اور تیمار دارو میں ہے۔

ہم نے صبح کے تین بجے تک اکرام کو بالکل پریشان نہ کیا۔ اُس وقت میں اس کے پاس آیا اور بالکل ویسا ہی پایا، جیسا فرید کے جانے کے وقت تھا، یعنی وہ اُسی صورت میں لیٹا ہوا تھا۔ نبض غیر محسوس تھی، سانس بہت ہلکا چل رہا تھا اور ہونٹوں پر آئینہ لگائے بغیر معلوم نہ ہو سکتا تھا، آنکھیں قدرتی طور پر بند تھیں، اور اعضا سنگرم ممر کی طرح سخت اور سرد تھے۔ تاہم اس کی عام ظاہری حالت سے موت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔

اکرام کے پاس پہنچ کر میں نے یکوشش کی کہ اُس کے دلہنے ہاتھ پر اثر ڈال کر اس کو اپنے ہاتھ کے ساتھ ساتھ ہلاؤں، چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ اُس کے جسم کے اوپر دھرا دھرا آہستہ آہستہ ہلانا شروع کیا۔ ان تجربات میں اکرام کے ساتھ مجھے پہلے کبھی پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی، لہذا اس وقت بھی مجھے اپنی کامیابی کا بہت کم خیال تھا۔ لیکن مجھے سخت تعجب ہوا کہ اکرام کا ہاتھ فوراً، مگر ذرا ضعف کے ساتھ، اسی طرف کو حرکت کرنے لگا، جس طرف میں اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتا تھا۔ میں نے چند سوالات دریافت کرنے کا تہیہ کر لیا۔

”اکرام!“ میں نے کہا ”کیا سوچے ہو؟“

اُس نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن اس کے ہونٹوں پر مجھے کچھ تھر تھرا منہٹ سی معلوم ہوئی، لہذا میں نے اس سوال کو بار بار دہرانے کا ارادہ کیا۔ تیسری مرتبہ دہرانے پر اس کے تمام جسم میں ایک ہلکی ارتعاشی کیفیت پیدا ہوئی،

آنکھوں کے پردے خود بخود اس قدر کھل گئے کہ ان میں سے ایک سفید لکیر نظر آنے لگی، ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے، اور نہایت نحیف آواز میں یہ الفاظ نکلے:-

”ہاں! اب سو رہا ہوں۔ جگاؤ مت! — اسی طرح مرنے دو!“

اُس وقت میں نے اُس کے اعضا کو چھوا، اور پہلے ہی کی طرح سخت پایا۔ دہنا بازو حسبِ معمول میرے ہاتھ کے اشاروں کی متابعت کر رہا تھا میں نے معمول سے پھر سوال کیا:-

”اکرام! کیا سینیہ میں تمہیں اب بھی درد محسوس ہوتا ہے؟“

اس مرتبہ جواب جلد ملا، لیکن پہلے سے بھی زیادہ کمزور آواز میں:-

”کوئی درد نہیں — میں مر رہا ہوں“

میں نے اسے زیادہ پریشان نہ مانا سب نہ سمجھا، اور ڈاکٹر فرید کے آنے تک خاموشی طاری رہی۔ فرید طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے پہنچا، اور رضی کو اس وقت تک زندہ دیکھ کر انتہائی تعجب کا اظہار کیا۔ اس نے نبض دیکھی، ہونٹوں پر آئینہ رکھا، پھر مجھ سے کہنے لگا کہ تم معمول سے گفتگو کرو۔ میں نے ایسا ہی کیا، اور پوچھا:-

”اکرام! کیا ابھی سو رہے ہو؟“

پہلے کی طرح چند لمحات گزرنے کے بعد جواب ملا، اور اس عرصہ میں معلوم ہوا تھا کہ مرنے والا بولنے کے لئے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے۔ سوال کو چوتھی مرتبہ دہرنے پر اُس نے نہایت کمزور تقریباً ناقابلِ سماعت آواز میں جواب دیا:-

”ہاں ابھی سو رہا ہوں — مر رہا ہوں“

اس وقت ڈاکٹروں کی رلے، بلکہ خواہش یہ تھی کہ اکرام کو اس کی موجودہ بظاہر چر سکون حالت میں چھوڑ دیا جائے، اور جب تک موت مداخلت نہ کرے پریشان نہ کیا جائے — اور ہم سب کا یہ خیال تھا کہ موت کے آنے میں صرف چند لمحات باقی ہیں۔ تاہم میں نے سوچا کہ اس سے ایک مرتبہ اور گفتگو کروں، اور اس غرض کے لئے پہلے سوال ہی کو دہرایا۔ میرے سوال پر معمول کے چہرہ پر ایک نمایاں تغیر نمودار ہوا۔ آنکھیں گھوم کر آہستہ آہستہ کھل گئیں، پتیلیاں بالکل اوپر چڑھ گئیں۔ جلد پر عموماً مدنی سی چھا گئی، چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا، اور دق کی وجہ سے جگول دھتے اُس کے ہر رخسار کے بیچ میں بالکل صاف نظر آتے تھے، ایک دم سبجہ گئے میں اس فقرہ (ایک دم سبجہ گئے) کو اس وجہ سے استعمال کرتا ہوں کہ ان دھتوں کا اڑنا اتنی سرعت کے ساتھ ظہور پذیر ہوا، کہ گویا ایک شمع کو پھونک، بارگزل کر دیا گیا۔ اوپر کا ہونٹ

ساتھ ہی ساتھ اینٹھ کر دانتوں سے علیحدہ ہو گیا، جن کو وہ اس سے پیشتر مکمل طور پر ڈھکے ہوئے تھا۔ نیچے کا جبراً جھٹکنے کی آواز کے ساتھ نیچے اچڑا، اور منہ اپنی پوری وسعت سے کھلا رہ گیا جس کے اندر سوچی ہوئی سیاہ زبان صاف نظر آرہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں کا کوئی شخص بستر مرگ کی خوفناکیوں سے واقف نہ تھا، لیکن اس وقت اکرام کی صورت اس قدر ناقابل قیاس طور پر ہیبت ناک ہو گئی تھی کہ ہم سب خوفزدہ ہو کر بستر کے پاس سے پیچھے ہٹ گئے۔

اب اکرام میں زندگی کی کمزور سے کمزور علامت بھی نظر نہ آتی تھی، اور اسے مردہ سمجھ کر ہم تیار داروں کے سپرد کرنے والے تھے کہ اُس کی زبان میں ایک زبردست استہزائی حرکت پیدا ہوئی۔ یہ حرکت شاید ایک منٹ تک جاری رہی، جس کے بعد اس کے پھیلے ہوئے بے حس و حرکت جبرطوں سے ایک آواز نکلی — ایسی کہ اُس کے بیان کرنے کی کوشش کرنا میرے لئے جنون کے مترادف ہوگا۔ دو تین صفتیں ایسی ضرور ہیں، جو اس پر صرف جبری طور پر صادق آسکتی ہیں — مثلاً میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ صدا سخت تھی، بے ہنگم تھی کھوکھلی سی تھی — لیکن اس گل ہیبت ناک صدا کو بیان نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ آج تک کسی ایسی صدا نے انسانی کان میں خراش نہ پیدا کی ہوگی۔ با ایں ہمہ دو باتیں ضرور تھیں، جن کی بابت میں نے خیال کیا، اور اب بھی خیال کرتا ہوں، کہ آواز کی خصوصیات میں شمار کی جاسکتی ہیں، اور انہیں سے اس کی غیر خلقی عجوبہ طرازی کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ایسا معلوم ہوا کہ وہ آواز ہمارے کانوں میں — کم از کم میرے کانوں میں — بہت دور و دراز فاصلہ سے، یا زمین کے نیچے کسی عمیق غار سے آئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے مجھ پر ایسا اثر کیا (مجھے خوف ہے کہ شاید میں اپنے بیان کی توضیح نہ کر سکوں گا) جیسے کوئی چپکتا ہوا ایس دارادہ جس لامسہ پر اثر کرتا ہے۔

میں نے ”صدا“ اور ”آواز“ دونوں لفظ استعمال کئے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس صدا کا ایک ایک حرف صاف صاف — جبرت انگیز طور پر متعین کن طور پر صاف صاف — سنائی دیا۔ اکرام بولا، اور اُس سوال کے جواب میں بولا، جو چند لمحہ پیشتر میں نے اُس سے کیا تھا۔ میں نے دریافت کیا تھا کہ کیا وہ ابھی سو رہا ہے۔ اُس نے اب جواب دیا۔

”ہاں — نہیں — میں سو رہا تھا — اور اب — اب — میں مرچکا ہوں“

ان چند الفاظ نے، جو اس حالت میں ادا کئے گئے تھے، ہم پر جو ناقابل بیان لرزادینے والی دہشت طاری کر دی، اس سے نہ کوئی انکار کر سکا، نہ اسے دبا سکا، نہ جلال طالب علم کو غش آگیا۔ تیار دار فوراً کمرہ چھوڑ کر بھاگ گئے، اور واپس لوٹنے پر کسی طرح رخصت ہوئے۔ میں اپنے احساسات ناظرین کے سامنے بیان نہیں کر سکتا تقریباً ایک گھنٹے تک ہم نہایت غبیضہ کے ساتھ — ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر — جلال کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف رہے۔

وہ ہوش میں آگیا، تو ہم نے پھر اکرام کی حالت کی تحقیق کرنی چاہی۔

اس کی حالت ہر صورت سے وہی تھی، جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، سوائے اس کے کہ اب آئینہ سے سانس کی آمد و رفت کا ثبوت نہ ملتا تھا۔ اس کے بازو سے خون نکالنے کی کوشش کی گئی، لیکن ناکام رہی۔ مجھے اس امر کا بھی اظہار کر دینا چاہئے کہ اب اس کا ہاتھ میری قوتِ ارادی کے ماتحت نہ رہا تھا، اور میں نے کافی زور لگایا کہ وہ میرے ہاتھ کے اشاروں کی متابعت کرے مگر بے سود۔ اب مسمریزم کے اثرات کا اظہار صرف اس کی زبان کی اہترازی حرکت سے ہوتا تھا، وہ بھی اس وقت جب میں اس سے کوئی سوال پوچھتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جواب دینے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن کافی طاقت نہیں رکھتا۔ میرے علاوہ اگر کوئی اور شخص اس سے سوال کرتا، تو وہ بالکل بے خبر معلوم ہوتا تھا، حالانکہ میں نے اس کے ساتھ تمام حاضرین کو بھی مسمریزم کے حلقہ میں لے لیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں بیان کر چکا ہوں، اس سے معمول کی ایسے وقت کی حالت سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے تیمارداروں کا انتظام کیا گیا، اور دس بجے میں، دونوں ڈاکٹر اور جمال وٹل سے رخصت ہو گئے۔

شام کے وقت ہم سب مریض کو دیکھنے کے لئے پھر جمع ہوئے۔ اس کی حالت بالکل ویسی ہی تھی، لہذا ہم نے اس امر پر بحث کی کہ آیا اس کو بیدار کرنا مناسب ہوگا، اور عمل پذیر ہو سکے گا یا نہیں۔ لیکن ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ ایسا کرنے سے کوئی فائدہ متصور نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ اس وقت تک موت کو دیا جس کو عموماً موت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مسمریزم کے عمل سے روک دیا گیا ہے۔ لہذا یہی صاف سمجھ میں آسکتا تھا کہ اکرام کو جگانے کے یہ معنی ہو گئے کہ اس کے یک لمحہ یا کم از کم فوری خاتمہ کا یقین کر لیا جائے۔

اُس وقت سے لے کر گذشتہ ہفتہ کے آخر تک — تقریباً سات مہینہ کے عرصہ میں — ہم اپنے تفریقِ دوست احباب کے ساتھ روزانہ اکرام کے مکان پر جاتے رہے۔ اس تمام مدت میں معمولِ قطعی اسی طرح رہا، جیسا کہ میں آخر میں بیان کر چکا ہوں۔ تیماردار برابر توجہ سے کام کرتے رہے۔

لیکن گذشتہ جمعہ کو بالآخر ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ اس کو جگانے کا، یا جگانے کی کوشش کرنے کا تجربہ کرنا چاہئے اور یہ اسی آخری تجربہ کے نتائج بدکا اثر ہے، جس نے مختلف طباقوں میں بحث و تمحیص کا ایک طوفان بپا کر رکھا ہے۔ ایسی بحث و تمحیص، جس کو میں نامناسب بازاری جذبات کے نام سے پکے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اکرام کو مسمریزم کے اثرات سے نکالنے کے لئے میں نے اپنے معمولی عمل استعمال کئے۔ ان میں کچھ عرصہ تک ناکامی رہی، مگر بعد میں اس سے ہٹا کر آنکھوں کی سیاہی کچھ کچھ نیچے اترائی۔ اس میں ایک خاص

بات یہ بھی دیکھی گئی کہ پتلی کے اترنے کے ساتھ ہی پلکوں کے نیچے سے زرد زرد مادہ بہت زیادہ مقدار میں بننے لگا،

اس وقت یہ تجویز ہوئی کہ میں پہلے کی طرح مریض کے بازو پر اثر ڈالنے کی کوشش کروں۔ میں نے کوشش کی اور ناکامیاب رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر فریڈ نے یہ خواہش کی کہ کوئی سوال کروں۔ میں نے سوال کیا۔ ”دراکرام! کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ منہائے جذبات اور احساسات اب کیا ہیں؟“ اس کے رخساروں پر مرض کے وہی دھبے پکایک پھر نمودار ہو گئے، زبان تھر تھرانے لگی، بلکہ منہ کے اندر نہایت تیزی کے ساتھ ناچنے لگی، حالانکہ جڑے اور ہونٹ پہلے کی طرح سخت اور بے حس و حرکت رہے، اور آخر کلد وہی دہشت انگیز آواز جس کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، سنائی دی۔

”خدا کے واسطے! ————— جلدی! ————— جلدی! ————— مجھے سلا دو! ————— یا جلدی!

مجھے بیدار کر دو! ————— جلدی! ————— میں تم سے کتنا ہوں کہ میں مرجچا ہوں!“

میرا دماغ بالکل پریشان ہو گیا، اور تھوڑی دیر تک میں قطعاً نہ سمجھ سکا کہ کیا کرنا چاہئے۔ پہلے میں نے مریض کو دوبارہ سکون میں لانے کی کوشش کی، لیکن قوت ارادی کے بالکل قابو میں نہ ہونے کی وجہ سے ناکامیاب رہا پھر میں نے وہی راہ اختیار کی، اور پوری قوت کے ساتھ اس کو بیدار کرنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کوشش میں شاید میں کامیاب ہو جاؤں۔ ————— یا کم از کم مجھے یہ نظر آنے لگا کہ میری کامیابی مکمل ہوگی۔ اور مجھے یقین ہے کہ کمرہ میں سب لوگ مریض کو بیدار دیکھنے پر آمادہ تھے۔

تاہم جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اسے دیکھنے کے لئے قطعی ناممکن ہے کہ کوئی انسان آمادہ ہوتا۔

میں جلد جلد اثرات مارنے کے عمل کر رہا تھا، درآںحالیکہ مریض کے ہونٹوں سے نہیں، بلکہ زبان سے ”مرچکا! مرچکا!“ کی خوفناک صدائیں متواتر نکل رہی تھیں، کہ یکایک ————— صرف ایک لمحہ یا اس سے بھی کم عرصہ کے اندر ————— میرے ہاتھوں کے نیچے اس کا تمام جسم سکڑ گیا۔ ————— ریزہ ریزہ ہو گیا۔ بالکل گل کے رہ گیا۔ او! بستر پر، ہم سب کی نظروں کے سامنے مکروہ، نفرت انگیز سڑاند کا ایک تقریباً رقیق ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

انیس الدین احمد

(ماخوذ از ایڈگر امین پو)

دل

عہدِ الفت کی داستاں ہو دل دلِ غِ حسرت کا اک نشاں ہو دل
 پوچھتے کیا ہو تم کہاں ہو دل ہم کو معلوم ہے جہاں ہو دل
 غمِ الفت کا رازواں ہو دل صرف بے تابی نہاں ہو دل
 یا گلہ ہے کوئی ندامت خیز یا خموشی اثرِ فغاں ہو دل
 اب وہ سودائے عرضِ حال کہاں یعنی پہلے سا اب کہاں ہو دل
 اب وہ الفت پرستیاں ہی نہیں نہ وہ حسرت کش بتاں ہو دل
 نہ وہ ہنگامہ ہائے شوق رہے نہ وہ لذت کش فغاں ہو دل

تجھ سے کیونکر کہے غمِ الفت

دل مضطر کہ بے زبان ہو دل

رام رتن مصنط

شہرت

میز کے اوپر، میز کے نیچے، فرش کے کونوں پر، ہر طرف دھندلی، بے رنگ تصویریں کس پرسی کے عالم میں پڑی سرسبز تھیں۔ دیوار پر پرانے چوکھٹوں میں جو نئی تصویریں جڑوا کرٹانگی گئی تھیں ان پر بھی گرد و غبار کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ہفتوں سے انہیں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک پرانی بوسیدہ میز پر تصویر کشی کا سا رادھر ادھر پھلا پڑا تھا۔ تین چار چھوٹی چھوٹی پیالیاں، کوئی نصف درجن چھوٹے بڑے برش، کاغذات، رنگوں کا بکس، کریم کے ٹکڑے، آلم غلم.....

اسی میز پر دونوں کنہیاں ٹیکے، سرکوباتھوں میں تھامے پرکاش چندر ہونٹ لٹکائے بیٹھا ہوا تھا، جیسے ابھی ابھی کسی سوخوب لڑکر آیا ہو۔ وہ اس وقت دل میں اس منخوس ساعت کو کوس رہا تھا جب اُس نے مصوری کی احقانہ دھن میں بیٹھے بٹھائے اپنی اچھی خاصی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا۔ اس گرانی کے زمانہ میں پچاسی روپیہ ماہانہ کوئی بڑی رقم نہیں۔ پھر بھی کفایت شعاری اور سلیقہ کی بدولت وہ اپنی اور اپنی بیوی کی تمام متوسط ضروریات کو پورا کر لیتا تھا۔ مقررہ رقم، مقررہ نرخ، مقررہ پروگرام۔ نہ بے جا کدو کاوش نہ ہر روز کل کیا ہوگا کی جان لیوا فکر۔ اس کی زندگی کی گاڑی ایک ایسے ہموار راستے پر دھیرے دھیرے چل رہی تھی جس میں مسافر کو ہچکولے کم لگتے ہیں اور نیند زیادہ آتی ہے۔ ایسے مستقل اطمینان، ایسے بے غل و غش راستے کو چھوڑ کر کیا ایک وہ زندگی کے اس نئے پُرخطر اور نامانوس سمندر میں کیوں کود پڑا؟ آخر وہ عسرت و تنگ دستی کی پھٹکار سے کب تک دست و گریباں رہے گا؟ ملازمت چھوڑے آج اسے پورا ڈیڑھ سال گزر چکا ہے۔ اس عرصہ میں اُس نے کتنی تصویریں بنائیں اور کتنی بیچیں؟ — بنائیں درجنوں، لیکن بیچیں مشکل سے تین چار۔ یا زیادہ سے زیادہ آٹھ دس۔ وہ بھی اپنے ایک پرانے ہم جماعت کی عنایتوں کی بدولت جس نے اُس کے افلاس پر ترس کھا کر اس کی امداد کا یہ بہانہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ اپنی ہر تصویر پر پھپھی تصویر سے زیادہ موٹے حرفوں میں نیچے کے کونے پر ”پرکاش چندر“ لکھتا، اس موہوم امید پر کہ وہ لوگ جو اس کی ملازمت کے زمانہ میں اُس کی تصویروں کو دیکھ کر تعریف کے پل باندھ دیا کرتے تھے اسے معاوضہ دیے بغیر تصویروں کی موقع بے موقع فراستوں سے اس کا تاک میں دم کر دیتے تھے اپنے پرانے ہیرو کی ان تازہ تصویروں پر اس کا نام دیکھ کر انہیں شوق و محبت سے بے تاب ہو کر خرید لیں گے۔ لیکن دن گزرتے گئے اور کسی آرٹ کے شیدائی نے اُس کی تصویروں کی نظر

رخ بھی نہ کیا۔ بجز تعریف کے چند رسمی نفروں کے، جن کی تہنیت حقیقی پسندیدگی کے بجائے اخلاقی دلہری زیادہ ہوتی تھی اُسے اپنے ان پرلنے مذاہن سے آدرکچہ نہ ملا۔

ملازمت چھوڑنے سے پہلے اُس کے لئے مصوڑی کا پیشہ کیسے کیسے خوش آیند اور دلکش خواہوں سے معمور تھا! اُسے اپنے تخیل، اپنی رنگ آمیزی، اپنے انتخاب موضوع پر کیسا کامل اعتماد تھا! اُسے ہمیشہ سے کامل یقین تھا کہ قدرت نے اُس کے وجود کو محض مصوڑی کے لئے وضع کیا ہے۔ اگر وہ عمر بھر سرکاری عدالت کے محکمہ میں پڑا سٹرا رہا تو دنیا ایک پیدا آئشی آرٹسٹ کے عظیم الشان کارناموں سے محروم رہ جائے گی! لیکن ملازمت چھوڑتے ہی زندگی کی تلخ، بے رحم حقیقتوں نے اُس کے اس خوبصورت خیالی شیش محل کو پاش پاش کر ڈالا اور اگر مایوسی کی کپ ہدیت ناک تاریکی میں اُس کی ذہین بیوی لاجونتی کی شعل حسن کا اجالا نہ ہوتا تو یہ ناکام مصوڑ کب کا وہ ڈرنا کام انجام دے چکا ہوتا جسے عرف عام میں خودکشی کہتے ہیں اور جس کی مشفقانہ آغوش اُن تمام نامراد ناول نویسوں، فساد نگاروں ایکٹروں اور اُن مایوس عاشقوں کے لئے ہر وقت کھلی رہتی ہے جنہیں کامرانی کا دیوتا اپنے پاس سے دھکے دے کر نکال دیتا ہے۔

لاجونتی ایک لطافت پسند، وہم پرست، تخیلی لڑکی تھی جس نے پرکاش کے کمال مصوڑی پر پہچہ کر، بلا سوچے سمجھے اُسے دل دے دیا تھا۔ اچھی تعلیم، بیسویں صدی کے دل و دماغ روشن کرنے والی تربیت، سب سے بڑھ کر مروجہ پاپ کی مشرقات فاق نقاشی، ان سب عناصر نے مل جل کر لاجونتی کے مذاق کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اگر وہ خود تصویر بنیں بنا سکتی تھی تو اس کے لئے یہ فخر بھی کچھ کم نہ تھا کہ اس فن میں اس کی گہری، بے خطا نظر پر اچھے اچھے مبصروں کو رشک آتا تھا۔ لاجونتی ایسی حسین، خوبصورت ہیرے کی طرح ترشائی دلربا کے اچھوتے دل پر فتح حاصل کر لینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس کامیابی کے نشہ نے پرکاش کو اس آخری فیصلہ پر لا ڈالا کہ اس کی انگلیاں دفتر کے قلم کے لئے نہیں بلکہ مصوڑ کے برش کے لئے بنی ہیں۔ لیکن زمانہ کی چال کبھی ٹیڑھی خطرناک چال ہوتی ہے! وہی کمال جس نے ڈیڑھ سال پہلے لاجونتی ایسی طرصار لڑکی کو اس کے قدموں پر جھکا دیا تھا آج اُس کے گلے میں رسی کا پھندا بنا ہوا اٹکا تھا۔ ایسا پھندا جسے کھول کر نکال دینے کی کوشش کرو تو اور زیادہ کتنا چلا جائے۔

اتنے دنوں کی پیہم ناکامیوں نے پرکاش کی خود اعتمادی کو بالکل کچل ڈالا تھا۔ اب وہ اکثر سنجیدگی کے ساتھ سوچا کرتا کیا واقعی مجھ میں ایک اعلیٰ درجے کا مصوڑ بننے کی قابلیت تھی؟ یا شروع سے میں اپنے متعلق محض مغالطہ ہی مغالطہ

میں مبتلا رہا۔ ٹھیک جس وقت وہ اس طرح شک و یقین کے درمیان غوطے کھاتا ہوتا اُسے یکایک لاجونتی کے وہ دل بڑھانے والے فقرے یاد آجاتے جنہیں وہ صبح سے شام تک بیسیوں مرتبہ الٹ پھیر کر دہراتی رہتی :-

”تم میں ایک حقیقی مصوّر کی روح بھری ہوئی ہے۔ دیکھ لینا کسی دن تمہارا نام سورج کی طرح چمک کر رہے گا۔“
 ”ہمت نہ ہارو۔ پہلے پہل یوں ہی دکھ اٹھانا پڑتے ہیں۔ تم جیسا آدمی زیادہ دنوں تک گنہگار نہیں ہو سکتا۔“
 یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں جملے پرکاش کی ٹوٹی ہوئی آس کو از سر نو جوڑ دیتے۔ یہی ہمت افزائی لے دے کہ اب اس کی مایوس زندگی کا سہارا رکھ گئی تھی۔ لیکن ان تمام ہمت افزائیوں میں محبت بھری تحریفوں، دلداریوں کے باوجود وہ اکثر تعجب کرنے لگتا کیا واقعی لاجونتی صحیح کہتی ہے کہ مجھ میں ایک حقیقی مصوّر کی روح بھری ہوئی ہے۔ یا اچھے اچھے خوں ہنگاموں کے ہوتے ایک گنہگار بے ایم مصوّر کو قبول کر لینے کی غلطی کو حق بجانب ثابت کرنے اور اپنے نفس کو تسکین پہنچانے کے لئے وہ ایسا کرتی ہے، پھر وہ نظر اٹھا کر لاجونتی کے بھولے چہرے کو، اس کی خلوص بھری آنکھوں کی دلفریب سیاہی کو، اُس کی پریم بھری مسکراہٹ کو دیکھتا تو اُسے لاجونتی کی صداقت کا یقین آجاتا۔ اُس کی نگاہوں میں محبت کا سرو چمک اٹھتا اور اُس کے چہرے کے خطوط سے ٹپکنے لگتا :-

”لاجونتی۔ تو بالکل دیوی ہے دیوی! مجھ سا نکمہ آدمی کب اس قابل تھا کہ تو اس کی بیوی بنتی!“

اور بے خبر لاجونتی ایک میل کچیلی، موٹے کپڑے کی ساری پہنے خوش خوش گھر کا تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتی پھرتی۔ وہ میلے چمکٹ کپڑوں میں کیسی معصوم کتنی خوبصورت معلوم ہوتی! اس کے الجھے ہوئے بال اس کی بلند پیشانی پر بکھرے رہتے اور اُس کے سرخ کنول ایسے نرم و نازک پاؤں صبح سے شام تک چھوٹے سے صحن کے ہزاروں چکر کر ڈالتے۔

سرکاری ملازمت کا بچا کھچا روپیہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اب گھر کا تمام خرچ اس قلیل رقم میں چلتا تھا جو ایک خوش حال بیرسٹر کے دولٹوں کو ڈرائنگ سکھانے کے صلہ میں مہینے کے مہینے پرکاش کو ملتی تھی۔ لاجونتی بھی طرح جانتی تھی اب پانی سر سے اونچا ہوتا جاتا ہے۔ اب تک افلاس کے مہیب دیو کا صرف میاں بیوی مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ دونوں نوجوان اور پُر جوش تھے۔ نوجوانی کے اٹھ رہنماؤں اور کسی کی طفلانہ بے پروائیوں میں دنیا کی ہر چھوٹی بڑی مصیبت کو غرق کر سکتے تھے۔ لیکن یہ حقیر رقم اُس ننھے مہمان کی مہماں داری کا خچ کیونکر پورا کرے گی جس کا نرم و نازک وجود عنقریب لاجونتی کی ماتا بھری گود کو آباد کرنے والا تھا؟ یہ فکر لاجونتی کو دن رات کھائے جاتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہ خیال ہر وقت اس کی گردن پر سوار رہتا۔ یہاں تک کہ آج جی

کیوں ہوتا جاتا ہے؟ دہلی میں بڑے بڑے راجہ مہاراجہ آتے رہتے ہیں۔ وہاں کے لوگ ویسے بھی اس فن کے قدردان ہیں۔۔۔۔۔۔ اس بے قدرے شکر کو چھوڑیے۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ دلی چل کر رہئے۔ اپنا ذاتی مکان موجود ہے۔ وہاں جان پہچان کی بھی کوئی کمی نہیں۔ قسمت نے ساتھ دیا تو تھوڑی سی دنوں میں کاروبار چمک اٹھے گا۔۔۔۔۔۔ پر کاش چند رکی بھویں سکرو گئیں۔ چڑچڑا کر بولا ”تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی سسرال کی روٹیوں پر جا پڑوں میں فاقوں مرحاؤں بلا سے۔ یہ ذلت گوارا نہ ہوگی“

پھر اپنے سخت جواب کے اظہار میں کاش کا احساس کر کے کسی قدر نرم آواز میں ”برانہ ماننا میں تمہارا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ بات یہ ہے کہ میری غیرت کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی کہ میں تمہاری ماتا جی پر اپنا بوجھ ڈال دوں۔ کاروبار چلتے چلتے بھی مہینوں دھکا رہیں۔ اتنے دنوں تک میں دوسروں کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ یہاں رہ کر کچھ نہیں تو میں کچھ پیسے روپیے کا سہارا تو لگا ہوا ہے“

لاجنتی پہلے ہی سے ڈر رہی تھی، پر کاش اس کی تجویز کو نا منظور کرے گا پھر بھی اُس نے ایک مرتبہ اور کوشش کی ”مہینوں کیوں دھکا رہنے لگے۔ بنارس اور دلی میں بڑا فرق ہے۔ وہاں معمولی معمولی مصوڑے سینگروں روپیہ پیدا کر لیتے ہیں اور مہینے میں اُن کی درجنوں تصویریں ہاتھوں ہاتھ تک جاتی ہیں پھر آپ کی تصویروں اور اُن کی تصویروں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی آپ کا کام اُن سے دس گنا اچھا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا اُن کی کامیابی کا بھید کیا ہے؟“

”کامیابی کا بھید! مجھ سے پوچھو۔ میں بتاتا ہوں۔ بھید وید کچھ بھی نہیں۔ سارا کھیل شہرت کا ہے۔ شہرت کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ بس ایک مرتبہ آرٹسٹ کا کسی طرح نام نکل جائے۔ چاہے وہ لائٹری کاروپہ جیتنے کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہو، چاہے چپا کے مرنے پر یکایک بہت سا روپیہ مل جانے کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔ یا پھر اخباروں اور رسالوں کے ڈیڑے بڑے بڑے تعریفی مضامین لکھ لکھ کر تمام ملک میں اُس کا نام اچھا لیں۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح اسے مشہور ہو جانا چاہئے پھر دیکھو اس پر کیسی روپیہ کی بارش ہونے لگتی ہے!“

لاجنتی نے آپ ہی آپ زیر لب پر کاش کے جملے کو دہرایا ”شہرت کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔۔۔۔۔۔ بس ایک مرتبہ کسی نہ کسی طرح آرٹسٹ کا نام نکل جائے۔۔۔۔۔۔ اور پھر وہ کسی گھرے سوچ میں پڑ گئی۔ بہت دیر تک خاموش کھوٹی کھوٹی سی رہی۔ یہ چپ اسے کئی دن تک لگی رہی۔ جیسے اندر ہی اندر اپنے کو کسی عظیم الشان مہم کے لئے تیار کر رہی ہو۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہتی تھی۔

ایک دن کوئی تین چار روز کی مسلسل خاموشی کے بعد وہ پھر پرکاش کے نگار خانہ میں گئی۔ پرکاش بیٹھا الیکٹ انی تصویر کے رنگوں پر برش پھیر رہا تھا۔ اُس نے اس انداز میں جیسے پرکاش سے ابھی ابھی اس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی دھیمی آوازیں کہا ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بالکل ٹھیک کہتے ہیں..... واقعی شہرت کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے..... اچھا میں آپ کو ایک تدبیر بتاتی ہوں بالکل اچھوتی۔ بالکل نئی۔ دو ہی دن میں سارے بنارس میں آپ کا نام نہ نکل جائے تو میرا ذمہ“

پرکاش چند سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لاجوتی پھر بولی ”آپ بہت عمدہ پیراک ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں پیرا کی کے بہت سے انعام جیت چکے ہیں..... کیوں ٹھیک نہ؟

اتنا کہ کروہ رک گئی۔ پرکاش حیرت میں تھا کہ لاجوتی کے اس فقرے کا ان کی موجودہ حالت سے کیا تعلق ہے۔ وہ جھنجھلا رہا تھا کہ لاجوتی ایک ہی سانس میں سب کچھ کیوں نہیں کہہ ڈالتی پسلیاں کیوں بکھار ہی ہے۔ بالآخر کوئی آدھ منٹ پرکاش کو شدید انتظار میں رکھنے کے بعد لاجوتی نے زوردار لہجے میں کہا

”اچھا تو آپ کو گنگا میں ڈوبنا پڑے گا“

پرکاش اچھل پڑا ”ڈوبنا پڑے گا؟“ اُس نے نتیجہ ہو کر پوچھا۔

”ہاں ڈوبنا پڑے گا..... یا دوسرے لفظوں میں آپ کو ڈوبتے ہوئے بچایا جائے گا۔ سمجھے آپ؟

”نہنہ! کیسی مہمل باتیں کرتی ہو۔ اچھا تو پھر اس سے فائدہ؟

”فائدہ! فائدہ یہ ہو گا کہ دوسرے ہی دن تمام اخباروں میں یہ خبر تیزی کے ساتھ شائع ہو جائے گی۔ ایک اخبار کے دوسرے اخبار میں نقل ہوگی سینکڑوں لوگ حادثہ کے صحیح حالات معلوم کرنے آپ کے پاس دوڑے آئیں گے ہر طرف آپ کا چرچا ہو گا۔ اس طرح سارے شہر میں بلکہ دور دور تک آپ کا نام مشہور ہو جائے گا“

”یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا“ پرکاش نے فیصلہ کن انداز میں ناگواری کا منہ بنا کر کہا۔

”پر ان ناتمہ! میری خاطر آپ کو یہ بات کرنا پڑے گی..... لکنتی اچھوتی تدبیر ہے۔ ذرا سوچئے تو یہ تیرے بھائی کا نہیں کر سکتا..... آپ سب لوگوں کی نظریں بکرا کر اک دم دریا میں کود پڑیئے گا۔ پھر میں شور مچانے لگوں گی۔ ہر طرف سے لوگ دوڑ پڑیں گے۔ کوئی نہ کوئی تو آپ کو نکالنے کے لئے پانی میں پھاند ہی پڑے گا۔.....“

”اور فرض کرو کسی نے مجھے بچانے کی ہمت نہ کی تو؟“

”واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دیکھا پر سینکڑوں آدمی نہانے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ بہت اچھا تیرتے ہیں۔

اس لئے کسی بات کا ڈر نہیں۔ پھر جب آپ کو کنا سے لگایا جائے گا تو اخباروں کے نامہ نگار چاروں طرف سے جھپٹ پڑیں گے۔ رپورٹ لینے میں ہر رپورٹر دوسرے سے باز می لے جائے گی کو شش کرے گا..... ان سے میں سمجھ لوں گی۔ دیکھئے کیسا کام کالتی ہوں..... دوسرے ہی روز تمام اخباروں میں سنسنی پیدا کر دینے والی موٹی موٹی سرخیاں شلٹ ہو گئی۔

”دریائے گنگا سے ایک ڈوبتے ہوئے مصوٰر کی جان بچائی گئی“

”مصوٰر کی نوعمر بیوی کا بیان“

بڑا لطف آئے گا۔ یہ آخری جوا بھی کھیل دیکھئے۔ آگے میری اور آپ کی قسمت“

پرکاش فکر میں پڑ گیا۔ اُس نے خیال کیا اخلاقی حیثیت سے یہ چال ایک چھوڑی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ شہرت کے کا لائن اتنا بڑا فریب! مجھ سے تو دریا میں نہ کودا جائے گا۔ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ زندگی ہے تو کبھی نہ کبھی پرمیشر کی مہربانی ہو ہی جائے گی۔

لاجنتی پہلے تو معنوی دیر تک غور سے پرکاش کا چہرہ دیکھتی رہی۔ شاید فیاض سے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی ہو۔ پھر بتیاب ہو کر بولی۔ ”تو پھر کیا کہتے ہیں۔ میری خاطر آپ کو یہ ترکیب منظور ہے نا؟“

پرکاش اک دم اپنے انکار سے لاجنتی کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اب تک وہ خود ذہن بک کے الجھاؤ میں الجھا ہوا تھا۔ اُس نے چبا چکا جواب دیا۔

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا..... تم نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے..... کل اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دوں گا“

وہ تمام دن لاجنتی کی تجویز پر غور کرتا رہا۔ رات کو سونے لیٹا تو بستر پر دیر تک کروٹیں بدلا گیا۔ عجب پس و پیش کی حالت میں مبتلا تھا۔ کبھی اٹھ کر ٹیلنے لگتا۔ پھر ٹھنڈا پانی پیتا۔ پھر ٹیلنے لگتا۔ اسی اوجھڑ میں بارہ بج گئے لاجنتی کا یہ معمول تھا کہ گھر کے کام کاج سے تنک کر پڑتی تو صبح کی خبر لاتی۔ اس غریب کو کیا خبر کہ اُس کا مجازی خدا اس وقت غور و فکر کے کیسے شدید کر ب میں مبتلا ہے۔

آخر سوچتے سوچتے پرکاش اس فیصلہ پر پہنچا کہ وہ لاجنتی کی بات نہیں مٹائے گا۔ اس فیصلہ پر پہنچنے کے لئے اُس نے جوتا ویلیں قائم کیں اُن میں سب سے پہلا مسئلہ جذبات کا تھا۔ وہ لاجنتی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اسے بری طرح چاہتا تھا۔ اس لئے اُس کا کنا ٹال کر اُس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے خیال

کیا اخلاقی نقطہ نظر سے تو یہ بات اُس وقت معیوب ہوتی جب حکمت عملی کے اس داؤن سے کسی دوسرے شخص کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔ میں کوئی چوری نہیں کروں گا۔ ڈاکا نہیں ڈالوں گا۔ کسی کی جائیداد پر ناجائز قبضہ نہیں کر بیٹھوں گا۔ دھوکے فریب سے کسی کا مال نہیں مار لوں گا۔۔۔۔۔۔ بس یہی ناکہ الگ ذرا دیر کے لئے پانی نہیں گرگا اس طرح ہاتھ پر چلانے لگوں گا جیسے کوئی ڈوب رہا ہو۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے لوگ کیسی کیسی گھناونی چالیں چلتے ہیں۔ کیسی کیسی قابلِ نفرت غابازیاں کرتے ہیں! پھر ان مکاروں کے مقابلہ میں تو یہ سیدھی سادی نذیر کچھ بھی نہیں ایک بے ضرر جرأت ہے جس کے بھلے بُرے نتائج سے سوا میرے کوئی دوسرا متاثر نہیں ہو سکتا۔ یہ سوچتے سوچتے پرکاش کو دریا میں کودنے اور بچائے جانے کی پُر خطر لذت کا تصور بندھ گیا اور وہ دل ہی دل میں اس خوفناک، جرأت آزما مہم کے خیالی مزے لینے لگا جو اُسے عنقریب شہرت کے سنہرے پردوں پر بٹھا کر لے اُٹے گی۔ وہ ایک جری نوجوان تھا۔ ہمیشہ سے ایسے کھیلوں کا شیدائی جن میں جان جو کھم کا ڈر ہو اس وقت اس کی جوفردی کی آزمائش تھی۔۔۔۔۔۔ وہ لا جوتی کو دکھائے گا کہ وہ تنہا ایک ہونا رصورت ہی نہیں بلکہ ایک جاننا بہادر بھی۔

لا جوتی ہلکے رنگ کی ایک نیلی ساری پہنے ہوئے تھی۔ پرکاش نے اس موقع کے لئے بادامی رنگ کا بند کالر کا کوٹ اور رنگ مہری کا پاجامہ منتخب کیا تھا تاکہ پانی کے اندر اُسے آزادی سے اُدھر اُدھر ٹانگیں چلانے کا موقع ملے۔ آنے والی مہم کے خیال سے لا جوتی کا رنگ کسی قدر زرد پڑ گیا تھا۔ پرکاش کے چہرے پر بھی کچھ کچھ بدحواسی کے آثار نمایاں تھے۔ پل کے اوپر سے کاروباری مصروف لوگ اُدھر سے اُدھر آ جاتے تھے۔ کسی نے اُس نوعمر جوڑے کی طرف توجہ بھی نہیں کی جو پل کے کنارے سٹٹا سٹٹایا بچوں کی طرح سسما ہوا اکھڑا تھا۔ پرکاش نے پل کی بلندیوں سے نیچے پانی کو جھانکتے ہوئے کہا ”بڑی لمبی جست ہے۔ ہوگی کوئی چالیس فٹ کے قریب“

پھر اس خیال سے کہ کہیں اس کی بیوی یہ نہ سمجھے کہ کوڑے سے چکچکا رہا ہے اس نے ذرا اکڑ کر کہا ”مگر میں تو اس سے کہیں زیادہ اونچے اونچے مقاموں سے کود چکا ہوں۔ بھلا اس کی میرے سامنے کیا حقیقت؟“ پل کے نیچے گھاٹ پر میسیوں لوگ تھوڑی تھوڑی دود کے فاصلہ پر پناہ دے تھے۔ کوئی غوطہ لگا رہا تھا۔ کوئی دھوتی چھانٹ رہا تھا۔ بعض جٹا دھاری سا دھوجن کے جسم پر بھبھوت ملا ہوا تھا دیا کے کنارے ریت پر آسن جائے، آنکھیں بند کئے سورج دیوتا کی پوجا میں مشغول تھے۔

کیا ایک پانی میں کسی نہایت وزنی چیز کے جھم سے گرنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی پل پر سے ایک چمچ

کے ساتھ ”دوڑو لوگو دوڑو! ارے میرے سوامی..... ہائے ہائے!.....“ کی دلدوز صدائیں بلند ہونے لگیں۔

لاجنتی کی چیخ بالکل اہلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی بدحواسی میں بناوٹ کا ذرہ برابر پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ پل کی برج سے ایک دیوانی عورت کے مانند اس طرح چمٹی ہوئی تھی جیسے وہ غریب غش کھا کر پانی میں گر جائے گی۔ وہ مدد کے لئے چیخوں پر چنیں مار رہی تھی۔ گواہ ان چیخوں کی بظاہر کوئی خاص ضرورت نہ تھی اس لئے کہ پرکاش کے گرنے کی آواز سننے ہی چاروں طرف سے لوگ جھپٹ پڑے تھے اور لاجنتی کو ایک خاصے مجمع نے گھیر رکھا تھا۔ پل کے اوپر یہ مجمع لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا تھا اور نیچے پانی میں پرکاش نہایت کامیابی کے ساتھ ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی پوری پوری نقل اتار رہا تھا۔

لاجنتی نے کنکھیوں سے اس مجمع پر نظر ڈالی۔ یہ محسوس کر کے اس کا دل بیٹھنے لگا کہ اس عظیم الشان بھیڑ میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو پرکاش کے ڈوبنے کو کوئی غیر معمولی واقعہ تصور کرتے ہوں۔ لوگوں کی زیادہ تر توجہ خود لاجنتی کی طرف تھی جو اس وقت مصنوعی سراسیمگی و پریشانی کے عالم میں بالکل کوہِ قاف کی پری معلوم ہوتی تھی۔ ایک موٹی تانزی ادھیڑ عمر کی مسلمان عورت لاجنتی کے پیچھے اس سے بالکل بھڑی ہوئی کھڑی تھی اور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سر ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی

”ہا ہا بے چارے کے دن پورے ہو گئے تھے..... اللہ کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے!“

جو اکا دکا لوگ پرکاش کی طرف متوجہ بھی تھے ان کی دلچسپی کی ساری تنگ و دو اس کوشش پر ختم ہو جاتی تھی کہ مجمع کے دوسرے لوگوں کو کمینیاں مار مار کر اپنے لئے ایسی جگہ حاصل کر لیں جہاں سے پرکاش کے ڈوبنے کا تماشا زیادہ اچھی طرح نظر آ سکے۔ لیکن کوئی اللہ کا بندہ اُسے بچانے کے خیال سے اپنی جگہ سے شش سے شش نہ ہوتا تھا۔ لاجنتی کا دل دھڑکنے لگا ”اگر پرکاش تیرا نہ جانتا ہوتا تو غضب ہی ہو گیا تھا“ اس نے خیال کیا اور پھر اک دم پھر کرمج کی طرف پلٹ پڑی

”کیا اس بھرے مجمع میں کوئی مرد نہیں ہے؟ کیا کسی میں اتنی بہت نہیں ہے کہ ایک ڈوبتے ہوئے بھائی کو بچا لے؟“

ادھیڑ عمر کی موٹی تانزی عورت پھر بول اٹھی ”ان لوگوں سے کہنا بے کار ہے..... آج کل کے مرد عورتوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ خدا کی مار ایسی مردانگی پر! اگر میں مرد ہوتی تو.....“

اُس کی احمقانہ بڑبڑاہٹ پر مجمع میں سے کسی بے فکرے نے ایک زور کا تھقہ لگایا اور عورت کا فقرہ فقہ کی آوازیں گم ہو کر ناتمام رہ گیا۔ اس پر دوسرے بے فکرے بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تمام مجمع میں ہنسی دل لگی کی ایسی لہر دوڑ گئی جیسے ڈوبنے کے واقعہ کو سب نے یککھٹ بھلا دیا ہو۔ لاجنتی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ قصع او بناوٹ کے آنسو نہ تھے۔ اپنی اسکیم کو ناکام ہوتے دیکھ کر اس وقت سچ جج اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

یہ ایک مجمع میں کسی طرف سے ایک بلند، حکمانہ آواز سنائی دی اور پلک جھپکاتے ایک لمبا نوجوان بھڑک چیرتا پھاڑتا آگے بڑھ آیا۔ ٹھیک جس وقت پرکاش پانی کے اندر سے بظاہر نیم غشی کی حالت میں اوپر ابھر رہا تھا اس نے پھرتی سے اپنی ٹوپی اور کوٹ اتار کر ایک طرف ڈے مارا اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے برج پر سے جست لگا کر دریا میں کود پڑا۔

یہ تمام واقعہ اس سرعت سے ختم ہو گیا کہ لاجنتی کو اجنبی کا چہرہ بھی اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہ ملا لیکن ایک اچنتی ہوئی سرسری نگاہ سے اُس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس کے چہرے پر رُسیانہ جلال و شکوہ کی چمک ہے اور محبت مجموعی وہ ایک خوبصورت نوجوان ہے۔

دخل در معقولات کرنے والی موٹی تازی بڑھیا نے پھر کچھ کننا شروع ہی کیا تھا کہ ایک مرتبہ اور اس کی آواز مجمع کے ستائشی شور و غل میں کھو گئی۔ اجنبی نے پرکاش کے ڈوبتے ہوئے جسم کو دونوں ہاتھوں کے سہارے پانی کی سطح پر کر لیا تھا اور کنائے کی طرف آہستہ آہستہ تیرتا ہوا آرہا تھا۔

اجنبی اور پرکاش کے کنائے تک پہنچتے پہنچتے سارا مجمع پل پر سے چھٹ کر رفتہ رفتہ گھاٹ کی سیڑھیوں پہنچ گیا لاجنتی بھی اسی مجمع کے اندر تھی۔

پرکاش کے تمام کپڑے بھیگ کر اُس کے جسم سے چھٹ گئے تھے۔ وہ اس طرح آنکھیں بند کئے نڈھال ہو رہا تھا گویا غرقابی کے حادثے نے اُس کے ہوش و حواس کو زائل کر دیا ہے۔ یا تو سب لوگ تھوڑی دیر پہلے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے پرکاش کے ڈوبنے کا تماشا دیکھ رہے تھے یا اُس کے کنائے آتے ہی ہمدرد مددگاریوں نے ہر طرف سے اس پر یورش بول دی۔ کسی نے اُس کے پیروں سے موزے اور جوڑے علیحدہ کئے۔ کسی نے کوٹ اتار کر الگ پھینک دیا۔ ایک شخص نے جو صدمت سے کسی میڈیکل کلج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا جھک کر اُس کی کلائی ہاتھ میں لے لی اور نبض دیکھنے لگا۔ جو لوگ کچھ نہیں کر رہے تھے وہ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر اس مقام پر پہنچ پڑے تھے جہاں لاکر پرکاش کو ریت پر لٹا دیا گیا تھا۔

لاجونتی کو آگے بڑھنے کی کوشش کرتے دیکھ کر اجنبی نے اپنی ایک مروانہ ڈانٹ سے لوگوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ لاجونتی بھاری قدموں سے آگے بڑھی۔ چہرے پر ہواٹیاں اڑ رہی تھیں۔ دل دھک دھک کر رہا تھا لیکن پرکاش کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اُسے اطمینان ہو گیا۔ سب معاملہ کیل کانٹے سے درست تھا۔ اُس کی انوکھی حکیم اپنی تمام تفصیلی جزویات کے ساتھ کامیابی سے نزدیک ہوتی جاتی تھی۔

اب لاجونتی کو ایک دوسری فکر لاحق ہو گئی۔ اس نے مجمع پر جستجو کی نظریں ڈالنا شروع کیں۔ اُس کی آنکھیں اخبار کے نامہ نگاروں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ انسانی بھڑوں کے اس عظیم الشان گٹھ میں جو سرے سر ملائے، ایک ہی مرکز پر نگاہیں گاڑے تھا ایک متنفذ بھی اپنی شکل و صورت وضع و قطع کے لحاظ سے اخبار کار پورٹر نہیں معلوم ہوتا تھا ایک مرتبہ پھر لاجونتی کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس کی تمام کی کرائی محنت بالکل برباد ہوئی جا رہی تھی۔ وہ بھی اُس وقت جب بظاہر منزل مقصود دور نہ تھی۔

اتنے میں مجمع کے کنارے سے دو شخص آگے بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ جسم پر سفید بے داغ سوٹ۔ سروں پر دھوپ سے بچانے والی انگریزی ٹوپیاں۔ ہاتھوں میں لکھنے پڑھنے کا سامان رکھنے والے چھوٹے چھوٹے چمڑے کے بکس۔ دونوں ایک ہی قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے اور بالکل بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کی عمر زیادہ تھی دوسرے کی کم۔

لاجونتی نے دیکھا ان لوگوں کی انگلیوں میں پینسل اور نوٹ بک بھی، دینی ہوئی ہے۔ اکدم اُس کے چہرے پر اطمینان و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ان میں سے ایک رپورٹر نے جو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ معمر اور تجربہ کار تھا نوٹ بک اور پینسل جیب میں ڈالتے ہوئے اپنے ساتھی سے منہ بنا کر کہا ”انہ۔ چلو کہیں اُدھلیں۔ بے کار وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟..... ایسے ایسے واقعات

تو روز ہوتے بہتے ہیں“

نا تجربہ کار اور نو عمر رپورٹر کا چہرہ سراپا استفسار بن گیا۔ بولا ”معاملہ کیا ہے؟ آئیے؟ آئیے پوچھ تولیں“
 معاملہ دالمہ کچھ بھی نہیں۔ وہی پرانی داستان ہوگی..... مایوسی..... زندگی سے بیزاری.....
 پھر خود کشی کی ناکام کوشش۔ اس طرح کے حادثے تو شہر میں سینکڑوں ہوتے بہتے ہیں۔ کوئی گمان تک
 ذرا ذرا سی باتوں کی رپورٹ لیتا پھرے“

اتنا کہہ کر دونوں پیٹنے ہی والے تھے کہ ان کی نگاہیں اکدم پرکاش کی جان بچانے والے نوجوان اجنبی کے

چہرے سے دو چار ہونٹیں جو پرکاش پڑھ چکا ہوا اُس کے ڈبلے تیلے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبائے انہیں گم کر رہا تھا۔
 ”آہا! مسٹر انڈرپال۔ آپ یہاں کہاں ہیں؟..... آداب عرض ہے۔“ معمر رپورٹر نے انتہائی مسرت
 کے عالم میں بے اختیار ہونکر کہا۔ پھر اُس کا ہاتھ جلدی جلدی کوٹ کی جیب میں نوٹ بک اور پینسل تلاش کرنے لگا۔
 ”اٹھا۔ مسٹر چٹرجی“ مسٹر انڈرپال بولے..... ”خوب اتفاقاً ملاقات ہوئی۔ واقعی آپ لوگ بھی کمال
 کتے ہیں! خبروں کی تلاش میں دنیا کا کوئی کونا آپ سے چھٹ تھوڑی سکتا ہے“

دونوں رپورٹروں نے مسٹر انڈرپال کے بھیگے ہوئے کپڑوں اور الجھے ہوئے بالوں کو دیکھتے ہی ایک ہی نظر میں سب
 کچھ بھانپ لیا تھا اور اب یہی لوگ جن کے نزدیک ایک سنٹ پیشتر اسی واقعہ میں کوئی قابل ذکر اہم بات نہ تھی۔ مشین
 کی تیزی کے ساتھ اپنی اپنی کامیوں کو رپورٹ کی عبارت سے سیاہ بنانے میں مصروف تھے کبھی کبھی مسٹر انڈرپال سے
 کوئی مختصر سوال بھی پوچھ لیتے۔ مگر پرکاش کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ دونوں میں سے کسی نے اس کا نام تک نہ پوچھا۔
 لاجونی کا غصہ کے مارے عجب حال تھا۔ جی چاہتا تھا ان ظاہر پرست، دنیا ساز کمینے رپورٹروں کی بوٹیاں
 فوج ڈالے۔ مانا کہ مسٹر انڈرپال کوئی بڑے آدمی ہیں۔ بے شک انہوں نے ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی جان بچائی ہے
 لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ اتنے مجمع میں کوئی مسخرہ اس آفت کے مارے بد نصیب کا نام بھی نہیں پوچھتا جس کی بدولت مسٹر
 انڈرپال کو جو آمدی کی نمائش کا موقع ملا..... اب یہ زر کے بندے خوشامدی رپورٹر اس واقعہ پر عاشرہ
 چڑھا چڑھا کر ملک بھر میں مسٹر انڈرپال کی بہادری کے ڈھول بٹیں گے۔ حالانکہ وہ تو خود پہلے سے مشہور ہیں۔ کوئی ان
 احمقوں سے پوچھے اُس شخص کے اوپر شہرت پر شہرت کیوں لادتے چلے جائے ہو جسے اس چیز کی ضرورت نہیں۔
 مگر ان لوگوں کی کیا خطا؟ شہرت تو خود ایک جفا پرست بے رحم دیوی ہے۔ جو شخص ہاتھ پھیلا کر،
 گھٹنے ٹیک کر اس کی پوجا کے لئے آگے بڑھتا ہے اس کا سر ٹھکرا دیتی ہے۔ جو منہ بنا کر خود اس کی طرف سے گردن
 موڑ لیتا ہے اس کا دامن پکڑے پیچھے بھاگتی چلی جاتی ہے..... اندھی دنیا اور اس سے زیادہ اندھا
 قانون قدرت! لاجونی دل ہی دل میں یہ باتیں کر رہی تھی اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اس کا سر جھکایا جاتا تھا۔ ارد گرد
 کا تمام مجمع اُسے دمعند لا نظر آ رہا تھا اور آدمیوں کا شور و غل اس کے کانوں میں اس طرح پہنچ رہا تھا جیسے شہد
 کی کمیاں کہیں دوڑ بھنبھنا رہی ہوں۔ اس کے بعد پرکاش کو جو مصنوعی غشی کے دورے سے صحت یاب ہو چکا تھا مانگے
 پر بٹھا کر گھر تک لانے کا واقعہ لاجونی کو بالکل خواب کی طرح معلوم ہوا..... قیمت کے جوئے خانے میں اس
 کا یہ آخری داؤں بھی خالی گیا۔

اس واقعہ کے دوسرے روز ٹھیک جس وقت پرکاش اپنے میلے کھیلے تنگ و تاریک مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ دہلی جانے کے لئے اسباب درست کر رہا تھا اسی شہر کے ایک دوسرے کو نے جس کسی شان دار ہوٹل کے آراستہ پیراستہ کمرے کے اندر مسٹر اندر پال اپنی چہیتی بیوی کے نام اپنے خط کے آخری فقروں کو پورا کر رہے تھے۔

..... ”جہاں چاہتا تھا چلا جاتا تھا جس قسم کے لباس کو دل چاہتا تھا پہنتا تھا۔ ہیکول

کے بچوں کی سی آزادی حاصل تھی..... ملاقاتیوں کا ہجوم نہ کانفرنس کی صدارتیں۔ نہ

ڈنر پارٹیاں۔ بنارس میں ایک متنفس کو بھی میرے موجود ہونے کی خبر نہ تھی۔ سب سے بڑا امن یہ تھا

کہ اخبار کے رپورٹروں کی داروگیر سے بالکل محفوظ تھا..... کل اس واقعہ نے سارا لطف

کر کر کر دیا۔ خیال تھا ایک آدھ ہفتے چین سے آزادیوں کی طرح گھومتا پھروں گا۔ مگر اب وہ بات

کہاں نصیب اہل صبح سے بری طرح گھرا ہوا ہوں۔ ملاقاتیوں کا یہ عالم ہے کہ دم مارنے کی فرصت

نہیں۔ پھر رپورٹروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بڑی مشکل سے تئیس دو چار سطریں لکھنے کا وقت

نکال رہا ہوں.....“

ذوق

محبت جو خدا کا جوہر ہے فضول معرف کے لئے نہیں بلکہ اُسے تو انسان کی ساری قدر و قیمت کا تقاضا ہے!

تین تنہا ہر شخص صادق ہے۔ ریا کاری کسی دوسرے کے آتے ہی داخل ہوتی ہے!

جب تم ختم کر چکتے ہو جو کچھ بھی کاروبار میں سیاست میں عیش و عشرت میں اور محبت وغیرہ میں ہے جب تم دیکھ چکے ہو کہ ان میں سے آخر کار تشویش کسی سے نہیں ہوتی کوئی نہیں ان میں جو بایں تیار ہو تو پھر بات کیا رہ جاتا ہے؟ بس اک فطرت باقی رہتی ہے کہ انسانی دل کے تاریک کونوں میں سے اُس میلان و کشش کو آشکار کرے جو مرد یا عورت کو کھلی ہوا سے درختوں کھیتوں سے اور موسم کی تبدیلیوں سے ہے۔ دن کو یہ چمکتا ہوا سورج اودھ رات کو وہ جھل جھل کرتے تارے!

گلچیں

تاثرات

بڑا مزا ہو جو یہ وقت خوش گوار آئے کہ تو بھی آئے مرے گھر میں جب سہار آئے
 جو درد قابلِ درماں نہیں لو موت ہی دے کسی طرح تو آئی مجھے قہر آئے
 ہم اس کو عین عبادت کہیں محبت میں کسی کا نام جو ہونٹوں پہ بار بار آئے
 محبت اُس کی حقیقت میں ایک دھوکا جسے نہ راس محبت میں انتظار آئے
 تصورات سے یوں وسعت نظر بڑھ جائے جدھر نگاہ اٹھاؤں خیال یار آئے
 اگر نہ جیلہ پسندی ہو تیری فطرت میں تو پھر نہ کیوں تھے وعدوں پہ اعتبار آئے
 صلہ عجیب ملا دل کو نذر کرنے کا امیدوار گئے اور سو گوار آئے

نشاط کو شئی دنیا نہ غم سے پھر بدلے

ظفر جو مستی فانی پر اعتبار آئے

نذیر احمد ظفر

محفل ادب

قدیم ہندوستان اور مصوری

روایات قدیم کے مطابق فنِ تصویر کی ایجاد بھی دیگر علوم و فنون لطیفہ کی طرح اہل ہند کی دماغی کاوشوں کی شرفِ احسان ہے۔ لیکن اس بارے میں ہندو کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہند میں مصوری کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی۔ تاہم قدما کی یادگاریں جس حد تک ہماری رہنمائی کرتی ہیں تجسس نگاہوں کو فی الحال اسی پر اتکا کرنا پڑے گا۔

عموماً ہر فن و ہر صنعت کو ایک طاقتِ اولین سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سنسکرت ادب کی ایک دلچسپ روایت سے مصوری کی ابتدائی تاریخ بہت کچھ روشنی میں آجاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی راجہ کے دورِ حکومت میں خلافِ معمول کسی زمین کے تحت جگر نے اپنے پابہ رکاب پدر کو داغِ مفارقت دے کر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ راجہ نے اس منحوس واقعہ سے ملول و متاثر ہو کر ”فضا و قدر“ کی بے حد منت سماجت کی مگر اس صاحبِ تاج کی بے لوث معروضات پر کوئی التفات نہ ہوا۔ آخر کار خالقِ علوم و فنون ”برہما“ نے عقبتِ کیش! اہل کی حالتِ زار پر نرس کھا کر برہمن نڈے کو حیاتِ ثانی عطا کرنے کا اقرار کیا، چنانچہ مرحوم کا مرقع تیار کرایا گیا اور اسی مرقع میں قادرِ قیوم نے روحِ زندگی بھونک دی۔

ممکن ہے کہ یہ کہانی شاعرانہ نازک خیالی سے زیادہ واقعہ نہ ہو۔ لیکن جو اس کی توہین بھی ایک عالمگیر مذہبی جذبہِ معمر ہے جس کی پاکیزگی کی آغوشِ تربیت میں پرورش پاکر ہر فنِ لطیفہ سن بلوغ کو پہنچا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز تک ڈراما کی طرح فنِ تصویر بھی مذہبی اصول و عقائد کی تبلیغ و اشاعت کا ایک کارآمد و موثر ذریعہ بنا رہا۔ سنسکرت اور بعض دیگر ملکی زبانوں کے علم و ادب کے مطالعہ سے اس خیال کی صحت پورے طور پر ثابت ہوتی ہے۔

ایسی تحریریں تو بکثرت دستیاب ہوتی ہیں جن سے اس فن کی قدامت قابلِ وثوق طریقے سے ثابت ہوتی ہے لیکن اُس مافوقِ الفطرت شخصیت کا نام نامی اب کسی کو یاد نہیں جو نہا سخاۃً ازل سے روح کا پایا مہربن کر آیا اور جس نے اُس کے لطیف پیغامات کو مادی صورت دے کر نہ صرف رنگینیوں اور دلفریبیوں کے سامان فراہم کئے بلکہ دنیا پر تخلیقِ عالم کا منشا واضح کیا۔

ہندوؤں کی مشہور کتاب مہابھارت جو حضرت مسیح کی ولادت سے صد ہا برس پیشتر تصنیف ہوئی اس حقیقت کی

کاشف و صفا من ہے کہ صنف نازک کے بلند پرواز تخیل کی رنگینیدل کو اول اول ایک دوشیزہ پری جمال نے رنگ و روغن سے صنفِ قمرطاس پر نمایاں کر کے حسن صورت عطا کیا، عالم ایجاد میں جس لطیف کی نازک خیالیاں وہ رنگ لائیں جو سنگ دل زمانہ کی لوح دل پر آج تک ثبت ہیں۔ واقعات یوں بیان کیا جاتا ہے کہ شہزادی اوشا نے عالم خواب میں ایک جوان رعنا کو دیکھا اور اس پر زلیفہ ہو کر اُسے اپنا رفیقِ حیات بنانے کے انتہائی اشتیاق میں مبتلا ہو گئی۔ اس کی سہیلی چتر کیکھا نے شہزادی کی دلجوئی اور اس کی داغی پریشانی رفع کرنے کے لئے قوتِ متغیلہ کی مدد سے نکلے دیوتاؤں اور اپنے زمانہ کے تمام مقتدر راجاؤں اور شہزادوں کے چہرے اتار کر اُس کی خدمت میں پیش کئے تاکہ شہزادی اپنے منظورِ نظر کو بآسانی منتقِب کر سکے۔ چنانچہ خواب میں جلوے دکھا کر نیند اڑانے والے انرودھ کی شبیہ جیل سونگیا میں چار سوتے ہی اوشا نے اپنے دل کا چور معلوم کر لیا۔

(دور کا لیللا)

عہدِ قدیم کا تمام ادبی سرمایہ شاہد ہے کہ ہندی مصوّر اپنے مذہبی عقاید کو انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کمالِ خوبی کے ساتھ عیاں کرتے تھے کہ چشمِ بصیرت اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ تبت کے ایک معروف مقام پنتی میں پرانے زمانہ میں دیواروں پر جو تصاویر منقوش تھیں اُن میں سے ایک اُس تصویر کی نقل بنائی جاتی ہے جو کسی بد مصوّر نے بغرض تبلیغِ چین کے کسی فرماں روا کی خدمت میں بطور پیشکش ارسال کی تھی۔ تصویر اس رعبہ موثر تھی کہ فرماں روا موصوفِ بلا تردد بدھ مذہب پر ایمان لے آیا۔

وسطِ ہند کے پہاڑی سلسلہ کیمور کے کوہساروں کی خاک چھاننے کے بعد بعض سرگرم محققین نے چند ایسی شہادتیں حاصل کی ہیں جو زبانِ حال سے بکار رہی ہیں کہ زمانہ قبل از تاریخ میں ہندوستان میں چاہے اور کچھ بھی نہ ہو لیکن فنِ تصویر کا سکھ ضرور رواں تھا۔ پتھر کے زمانے کے لوگوں کی مصوّر کی عجیب غریب نمونے اب بھی بندھیا چل کے کہنے و پُر اسرار غاروں میں محفوظ ہیں۔

بندھیا چل کے کوہستانی علاقہ کے قرب و جوار میں کالج اور شیشہ کی کچھ ایسی سیالیاں پائی گئی ہیں جن میں غالباً گہرے اور دیگر وجہ رنگ حل کئے گئے ہیں۔ زمانہ نے وہ علامتیں مٹانے کی ہزار کوشش کی مگر پھر بھی کچھ نشانات باقی رہ ہی گئے۔ اس کا ثبوت کہ ہندوستانی اس عہد میں شیشہ اور کالج کے ظروف بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ ثباتِ تھہ برہمن اور سچا کے ارتھ شاتر کے مطالعہ سے ملتا ہے۔

صوبہ متوسط کی معروف ریاست رائے گڑھ میں سنگھان پور ایک چھوٹا سا موضع ہے جسے دریائے مندریر کے تارے ہے۔ اس دریا کی سمت مشرق جو پہاڑیاں واقع ہیں ان کے فاروں کے دھانوں کی چٹانوں پر انسانوں اور حیوانوں کی

نہایت بھونڈی تصویریں ثبت ہیں یہ تصویریں جس حالت میں اس وقت موجود ہیں وہ ان کی انتہائی قدامت کا پتہ دیتی ہیں۔ اُس گزے ہوئے وقت کا نقشہ ہمارے پیش نظر کرتی ہے جب کہ آل آدم وحشی و خوشنور درندوں پر گذارہ کرتی تھی۔

رام گڈھ کی پہاڑیوں کے جوگی مارا نامی غاروں اور مرزا پور کے پتھر یلے مقاموں سے چند ایسے زریں کتبے برآمد ہوئے ہیں جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ان ایام میں بھی یہ صنعت ہندوستان میں رائج تھی۔ بدھ مذہب کے عروج سے قدیم فن تصویر نے جس قدر فروغ پایا اس کا آئینہ اجنٹا کے غار میں جو ایک جد ابصرہ کے غلج ہیں۔ سترھویں صدی کے تہمی فن "نارائتھ بدھوں کی صنعت و حرفت کے اجمالی تذکرہ میں رقمطراز ہیں کہ تمام ہندوستانی علوم و فنون ایک مدت نامعلوم سے سینہ سینہ چلے آتے ہیں" ان کی صائب لائے میں ہمانا گوتم (بدھ) کی وفات (۴۸۰ ق م) سے بہت پہلے بھی ہندوستانی فن تصویر کے سر تھے۔

"تاریخ میں مذکور ہے کہ اشوک (۲۵۰ ق م) اور ناگر جونا (۲۰۰ ق م) کے عہد حکومت میں بڑے بڑے بالکال و چاکر دست بہت ساز و رنگ تراش ہندوستان میں موجود تھے۔ بدھ مذہب کے آغاز سے پیشتر ہی فن تصویر اس درجہ مکمل ہو چکا تھا کہ اس کے "سدا رنگ" (چھ اجزا) باقاعدہ طور پر مرتب ہو چکے تھے اور ہر جزو کے متعلق متعدد اصول قائم ہو گئے تھے جن کی پابندی لازمی و ضروری تھی۔

"وتیہ یانا" کی مشہور کتاب "کام سنوزر" میں چوتیسری صدی عیسوی کی تصنیف ہے ان چھ اجزا کا ایک مفصل و مبسوط تبصرہ درج ہے۔ وہ چھ اجزاء تھے:-

- | | |
|--|------------------|
| خط و خال اور نقش و نگار کا علم | (۱) روپ بھید |
| قد و قامت اور تناسب اعضا کی تمیز | (۲) پرمانم |
| علم النفس و نیز ادا و انداز کی تشخیص | (۳) بھاو |
| سطح کی دلکشی اور ادراک حسن کی جلوہ گری | (۴) لاوینہ یوجنم |
| تمثیلات | (۵) سدریشم |
| ترتیب خطوط و قواعد رنگ آمیزی | (۶) درینک بھنگ |

درحقیقت فن تصویر کو اس قدر مکمل بنا دیا گیا ہے کہ اب تلاش کرنے پر بھی کسی رخ سے کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا اہل دانش کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ کوئی علم و کمال منزل ارتقا کی دشوار گذار راہیں اتنے قلیل و صمد میں سرگزشتے نہیں کر سکتا جتنا کہ قیاس کیا جاتا رہا ہے، ان چھ جزوں کو اپنے روبرو رکھ کر قدیم ہندی مصوروں

کے کمال فن کا اندازہ لگائیے۔

جن کتب قدیمے ”کام سوز“ کی تالیف میں استفادہ حاصل کیا گیا اُن کی مختصر کیفیت درج ذیل ہے

وشنوپران اس کے زمانہ کا تعین کرنا قطعی محال ہے۔

شکر منی اس کا وجود کام سوز سے پہلے یقینی ہے

مایا شاستر ایضاً

پرستی بھاکشتم

چترکشن

جودہ کی پیدائش سے پیشتر کی روایات سے پُر ہے اور تناسبِ اعضا اور مذہبی رنگتیں مصوری کے موضوع سے بحث کرتی ہے۔

سنہء کے ایک مشہور آفاق چینی مصور ہسی ہونے سے پہلے اپنی کتاب میں ان چھ اجزاء کو بعینہ نقل کر دیا

ہے جو ہندوستانی دماغ کی لکڑ کاوش کا نتیجہ ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ چین اور جاپان نے ہندوستان ہی سے اُن فن کی تعلیم حاصل کی ہے حالانکہ چینی صنّاعوں اور جاپانی مصوروں کی نقاشی ہی اس حقیقت کی پردہ دری کرتی ہے اور باریک بین نگاہیں بیک نظر تبدیلِ اسلوب سے اس کے راز چھین لیتی ہیں۔

”زمانہ“

غالب کی دو غزلیں

پروفیسر سید سجاد صاحب نے ”مجلہ عثمانیہ“ میں غالب کی ایک غیر معروف تصنیف ”قادر نامہ“ شائع کرائی ہے

یہ نظم کی وہی صنف ہے جسے عام طور پر ”آمد نامہ“ کہتے ہیں اور جس میں الفاظ و مصادر کے معنی بیان کئے جاتے ہیں۔

بقول سید سجاد صاحب ”غالب کی کوئی بات لطف سے خالی نہ تھی“ چنانچہ اس نظم میں لکھتے لکھتے ایک جگہ فرماتے ہیں:-

ہے قلم کا فارسی میں خامہ نام ہے غزل کا فارسی میں چامہ نام

کس کو کہتے ہیں غزل ارشاد ہو ہاں غزل پڑھتے سبق گریاد ہو

غزل

صبح سے دیکھیں گے رستہ یار کا جمعہ کے دن وعدہ ہے دیدار کا

وہ چراوے بلغ نہیں میوہ جسے پھاند جانا یاد ہو دیوار کا

پُل ہی پر سے پھیر لاتے ہم کو لوگ ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا

شہر میں چھڑیوں کے میلے کی ہے بھڑ
آج عالم اور ہے بازار کا
لال ڈنگی پر کرے گا جا کے کیا
پل پہ چل ہے آج دن اتوار کا
گر نہ ڈر جاؤ تو دکھلاؤں تمہیں
کاٹ اپنی کاٹ کی تلوار کا
واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا
اس "اچھی غزل" کے بعد پھر الفاظ اور ان کے معانی شروع ہو جاتے ہیں اور "قادر نامہ" کے اختتام پر پھر ایک غزل نظر آتی ہے:-

شعر کے پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں
مانتا لیکن ہمارا دل نہیں
علم ہی سے قدر ہے انسان کی
ہے وہی انسان جو جاہل نہیں
کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار
آج بنتے آپ جو کھل کھل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو رک رک کر سبق
ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں
جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

افسردگی

دن نے ٹھنڈی سانس لی خورشید اچھل گیا
رنگ اڑا، صحرا ہوا خاموش دریا سو گیا
نور مٹا، تیرگی پھیلی، ہوائیں رک گئیں
پھول کھلائے، چمن برباد، شاخیں جھک گئیں
رنگ گل، شور چین، جوش صبا کچھ بھی نہیں
ایک غم انگیز خلوت کے سوا کچھ بھی نہیں
اڑ گیا غارہ شفق کا، آسمان سنو لا گیا
رفتہ رفتہ روئے عالم پر اندھیرا چھا گیا
اس دھوئیں میں اپنی رتیں روشنی کھوتے ہوئے
روح انسانی کو دیکھا میں نے گم ہوتے ہوئے
"معارف"

خزاں کی شام

دفعتاً میری سہیلی نے اپنی لمبی اور موم تہی کے شعلے کی سی باریک باریک نگلیاں سارے تاروں پر رکھ دیں۔

کہنے لگی ”دیکھو! فطرت نے ہر ایک کی زندگی کے ساتھ ایک مشغلہ جیات بھی پیدا کر دیا ہے! آہ دیکھو تو سنا کے گیت کے لئے کیسے بے تاب اور تیار رہتے ہیں۔ ان کو اپنا ادبی مشغلہ یاد ہے۔

اور خزاں کا آفتاب کیسی تیزی سے اپنا سفر ختم کر رہا ہے۔

اور سردیوں کی صبح میں ننھی نندی کیسے زور زور کے گیت گایا کرتی ہے!

اور رات کی تنہائیوں میں آواز اڑے درختوں اور ویران دیواروں پر کیسے دل خراش لہجے میں بولتا ہے!

ان سب کو اپنی زندگی کے مشاغل یاد ہیں!

دیکھو روح کی آنکھیں تاریکی میں بھی فرشتہ موت کو پہچان لیتی ہیں!

آہ فطرت نے ہر ایک کو ایک کام تفویض کر دیا ہے۔ ایک مشغلہ دے دیا ہے! پرافسوس میں نہیں جانتی

کہ میرا بڑی مشغلہ کیا ہے؟

اُس نے ایک الم انجیز آہ کھینچی۔

ہر طرف موت کا سناٹا تھا۔ وہ خزاں کی ایک اداس اور پژمردہ شام تھی! موسم کے گرد و غبار کے پتے دور

افق میں خزاں کا آفتاب ڈوب رہا تھا۔ بڑے موسم نے ببل کی مسکراہٹوں کو غائب کر دیا تھا۔

اور وہ ہمیں ایک بے راگ کا باجا معلوم ہوتی تھی۔ یا ایک ایسا شعر جس میں نغمہ نہ ہو۔

زندگی ایک بے مزہ کہانی معلوم ہوتی تھی۔

یا ایک ایسا خواب جس کی تعبیر نہ ہو!

اس اداس شام، ہم اپنی زندگی کے مشغلے کو بھول گئی تھیں۔

روح کے نغمے کو فراموش کر چکی تھیں!

آہ وہ خزاں کی شام — جب کہ زندگی ہمیں ایک بے مقصد سفر معلوم ہوتی تھی۔

دفعتاً میں نے دیکھے سے باہر دیکھا۔ باغ کی دیوار کے پاس ایک چھوٹا سا گل نیلوفر خزاں کی ہواؤں میں جھوم

رہا تھا — اور زندگی کی سانسیں لے رہا تھا۔

مجھے کچھ یاد آگیا۔

میں نے سہیلی سے کہا ”سگند — سہیلی! زندگی بسر کرنا خود اک مشکل مشغلہ ہے!“

یہ سن کر میری سہیلی کا چہرہ خزاں کے آفتاب کی طرح جگمگانے لگا!

”تہذیب نسواں“

تبصرہ

اردو زبان اور ادب - تقریباً تین سال ہوئے الہ آباد میں چند اہل علم و ذوق حضرات کی کوشش اور مشورہ متحدہ کی سرپرستی سے ہندوستانی اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اکیڈمی کی کونسل کے پہلے اجلاس میں یہ طے پایا کہ تصنیف و تالیف کا کوئی کام شروع کرنے سے پہلے موجودہ اردو اور ہندی ادب کی پڑتال کی جائے تاکہ معلوم ہو کہ دونوں زبانوں کو کس صنف کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی یہ اردو زبان اور ادب، اسی کمیٹی کی رپورٹ ہے جسے سید ضامن علی صاحب صدر مجلس نے بڑی محنت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے (۱) زبانِ اردو کی ابتدا، (۲) زبانِ اردو کی تدریجی ترقی، (۳) سلاطین مغلیہ کے زمانے میں زبان کی ترقی اور (۴) سلطنتِ برطانیہ کے زمانے میں اردو کی ترقی۔ انہیں ابواب میں ہر زمانے کی بعض تصانیف کا ذکر اور ابتدا سے لے کر اب تک ہر صدی کی زبان کے نمونے بھی دیئے ہیں + دوسرے حصے میں اردو ادب کی ضروریات، زبان کی حفاظت و ترقی اور اکیڈمی کے لائحہ عمل کے متعلق تجاویز ہیں۔ ان تجاویز کا حاصل یہ ہے کہ ادب کے جن شعبوں میں تصنیف یا تالیف یا ترجمہ کی ضرورت ہے ان کے لئے ایک دارالتالیف قائم کیا جائے اور ملک کے فاضلین و کالمین سے معاوضہ دئے گئے کتابیں لکھوائی جائیں۔ نظم و نثر پر تاریخی و تنقیدی کتابیں تیار کرائی جائیں اور مستند کتابوں کو تصحیح و تشریح کے بعد اور مصنفین کے حالات اور ان کی تصانیف پر تبصرہ کر کے اچھی طباعت کے ساتھ شائع کیا جائے۔ جامع اور مکمل لغات اور ایک انسائیکلو پیڈیا کے طرز کی کتاب تیار کی جائے جو انگریزی انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ نہ ہو بلکہ ہندی انسائیکلو پیڈیا ہو۔ دوسری کتابیں یا تو اکیڈمی خود تیار کرے یا جو کتابیں دوسرے ناشرین کی نصاب کے لئے تیار ہوتی ان پر ایک مجلس اعتبار قائم کرے تاکہ بڑی کتابیں نصاب میں داخل نہ ہو سکیں۔ وظائف و رانگات کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ اکیڈمی کی طرف سے ایک اچھا کتب خانہ اور ایک سالہ جاری کیا جائے۔ ایک شاہی مجلس بنائی جائے جو ہندوستان کے باکمال شہر اور فضلاء پر مشتمل ہو اور زبان کے متعلق تمام اختلافات اس مجلس میں پیش ہو جائیں۔ رپورٹ کے تیسرے حصے میں ابتدا سے لے کر اس وقت تک جو کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں ان کا انتخاب جس سے اردو ادب کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

گویا ہندوستانی اکیڈمی نے ایک عظیم الشان کام اپنے فے لیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس سے شان دار نتائج ظور پذیر ہونگے۔

کامیاب زندگی۔ اگرچہ ہندوستان کے اردو لٹریچر کا حلقہ روز بروز زیادہ وسیع ہو رہا ہے اور نئی کتابوں کے مصنف یا مترجم اردو ان پبلک کی علمی معلومات میں ایک قابل قدر اضافہ کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ملک میں ایسی کتابوں کی تعداد بہت قلیل ہے جو اقتصادی نقطہ خیال سے پڑھنے والوں کی زندگی میں ایک نمایاں تغیر پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہوں۔ ہندوستان کا افلاس ضرب المثل ہو گیا ہے اور اس لئے وطن کی حقیقی خدمت اس امر کی متقاضی ہے کہ فرزندان ہند کی اُن مشکلات کے ازالہ کے لئے عملی تدابیر اختیار کی جائیں جن کی وجہ سے ان کی زندگی ناکامی کا ایک زندہ مرقع نظر آتی ہے۔

اس لحاظ سے ہم چودھری غلام حیدر خاں صاحب سابق مدیر صداقت کلکتہ کی جدید کتاب ”کامیاب زندگی“ کا خیر مقدم کرتے ہیں جو دراصل امریکہ کے ایک مشہور ماہر اقتصادیات کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور جسے بجا طور پر اس کی زندگی بھر کے تجربات کا نیچوڑ قرار دیا جاسکتا ہے۔ چودھری صاحب نے اس کتاب کے ترجمہ سے اپنے اہل وطن کی ایسی خدمت انجام دی ہے جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ”کامیاب زندگی“ کی طویل فہرست مضامین پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ جو نوجوان زندگی کی جدوجہد سے بوجہ احسن عمدہ رہا ہونے اور شہرت و عظمت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی تمنا رکھتے ہیں اُن کے لئے یہ کتاب ایک بہترین شیر اور ایک مخلص رفیق کا حکم رکھتی ہے۔ کامیابی اور ترقی کے جوہرے اور گراں میں بتائے گئے ہیں وہ اس قدر صحیح ہیں کہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ کسی عمر یا درجہ کا ہو اُن پر عمل کرے اور پھر زندگی میں ناکام رہے۔ ترجمہ ایسا صاف اور سلیس ہے کہ ایک معمولی قابلیت کا شخص بھی اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتا ہے۔ ہماری رائے میں ہر تعلیم یافتہ نوجوان کو اپنی زندگی کا عملی دور شروع کرنے سے پہلے ایک دفعہ ”کامیاب زندگی“ کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے بھی کتاب دیدہ زیب ہے۔ قیمت مجلد دو روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپے بارہ آنے محصول ڈاک بذمہ غریب دار ملنے کا تہہ بیخیر صداقت بکٹ پو، رام شن بلڈنگ، بیروں شیرال والہ دروازہ لاہور۔

ادبستان۔ یہ کتاب حضرت خلیق دہلوی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ خلیق صاحب سے ناظرین ہمایوں بخوبی واقف ہیں۔ پچھلے دور میں، ان کے متعدد دلکش اور لطیف مضامین ”ہمایوں“ میں شائع ہو چکے ہیں خلیق صاحب کی انشاء لطیف، اک خاص ادبی رنگ کی حامل ہے ما اور ان کے تمام مضامین اس

دلچسپ خصوصیت سے لبریز ہوتے ہیں۔ ان کا ایک محرکہ آکا مضمون ”نذرت ذوق و نظر کے عنوان سے ہمایوں“ میں، بے حد دلچسپی اور قبولیت کی نظروں سے دیکھا گیا تھا، یہ مضمون بھی اس مجموعے میں موجود ہے بعض مضامین کے ساتھ تصویریں بھی دی گئی ہیں، جنہوں نے کتاب کی دلاویزی میں کافی اضافہ کر دیا ہے۔ شروع میں حضرت اختر شیرانی کا ایک طویل مقدمہ بھی شریک ہے، جس میں انہوں نے مختلف نقاطِ نظر سے، مصنف کی ادبی خصوصیات پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ مقدمہ بھی بجائے خود، دلچسپ ہے، ساتھ ہی مصنف، اور مقدمہ نگار کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ — طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی بدادبستان قابلِ دید کتاب ہے۔ اور بحیثیت مجموعی اسے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ہم سطر عبد المجید متمم کتب خانہ ناشر العلوم لاہور کو ان کے ذوقِ انتخاب پر مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے خلیقی صاحب کے مضامین کو یکجا شائع کر کے ایک گراں قدر خدمت سرانجام دی۔ اور ناظرین ہمایوں“ سے ان کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں قیمت مجلد چھ، بے جلد عاشر ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ ناشر العلوم لاہور۔

دہقان یہ کتاب چودھری عبدالعزیز صاحب پیر ایم سی نے زمینداروں کی موجودہ بہت حالت سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ اس میں زمینداری اور زمینداروں کے مسائل و مشکلات کو نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں حل کیا ہے اور ان کی فلاح و بہبود کی موثر تجویزیں پیش کی ہیں۔ زمینداروں کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اشتغالِ اراضی کی اہمیت، کاشت کی حقیقت اور اُس کے طریقے، کھاد کا مقصد، ماہیت اور اچھی کھاد تیار کرنے کی ترکیبیں، اچھے بیج اور اعلیٰ جنسوں کی کاشت کی اہمیت، زراعت کے تقابلی مشاغل کی ضرورت، ماہِ دہائی کے فوائد، بچپن کی شادی کی خرابیاں، زمینداروں کے افلاس کے اسباب اور اس سے مخلصی کی تجاویز شرح و بسط سے لکھی ہیں۔ اس کتاب کا حجم ۱۷۰ صفحات ہے اور قیمت آٹھ آنے۔ اسی سلسلے کی دوسری کتاب

دیہاتی ہے۔ یہ بھی چودھری عبدالعزیز صاحب کی گراں قدر تصنیف ہے۔ اس میں دیہات کے رہنے والوں کے تمدن و معاشرت اور جمہالت کے نقائص بیان کئے ہیں، اور اس کے بعد ان لوگوں کو ان نقائص کے رفع کرنے کے نہایت آسان اور سہل الحصول ذرائع بتائے ہیں۔ یہ کتاب ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے قیمت آٹھ آنے مقرر کی ہر دونوں کتابیں اس درجہ مفید ہیں کہ ہم ہر دہقان اور ہر دیہاتی سے اُن کے پڑھنے کی سفارش کریں گے۔ پہلی کتاب ملک نور الہی رحمت الہی پبلشرز کشمیری بازار لاہور سے دستیاب ہوتی ہے اور دوسری شیخ غلام علی بک علی تاجران کتب کشمیری بازار لاہور سے ملتی ہے۔

آج تقریباً پچاس برس کے بعد بھی وہی قد اور صورت اور اوصاف ہیں

جو پیدائش کے روز تھے

آپ خیال نہ کریں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے مگر یوم پیدائش اور آج کی صورت میں کوئی فرق کیوں نہ ہو گا۔ آپ خود قبول کر لیں گے۔ جام نگر کا بیٹا میں پیدا ہوا تو تمام مذاہب اور فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور و معروف ہونے کے ساتھ سرزد بشر کی حفاظت کے نا اپنا فرض نبایا ہی خواہ مسلمان ہو یا عیسائی یا ہندو یا برہمن ہو یا چار جہتی کہ ہر انسان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا اس کا خواہش ہے، دوستوں کو بہرہ اندوز کرنے میں لاشائی لیکن دشمن کو ذرا بھی اذیت نہ دینا اس کی عادت تھی اب سنئے یہ میں عقوبت سترلع عالم آتنگ گنگہ گولیاں! جنکو جام نگر کا بیٹا وار کے پیشانی منی شکر گو دندجی نے آج سے پچاس برس قبل ایجاد کر کے عقوبت میں تھما کا پیدا کر دیا یہ گولیاں اس طرح مقبول ہیں کہ ہندوستان اور مالک غیر سے ان کی مانگ سدا افزوں ترقی پر ہے۔

یہ گولیاں قبض۔ بہرہ منی دل دماغ معدہ کی کمزوری خون کی خرابی اور جملہ اعضا مخصوصہ کے دور کرنے میں پوری فتح حاصل کر چکی ہیں۔ آپ ایک غمہ استعمال کریں گے تو تعریف کے بغیر نہیں گے ایسی خوبیوں کے ہوتے ہی قیمت اس لئے کم رکھی گئی ہے کہ ہر امیر و غریب مستفید ہو سکیں اس گولیوں کی ڈبیا ایک روپیہ اور بیہ بال منتر گولیاں (مہد اطفال) بچوں کی ناساز طبیعت سے لے کر دین کو سخت تکلیف ہوتی ہو کر گھر بے وفی ہو جاتا اور اس لئے بیمار بچوں کو تندرست اور تندرست کو بھلا بنانے کیلئے بال منتر گولیوں کا استعمال کرادیں گولیاں بچوں کی جلد شکایتوں دست کا زیادہ آٹنے کا ہونا، شکم کا ٹھنڈا جسم کا زرد پڑنا، تھکی، کالی، بھابھ وغیرہ کو پوری صحت حاصل ہوتی ہے قیمت تین سو گولیوں کی ایک بیڑ یہ ایک پیڑ (دو) بیڑ کا پیڑ۔ ویدیشا تری منی شکر جی گو وندر رام جی جام نگر کا بیٹا ہوا

مردہ عزیزوں سے

ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نو ایجاد آلہ سپرٹس و رنگ پلاٹھ جیسے ذریعہ ہم خود اکیلے ہر ایک سوال کا جواب لے سکتے ہیں۔ ایک امریکن دماغ کی اختراع ہے۔ آلہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں، جو کسی روح آپ چاہیں آلہ میں حاضر ہو کر آپ کے سوالوں کا درست جواب دے گی معمولی لکھا پڑھا ہر عمر ہر مذہب کا آدمی کام لے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑنا ہے اور نہ ہی کسی چلکشی کی ضرورت ہے، عالم بالا کے حالات معلوم کرنا گتہ کا پتہ لگانا، چوٹی کا سر لکھ معلوم کرنا دشمن سے بدلہ لینا، مقدمات میں فتح یا ہار سے محنت حاکم سے حسب نواہ کا نام لکھنا اور دراز فاصلہ پر ایک سیکند میں خبر بھیجنا، حسب نواہ کو کوئی یاد دہانہ حاصل کرنا۔ بند لافوں کی عبارت پڑھنا۔ مفضل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیاء معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کے کام ہو سکتے ہیں اس نیاپ چیز کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے اصل قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے مع حصول ڈاک صرف تین روپے آٹھ آنے لئے جاویں گے ہدایات مفت ارسال ہو گئی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں لکھیں۔

کیمیکلز سنڈکیٹ (H)، جالندھر شہر (پنجاب)

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

طبیبہ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر رساگ اور عطر عروس نہایت مقبول ہے
یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے
اعلیٰ طبقت کی خواتین میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ بانو ہیرا سہل استعمال کرتی ہیں
حکومت

صفحہ ۴۴

جولائی ۱۳۹۳ھ

اُٹھو گر نہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دو روزمانہ چال قیامت کی چل گیا

(پہلوں)

بِیَاکَا رَعْلَا فِیْہِ زُبَیْنٌ مِّمَّا مَحَدَّیَا صَبَا ۝ ہَمَاوِیْنُ

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہَمَاوِیْنُ

ایڈیٹر: بشیر احمد بی. اے (آکسن) بیربٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد

فہرست مضامین

جلد ۱

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۱ء

تصاویر :- ۱۔ مصطفیٰ کمال پاشا، نئے فوجی لباس میں
۲۔ پارلیمنٹ میں صدر کی نشست
۳۔ ترکی مدارس میں غلو ط تعلیم — اور ڈرائنگ کا ایک سبق

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	نمبر شمار
۳۲۸	~~~~~	جہاں نما	۱
۳۳۲	مصور رائد	جدید ترکی	۲
~~~~~	~~~~~	تصاویر :- ۱۔ مصطفیٰ کمال پاشا، نئے فوجی لباس میں	
~~~~~	~~~~~	(۲) پارلیمنٹ میں صدر کی نشست	
~~~~~	~~~~~	(۳) ترکی مدارس میں غلو ط تعلیم — اور ڈرائنگ کا ایک سبق	
۳۴۵	جناب حامد علی خاں صاحب، بی اے	غزل	۳
۳۴۶	جناب مولوی بدر الدین صاحب بدر اصلاحی	عربی خوانین اور تعلیم	۴
۳۵۰	حضرت ذوقی، بی اے (علیگ)	پہینا و نظم	۵
۳۵۱	جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب بستم ایم اے	ترکی اور آزادی شوال	۶
۳۵۴	جناب جلال الدین صاحب اکبر، بی اے آرز	خلد نشاط و نظم	۷
۳۵۸	جناب حمید احمد خاں صاحب، ایم اے	لفظ شریف زادہ کا صبیح مغموم	۸
۳۶۰	جناب متر مرع - ب صاحبہ	بچہ ہوا جل بالمش (افسانہ)	۹
۳۶۳	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب، ایم اے، دکیل، سیالکوٹ	تجلیات و نظم	۱۰
۳۶۷	جناب مولوی محمد شفیع صاحب	خواہشات کا صرف	۱۱
۳۶۸	جناب متر مرع - ح صاحبہ	بے ناگی و نظم	۱۲
۳۶۹	جناب عاشق حسین خاں صاحب بٹالوی، بی اے	سویرا اتفاق (افسانہ)	۱۳
۳۷۹	جناب راشدہ وحیدی	زندگی و نظم	۱۴
۳۸۰	دراہو	وادی کا سوانہ (افسانہ)	۱۵
۳۸۹	جناب مولانا ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری	خمریات (رباعیات)	۱۶
۳۹۰	جناب عبدالعزیز خاں صاحب ازبٹول	بازیافت	۱۷
۳۹۱	جناب مولوی مظفر احمد صاحب	رحمن کی ایک غزل	۱۸
۳۹۲	~~~~~	مختل ادب	۱۹
۳۹۷	~~~~~	نئی کتابیں	۲۰

# جہاں نما

## مسلمانان ہند کی تعلیمی ترقی

ہندوستان کے مسلمانوں نے ان نمایاں تبدیلیوں اور تجویزوں پر کافی توجہ نہیں دی جن کا حامل ہرنوگیشی کی رپورٹ کا نواں باب ہے۔ اس باب میں مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور تعمیری تجاویز کو پورے پورے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یونیورسٹی میں اور ثانوی تعلیم میں مسلمانوں کی مشکلات کا اس میں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ اسے ان وجوہ کی تشریح و توضیح تک محدود کر دیا گیا ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ بنی رہیں۔

مندرجہ ذیل دو نقشے مسلمانوں کی عام تعلیمی حالت کا خلاصہ پیش کرتے ہیں :-

مختلف درس گاہوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد صوبہ وار

صوبہ کا نام اور مسلمان آبادی (ملینوں میں)		یونیورسٹیوں و سارٹ کالجوں میں		ثانوی اور ابتدائی مدرسوں میں		تمام تسلیم شدہ درس گاہوں میں مجموعی تعداد	
۱۹۱۴ء	۱۹۲۴ء	۱۹۱۴ء	۱۹۲۴ء	۱۹۱۴ء	۱۹۲۴ء	۱۹۱۴ء	۱۹۲۴ء
۱۸۲	۳۹۳	۱۳۶۶۹۰	۲۴۱۰۴۲	۱۳۴۴۳۲	۲۴۲۶۸۰	(۲۲۸)	دراس
۱۵۷	۳۱۸	۱۲۳۹۴۳	۱۸۵۱۴۲	۱۲۵۰۴۸	۱۸۹۴۶۲	(۲۰۴)	بمبئی
۱۶۳۹	۳۴۱۹	۷۸۷۸۱۱	۱۰۲۹۶۶۲	۸۱۷۰۷۶	۱۱۰۹۲۳۷	(۲۵۷۰)	بنگال
۱۴۳۹	۱۱۲۷	۱۱۶۴۷۱	۲۰۶۹۶۴	۱۱۹۹۷۵	۲۱۲۷۶۶	(۶۵)	صوبہ متحدہ
۸۹۱	۱۸۵۴	۱۵۶۲۸۰	۴۶۴۸۲۳	۱۵۹۷۹۱	۵۱۶۸۳۱	(۱۱۷)	پنجاب
۴۱	۷۵	۱۶۳۹۹	۲۱۷۶۴	۱۶۵۳۱	۲۱۸۷۴	(۵۷)	برما
۴۷۰	۴۶۷	۶۷۳۳۷	۱۳۱۵۰۶	۹۸۶۷۱	۱۳۵۶۹۵	(۳۵)	بہار اور اڑیسہ
۶۳	۹۰	۳۰۶۹۱	۳۵۷۶۹	۳۰۸۴۷	۳۶۲۳۷	(۵۷)	صوبہ متوسط
۸۶	۱۹۷	۵۰۹۵۸	۶۰۸۳۶	۵۱۷۱۸	۶۳۴۸۳	(۲۷۲)	آسام
۵۲۱۲	۸۴۵۶	۱۵۵۲۱۴۲	۲۴۳۷۳۷۳	۱۵۹۳۵۲۸	۲۵۸۹۸۳۶	(۵۹۷)	برطانیہ ہند

## مسلمان طلبہ اور آبادی کا تناسب بحساب فیصدی

صوبہ	۱۹۱۷ء				۱۹۲۷ء			
	تمام تسلیم شدہ و			فی صدی تناسب	تمام تسلیم شدہ و			فی صدی تناسب
	غیر تسلیم شدہ درجہ اول	مسلمان آبادی کا مجموعی آبادی سے	مسلمان طلبہ کا کل طلبہ سے		غیر تسلیم شدہ درجہ اول	مسلمان آبادی کا مجموعی آبادی سے	مسلمان طلبہ کا کل طلبہ سے	
مدراں	۱۳۸۱۵۵	۶۱۶	۶۱۶	۱۱۷۱	۲۷۸۵۶۸	۶۱۶	۱۱۷۱	۱۱۷۱
مبئی	۱۴۹۶۷۲	۲۰۱۲	۳۱۷	۱۹۷۲	۲۰۹۹۱۳	۱۹۷۲	۱۹۷۲	۱۸۷۱
بنگال	۸۶۴۲۵۹	۵۲۷	۳۷۶	۴۵۷۰	۱۱۴۰۱۴۰	۵۲۷	۴۵۷۰	۵۱۷۳
صوبہ متحدہ	۱۶۲۶۷۷	۱۴۷۱	۲۱۴	۱۸۷۲	۲۴۴۶۹۷	۱۴۷۱	۲۱۴	۱۸۷۱
پنجاب	۱۹۶۹۲۱	۵۴۷۸	۱۷۸	۲۰۷۸	۵۹۰۸۳۴	۵۴۷۸	۲۰۷۸	۵۰۷۰
برما	۲۰۴۸۹۹	۳۷۵	۵۱۹	۴۷۲	۲۴۷۷۷	۳۷۵	۵۱۹	۳۷۸
بہار اور اڑیسہ	۱۱۰۱۵۵	۱۰۷۶	۳۷۰	۱۳۷۰	۱۴۴۹۱۱	۱۰۷۶	۳۷۰	۱۳۷۱
صوبہ متوسط	۳۲۳۵۶	۴۷۱	۵۷۷	۹۷۲	۳۷۹۲۰	۴۷۱	۵۷۷	۹۷۵
آسام	۵۵۶۲۵	۲۸۷۱	۲۱۹	۲۳۷۸	۷۴۸۳۱	۲۱۹	۲۳۷۸	۲۵۷۹
برطانیہ ہند	۱۸۲۴۳۶۴	۲۳۷۵	۳۷۲	۲۳۷۲	۲۸۲۱۱۰۹	۲۳۷۵	۳۷۲	۲۵۷۳

ان نقٹوں سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان مسلمانوں کی زیادتی بہ سرعت اور عام طور پر عمل میں آئی۔ دس سال کے عرصے میں طلبہ کی تعداد ۶۲۷۵ فیصدی یا تقریباً دس لاکھ کے بقدر بڑھ گئی۔ مجموعی مسلمان آبادی کی نسبت سے طلبہ کی تعداد ۳۷۲ سے بڑھ کر ۷۴۸ فیصدی ہو گئی، درآں حالیکہ تمام اقوام اور مذاہب کے طلبہ کی وہ نسبت جو انہیں مجموعی آبادی سے ہے صرف ۱۳ سے ۳۷ تک بڑھ سکی کل آبادی سے مسلمانوں کی نسبت ۲۸ فیصدی سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن کل اضافہ سے مسلمان طلبہ کے اضافہ کی نسبت ۳۱ فیصدی سے بڑھ کر رہی۔ گویا مسلمان طلبہ تمام اقوام کے طلبہ سے زیادہ تعداد میں مدرسوں کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

لیکن اونچے درجوں میں لڑکیاں ابھی لڑکوں سے کافی پیچھے ہیں ۲۶۰۳۱ مسلمان لڑکیوں میں سے جو سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہی ہیں بہت کم ہیں جو پرائمری سے اوپر کے درجوں میں پڑھ رہی ہیں اور دس میں سے نو سے بھی زیادہ پہلی

جماعت میں ہیں۔

## شودر با نیاں سلطنت

سٹر کے پی جیسوال اخبارؔ مازنگ پوسٹؔ میں بعض شودر با نیاں سلطنت کے متعلق لکھتے ہیں:-  
 ”ہندوؤں کی تاریخ میں مہابھارت کے زمانے سے پہلے شودروں کی جانب سے سلطنت کے قیام کی چار کوششیں  
 عمل میں آئیں۔ تین ان میں سے کامیاب ہوئیں اور چوتھی کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی۔ ہند کی سلطنت اس قسم کی پہلی حقیقی  
 سلطنت تھی۔ ہندو مورخوں نے اسے تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز تسلیم کیا ہے۔ تمام پُران اس کی اہمیت کو ظاہر کرتے  
 ہیں۔ مہا پراکھ کی ایک چھتر بادشاہت پنجاب سے بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوستانی لوگیت کی ایک نادر الظہور مثال تھی۔ اس کا  
 بنیادی ایک شودر نے ڈالی اور یہ کئی نسلوں تک شودروں کے ہاتھ میں رہی۔ اس سلطنت کا دور تقریباً ۵۵۴ ق م سے  
 شروع ہو کر ۳۲۵ ق م میں ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سلطنت ٹوٹی نہیں بلکہ وراثت کے طور پر چندرگپت یا  
 کے ہاتھ آئی جس نے اس کی حدود کو اور زیادہ وسیع کیا۔ شمال میں یہ ہرات اور ہمالیہ تک پہنچ گئی اور شرق و مغرب میں  
 اس نے ہند کے ساحلوں کو جا چھوٹا۔ چندرگپت کے جانشین ہندو سارا اور اشوک نے اس نظام حکومت کو ایران  
 اور ہمالیہ کے پار خواتان تک پہنچایا۔ مشرق میں آسام تک اور جنوب میں میسور تک جس کا سیاسی اثر سیلون پر بھی پڑا۔ پُران کے  
 موضوع کی متفقہ شہادت اور سنسکرت ادب کی تصریحات اس امر کا ثبوت ہیں کہ مہا پراکھ ان بھی شودر تھا۔

تیسری سلطنت گپتا خاندان کی ہے جس کی بنا چندرگپت ماوراس کے بیٹے سمرگپت نے ڈالی۔ یہ سلطنت  
 صدیوں تک قائم رہی اور ان سلطنتوں میں سے ایک ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ دیر تک قائم رہی۔ ادبِ تعمیر سنگتراشی  
 عام آرٹ اور تجدید مذہب کے لحاظ سے گپتا خاندان کی سلطنت کی مثال نہیں ملتی۔ وید برہمن اور عام ہندو تہذیب کی  
 بڑی محافظ ثابت ہوئی۔ اس خاندان میں ایک نہیں بلکہ کئی ایک افراد ایسے نظر آتے ہیں جو بڑی بڑی رزیرفوں کے  
 موضوع بننے کے قابل ہیں، لیکن اس زمانے کے دالمیک خاموش ہیں۔ ایک قدیم ناٹک جسے رام کرشن کوئی نے حال ہی میں  
 شائع کیا ہے ظاہر کرتا ہے کہ وہ کرشنکار ذات کے شودر تھے۔ انہوں نے اپنے کتبوں میں کبھی اپنی ذات کا اظہار نہیں  
 کیا، لیکن بعض سکوں پر ایسے الفاظ پائے گئے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھتریوں کے سخت دشمن ہیں۔

## غلامی ابھی موجود ہے

اخبارؔ لٹریٹری ڈائجیسٹؔ کے مندرجہ ذیل شذرہ سے معلوم ہوگا کہ غلامی کا قطعی استیصال ابھی بہت دور ہے:-

غلامی ابھی تک دنیا کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بنی ہوئی ہے۔ جمیعتِ اقوام کی ایک ناموریہ کا بیان ہے کہ آج بھی دنیا میں غلاموں کی تعداد چالیس لاکھ سے کچھ کم نہیں ہے بلکہ غالباً ساٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوئی شخصیت نہیں، وہ لوگ جنہیں کسی قسم کی جائداد بنانے کا حق حاصل نہیں، جنہیں ان کے اپنے معاملات میں بھی صنیر کی آزادی میسر نہیں اور جن کے بیوی بچے ان کے اپنے اختیار میں نہیں۔ کم از کم میں لاکھ ان میں سے چین میں ہیں، پانچ لاکھ سے سات لاکھ تک عرب میں ایک کافی تعداد لائبریا میں اور چند ہزار دنیا کے دوسرے مختلف حصوں میں مختلف مقامات میں غلامی مختلف حالتوں میں ہے۔ مانی سینیا میں غلاموں کو کھلم کھلا عذاب دیا جاتا ہے، ایک چین میں ایک پوشیدہ طریق جاری ہے۔ وہاں لڑکیاں جو حقیقت میں گھر کی لڑکیاں ہوتی ہیں کھنڈ کو افراد خاندان کی طرح رتی ہیں۔ جمیعتِ اقوام کی کوششوں سے ایک لاکھ پچاسی ہزار مالگائیکامیں، دو لاکھ پندرہ ہزار سیرالیون میں اور کچھ ہزار غلام برامیں آزاد کئے گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان شمار و اعداد کو دیکھ کر دنیا کی رستے عامہ انسانی غلامی کی آخری زنجیریں ٹڑانے میں جمیعت کی کوششوں کی مددگار ثابت ہوگی۔

## رباعیاتِ عمر خیام کا ایک گراں بہا نسخہ

ایڈورڈ فٹز جیرلڈ کا ترجمہ ”عمر خیام“ پہلی بار ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا اور اس کی قیمت ایک شلنگ لکھی گئی۔ گو اس کی فضیلت اور قدر کو بعض لوگوں نے جن میں بہت بڑے بڑے آدمی بھی موجود تھے اُسی وقت جان لیا تھا لیکن یہ مقبول عام نہ ہو سکا، اور اس کی قیمت گھٹا کر چارپنس کر دی گئی۔ حال ہی میں اس ایڈیشن کا ایک نسخہ خود ناشر نے ۱۹۱۰ء پونڈ کو خریدا ہے۔ اس کا حجم اٹھارہ ورق ہے اور آج سے پچاس سال پہلے بیچنے والے نے اسے سات گنی میں خریدا تھا۔

## دس لاکھ سال پہلے کا انسان

پسین کے قریب ایک غار کے اندر دس لاکھ سال پہلے انسانوں کی متحجر ہڈیاں ملی ہیں جو آج سے دس لاکھ سال پہلے زمانے پر بنے تھے۔ ان ہڈیوں میں سب سے اہم ایک کھوپڑی ہے جس کے امتحان کے بعد نتیجہ نکالا گیا جو کہ اس قدیم زمانے میں بھی دنیا میں ایسی مخلوق موجود تھی جس میں سوچنے کی طاقت تھی اور جو بیدار چل سکتی تھی۔ ماہرین کی رائے ہے کہ اس پہلے ایسا عجیب اور قدیم انکشاف آج تک نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ انسانی نسل براہ راست اسی انسان سے چلی اور جاوا کا بن مانس اس خاندان سے نہیں تیار کیا۔ وہ کہتی ورنہ آج دس انسانوں کی ہڈیوں کا کچا پایا جانا اس امر کی دلیل کہ وہ دل چاہتے تھے



# جدید ترکی

مس گریس ایلیس جن کی تحریریں ترکی کے متعلق نہایت مغنہ بھی جاتی ہیں اور جن کے ترکوں سے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں پانچ مرتبہ ترکی گئی ہیں اور ان کو سلطان عبدالحمید کے عہد سے لے کر اب تک ترکی کے انقلابات کے ساتھ خاص ربط و ضبط رہا ہے۔ ہمارے اس مضمون کی تصریحات انہیں کی کتاب سے ماخوذ ہیں جو عہد حاضر کی تاریخ کا ایک عظیم الشان اور دلچسپ باب ہے۔

## مصطفیٰ کمال پاشا

اُس کی شخصیت اور اُس کا کام۔ اُس شخص کا ذکر کئے بغیر جدید ترکی پر کچھ لکھنا ناممکن ہے جو گویا اُس کا خالق ہے۔ اُس کی زبردست شخصیت کا نقش تمام ملک کے چپے چپے پر ثبت ہے۔ ہر گاؤں پر، ہر مدرسے پر، ہر مسجد پر، بہبود اطفال کے مراکز پر جو اُس کے حکم سے جاری ہیں اور پودوں کی اُن چھوٹی چھوٹی تربیت گاہوں پر جن سے وہ اناطولیہ کی سی سنان اور بے شجوزمین کو ایک جنت بنانے کا ارادہ رکھتا ہے اُس وقت تک جدید ترکی کا مطالعہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہمارے دلوں میں اُس مصویرِ عظیم سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی خواہش پیدا نہ ہو جائے جس نے اُس کے حیرت انگیز نظاروں کو اپنے بلند تصور سے نکال کر صفحہ ہستی پر کھینچ دیا۔ یقیناً جدید ترکی کو اگر کوئی ”کمالستان“ کہے تو بجا ہے کیونکہ جدید ترکی مصطفیٰ کمال پاشا کی تخلیق ہے!

وہ ایک فوق العادت انسان ہے۔ وہ اُن عظیم الشان ہستیوں میں سے ہے جو اُس وقت ظاہر ہوئی ہیں کوئی قوم اپنا تمام سرمایہ حیات کھو بیٹھتی ہے، اور اس لئے ظاہر ہوتی ہیں کہ وہ انہیں باؤسیوں اور محرموں کی پستی سے نکال کر آزادی اور کامیابی کے آسمان پر لے جائیں۔

عبدالحمید کے عہد کی بدانتظامیوں سے متاثر ہو کر اُس نے اوائل عمر ہی سے اپنی قوم میں حب الوطنی کی روح بکھینی شروع کر دی تھی۔ اسی حب الوطنی نے اب وہاں ایک نئے مذہب کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ وہ ایک سپاہی ہے جس نے وطن کی محبت اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں پائی، پھر اپنے مضبوط ارادے کو ساری قوم کے دلوں میں راسخ کر دیا۔ اور انہیں

آزادی کے لئے لڑنے، ترقی کے لئے جدوجہد کرنے، روایات کے فتنے کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے اور ایک نئی مملکت تعمیر کرنے پر مجبور کر دیا۔ لڑکپن کے زمانے میں جب ابھی وہ مکتب میں پڑھا کرتا تھا لوگوں کے بے فائدہ غم، معیبت اور بھالت پر اسے غصہ آجایا کرتا تھا اور وہ بھی باندھ کر کہا کرتا تھا ”آہ میرا وطن! میں اپنے وطن کو بچا لوں گا“ اور اس کی عمر ابھی کچھ سال کی نہ ہوئی تھی کہ اس نے تپاخ، حکومت جمہوری اور حکومت دستور کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں وہ لوگوں کو سوئے کی صورت میں ایک اخبار بھی تقسیم کیا کرتا تھا جس میں حکومت کی غلطیوں کی طرف اشارات ہوتے تھے اس نے خود بتایا ہے کہ ”دس سال کی عمر سے لے کر اب تک میں نے دن رات اپنی قوم کی ترقی کے لئے کام کیا ہے“

گو قسمت نے اسے ملک میں سب سے بلند و بزر حیثیت عطا کی ہے لیکن اسے اپنی ذات کے لئے کوئی خواہش نہیں۔ اسے دولت، خاندان یا مرتبے کی کوئی آرزو نہیں۔ اور اگر یہ ممکن ہوتا تو وہ سلطان کو بھی تخت سے الگ کرتا۔ اس کی احسان اور شکر گزار قوم نے اسے سلطان اور خلیفہ کا منصب پیش کیا لیکن اس نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ مجبوراً نہ ہوتا بلکہ محض ایک فاتح ہوتا۔

مس ایلین نے مصطفیٰ کمال پاشا سے اپنی پہلی ملاقات کو اس طرح بیان کیا ہے :- وہ پہلا نقش جو مصطفیٰ کمال پاشا کی شخصیت نے مجھ پر کیا یہ تھا کہ اس کو دیکھ کر مضبوط سے مضبوط جگرے کا آدمی بھی کانپ جاتا ہوگا۔ جب اپنے ڈسک پر اپنی دونوں باہوں کو جوڑ کر اور ذرا اٹھک کر اس نے اُن آنکھوں سے میری طرف دیکھا جن کی مثال میں نے کسی دوسرے انسان میں نہیں پائی تو مجھے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے میں پھر وہی چھوٹی سی بچی ہو گئی ہوں جو چڑیا خانے کے سب سے بڑے شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پہروں کھڑی رہتی تھی یہاں تک کہ یہ عظیم جانور اپنی نظریں جھکالیتا تھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی نظر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روح کی گہرائیوں تک انزگئی ہے۔ اور میں نے شکر کیا جب ایک وزیر کی آمد سے یہ عجیب مقابلہ ختم ہوا جس میں میں محض ناگمانی طور پر مبتلا ہو گئی تھی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہ آنکھیں کبھی گہری نیلی ہو جاتی ہیں اور کبھی سخت جھوڑی، کبھی اُن میں انتہائی نرمی آ جاتی ہے اور کبھی بالکل قائل نظر آتی ہیں۔ اس کا چہرہ ایک جنگجو سپاہی کا چہرہ ہے لیکن اس کی آواز اس قدر شیریں ہے کہ ترجمان سے اس کے ترکی یا فرانسیسی الفاظ کا ترجمہ سننے سے پہلے انسان مسحور ہو جاتا ہے۔

مذہب کے متعلق اس کا قول ہے کہ ”میر کوئی مذہب نہیں، اور بعض اوقات میں چاہتا ہوں کہ تمام مذاہب کو لے کر سمندر کی نہ میں پہنچا دوں“ وہ کہتا ہے کہ ”وہ ایک کمزور حاکم ہے جسے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے مذہب کے سنتوں کی ضرورت ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی انسان کو دام سے پکڑنا چاہے۔ میری قوم جمہوریت کے

اصول حقیقت کے قانون اور علوم کے ارشادات سیکھنے لگی۔ تو بہت کو اب مٹ جانا چاہئے۔ لوگ جس طریقے پر چاہیں عبادت کریں، ہر شخص اپنے ضمیر کی پیروی کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اُسے عقل کے خلاف یا اپنے بھائی بندوں کی آزادی کے خلاف عمل کرنے کی ترغیب نہ دے۔“

اُس کے یا اُس کی قوم کے دل میں کسی کے لئے نفرت موجود نہیں۔ وہ ترکی کے ہمسایوں اور دوسری قوموں کے لئے سراپا امن اور دوستی ہے۔ اُس کی خواہش بس یہی ہے کہ سب قومیں ترکوں کی آزادی کا احترام کریں۔ وہ کہتا ہے: ”میں نے جب کبھی جنگ کے لئے تلوار اٹھائی میرا مقصد حق کی حفاظت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ہم اپنے ہمسایوں — روس، یونان، بلغیریا، سربیا، انگلستان اور فرانس کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اپنے ملک کی شکستہ عمارت کو دوبارہ تعمیر کر سکیں اور جو اقتصادی کرم اور رنگ اُسے مدتوں سے لگ رہا ہے اُسے صاف کر سکیں۔“

وہ اپنے آپ کو صرف اپنی قوم کی جماعت کا امیر سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ بھی اُسے یہی سمجھیں۔ اصلاح کے لئے عمل کا اعلان ہمیشہ ان الفاظ میں ہوتا ہے کہ ہم نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے، اور اُن سے ہمیشہ یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو کچھ اُس نے کیا ہے وہ اس کا فرض تھا۔ تاریخ کی اُس کے دل میں بڑی عزت ہے اور وہ اپنا معاملہ تاریخ ہی کے سپرد کرتا ہے کیونکہ تاریخ بے رحم ہے اور ہر چیز کو اس کی حقیقی حیثیت کے مطابق اہمیت دیتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کسی بڑے آدمی سے اُس کی مثال دی جائے۔ کیونکہ اس قسم کے مقابلے دونوں بڑی ہستیوں کو چھوٹا کر دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ کہتا ہے ”میرا نام مصطفیٰ کمال ہے!“

اُس کی معمولی گفتگو بھی نہایت دلکش اور مسرور کن ہوتی ہے۔ جب وہ کام کرتا ہے تو اُس کے پیش نظر صرف کام ہوتا ہے اور جب وہ کھیل میں مشغول ہوتا ہے تو اُسے کوئی اور دھیان نہیں سنا تا جب وہ اپنی تجاویز کے نقشہ تیار کرتا ہے یا کسی اور تعمیری کام میں مصروف ہوتا ہے تو اُسے کوئی پریشان نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے کام میں قطعاً منہمک ہوتا ہے لیکن کھیل کا بھی وہ اسی قدر فائل ہے۔ اگر وہ ناچ گھر میں ہے اور ناچ صبح کے آٹھ بجے ختم ہوتا ہے تو وہ شروع سے لے کر آخر تک اس میں ایک نوجوان لڑکے کی طرح ڈھپسی لے گا، اور ایک گھنٹے کے اندر اندر بہترین تقریر کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

کاشت کے کام کو پاشا کی تفریح کا سامان نہا جائے یا نہ کہا جائے لیکن یہ اُس کی حکومت کے انتظامات کا بال ضرور ہے بعض اوقات صبح سے پہلے ہی پہلے وہ اپنے کھیت میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں نئی نئی کھول اور نئے نئے اصولوں سے ایسی محنت کے ساتھ کام کرتا ہے کہ اُس کے دوستوں کی یہ بات دہشت معلوم ہوتی ہے کہ اس کا مقصد

زراعت کی ترقی کے سوا اور کچھ نہیں، اور وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بہترین کھیتی کس طرح تیار کی جاسکتی ہے۔  
 نئی ترکی کا بانی وہ خود ہے۔ لیکن یہ عبارت صرف اُس کی قوم کے اشتراک سے تفسیر ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اُس نے  
 ساری قوم کی ذہنیت کو بدل دیا، تاہم جتنی اصلاحات بھی ہوئی ہیں وہ اُس کی نہیں بلکہ اُس کی قوم کی ہیں۔ وہ ہمیشہ  
 حکومت کو ”ہماری حکومت“ اور قوم کو ”ہماری قوم“ کہہ کر پکارتا ہے، اور جب وہ ”مصطفیٰ کمال پاشا“ کہتا ہے تو  
 اُس کا مفہوم اُس کی اپنی ذات نہیں ہوتا بلکہ ”قوم“ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے ”ہماری حکومت نہ عمومی ہے نہ اشتراکی۔ یہ  
 حکومت کسی دوسری حکومت سے مشابہت نہیں رکھتی۔ یہ قومی آزادی کی نمائندہ حکومت ہے، قوم کی فزادائی کی  
 نمائندہ حکومت۔ ہم نے روشنی کو پالیا ہے اور ہمیں رات مل گیا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ہمیں آگے بڑھنے  
 سے روک سکے۔“

## انگورہ

دار الخلافہ۔ انگورہ آج ایک تسلیم شدہ، ذمہ دار حکومت ہے۔ دار الخلافہ ہے۔ پہلے ایک قریب وضع کا ایشیائی  
 گاؤں سا تھا۔ انگورہ جاتے ہوئے ایک بے برگ درخت اور تقریباً غیر آباد سطح مرتفع سے گزرتا ہے جس میں بونیشی تک نظر  
 نہیں آتے۔ شاذ و نادر کہیں بھیڑیوں پر نگاہ پڑتی ہے۔ انگورہ صحرا میں واقع ہے۔ آب و ہوا گرمیوں میں سخت گرم اور گر آلود  
 اور سردیوں میں سخت سرد ہوتی ہے۔ قدیم انقرہ ہی ہے اور اب بھی اس جگہ بعض دلچسپ رومی آثار اور سنگٹس ایک منہ  
 موجود ہے، جن پر ترکوں کو بڑا ناز ہے۔

پرانے زمانے کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں جو کلکڑی اور گاسے سے بنائے جاتے تھے کوئی ترتیب ملحوظ نہیں  
 رکھی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کو اوپر سے پھینکا ہے اور یہ بکھر کر پہاڑوں کے پہلوؤں میں آئے  
 ہیں۔ ان میں سے کسی ایک مکان کو یاد رکھنے کے لئے اکثر کوئی فتورہ یا اسی قسم کی کوئی اور چیز کی نشانی کے طور پر کھنی  
 پڑتی تھی۔ آج سترے مکانوں اور نئی سڑکوں نے یہاں ایک عجیب بے نظیر منظر پیدا کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے  
 کسی مصوّر کی بہترین تصویر ہے جو ابھی تکمیل کو نہیں پہنچی۔

انگورہ کی موجودہ معاشرت۔ انگورہ کا حلقہ معاشرت وزراء، عمدہ داران حکومت، نائبین اور ارباب  
 ریاست پر مشتمل ہے۔ اگر آپ دو یا تین دعوتوں میں شامل ہوں تو آپ ان سب کو جان لیں گے کیونکہ ہر جگہ یہی لوگ  
 مدعو کئے جاتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان اب پردہ حائل نہیں، عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ ہر جگہ جاتی ہیں

ہمانوں کی خاطر مدارت کرتی ہیں ابال (ناچ) میں شامل ہوتی ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو خود بھی ناچ سے دلچسپی ہے اور وہ اسے تقویت دینے کا اس لئے حامی ہے کہ اس سے وہ نوعی حجابات اٹھتے ہیں جو اب تک قومی ترقی کے لئے سدِ راہ تھے۔

## نشاة الثانیہ

رفع نقاب۔ جب ملک ہر طرح کی اندرونی اور بیرونی غلامی سے آزاد ہو گیا، جمہوریت قائم ہو گئی تو مصطفیٰ کمال نے آزاد مردوں اور عورتوں کی ایک نئی عمومیہ کا کام اپنے ذمہ لیا۔ بجلی کی سی سرعت سے انقلاب پر انقلاب پیدا ہوتا گیا۔ پاشا نے ایک عزمِ راسخ کے ساتھ مملکت کے گلے سڑے اعضا کو الگ کرنا شروع کر دیا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا اسے وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اور اسے اپنی کامیابی کا پورا پورا یقین تھا۔

خلافتِ رخصت ہوئی اور ساتھ ہی ملک کا قانون بھی بدل گیا۔ قانون بدلتے ہی آزادیِ نسواں کی عظیم الشان اصلاح عمل میں آئی۔ غازی نے کہا ”جمہوریت کا قیام کیسے ممکن ہو سکتا تھا جب کہ عورتیں بندش میں تھیں اور تمام معاشرتی نقشہ آدابِ حرم کی پابندیوں نے بگاڑ رکھا تھا۔ ہمارے تعمیری کاموں میں ہمیں مدد دینے کی بجائے عورتوں کو سست کیا جا رہا تھا۔ تمام نظامِ معیہ خیز بن چکا تھا، اس لئے اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر تھا“

قانون کی تبدیلی، تعددِ ازواج کی منسوخی اور اپنی شادی سے اُس نے نمایاں کر دیا کہ وہ آئندہ مملکت اور معاشرت میں عورت کا کیا درجہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ جو سلوک اُس نے اپنی بیوی سے کیا وہ ایک اظہار تھا اس امر کا کہ وہ دوسروں سے بھی اُن کی بیویوں کے لئے ایسے ہی سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ اُس نے نہ صرف عورتوں کو کامل آزادی دی بلکہ معاشرتی طور پر بھی اُن کی حیثیت کو محفوظ و متیقن کر دیا۔ جہاں وہ یورپ کی طرح ترکی میں بھی ہر جگہ اپنے شوہروں کے ساتھ جا سکتی ہیں وہاں انہیں یہ بھی اجازت ہے کہ جو پیشہ چاہیں اختیار کریں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ عورتوں کو آزادی جنگ کے دلائل اور یہ سچ ہے کہ جنگِ آزادی میں انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ آزادی کی مستحق ہیں۔ انکو وہیں جنگ کی جو یادگار قائم ہوئی ہے اُس میں اُس تصویر نے ترکی عورتوں کے کام کو غیر فانی بنادیا ہے جس میں وہ توپ کے گولے اٹھائے لئے جا رہی ہیں۔ توپ کے گولے اٹھانا کسی حالت میں بھی آسان کام نہیں ہے، لیکن انکو وہ کے اُس ہولناک، ماحول میں، جب بے پینہ کو کافی کپڑا میسر نہ تھا نہ کھانے کو کافی خوراک، ان کے عظیم بوجھ تلے دبے ہوئے ہونا ترک عورتوں کا ایک کبھی نہ بھولنے والا کارنامہ ہے۔ ترکی قوم کی قوتوں کی صحیح رہنمائی کرتے ہوئے غازی

پاشا نے عظیم ترین قوت — عورت — کو اُس کا حقیقی درجہ عطا کیا ہے۔ پہلی حالت میں عورت ایک عضوِ معطل ہو رہی تھی کیونکہ اُس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ یادہ ایک پودا تھا جو پانی کے فقدان کی وجہ سے مرجھا یا جا رہا تھا۔ جو تھوڑی بہت طاقت اس میں تھی وہ چھپی ہوئی تھی، اس لئے خطرناک تھی۔ اب اُسے ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ترکی کی عورتوں کو یہ نیا افتخار دے کر یقیناً مصطفیٰ کمال تمام مشرق کی عورتوں کا رتبہ بلند کر رہا ہے۔

**ممنوع فیض**۔ ترک بھی دوسری یورپی قوموں کی طرح اس ہیٹ پہنتے ہیں فیض کا پہننا قانوناً ممنوع ہے۔ ترکی میں یہ پہلا موقع نہیں کہ لوگوں کو سر کا پہنا واید لے کر مجبور کیا گیا ہو۔ جب فاتح ترکوں کو فیض پہننے پر مجبور کیا گیا تھا تو اُس وقت بھی صدر نے احتجاج بلند ہوئی تھی جس کے سلسلے میں دس آدمی سرگئے تھے اور چالیس زخمی ہوئے تھے جب پیر اعظم لوگوں کو جبراً ہیٹ پہنانے جا رہا تھا تو سواروں کے دو دستے اُس کے ساتھ تھے لیکن مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنی قوتِ ترغیب اور اپنی شخصیت پر بھروسہ تھا۔ صرف ایک مصاحب اور ایک ستمد کو ساتھ لے کر اُس نے ترکی کے مجنون ترین شہر میں لوگوں کے جم غفیر کے سامنے اعلان کیا کہ انہیں کل کے دن سے ہیٹ پہننی پڑے گی۔ اور کیوں؟ اس لئے کہ ”ہماری جلیل القدر قوم کو ایک مہذب اور بین الاقوامی لباس کی ضرورت ہے، ہم اس کو ضرور پہنیں گے۔ ہم شو، بوٹ، تیلو، واسکٹ، قمیص، کالر، ٹائی اور جاکٹ پہنیں گے اور اس تمام لباس کی تکمیل کے لئے سر کا وہ پہنا دنا اختیار کریں گے جس کا کتنا بڑھا ہوا ہو۔ سر کے لباس کا نام ہیٹ ہے۔ جو لوگ اس معاملہ میں ہچکچائیں گے اُن سے میں کہوں گا کہ وہ جاہل اور بیوقوف ہیں۔ اگر فیض کا پہننا درست ہے جو یونانی ٹوپی ہے تو ہیٹ کا پہننا کیوں درست نہیں؟

”وہ لوگ جو طفلانہ خیالات میں الجھ رہے ہیں جن کی ذہنیت قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت ہے اور جو تہذیب کے خلاف جنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن لوگوں کو اپنے انجام کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ اور وہ انجام کیا ہے؟ غلامی اور ناکامی۔ لیکن ترکی جمہوریت کے افراد نے اپنی بیڑیوں کو توڑ ڈالا ہے، اُن کی شجاعت کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، وہ اپنی زندگی ایک مہذب قوم کی طرح گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“

یہ سچ ہے کہ دس آدمیوں کا ہیٹ کے پہننے سے انکار کر کے جان سے گزر جانا انسان کے سلبی جسم میں لہزہ پیدا کر دیتا ہے، لیکن ہیٹ نئی تہذیب کا نشان اور جمہوریت کے ساتھ اتحاد کا ثبوت ہے اس کے پہننے سے انکار کرنا حکومت کے احکام کی خلاف ورزی ہے اور فیض کے پہننے کے یہی معنی ہیں کہ پہننے والا سابق سلطان کا طرفدار ہے، جو موجودہ حکومت سے بغاوت ہے اور باغی کو اُس کی مرالمنی ضروری ہے۔

دیہات۔ دیہات میں بھی نئی تہذیب اور جمہوریت کا اثر پہنچ گیا ہے، اور وہاں بھی اصلاحات عمل میں آ رہی ہیں۔

دیہات کے باشندوں کو فخر ہے کہ جمہوریت میں اب اُن کا بھی ایک حصہ ہے۔ انہوں نے در سے جاری کئے ہیں اور نئی صاف سیدھی سڑکیں بنائی ہیں۔ زندگی اب اُن کے لئے پہلے سے بہت مختلف ہے۔ پہلے زمانے میں اُلی (گورنر) غیض و غضب کا پتلا بن کر یہاں آتا تھا اور غریب دیہاتیوں سے جو روپیہ پسہ اُسے ملتا تھا زبردستی چھین کر لے جاتا تھا۔ محصولات کے بوجھ نے اُن کی پشت دہری کر دی تھی۔ انہیں بادشاہ کے لئے جیسے انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا جنگلوں میں لڑنا پڑتا تھا۔ اب انہوں نے اپنے حاکم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اُس کے ساتھ مصافحہ کیا ہے اور اُس سے گفتگو کی ہے۔ والی اب اُن کا دوست ہے۔ وہ اُن کے رنج و راحت کا شریک ہے۔ دیہات کے باشندے اُس کے لئے چشمہ پراہ سہتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت اُن کی مدد کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ وہ بڑی محنت سے کام کرتے ہیں اور خوش ہو کر مالہ ادا کرتے ہیں۔ ترقی اور کامیابی اب ہر وقت اُن کے پیش نظر رہتی ہے۔

عورتیں مردوں کے دوش بدوش کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے انہیں آزادی دے دی ہے لیکن ابھی انہوں نے پوری طرح پردہ نہیں اٹھایا۔ اُن کے سر کے بال ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں اور جب وہ غیر مردوں کو کچھنی ہیں تو بعض اوقات اپنے پہروں پر نقاب کھینچ لیتی ہیں۔

### اصلاحات عظیمہ

منجہد کا اثر مذہب پر جب ہم اس کے طبقے کے بعض لوگوں کی باتیں سنتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہو کہ مذہب کے متعلق ترکی میں ایک بغاوت جاری ہے۔ لیکن یہ بغاوت بڑی حد تک اُن تعلیمات اور نوہمات کے خلاف ہے جنہیں محمد جدید سے پہلے وہاں کے مولویوں اور درویشوں نے رائج کر رکھا تھا۔ عوام کو جاہل رکھ کر اُن کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانا مولوی لوگوں کا شیوہ تھا۔ وہ اتنا بھی برداشت نہیں کرتے تھے کہ قرآن مجید کا ترجمہ ترکی زبان میں ہو جائے۔ چنانچہ جب غازی پاشا نے اصلاحات کا کام شروع کیا تو اُس نے بڑے بڑے مولویوں کو بلا کر پوچھا کہ آپ کیوں ترجمے کی مخالفت کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ قرآن مجید میں بعض آیات ایسی ہیں جن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا، اُس نے کہا ”اگر وہ ایسی ہی مشکل اور غصائی ہیں تو انہیں چھوڑ کر باقی قرآن کا ترجمہ کر لینا چاہئے“

کرنل میل بے نے اپنے قیام پر یہ س کے دوران میں قرآن مجید کا بہت اچھا ترجمہ کیا تھا۔ جب مصطفیٰ کمال کو اس کا علم ہوا تو اُس نے اس کی اشول بڑے بڑے علما کو بھجوائیں۔ انہوں نے پڑھے بغیر اس کی شدید مخالفت کی لیکن غازی نے اُسے طبع کر لیا اور اس کی جلدیں تمام مذہبی اور علمی مراکز میں بھیجیں۔

ان لوگوں کی جہالت بھی بعض اوقات ملک کے لئے نہایت ہی مضر ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے زلزلے میں جب کہ مغربی طاقتوں نے نئی حکومت کو سنبھلنے کی مہلت دینے بغیر ترکی علاقوں پر دستِ تجاوز کرنا شروع کر دیا۔ اسٹریٹس بوسینا ہرزیگووینا پر قبضہ کر لیا، یونان نے کریٹ کا الحاق کر لیا اور اٹلی نے ٹریپولی پر ہاتھ ڈالا۔ تو گوتروں کو شکست صاف نظر آرہی تھی مگر وہ اس ٹوٹ کو روکنے کے لئے مدافعت پر آمادہ ہو گئے۔ ایسے نازک وقت میں ان لوگوں نے بجائے قوم اور سپاہ کی ہمت بڑھانے کے یہ وعظ کھنا شروع کیا کہ اس مہابی عیث ترک کی مغرب پرستی ہے۔ اب غازی نے ان پر مختص مقرر کردیئے میں جو ہر وقت ان کے افعال پر نظر رکھتے ہیں۔ اسی طرح درویش تھے جو ناچتے تھے، مہاریوں کے سے کرتب دکھاتے تھے اور لوگوں کو اپنے معجز نما علاجوں اور گندے تعویذوں کا معتقد بناتے تھے۔ ان کا کوئی منطق نظر نہ تھا، ان کی عبادت میں قربانی کا کوئی پہلو نہ تھا، یہ صرف سادہ لوح لوگوں سے اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لئے روپیہ بٹورتے تھے۔ ان کے تکیوں کی خلوت اور پاکیزگی صرف ان کی بدکرداریوں کی ایک نقاب تھی۔ ان کے مذہبی رسوم اور خصوصاً ان کے گیدڑوں کے سے نعرے آس پاس کے پتے والوں کے لئے عذاب بن گئے تھے۔ اور اس کے سوا چارہ گا رہی رہا تھا کہ ان کی جہانہ توہم پرستی کا قلع قمع کر دیا جائے۔

دینیات کے مدرسوں میں محض وقت ضائع کیا جاتا تھا اور طالب علم بھی یہاں صرف اسی کشش کی وجہ سے داخل ہوتے تھے۔ اب یہ مدرسے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اب جو طالب علم علم دین حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں بھی یونیورسٹی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

قومی تعلیم چھوٹے سے چھوٹے قریہ میں بھی تعلیم نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ یہ تحریک بھی اسی طرح شروع ہوئی جیسے ترکی کی اور تحریکیں ایک طریق عمل اور ایک حکم کو لے کر شروع ہوتی ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے کہا ”تعلیم حاصل کرنا تمہارا قومی فرض ہے“ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والدین اور ان کے بچوں نے تمام ملک میں تعلیم کا دھکا بٹایا۔ حکومت کی طرف سے تمام مخالفاہیں اور تمام درویش گاہیں مدرسوں میں تبدیل کر دی گئیں۔ کونیہ کی تین عظیم الشان عمارتیں جو کسی زمانے میں ناچنے اور غل مچانے والے درویشوں سے بھری رہتی تھیں آج صنعت و حرفت کی ایک عمدہ درس گاہ بن رہی ہیں۔ یہاں لڑکے اور نوجوان مرد ایک اطالوی اور ایک جرمن کی ہدایات کے ماتحت ہل سے لے کر کرسی اور میز تک تمام چیزیں بنانا سیکھتے ہیں، اور ان کی بنائی ہوئی چیزیں درس گاہ کے فائدے کے لئے فروخت کر دی جاتی ہیں۔ فروخت سے پہلے گورنر کے معائنہ کے لئے نمائش ہوتی ہے۔ گورنر تمام طلبہ سے واقف



ہے اور وہ ایک ایک کو علیحدہ علیحدہ مبارک باد دیتا ہے اور کہتا ہے ”اگر تم پھر غلام بننا نہیں چاہتے تو خوب دل لگا کر کام کرو“

موازنہ (بجٹ) خواہ کتنا بوجھ تلے دبا ہوا ہو وزیر مالیات کو تعلیم کے لئے اتنی رقم منظور کرنی پڑتی ہے کہ مالیہ کو ملحوظ نظر رکھ کر اس کی منظوری بالکل غیر موزوں معلوم ہوتی ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے لوگوں کی نظروں سے گر جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ وہ تعلیم کو اپنی ”قومی روٹی“ سمجھتے ہیں۔

ترکی میں اس وقت تین قسم کے مدرسے ہیں — ابتدائی، ثانوی اور سیناؤں کے تعلیم کے نئے ضابطے میں جسے غازی کے منشا کے مطابق وضع کیا گیا ہے مشاہدے کی تربیت پر بڑی توجہ دی جاتی ہے۔

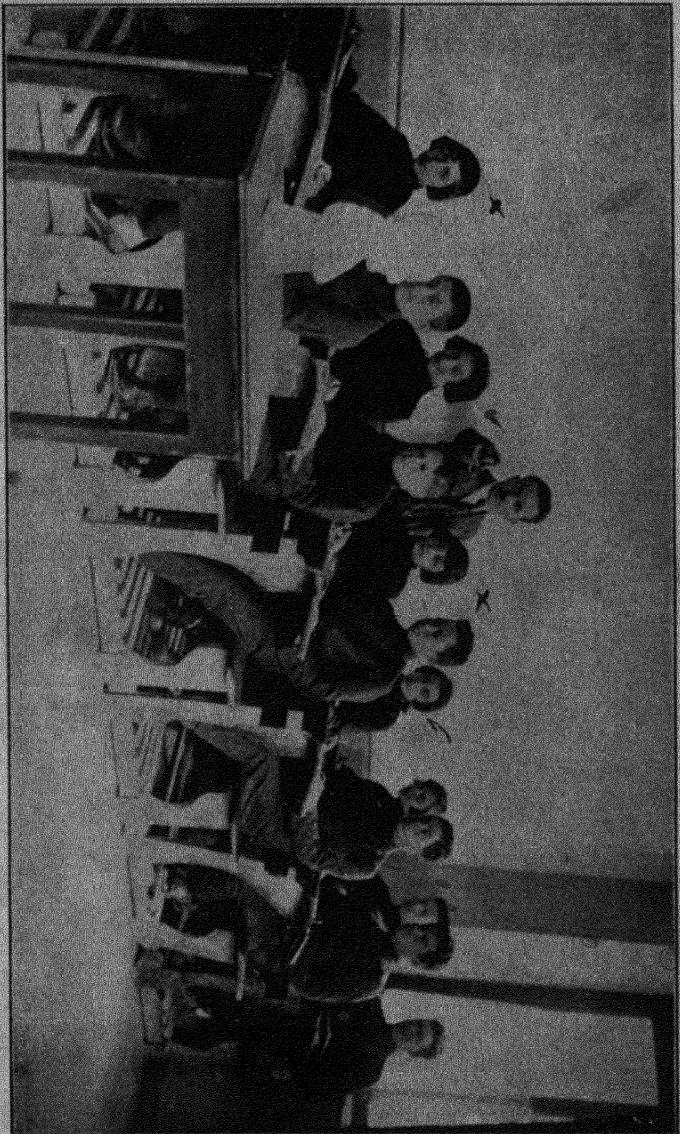
تمام مدرسوں میں حتیٰ کہ دیہاتی مدرسوں میں بھی عجائب خانے موجود ہیں جن میں طلبہ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چیزوں کی نمائش کی گئی ہے۔ ننھے کارگردوں کو ان چیزوں کے بنانے میں استاد کسی قسم کی مدد نہیں دیتے، طلبہ اپنے تخیل کو آزادانہ استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بہت سی نئی چیزیں معرض وجود میں آجاتی ہیں۔ ترکی مدرسوں میں اب مغربی موسیقی اور مصوری دونے اور اہم مضمون ہیں جیسے کہ ریاضی، کیمیا اور ترکی زبان وغیرہ اہم مضامین ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر وہاں تاریخ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ پہلے درجے پر قومی تحریک کی تاریخ ہے جس میں صاف صاف اور سچی باتیں لکھی ہیں کہ ترک زمانہ گزشتہ میں کیوں شکستیں کھاتے رہے۔ اب انہیں فتح کیوں نصیب ہوئی اور شہریت کے حقوق کیا ہیں۔

یہ تاریخ ہی کی تعلیم ہے جو ترکوں اور بدلیسی مدرسوں کے درمیان وجہ نزاع بنی رہی۔ ترک سمجھتے ہیں کہ بدلیسی اس ”مقدس“ علم کو پڑھانے کے ناقابل ہیں۔ سلاطین کے زمانے میں بدلیسی مدرسے جو تعلیم چاہتے تھے ترکی طلبہ کو دیتے تھے۔ اب جمہوریہ ترکیہ اکثر اپنے انسپکٹران کے معاملے کے لئے بھیجی رہتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی ترک دیکھتے ہیں کہ کوئی مدرسہ پرانے نقشے استعمال کر رہا ہے جن میں سمرنا کو یونانی اور مغربی ولایتوں کو ارمنی مقبوضات ظاہر کیا گیا ہے تو ترک کہتا ہے ”نہ بھی وہ غیر کے قبضے میں تھے اور نہ ہوں گے“ اور مدرسہ بند کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے معاملے میں بھی ایسی ہی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے جمہوریہ ترکیہ کے دعویٰ کے خلاف ایک غلطی سرزد ہو جائے اور مدرسہ بند کر دیا جاتا ہے۔

ہر ترکی ماں سمجھتی ہے کہ وہ اپنے بچے کی تربیت دنیا کی بہترین ماں سے بہتر طریق پر کر سکتی ہے۔ اسی طرح ہر ترک اپنے آپ کو ترکوں کی تعلیم کے لئے، اُن کو اُس طرح تاریخ پڑھانے کے لئے جس طرح وہ پڑھنا چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اُن کو مفید ترکی شہری بنانے کے لئے بہترین ذریعہ خیال کرتا ہے۔

اجنبی کہتا ہے ”منا سے پاس استاد کافی نہیں ہیں“





توکی مدارس میں مخلوط تعلیم اور قارئین کا ایک سبق

ترک جواب دیتا ہے: ”ہم استاد پیدا کر لیں گے اور اس اثنا میں ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور اُس کا جتنا اچھا انتظام ہم کر سکتے ہیں کریں گے۔“

ترکی مدارس میں اب انقلاب سے پہلے کی بنسبت ایک بہتر فضا پیدا ہو گئی ہے۔ استاد یہ کوشش کرتے ہیں کہ بچے کے ذہنی جوہر سے واقفیت حاصل کریں اور بچوں کے دل میں بھی اب اپنے استاد کے لئے پہلے سے زیادہ عزت موجود ہے۔ ان خوشگوار تعلقات کی وجہ مصطفیٰ کمال کا یہ حکم بھی ہے کہ طلبہ کو جسمانی سزا نہ دی جائے جب وہ خود طالب علم تھا تو اُسے ایک دفعہ بے قصور سزا دی گئی تھی جس پر اُس نے مدرسے کو چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ اسے اب بھی طالب علم کا حق سمجھتا ہے۔

غازی پاشا لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا بڑا حامی ہے نفی خانم کا سکول اسی اصول پر نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ لڑکیاں جن کے بال مغربی طریق پر کٹے ہوئے ہیں لڑکوں کے ساتھ جوڑا جوڑا بن کر بیٹھتی ہیں۔ ممکن ہے آئندہ ان میں سے بعض شادی کر لیں اور امریکا کی طرح یہاں بھی وہ لڑکے اور لڑکیاں جو مدرسے میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں میں سرور ترین متاثر زندگی گزاریں۔

صحّت عامہ۔ اب سے پہلے ترکی میں عورتیں اپنا علاج مرد ڈاکٹروں سے کرنا مجبُوب خیال کرتی تھیں اور اب بھی ان کا خیال کچھ زیادہ نہیں بدلا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کی آزادی نے قوم کی صحّت پر بھی بہت بڑا اثر ڈالا ہے عورتیں جلد جلد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور متعدد خواتین بہت اچھی ڈاکٹر بن چکی ہیں۔

صحّت عامہ کا مسئلہ تو اہم تھا ہی لیکن بچوں کی اٹھتر فی صدی اموات خوفناک حد تک اہم تھیں۔ مصطفیٰ کمال نے یہ کام عورتوں کے سپرد کیا کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس نقصان میں کمی پیدا کرنے کی کوشش کریں کیونکہ ایک ایسا ملک جو اپنا تمام خون انقلاب اور عسرت کی راہ میں بہا چکا ہو اپنی نئی پود کو یوں بے دردی سے ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ سردی، خوراک کی کمی، تنگ و تاریک حرموں میں ہوا کی قلت، صحّت کش موٹے نقابوں اور ناموزون کپڑوں نے سل اور ذوق کی خوب پرورش کی تھی۔ بچوں والی ماٹوں کی طرف سے بے پروائی کا نتیجہ نکلا تھا کہ موت کے منہ سے بچنے کی استعداد بہت کم بچوں میں پائی جانے لگی تھی۔ حرم اور نقاب کے منسوخ ہوتے ہی اس خرابی کا ایک حد تک علاج ہو گیا۔ ضیاع اطفال کے اس مسئلہ کا حل غازی پاشا نے یہ سوچا کہ اپنی ذاتی سرپرستی میں ایک ”انجمن تحفظ اطفال“ قائم کر دی۔ قومی صحّت کو بہتر بنانے کے لئے ہر طرفہ عمل میں لایا جا رہا ہے۔ عورتیں گھر میں بھی اور باہر جا کر بھی طبی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ سویڈش قواعد تمام مدرسوں میں رائج کر دی گئی ہے، فاضل ڈاکٹر حفظانِ صحّت پر

تقریریں کرتے ہیں اور جہاں جہاں امکان ہے وہاں بہبودِ اطفال کے مراکز بھی کھول دیئے گئے ہیں، جن میں بچوں اور اُن کی ماؤں کو خالص دودھ اور ہر قسم کی طبی امداد بہم پہنچائی جاتی ہے، اور ماؤں کو بچوں کی تربیت کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔

ترکی عورتیں مذہبی توہمات میں بھی بڑی حد تک اسیر تھیں۔ اور اگر ایک زبردست انسان اٹھ کر ان تمام توہمات کا قلع قمع کر کے قومی صحت کو ایک علمی اصول پر قائم نہ کر دیتا تو اب تک جاہل عورتیں اپنے بچوں کو بجائے ماہر نرسوں کے حوالے کرنے کے درویشوں سے پامال کسانے کے لئے جیا کر نئیں لیکن اس کام کے لئے اُن کی اپنی قوم کے ایک شخص کی ضرورت تھی، کوئی اجنبی اس کو انجام نہیں دے سکتا تھا۔ عورتوں کو آزاد کرنے میں مصطفیٰ کمال پاشا نے اُسی طاقت کو استعمال کیا جو اُس کی قوم کو بچا سکتی تھی، اور شمار و اعداد اُس فرق کو ظاہر کر رہے ہیں جو بچوں کی اموات میں واقع ہوا ہے۔

تحریکِ خواتین۔ ترکی میں تحریکِ خواتین کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی غیر موجود چیز کے متعلق کچھ لکھا جائے! تحریکِ خواتین وہاں دراصل مردوں کی تحریکِ ترقی کا ایک جزو ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ کوئی امکان پایا جاتا کہ عورتوں کو ایک الگ تحریک کی ضرورت ہو۔

چونکہ آزادی عورتوں کو مصطفیٰ کمال نے دی ہے اس لئے اُن کے مستقبل کا ذمہ دار بھی وہی ہے دچانچہ اُس نے حکم دے دیا ہے کہ عورتیں بھی انہیں شرائط اور اُسی طریق سے پروفیسر، ڈاکٹر، وکیل، سنّاع اور مصنف بن سکتی ہیں جس طرح مرد چنتے ہیں اُن کی علیحدہ درسگاہیں قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُس کا خیال ہے کہ ”آرٹ یا جوہر کے لئے کسی نوع کی تخصیص نہیں۔ یہ ایک الامام ہے جس کی مردانہ یا زنانہ نوعیت کا انحصار روح پر ہے“ اس لئے ملک کو مردوں اور عورتوں کی تحریکات میں تقسیم کرنا ایک مانی ہوئی غلطی ہے۔ ”ترک اوجق“ (ترکی کلب) جس کی شاخیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اُس کی سب سے اہم شاخ کے لئے قوم نے ایک خاتون نفی خانم کو صدر منتخب کیا ہے اور یہ وہی اور عورتوں کے بے غرضانہ اشتراک کی ایک قابلِ تعریف مثال ہے۔ یہ کلب جس پر نرکوں کو بڑا ناز ہے اپنے وجود کے لئے حمد اللہ صبحی بے کی ممنون ہے۔ نہایت ادنیٰ حالت سے یہ ادارہ ترقی کر کے اب اس عروج کو پہنچ گیا ہے کہ ہم اسے رجعت اور مذہب کے فتنوں کے لئے ایک زبردست ہتھیار اور ملک کی عظیم ترین قوتوں میں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہاں تقریریں ہوتی ہیں، مختلف مضامین کے سبق دیئے جاتے ہیں اور موسیقی، ناکام اور سنیما کے نمائشے دکھائے جاتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ۔ اگر یہ سچ ہے کہ بصیرت کے بغیر قوم مٹ جاتی ہے تو ہم کہیں گے کہ آرٹ بصیرت کی غذا ہے۔ اُس ملک کی روح جہاں آرٹ کم ہے تشنه رہتی ہو اور ترکی کی روح بھی تشنه ہی تھی۔ مصطفیٰ کمال نے جہاں اور اہم اصلاحات

کیں وہاں اس شعبہ میں بھی ترقی کے امکانات پیدا کر دیئے۔ اب ترکی میں نصاب کی مناسبتیں منعقد ہوتی ہیں اور پاشا کی طرف سے مصوری، موسیقی اور ادبیات کے لئے انعام تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ملک کے تمام نوادروں کو جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے اکٹھے کر کے عجائب خانوں میں رکھ دیئے گئے ہیں اور ان پر ٹکٹ لگا دیا ہے۔

تمام فنون میں سے ڈراما کے لئے ترکی میں کامیابی کے بہت زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں کیونکہ ترک قوم کی ایک ایک بات ڈراما سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ صدر سے لے کر معمولی کسان تک اس قوم کا ہر فرد اپنے مطلب کو کامل طور پر اشاروں میں بیان کر سکتا ہے۔ اچھی تمثیل کی پہچان یہ ہے کہ اسے انسان الفاظ سے بغیر سمجھ سکے اور یہ خوبی ترکی تمثیل میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

پہلے زمانے کے نامک میں ایک نقص یہ تھا کہ اس میں مسلمان عورتیں حصہ نہ لے سکتی تھیں۔ عورتوں کا پارٹ یا تو مرد کیا کرتے تھے یا ارمنی عورتیں کرتی تھیں۔ دونوں صورتوں میں کھیل تباہ ہو جاتا تھا۔ مردوں کے تو حرکات و سکنات ہی عورتوں سے الگ ہوتے تھے اور ارمنی عورتیں ترکی زبان ایسے کثرت لہجہ میں بولتی تھیں کہ کانوں پر اس کا نہایت ناخوشگوار اثر پڑتا تھا۔ نئے دور نے نامک میں جان ڈال دی ہے۔ اب جو کھیل دکھائے جاتے ہیں ان میں ترکوں کے گزشتہ اور موجودہ مشہور پاروں اور دوسری زبانوں کے تراجم کو پیش کیا جاتا ہے۔

موسیقی میں بھی مغزیت آگئی ہے۔ ترکی عود کی دھیمی لطیف آواز اب سنائی نہیں دیتی نہ دوسرے قدیم ساز کہیں نظر آتے ہیں۔ موسیقی کے لئے اصول اور اصطلاحات تمام مغربی ہیں اور غزلوں کی جگہ قومی گیتوں نے لے لی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حد سے بڑھی ہوئی قومیت کا یہ دور جس میں سے اس وقت ترک گزر رہے ہیں ان کی غزلی اور ادبی خوبیوں کو کھودے گا۔ لیکن وہ غلطی پر ہیں۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ ”قومیت“ کے مبالغہ کا یہ دور جب گزر جائے گا تو انگورہ کی کمائی اپنی تمام لطافتوں کے ساتھ اپنا اظہار چاہے گی۔

ترکی سکول آف آرٹ ایک عمدہ درس گاہ ہے جو پانی پارلیمنٹ کی عمارت میں قائم ہے۔ آرٹ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے حکومت نے بڑی کوششیں کی ہیں اور جو متعدد مناسبتیں یہاں منعقد ہوئی ہیں وہ امید افزا مستقبل کی خبر دیتی ہیں۔

رسم الخط کی تبدیلی۔ اصطلاحات کے سلسلہ میں عربی کے بجائے لاطینی حروف کا رواج ایک اہم تبدیلی ہو۔ گزشتہ دور کے بہت سے لوگ اب بھی اپنی ذاتی خط و کتابت میں عربی رسم الخط کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر دفتری اور کاروباری تحریروں میں جن کے لئے نیا ترکی رسم الخط ضروری ہے ان کا یہ طرز عمل ہے کہ وہ پہلے مسودہ عربی خط میں تیار کر لیتے ہیں

اور پھر عجب بے سلیقگی سے لاطینی خط میں اس کا مبیضہ لکھتے ہیں۔ بہر حال اب معلوم یہ ہوتا ہے کہ لاطینی رسم الخط ترکی زبان کے لئے مستقل طور پر رائج ہو چکا ہے۔

یہ ہے جدید ترکی کا ایک ہلکا سا خاکا! ترکی، جسے مصطفیٰ کمال نے بنایا! لوگ حیران ہوا کرتے تھے کہ انگورہ کا یہ راہب اپنے دور افتادہ مکان کی تنہائیوں میں کیا کیا کرتا ہے! وہ جدید ترکی کا نقشہ اپنے دل میں تیار کر رہا تھا، ایسا نقشہ جس میں قوم کی فلاح و بہبود کا رنگ نہایت شوخ بھرا گیا تھا۔ پھر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا یہ شاہ کا تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور اب وہ اس قابل ہے کہ لوگوں کی نگاہیں اس پر پڑیں تو اُس نے حجاب اٹھا دیا کہ دنیا حیرت انگیز شخص کا حیرت انگیز کارنامہ دیکھ لے!

### منصور احمد

اگر میں اس قدر کم مایہ اور ادنیٰ ہوتا جیسے پستی کے میدان، اور تم میری پیاری، اتنی اعلیٰ اور بلند جیسے آسمان کی سطح، تاہم میرے خیالات، میری محبت کے اعزاز میں، تمہارے ساتھ ساتھ آسمان تک پہنچ جاتے۔

اگر میں اس قدر سربلند ہوتا جیسے آسمان کی رفعت، اور تم میری پیاری، اتنی کم مرتبہ اور ناچیز جیسے سمندر کی سب سے نیچی سطح، — تم کچھ بھی ہوتیں، مگر میری محبت تمہارے ہی لئے ہوتی۔

اگر تم زمین ہوتیں، میری پیاری، اور میں آسمان، میری محبت، آفتاب کی مانند تم پر چمکتی رہتی، اور بے شمار آنکھوں سے تمہارے چہرہ کو دیکھتی، یہاں تک کہ آسمان الٹا ہو جاتا اور دنیا فنا ہو جاتی۔

غرض میں جو کچھ بھی ہوں، عالی مرتبت، یا بے بساط، اور تم جو کچھ بھی ہو، میرا دل ہمیشہ تم سے محبت کرے گا۔

مختصر عابدی

(سلوٹرا)

# غزل

اُس کم آزار کو رسوا، ہمیں کرنا ہی پڑا  
 زندگی اس قدر آساں تھی کہ مرنا ہی پڑا  
 قصدِ ساحل تھا، پر اے ہمتِ دشوار پند  
 آگے دریا ہے تو اب پاؤں اترنا ہی پڑا  
 تھے ہم افتادہ، یونہی سرسبز ہو جاتی  
 اب دباتا ہے زمانہ تو اب بھرنا ہی پڑا  
 گر ہے جینے کے لئے منزلتِ عیسیٰ بھی ضرور  
 ہم کو مرنا ہی پڑا، جاں سے گزنا ہی پڑا  
 جوشِ دریا نہیں خود داریِ ساحل کا حریف  
 آخر ابھری ہوئی موجوں کو اترنا ہی پڑا

حامد علی خاں



# عربی خواتین اور تعلیم

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مستورات کو تعلیم دینا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ سزا پا مضر بھی ہے لیکن سچ پوچھئے تو واقعہ کی اصل حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ عبد الصنیٰ ہیں خواتین و مستورات اعلیٰ پیمانے پر تعلیم پاتی تھیں اور ان کا اخلاق دنیا کے لئے ایک بہترین نمونہ عمل ہوتا تھا۔ آج بھی ترکی، سورہ اور مصر وغیرہ میں جہاں مستورات کی تعلیم کا اہتمام ہے وہاں کی عورتیں اپنے اسلاف کی ہیرقہ اولیٰ کا ایک پیکر محسوس ہیں۔ اس لئے خواتین کے لئے تعلیم کو غیر ضروری سمجھنا درحقیقت ایوان عدل و انصاف کا ایک سنگین جرم ہے۔ عربی خواتین کے تئسی حالات ٹھہئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں تعلیم و تعلم کا اس قدر رواج تھا کہ بیشتر خواتین متعدد علوم و فنون میں علم الثبوت استاد مانی جاتی تھیں۔

ابتداء اسلام میں بعض تعلیم یافتہ خواتین۔ عربی مستورات کی تعلیم کے متعلق جب ایک خاص نوع کے ماتحت غور کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں بھی بعض تعلیم یافتہ عورتیں موجود تھیں۔ علامہ بلاذری مصنف فتح البلدان اپنی تاریخ میں جہاں یہ لکھتے ہیں کہ عہد رسالت میں ۱۷ اشخاص فن کتابت کے جاننے والے تھے وہاں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ابتداء اسلام (۶۲۲ء) میں چار پانچ تعلیم یافتہ خواتین بھی تھیں۔ انہی کی ایک وایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کو کتابت رقی کی صنعت سکھانے کے لئے شفا بنت عبد المذکور کو طلب فرمایا تھا۔ اس لئے کہ شفا، ام المومنین کو پہلے سے فن کتابت سکھا رہی تھیں، اور خود شفا اس فن کو بہت دنوں سے جانتی تھیں۔ ایک وایت میں بھی آیا ہے کہ حضرت ام کلثوم بھی فن کتابت سے واقف تھیں۔ عائشہ بنت سعد بیان کرتی ہیں کہ خود میرے باپ نے مجھ کو پڑھنا بتایا تھا اور کریمہ بنت عذاد کو ان کے اپنے گھنے کا ڈھنگ سکھایا تھا حضرت ام سلمہؓ پڑھ لیتی تھیں لیکن لکھنا نہ جانتی تھیں۔ یہ چھ خواتین ہیں: شفا، حفصہ، ام کلثوم، عائشہ، کریمہ، ام سلمہ جو عرب کے اندر ساتویں صدی کے اوائل میں تعلیم یافتہ گذری ہیں۔

علامہ نووی نے (۱۲۷۸ء) اپنی مشہور تصنیف تہذیب الاسماء میں قاموس تراجم کے ضمن میں شہیرات خواتین کی ایک فصل باندھی ہے۔ ان میں سے بعض خواتین کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے جو احادیث نبوی کی نقل کا واسطہ تھیں اور جنہوں نے عصر اول میں کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو تاریخ اسلام میں ہمیشہ باقی رہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو محترم ہستی لائق ذکر ہے وہ ام المؤمنین حضرت عائشہ کی ذات گرامی ہے حضرت عائشہ ام المؤمنین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیوی تھیں۔ آپ کے غیر معمولی نعم اور ذکا، فطنت اور دانائی پر تمام مومنین اور مایہ ناز کا اتفاق ہے۔ بطور بالائیں یہ گزرجکا ہے کہ آپ پڑھنا جانتی تھیں، لیکن نووی کی روایت میں اتنا اور آیا ہے کہ آپ ہزار حدیثوں کی حافظ تھیں، ام المؤمنین کی قوت اور شہامت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آپ نے اکثر اسی بوجہ پر او را زہ سیاسیت شریعت فرمائی ہے حتیٰ کہ واقعہ جل میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ کے لئے خود بہ نفس نفیس معرکہ کارزار میں تشریف لاتی تھیں حضرت عائشہ کی ہمیشہ حضرت اسماء بھی ایک نامور تعلیم یافتہ اور مشہور خاتون گذری ہیں ثقافت اسلامیہ کی غیر معمولی ترقی میں آپ کا ہاتھ بھی شریک تھا۔ ۵۶ حدیثوں کی آپ راوی ہیں، عبداللہ بن زبیر جب امویوں کے حق میں اعتراف شاہی سے منکر ہو گئے اور اس کی پاداش میں حجاج کی طرف سے ان پر سختیاں ہوئے لگیں، تو اس نازک وقت میں حضرت اسماء نے ہی ان کی پشتیبانی کی، اور آخر وقت تک حسن و صداقت کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔ یہاں تک کہ قتی القلب حجاج نے اس راہ حق کے مجاہد کو موت کے گھاٹ اتار کر دم لیا حضرت اسماء کی بلند نفس اور شجاعت کا اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۳۷ء میں آپ اپنے شوہر کے ساتھ معرکہ یرموک میں تشریف لے گئی تھیں، اور تاریخ کا یہ وہ مشہور واقعہ ہے جس میں عربوں نے رومیوں کو بڑی طرح شکست دے کر یوپیے سورہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ حجاج کے مقابلہ میں راہ حق کے ثبات پر آپ ہی نے اپنے تحت جگر کو ان لفظوں میں غیرت دلائی تھی یا نبی! عیش کو میاں اومت کو میاں۔

حضرت اسماء پوری ایک صدی تک زندہ رہیں اور آخر وقت تک آپ کے تمام عقلی اور جسمانی قواعد درست و صحیح تھے حتیٰ کہ آپ کا ایک دانت بھی نہیں ٹوٹا تھا۔

اس سلسلہ کی تیسری سہری کڑی حضرت ام دہدہ ہیں آپ ایک تعلیم یافتہ اور بڑی پابند شریعت خاتون گذری ہیں۔ آپ مصاحبت علما کی بہت حریص تھیں۔ ساتویں صدی کے وسط تک زندہ رہیں، آپ کے غیر معمولی منفرد ذکا پر سب کا اتفاق ہے۔

مدارس نسواں جن خواتین و سیدات کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے، وہ تو اسی طرح اپنے اپنے گھروں میں رہ کر علوم تحصیل کرتی تھیں جس طرح مرد باہر اس دولت کو کمایا کرتے تھے، لیکن اس کے بعد تاریخ میں ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جس میں مستورات بھی مدرسوں میں جا جا کر علوم حاصل کیا کرتی تھیں، اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانہ کے مدارس میں عورتیں بچوں کے ساتھ ساتھ پڑھتی تھیں، اور ان کے معلم بھی عموماً مرد ہی ہوا کرتے تھے۔ نویں صدی کے وسط میں کوفہ کے اندر ایک نسوانی مدرسہ کا ذکر تاریخ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کوفہ ہی کے مشہور قبیلہ بنی عباس میں بھی ایک مکتب تھا

جس کے تلامذہ کی صف میں نوجوان عورتیں بھی شامل تھیں، ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدارس میں بچوں کے ساتھ نوجوان عورتیں بھی پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ مشہور معلم علامہ خلیل کے مدرسہ میں بچوں کے ساتھ ساتھ بچیاں بھی تعلیم پانی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ولید بن عبد الملک خلیفہ اموی (۷۵۰ء) کا ایک ایسے مدرسہ پر گذر ہوا جس میں طلباء کے ساتھ ایک کینز بھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ کثرت تعلیم کی وجہ سے اس زمانہ میں کینز بھی عموماً تعلیم یافتہ ہوا کرتی تھیں۔ مرحوم علامہ براؤن پروفیسر کیرج یونیورسٹی لکھتے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں (۸۰۹ء) ایک کینز ۱۰ ہزار دینار پیش کی گئی، تو خلیفہ نے اس کی خریداری اس شرط پر منظور فرمائی کہ پہلے علوم و فنون میں اس کا امتحان لیا جائے۔ پروفیسر مرحوم اس امتحان کی کیفیت ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ :-

”مشہور مشہور اساتذہ فقہ و شرع، تفسیر و حدیث، طب حکمت، فلسفہ و منطق، ادب، بلاغت، بشری و نجوم و جوہر کے علم کے دیگر اس کینز کا امتحان لیا۔ اس نے ان کے ہر سوال کا بہترین جواب دیا، اور بعض مواقع پر اس نے جب ان علماء کا تعاقب کیا تو ان کو اپنا چھپا چھڑانا دشوار ہو گیا۔ یہ شہادت درحقیقت ایک بہت ہی قبیح شہادت ہے اس سے یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصور وسطیٰ میں مسلمان کیونکر اہل علم کو حاصل کیا کرتے تھے اور سیدائے خواتین مختلف علوم و فنون میں کتنی دستگاہ کھتی تھیں؟ صاحب غانی نے اس قسم کی ایک سری روایت نقل کی ہے کہ خالد بن عبداللہ بڑی بڑی قیمتوں پر ۳۰ لٹریاں خریدیں اور ان کو قرأت و تجوید، موسیقی اور شاعری کی عمدہ تعلیم دلوائی، حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک کو کمیت شاعر کے تمام قصائد بر زبان یاد تھے۔ اسپین کی ایک کینز نے خواہر بنت منہال کی کہ اس نے اس کو مسلم الثبوت اساتذہ کا منصب عطا فرمایا۔ ان تمام تاریخی واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عصور وسطیٰ میں خواتین و سیدائے تعلیمی میدان میں بہت آگے تھیں، اور ان میں حصول تعلیم کے دونوں طریقے عام طور سے رائج تھے، اگر بعض سیدائے گھروں میں رہ کر تعلیم حاصل کرتی تھیں تو اکثر خواتین مدارس عامہ میں بٹے بٹے اساتذہ فن کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کے شرف سے مشرف ہوتی تھیں،

مدارس میں جنسین کے اس اشتراک اختلاف پر آپ کو متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ عربی عورتیں اپنے شوہروں کی مرافقت میں میدان جنگ کی طرف بھی جاتی تھیں اور حیات عامہ کے بوجھوں کو اٹھانے میں بھی ان کا ساتھ دیتی تھیں، اور شوہروں عامہ کی تندیوں میں بھی ان کے ساتھ مشترک رہتی تھیں۔ غرض یہ کہ وہ مردوں کے ساتھ ہو کر تمام کام کرتی تھیں۔ اور یہ صرف اس لئے تھا کہ ان کی حریت و آزادی عین شریعت کے مطابق تھی، رسم و رواج کی بوجھل زنجیروں سے ان کے قدم گرنا نہ تھے۔

معلمائے عربیات عرب کی بعض خواتین فاضلہ نے درس و تدریس کی خدماتِ جلیلہ بھی انجام دی ہیں علامہ ابن خلکان اور تری

نے بہت سی ایسی خواتین کے نام گنائے ہیں جو محکمے میں شہرہ آفاق تھیں، چنانچہ شہدہ بنت ابی نصر تعلیمی ہمارت میں بہت مشہور ہیں۔ آپ سے بہتیرے مردوں نے علوم کی تحصیل کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۸۲۰ھ میں جب امام شافعی رحمہ اللہ تشریف لے گئے تو نفیسہ بنت ابی محمد کے پاس آئے اور ان کی مرویات کا استماع فرمایا۔ یہ محترم خاتون جہاں علم و فضل میں مشہور تھیں، وہاں تقویٰ و پرہیزگاری میں بھی اپنی نظیر آپ تھیں۔

ابو حیان کتنا ہے، جن اساتذہ سے میں نے علوم کی تحصیل کی ان میں تین عورتیں بھی ہیں (۱) مؤنسہ بنت ملک العادل (صلاح الدین کا بھائی ۹۶۶ھ) (۲) شامیہ بنت حافظ (۳) زینب بنت عبد اللطیف، اس کے علاوہ کاتبہ بنت عبری (جنہوں نے عبد الرحمن فقیہ سے بخاری پڑھی تھی) وغیرہ ملاقاتی معلّمات کی تعداد مزید برآں ہے۔ اشبیلیہ میں مریم بنت ابی یعقوب آداب زبان کی ایک ماہر معلمہ تھیں، موصوفہ محض معلمہ ہی نہ تھیں بلکہ نکتہ سنج شاعرہ بھی تھیں۔ یاقوت کی ایک روایت میں ہے کہ ابن عساکر نے ۳۰۰ معلم اور ۸۰۰ معلّمات سے علوم کی تحصیل کی تھی۔ ابن خلکان لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتیں برابر درس دیتی تھیں اور فاضل طلبہ کو اجازات و شہادات بھی عطا کرتی تھیں۔

اسپین کا مورخ مورخ مفری بیان کرتا ہے کہ اندلس کے عرب اپنی تعلیم یافتہ عورتوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ مفاخرۃ کے باب میں مورخ موصوف نے کسی عربی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کیا تمہارے شہر نے کوئی ایسی خاتون پیدا کی جو ہمارے مشہور شاعرہ مروانیہ کے مانند ہو؟ ہماری وہ مروانیہ جس نے شعر و سخن میں وزیر ابن زیدون سے بحث کی تھی، اور کیا زینب بنت زیاد کی کوئی نظیر تمہارے ملک میں ہے؟ پھر مورخ مذکور ہی آگے چل کر یہ لکھتا ہے کہ اہل اندلس مرد ہو یا عورت، بوڑھے ہوں یا جوان سب کے سب آدابِ لغت میں ماہر اور یکساں ہیں۔

بہر حال ان تمام واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں سچیاں بھی عموماً بچوں کے ساتھ مدارس میں پڑھتی تھیں، اور اکثر لڑکیاں کینزس علوم و فنون میں ماہر اور ثقافت و تہذیب کے انتہائی درجہ پر فائز ہوتی تھیں، اور خواتین فاضلہ، مردوں کو بڑے بڑے موضوعاتِ ادبیہ کی تعلیم دیتی تھیں۔ یہی وہ تاریخی واقعات ہیں جو اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ مستورات بھی ضاعاتِ ادبیہ میں مردوں کی مشارک اور سہم رہ چکی ہیں۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ بلدانِ عرب میں عورتوں کی تعلیم بالکل عام تھی، مگر اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ متقیف عقل اور تحصیلِ علوم میں ایک عورت کے حقیقی میلان اور واقعی رجحان پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے۔

فَاتَحْتِیْہَا وَاِیَّاهُ لَیْ لَا بُصَا رَ لَکُمْ تَقْلُوْنَ ط

بدرِ اصلاحی

## پہیا

روح بیتاب پر افشاں ہر ترے نغموں سے  
کس قیامت کا ہی نغموں میں تے سوز گدگد  
تیر کی طرح سے پیوست ہوئی جاتی ہے  
تیری "پہو" میں وہ پنہاں ہر خروش بیتاب  
اب تکھیل میں ہے دُھندلا سا وہ عزمِ مہم  
ایسی بے نام فضاؤں میں اڑا جاتا ہوا  
دل مئے درد سے لبریز ہوا جاتا ہے  
یہ خلش وجہ سکوں بھی ہی جنوں خیز بھی ہے

حافظہ حشرِ بد اماں ہر ترے نغموں سے  
جسم سے روح ہوئی جاتی ہے محو پروا  
تیری آوازِ رگِ جاں میں جھپی جاتی ہے  
جس نے یکلخت اُلٹ دی رخِ ماضی سونقا  
جس جگہ دفن ہے گزری ہوئی خوشیوں کا جہم  
جس جگہ ہوش، نہ مستی، نہ خرد ہے نہ جنوں  
غم نہ ہونے پہ بھی دل ہے کہ بھرا آتا ہے  
دردِ جانکاہ بھی، تسکینِ غم آمیز بھی ہے

روح بے تاب پر افشاں ہر ترے نغموں سے

حافظہ حشرِ بد اماں ہے ترے نغموں سے

ذوقی

# ترکی اور آزادی نسواں

عورتوں کی سب سے پہلی انجمنیں قسطنطنیہ میں ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں نے قیام کا مقصد مختلف قسم کے حقوق آزادی حاصل کرنا تھا۔ مثلاً بے پردہ پھرنا، گھر میں مردوں کے مقابلے میں مساوی درجہ رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اسی سلسلے میں قسطنطنیہ کی پڑھی لکھی عورتوں میں سے عزیز حیدر عثمان کی مساعی خاص طور پر قابل ستائش ہیں۔ "سینٹ پیٹرز برگ" (۲۲ فروری ۱۹۱۳ء) کی اطلاع کے مطابق قسطنطنیہ میں خالد خانم فاطمہ علی، نگار خانم، طبقہ نسواں کی ممتاز سرکردہ تھیں۔

لیکن اس تحریک کی کامل ترقی جنگ عظیم کے بعد ہوئی۔ جب کہ بہت سی عورتوں نے ترکوں کے دوش بدوش میدان کارزار میں حصہ لیا۔ جب یونانیوں نے سمیرنا پر قبضہ جالیا تو سب سے پہلے ان کے خلاف آواز اٹھانے والی یہی جماعت تھی۔ اس کے بعد عورتیں مختلف محکموں میں کام کرنے لگیں۔ اور یہ چیز ان کو حقوق آزادی کے حصول میں بڑی حد تک مدد ہوئی۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے آزادی کی یہ تحریک جنگ عظیم کے بعد پورے جوش سے نمودار ہوئی۔ عورتوں نے جہاں ایک طرف اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی جدوجہد کی وہاں اپنے ملک میں جمہوریت پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ اور آج ترکی کی آزادی انہی کی پُر زور اور خالص مساعی کی شرمندہ احسان ہے۔

حکومت انگلورہ نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مشترکہ ابتدائی مدارس کھول کر ملک پر بہت بڑا احسان کیا۔ ۱۹۲۲ء میں تقریباً بارہ زمانہ انجمنیں تھیں جن کا کام طبقہ نسواں کی سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کرنا تھا۔ آج ترکی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کا سہرا انہی جماعتوں کے سر ہے۔

عورتوں نے حقوق آزادی کے لئے منظم کوششیں ۱۹۲۳ء کے اوائل میں شروع کی۔ "وقت" کی اس مہم کی اشاعت میں ایک نئی زمانہ انجمن کے قیام کا اعلان ہوا۔ اس انجمن کا نام "مدافع حقوق نسواں" تھا جس کی بانی محی الدین خانم تھی جو موصل کے حاکم مرافعہ کی بیٹی تھی، لیکن اس انجمن کا کام کچھ زیادہ فروغ حاصل نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ حکومت نے ان کی مدد کے لئے ہاتھ بڑھایا، غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے برسرِ اقتدار ہوتے ہی سب سے

پہلا کام جو کیا وہ آزادی نسواں تھا، ابتداء ۱۹۲۵ء میں مردوں کو انگریزی ٹوپی پہننے اور عورتوں کو بے پردہ پھرنے کی اجازت مل گئی، ۱۹۲۶ء کو انگورہ کی مجلس جمہوریہ کے متفقہ فیصلے پر ملک میں عورتوں کی جداگانہ اور مستقل حیثیت قائم ہو گئی۔

’ سب سے پہلے مسئلہ طلاق و نکاح کی اصلاح ہوئی۔ اور یہ قرار پایا کہ فریقین میں سے کسی کو طلاق کا حق حاصل نہیں جب تک کہ قانون اجازت نہ دیتا ہو اور ساتھ شرعی نکاح سے پہلے سول نکاح (قانونی طور پر) کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس اصلاحی قانون پر سب سے پہلے ۱۹۲۶ء میں عمل شروع ہوا۔ ٹرکی میں نابالغوں کا نکاح ولی کی وساطت سے ہوتا تھا۔ اس کے لئے بالغ لڑکوں کی عمر ۸ سال اور لڑکیوں کی عمر ۱۵ سال مقرر ہوئی۔ لیکن ”کادین ریسکی“ یعنی انجمن نسواں نے اس کو بھی ناکافی سمجھا اور مختلف امور کی غور و پرداخت کے لئے قسطنطنیہ کانگریس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۷ء تاریخ جلسہ مقرر ہوئی لیکن کورم کے پورا نہ ہونے پر جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ تاہم مفصلہ ذیل مباحث پر ابتدائی کارروائی عمل میں آئی :-

(۱) مجلس بین الاقوام کے نقطہ نظر سے عورتوں کی حالت۔

(۲) مردوں اور عورتوں کی تنخواہ میں مساوات۔

(۳) محکمہ پولیس میں عورتوں کا داخلہ۔

(۴) آزادی کا موجودہ مفہوم۔

(۵) منکوحہ عورتوں کی قومیت

(۶) بے وسیلہ عورتیں اور حکومت کا فرض۔

(۷) کنواری ماٹیں اور اولاد حرام

(۸) بچپنی کا اسناد

یہ تمام تجاویز زناہ مجلس بین الاقوامی کے روبرو پیش ہونے کے لئے تھیں۔

چند روز بعد کانگریس نے اپنا کام محی الدین خانم کی صدارت میں شروع کیا۔ انجمن کے اغراض و مقاصد کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ہم یہاں اس لئے نہیں جمع ہوئے کہ مردوں سے مسترحانہ انداز میں اپنا استحقاق ظاہر کر کے ان سے حقوق کے تحفظ کی درخواست کریں بلکہ ہمارا منشا مستقل اور کُلّی حقوق مساوات کے حاصل کرنے کا ہے۔ اس پرز کی شاعر امین علی بے نے جو اس کانگریس کا حامی تھا سوال کیا کہ یہ مجلس اتنے اہم اور ٹیڑھے کام کی تمام

لازمی مشکلات کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہے؛ صدر جلسہ نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ مجلس جمہوریت کے اصولوں پر قائم ہوئی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد میں ان تمام اہم اور مشکل امور سے عمدہ براہنہا شامل تھیں۔ تین سال کی لگاتار کوشش کے بعد یہ قرار پایا کہ ہر ایک شخص کو کونسل میں جانے کا حق حاصل ہے تو اس مجلس نے مفصل ذیل کمیشن مقرر کئے۔

(۱) تعلیم نسواں

(۲) پریس

(۳) صحت عامہ

(۴) زنانہ مجلس بین الاقوام کے ساتھ تعلق

جلسے کے برخاست ہونے سے پہلے صدر نے عورتوں کے کونسلوں اور میونسپل کمیٹیوں میں امیدوار کھڑے ہونے پر بے حد زور دیا۔ اس تجویز کو ابتداءً قسطنطنیہ کے گورنر نے نامنظور کیا اور یہ عذر پیش کیا کہ عورتیں محض بچے پیدا کرنے کے لئے ہیں ان کے لئے سیاسی امور میں حصہ لینا جسمانی طور پر ناممکن ہے۔ اس پر نامی خانم ایک خاتون نے نہایت شدید جواب دیا جس پر حکومت کو اسے سزا دینی پڑی۔ لیکن ساتھ ہی حکومت نے عورتوں کے ایک کلب کو جو زنانہ یونین کے ماتحت تھا تسلیم کر لیا۔ اس کلب کا کام عورتوں کی عام معاشرتی اصلاح کرنا تھا۔ اسی یونین نے لڑکیوں کے لئے فرانسیسی زبان کے درس و تدریس کا انتظام کیا اور ان کے لئے جدید سادہ لباس تجویز کیا۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود سیاسی حقوق کے لئے جدوجہد جاری رہی اور اخبارات و رسائل اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں اس پر خوب بحثیں ہوئیں، مجلس مشاورت کے صدر کاظم پاشا نے لکھا کہ عورتیں ابھی اس قابل نہیں ہوئیں کہ وہ ممبر انتخاب کی جائیں۔ فی الحال انہیں ووٹ کا حق حاصل کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ ”جب بے“ نے جو ان کا بہت مداح تھا یہ کہہ دیا کہ ابھی اس کام کے کرنے کا وقت نہیں آیا۔ اسی طرح جمہوریت کے ڈاکٹر نے جب ترکی عورتوں کی جنگی کارگزاریوں کی بے حد تعریف کی تو محی الدین خانم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ حقوق ووٹ اور فوجی خدمات کو ضبط کہہ دینا غلطی ہے، بوڑھے آدمی جو میدان جنگ میں نہیں جاسکتے ووٹ کیوں دیتے ہیں؟

ان تمام مخالفتوں کے باوجود یہ جدوجہد جاری رہی یہاں تک کہ نظام حکومت میں اوجھی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔



پبلک میں عورتوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ محی الدین خانم نے اخبارات میں یہ اعلان شائع کیا۔  
 ”آج تک ہماری کوششوں کا نتیجہ صرف اتنا ہوا ہے کہ ہم نے پبلک کے صحیح خیالات کا اندازہ کر لیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لوگ ہمارے ہمدرد ہیں۔ اب ہم آئندہ کونسل میں امیدوار بھیجیں یا نہ بھیجیں ایک سی بات ہے۔ اس وقت تک تین سو مرد ہماری حمایت پر تلتے ہوئے ہیں۔ محمود صادق بے ہمارے ساتھ ہیں۔“

اسی قسم کا ایک اور اعلان بھی شائع ہوا جس میں عورتوں نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت جوش آمیز لہجہ میں کیا۔  
 ”ہم اپنے حقوق انتخاب کے لئے جدوجہد کو نہیں چھوڑ سکتے اور اس کے لئے آخری دم تک جان توڑ کوشش کریں گے اور اگر حصول مقصد کے لئے ہماری زندگی بہت مختصر ہوئی تو ہماری آئندہ نسل اس کام کو سر انجام دے گی۔“  
 کچھ عرصے کے بعد یونین میں اختلاف رلتے ہوئے اوپر ہلنا نظام درہم برہم ہو گیا۔ محی الدین خانم کی جگہ سعدی خانم متفقہ طور پر صدر مقرر ہوئیں۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور بالآخر لطفی خانم نے ان کی جگہ لے لی۔ اس تبدیلی نظام سے یونین میں بھی انقلاب آگیا۔ ممبروں کی تعداد ڈیڑھ سو سے ساڑھے تین سو تک پہنچ گئی، اور مجلس کی کارگزاریوں میں ایک نازہ روح آگئی۔ اور اس کے مقاصد پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئے۔ بہت سی انجمنیں قائم ہو گئیں جن کی اغراض اگرچہ جداگانہ تھیں لیکن وہ سب کی سب مرکزی مجلس کی زبردست حامی تھیں اور انہیں اس کے مقاصد سے کئی اتفاق تھا۔ عورتوں کی تعلیم، طرز معاشرت، لباس غرض ہر چیز پر غور ہونے لگا اور سب سے زیادہ سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے آواز بلند کی گئی۔ بالآخر حکومت کو ان مختلف جماعتوں کے وجوہ تسلیم کرنا پڑا۔ چنانچہ نئی مجلس مرکزی نے جب صدر جمہوریت غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو ایڈریس لکھ کر بھیجا تو مجلس کی صدر لطیفہ خانم اور ناظم مجلس عفت حلیم خانم کو مفصلہ ذیل جواب ملا:-  
 ”مجھے صدر جمہوریت کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ میں ان خیالات و جذبات کے جواب میں جو آپ نے ان کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں ظاہر کئے آپ کی مجلس کا شکریہ ادا کروں۔“

توفیق

ناظم اعلیٰ صدر جمہوریت سفیر اسکو

نر کی عورتوں کی موجودہ تمدنی حالت گذشتہ چند سالوں میں ترکی عورتوں نے جس چیز میں تہا  
 عظیم الشان ترقی کی ہے۔ وہ ان کی تمدنی حالت ہے۔ متعدد عورتیں ملک کے نظام حکومت میں ممتاز عہدوں کے حصول میں کامیاب ہو گئی ہیں اور اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ دوسرے علمی محکموں میں جواب تک مردوں کے

لئے مخصوص تھے۔ انہیں بہت سی اسامیاں مل چکی ہیں۔ صرف گزشتہ دو سالوں کو لے لیجئے۔ اس قسم کے صدقات بطور شہادت پیش کئے جاسکتے ہیں جن میں عورتوں کے شاہراہ ترقی پر نہایت سرعت کے ساتھ کام رہا ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۷ء میں قسطنطنیہ کے سول چیمبر میں رجسٹر کار کا عمدہ نزہت جلیل خانم کو ملا جس نے قانونی سند حاصل کی تھی، چھ نوجوان لڑکیوں نے طب میں اعلیٰ درجات حاصل کیں، اور بحری ہسپتال میں ماہر دندان کے عہدے پر ایک عورت فائز ہوئی۔ پانچ نوجوان لڑکیوں نے سائنس میں علم کیمیا کی ڈگری لی۔ اسی سال انگورہ کی طبی کانگریس میں عورتوں کو وہی حقوق ملے جو مردوں کو حاصل تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں فخر النساء کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسی سال تقریباً پندرہ عورتوں کی شرکت سے ایک پریس جاری ہوئی عورتوں کی طرف سے صنعت و حرفت کے میدان میں یہ پہلی پیشقدمی تھی۔ اس شرکت کی سرکردہ جلال، سلمیٰ درویش اور ذکر یا خانم تھیں۔

ہالینڈ والوں نے ترکی کے مال تجارت کو اپنے علاقے میں لانا ممنوع قرار دیا تھا، کاظم بے خانم نے پیہم کوششوں کے بعد اس چیز کی اجازت حاصل کر لی اور سمرنا سے بعض میوہ جات مثلاً کشمش وغیرہ ہالینڈ بھیجے گئے۔ اس کامیابی پر ہالینڈ کے ایک اخبار نے اس عورت کی مساعی جہیلہ کی بے حد تعریف کی۔

۱۹۲۷ء ہی میں قسطنطنیہ کی یونیورسٹی سے دو عورتوں نے فلسفے کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ انگورہ میں بہت سی نوجوان لڑکیاں سول انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئیں۔ اس جگہ صبیحہ خانم کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے اٹلی میں جا کر معلمی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اخبار ”اقدام“ نے ترکی عورتوں کی علمی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس عورت کی خاص طور پر تعریف کی تھی۔

غرض ترکی عورتوں نے ہر شعبے میں نمایاں ترقی کی ہے مختلف محکموں کی ملازمتوں، اور سیاسی مجلسوں کے علاوہ وہ رفاہ عام کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتی ہیں۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر فواد بے نے انگورہ میں کس بچوں کی اموات کو روکنے کے لئے ایک کمیٹی یورپ اور امریکہ کے متبع میں بنانی چاہی۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے کہا کہ ترکی میں اس وقت کوئی کام بھی مشکل نہیں۔ چنانچہ ایندھ خانم کے ماتحت فی الفور ایک مجلس قائم ہو گئی۔ اور اس نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔

میں یہاں اختصار کی غرض سے صرف ان عورتوں کے نام لکھ دینے پر اکتفا کروں گا جنہوں نے نئی قابلیت سے ملک میں نام پیدا کیا۔

صفیہ خانم نمائندہ ترکی طبی کانگریس بولون -  
 بدیعہ خانم وکیل عدالت عالیہ قسطنطنیہ  
 ثریا خانم " " "  
 نیکو ار خانم " " "  
 شگوفہ خانم ایل ایل ڈی -

پیشتر اس کے کہ اس مضمون کو ختم کیا جائے اس امر کی طرف اشارہ کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ترکی میں پردہ کی رسم اٹھتی جا رہی ہے۔ اور یہ آزادی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ گزشتہ سال یعنی ۱۹۲۹ء میں "مقابلہ حسن" کا اہتمام بڑے زور شور سے کیا گیا۔ زیادہ قابلِ تعجب یہ امر ہے کہ اس مقابلہ میں شریک ہونے والی عورتیں اکثر مسلمان تھیں۔ اس مقلبے سے نہ صرف چہرے کی زیبائش و نمائش مقصود تھی بلکہ تمام جسم کے مختلف اعضا کے تناسب اور ان کے اندازِ غرض حسن کی مجموعی دلغریبوں کا مقابلہ تھا۔ بہترین حسینہ کا انتخاب ایک مجلس کے سپرد تھا لیکن پیشتر اس کے کہ مجلس قائم ہو اس بات پر سخت بحث ہوئی کہ مجلس کے ممبر کون ہوں بڑی رد و کد کے بعد یہ قرار پایا کہ عورتیں اور مرد دونوں اس مجلس میں شریک ہوں۔

اس مقابلہ حسن کے علاوہ اور بہت سے موافقہ پر ترکی عورتوں نے پبلک کے سامنے جسمانی کربت، کھیل اور رقص کا مظاہرہ کیا۔ الحاصل اس وقت ترکی عورتیں ممالکِ یورپ کی عورتوں سے آزادی میں کسی لحاظ سے پیچھے نہیں۔

ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان عورتوں میں جہاں اعلیٰ تعلیم کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے وہاں محض مغرب پرستی کے باعث ان کے ایک طبقے میں بعض ایسی چیزیں بھی آگئی ہیں جو مشرقی تمدن اور اسلامی روایات کے خلاف ہیں۔ یہ افراط و تفریط ہر بالغ نظر کے دل میں ان کے مستقبل کے متعلق اندیشہ پیدا کر رہا ہے۔

صوفی غلام مصطفیٰ بٹسم

(ماخوذ)

## خلدِ نشاط

ثنائے خلدِ نشاط و سرور کیا کیجے  
 کسی کے حسن کے جلوے جو ہوں نگاہوں میں  
 کسی کی مست نگاہوں کی مے میسر ہو  
 کسی کے دامن الفت کی ہو پناہ اگر  
 کسی کی بزم میں کوئی مکان کے جلوے ہو  
 جو عیش و عشرتِ امروز تک رسائی ہو  
 کسی کی چشمِ سخن گو ہو جب تکلم ریز  
 کسی کی شوخ ادائیں جو ہوں جنوں انگیز  
 بجومِ شوق نے بے درتِ پاک کیا ہے ہمیں  
 ہمیں بھی دعویٰ تمکین و ہوش تھا لیکن  
 بیانِ عشرتِ محمود پور کیا کیجے  
 تو دل کو وقفِ تننائے حور کیا کیجے  
 تو آرزوئے شرابِ طہور کیا کیجے  
 تو خوفِ سختیِ روزِ نشور کیا کیجے  
 تو شوقِ جلوۂ بالائے طور کیا کیجے  
 تو دل کو واقفِ امیدِ دور کیا کیجے  
 تو اپنے شعروِ سخن پر غرور کیا کیجے  
 تو نازِ ہوش و حواسِ شعور کیا کیجے  
 ہے عضوِ عضو مگر نا صبور کیا کیجے  
 نہیں ہوتا کسی کے حضور کیا کیجے

غرض کہ موردِ الطافِ بے حساب ہیں  
 خوشا نصیبِ محبت میں کامیاب ہیں

اکبر  
 سروری

# لفظ شریف زادہ کا صحیح مفہوم

زمانہ حال کے نظام معاشرت میں دو بڑی غلطیاں جنہوں نے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کے دلوں پر اپنی جگہ نہایت زہر ملا اثر پیدا کیا ہے، عظیم فساد اور عظیم تر بدبختی کا سرچشمہ ثابت ہوئی ہیں۔ یہ غلطیاں اُس طریق تعبیر کی وجہ سے ہیں جو ہم لفظ ”شریف زادہ“ کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اپنے اوّلیٰ لغوی اور مدّامی مفہوم میں اس کے معنی ”صحیح النسب آدمی“ کے ہیں۔ یعنی اچھی نسل کا اُسی مفہوم میں جس میں کوئی گھوڑا یا کتا اچھی نسل کا ہوتا ہے۔

وہ طبقے جن کو ہم اعلیٰ طبقوں کا نام دیتے ہیں چونکہ بالعموم ادنیٰ طبقوں سے زیادہ صحیح النسب ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے دل میں اصلی خیال اور اس کے اذعانات متعلقہ کو قائم رکھا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اس کے اظہار سے ڈرتے بھی ہیں اور اس کے متعلق عوام الناس میں منافقانہ غلط گوئی سے کام لیتے ہیں۔ اس منافقانہ غلط گوئی کی علت غائی بڑی حد تک ان کی یہ خواہش ہے کہ وہ اس لفظ کو ایک اور مفہوم اور غلط مفہوم پہنا نا چاہتے ہیں۔ وہ مفہوم یہ ہے: ایک ایسا آدمی جو بے کاری کے عالم میں دوسروں کی محنت پر بسر اوقات کرے، حالانکہ اصل لفظ کو اس خیال سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں۔

ادنیٰ طبقے اس خیال کی کہ شریف زادے سے مراد ایک سست اور کابل آدمی ہے نہایت شدت کے ساتھ اور بالکل بجا طور پر زبرد کر رہے ہیں۔ وہ بالکل صحیح طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر زیادہ کوئی شخص کام کرتا ہے اُسی قدر زیادہ شریف وہ بن جاتا ہے اور بنتا جائے گا لیکن اس حقیقت سے جو فائدہ انہیں حاصل ہو سکتا تھا اس کو انہوں نے ضائع کر دیا ہے کیونکہ وہ اس سچائی کے ساتھ ایک جھوٹ بھی ملانا چاہتے ہیں یعنی یہ کہ نسل و خاندان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ حالانکہ انسان کے لئے بھی اس کی بالکل اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی اور حیوان کے لئے۔

قوم اُس وقت تک حقیقی معنوں میں خوشحال نہیں ہو سکتی جب تک یہ دونوں مغالطے حتیٰ طور پر پلیسٹ نہ کر دیے جائیں۔ شرف کو ابھی یہ سیکھنا ہے کہ کسی صورت میں بھی اُن کا یہ فرض نہیں ہے نہ اُن کو یہ حق

پہنچتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی مشقت پر زندگی بسر کریں۔ انہیں ابھی یہ سیکھنا ہے کہ سخت ترین مزدوری یا حقیر ترین خدمت گاری میں اگر وہ دیانت دار نہ ہو، کوئی ذلت نہیں ہے لیکن ذلت ہے اور نہایت شدید ذلت ہے اسراف میں، رشوت ستانی میں، ہستی اور کالہی میں، نخوت و تجتر میں، ایسی جگہیں سنبھالنے میں جن کے وہ اہل نہیں ہیں۔ یا ایسی جگہیں نکالنے میں جن کی درحقیقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی شریف زادہ اگر ایک خانگی ملازم یا محنت کش مزدور بن جائے تو اس سے اُس کی تذلیل نہیں ہوتی۔ لیکن ایک بد معاش اور چور بننے سے یقیناً اس کی تذلیل ہوتی ہے۔ بد معاشی کچھ کم بد معاشی نہیں ہوتی اگر اس کا پھیلاؤ بہت بڑی بڑی بانوں کو اپنے اندر سمیٹتا ہو۔ نہ چوری کچھ کم چوری ہے اگر رولج اس کی حمایت کرتا ہو۔ یا اپنے ذمے لئے ہوئے فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہنا اس کے ساتھ شامل ہو۔ کسی شخص کی جیب کترنا ڈاکے کی ایک بے انتہا کم مجرمانہ شکل ہے بمقابلہ اس کے کہ تم اس کی رضامندی سے اس کی جیب پر اس مفاہمت کے ساتھ قبضہ کرو کہ تم اس کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ دریا کے پار لے جاؤ گے حالانکہ تمہیں دریا میں مختلف مقامات کی گہرائیوں کا کوئی اندازہ نہیں۔ دوسری طرف ادنیٰ جماعتوں بلکہ تمام جماعتوں کو یہ سیکھنا ہے کہ ہر بری عادت اور ہر مریض نسبتاً متواتر ہوتا ہے۔ اور نسب کی پاکیزگی سے انسانی جسم اور روح کا پورا نظام بتدریج بلند نسب کی ذناعت سے ذلیل و پست ہو سکتا ہے۔ تا آنکہ ایک اونچی ذات والے اور نیچ ذات انسان کے درمیان اتنا ہی فرق حائل ہو سکتا ہے (خواہ ان کی تعلیم پر کتنی ہی زبردست محنت کی جائے) جتنا ایک اعلیٰ درجہ کے تازی اور ایک بد نسل دوغلے گتے میں ہوتا ہے۔ اور اس عظیم صداقت کا علم ہمارے نوجوانوں کی تعلیم اور قوم کے تمام اعمال کا رہنما ہونا چاہئے۔

حمید احمد خاں

(ماخوذ از رسکن)



# بچھڑا ہوا حل مانس

آؤ پیاسے بچو! اب جائیں، نیچے ہی نیچے، سمندر کی گہرائیوں میں۔۔۔ اب میرے بھائی مجھے کھاڑی میں سے بلا رہے ہیں، طوفانی ہوائیں ساحل کے رخ چل رہی ہیں، موجوں کا تلاطم لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے اور نمکین طوفان سمندر کی طرف واپس آ رہا ہے۔ جوشی نیند ریائی گھوٹے طرارے بھر رہے ہیں، وہ پانی میں اچھلتے ہیں اور جھپٹنے اڑاتے ہیں۔

پیاسے بچو! آؤ اب ہم جائیں۔ لیکن جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اُسے آواز دو۔ انسانی آواز میں جسے وہ سمجھ سکے۔۔۔ مارگرٹ! مارگرٹ! ایک آواز ہے دو۔ بچوں کی آوازیں ماں کے دل پر ضرور اثر کرتی ہیں، بالخصوص جب وہ درد و کرب سے بھری ہوئی ہوں۔ اگرچہ میرے لئے اُس کے دل میں محبت اور رحم کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہا لیکن یقیناً ابھی وہ اپنے بچوں کو نہ بھول سکی ہوگی۔ وہ ضرور مہماری آواز سن کر آئے گی۔ ایک مرتبہ اُسے پھر آواز دے لو۔ اور پھر آؤ اپنے جائیں نیچے، بہت دور، سمندر کی گہرائیوں میں۔۔۔ پیاری اماں ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔۔۔ دریائی گھوڑوں کی کھیل کود سے سمندر میں کف پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ مارگرٹ! مارگرٹ!

آؤ پیاسے بچو! چلو نیچے چلیں، اب آوازیں نہ دو، لیکن جانے سے پہلے ایک آخری نگاہ سفید دیواروں والے شہر پر ڈال لو، اور اس جھپٹے گرجا کو ایک نظر دیکھ لو جو سمندر کے طوفان خیز کنارے پر واقع ہے۔ اس کے بعد چلو نیچے چلیں سمندر کی گہرائیوں میں جہاں ہمارا گھر ہے۔ خواہ تم تمام دن آوازیں دیتے رہو وہ اب نہیں آئے گی۔

پیاسے بچو! کیا یہ کل کی بات ہے؟ جب کھاڑی کے اوپر سے گرجا کی گھنٹیوں کی نرم دھیمی اور شیریں آواز لہروں کے شور میں مل کر رہا ہے غاروں میں پہنچی تھی، جہاں ہم لیٹے ہوئے تھے، جہاں اور لہروں کے اوپر دور سے نفرتی گھنٹیوں کی آواز گہرے ٹھنڈے اور ریت سے بھرے ہوئے غاروں میں، جہاں ہوا بالکل خاموش ہوتی ہے، جہاں روشنی بہت کم پہنچتی ہے، جہاں نمکین گھاس پانی کی رُو میں ادھر ادھر لہتا ہے۔ جہاں دریائی جانور جمع ہو کر کچر میں اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں، جہاں دریائی سانپ کڈلی مار کر بیٹھے ہیں اور سمندر کے گرم پانی میں نہاتے ہیں، جہاں بڑی بڑی ویل مچھلیاں تیرتی ہوئی گذرتی ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ تیرتی جاتی ہیں۔ پیاسے بچو! وہاں لگانے کی آواز کب آئی تھی؟ کیا یہ کل کی بات ہے؟ پیاسے بچو! کیا یہ کل ہی بات ہے؟ جب

وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھی؟ ————— وہ ہم سب کے درمیان ایک سمندرے تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سب سے چھوٹا بچہ اس کے گھٹنوں پر بیٹھا تھا، وہ اس کے چمکیے بالوں کو آراستہ کر رہی تھی، جب دورے گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے آہ بھری اور شفاف سبز سمندر میں سے اوپر کود دیکھا۔ ————— اُس نے کہا ”مجھے جانا چاہیے، مجھے ضرور جانا چاہیے، کیونکہ میرے متعلقین چھوٹے سفید گرجا میں جو سمندر کے کنارے واقع ہے دعائیں مشغول ہیں۔ دنیا میں آج ایٹر کا متبرک دن ہو گا اور اسے جل مانس آہ میری روح یہاں تیرے ساتھ رہ کر روزِ روستی میں جا رہی ہے اور میں اپنے بلند خیال بھول چکی ہوں“ میں نے کہا ”اچھی مار گرتا تم جاؤ، لہروں میں سے ہو کر، اور اپنی نماز ادا کر کے پھر ان آرام دہ بحری غاروں میں واپس آ جاؤ“ وہ ہنسی، اور پانی اور جھاگ میں سے ہوتی ہوئی کھاڑی میں پہنچی۔

پیائے بچو! کیا یہ کل کی بات ہے؟ ————— سمندر میں طوفان آنے لگا اور ننھے بچوں نے اُسے پکار پکار کر رونا شروع کیا میں نے کہا، ”دنیا میں لوگ بہت ہی لمبی نمازیں پڑھتے ہیں“ ————— ہم پانی اور جھاگ میں سے ہوتے ہوئے کھاڑی میں پہنچ گئے۔ پھر ہم سمندر کے ریت کے کنارے پر پہنچے، اور اس وادی میں سے ہو کر، جہاں خوشبودار پھول کھلتے ہیں، سفید دیواروں والے شہر میں پہنچے، اور تنگ پختہ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے جہاں کل خاموشی چھائی ہوئی تھی، ہم اس چھوٹے گرجا کے پاس پہنچے۔ چوپھاڑی پر واقع ہے۔ گرجا میں سے نماز کی آواز آرہی تھی، لیکن ہم باہر کی ٹھنڈی ہوا میں کھڑے ہے۔ پھر ہم قبروں کے اوپر چڑھ گئے، جن کے پتھر بارشوں سے خراب ہو گئے تھے، اور ہم نے کھڑکیوں میں سے گرجا کے مختلف حصوں میں جھانکا۔ وہ سنون کے پاس بیٹھی ہوئی تھی ہم نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا۔ میں نے زور سے اُسے پکارا ”مار گرتا! ادھر دیکھو، ہم یہاں آ گئے ہیں“، لیکن اُس نے میری طرف کچھ التفات نہ کیا۔ میں نے پھر کہا ”مار گرتا! مار گرتا! سن ہم بہت دیر سے تنہا ہیں، سمندر میں طوفان آ رہا ہے اور ننھے رورہے ہیں“ اُس نے مجھ پر نگاہ تک نہ ڈالی، کیونکہ اُس کی نظریں مقدس کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ پادری زور زور سے دعا مانگ رہا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

آؤ پیائے بچو! آؤ اب چلیں اب آوازیں نہ دو، اب اسے بلانا بے سود ہے۔ اس نے اپنے دل سے محبت تمام لطیف جذبات نکال دیے ہیں۔ ————— چلو آؤ نیچے، اب لے نہ بلاؤ۔ آؤ اب سمندر کی گہرائیوں میں واپس چلے جائیں۔ وہ شور انگیز اور روشن شہر میں چڑھتا رہی ہوگی، اور نہایت مسرت سے گارہی ہوگی۔ شاید وہ پادری کی باتوں، شہر کی رونق، اور خوشگوار چمکیلی دھوپ کی تعریف کے گیت گاتی ہوگی۔ ————— اپنے چرنے کی گھنٹیوں کی



دلکش آواز اور سورج کی دلفریب روشنی کو دیکھ کر اس کا دل مسرت سے محو ہو جاتا ہوگا، اور وہ گاتی ہوگی۔ اسی بے خودی میں اس کے ہاتھ سے چرنے کا ہتھ چھوٹ جاتا ہوگا اور وہ کھڑکی میں کھڑے ہو کر سمندر کے ریتیلے ساحل پر نگاہیں ڈالتی ہوگی، اور پھر اس سے آگے سمندر پر۔ اور پھر ایک سرد آہ بھرتی ہوگی۔ — شاید آسنو کا ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے کھڑکی کی دلیز پر گر کر مٹ جاتا ہوگا، پھر وہ بہت سی آہیں بھرتی ہوگی۔ اور شاید اُس وقت اسے یہ آرزو ستانی ہوگی کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کو دیکھے جس کی آنکھیں خوبصورت اور بال چمکدار سنہرے ہیں۔ — میرے بچو! آؤ ہم جلد سمندر کی گہرائیوں میں واپس چلے جائیں۔ بہت رات ہو چکی۔ ہوائیں چل رہی ہیں، اور شہر کے اندر لپ جل چکے ہیں۔ آدھی رات کے وقت، جب تیز و تند ہوائیں اس کے دروازے پر جا کر شور مچائیں گی تو سمندر کی لہروں کے شور اور ہوا کی آوازوں سے اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ اس وقت ہم بھی جاگ اٹھیں گے۔ ہمارے سر پر سمندر کی تیز لہریں شور مچاتی ہوئیں گی۔ اور ہم اپنی نیلے رنگ کی شفاف چھت کے نیچے، جو اس کے فرش پر لیٹے ہوئے گائیں گے۔

”یہاں ایک انسانی ہستی آئی تھی، مگر وہ بے وفا تھی، اور اب سمندر کے بادشاہ

ہمیشہ تنہا رہیں گے۔“

پیارے بچو! ہم پھر آدھی رات کو خشکی پر جانیں گے۔ جب اندھیاں بند ہو چکی ہوں گی۔ اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہو گی چاند آسمان پر سے سمندر کی سطح پر نور کے پھول برسا رہا ہوگا، اور خشکی پر وہ پھول کھلے ہوں گے جو گھاس میں خفے تاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ ان کی خوشبو سے ہوا معطر ہو رہی ہوگی۔ — ہم جلد جلد کنائے پر جانیں گے جہاں پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ ان پتھروں اور بھاٹیوں پر سے گزرتے ہوئے جن کو سمندر کی لہریں اسی وقت جھگوڑا پس گئی ہوتی ہیں، ریت کے بڑے بڑے ڈھیروں پر کھڑے ہو کر ہم چاندنی میں دھلے ہوئے شہر پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔ تمام شہر پر خاموشی چھا رہی ہوگی اور پہاڑی پر جو گر جا ہے وہ بھی ہمیں صاف نظر آ رہا ہوگا۔

ہلکی ہلکی ہواؤں میں مل کر ہمارا ہر ذرہ آہیں جب باگڑ کے کانوں تک پہنچیں گی تو وہ بے تاب ہو جائے گی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ ابل پڑے گا۔ اگرچہ اسے اس بات کا علم نہ ہوگا کہ وہ کیوں رو رہی ہے، لیکن اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جائے گا۔

اس وقت ہم سمندر کی گہرائیوں میں ریگاتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔

”اس شہر میں ایک محبوب ہستی رہتی ہے مگر وہ ظالم ہے اُس نے سمندر کے بادشاہوں

کو ہمیشہ تنہا رہنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔“

(ماخوذ از انگریزی)

# تخلیات

میں بھی سرودخانہ ہستی میں سا ز تھا      جس کا ہر ایک نغمہ بہت دل گداز تھا  
 پندار نے "وجود" و "عدم" کو سمجھ لیا      سوچا تو یہ بھی راز تھا اور وہ بھی راز تھا  
 سرمستیاں عجیب تھیں عہدِ شباب کی      عالم تمام مے مکدہ حن و ناز تھا  
 ہر حال میں دماغ مرا عرش پر رہا      لوح ازل پہ نام مرا سرفراز تھا  
 اے حُسنِ اکیا اُسی سے تغافل شعار یا!      ہر سانس جس کا تیرا فسانہ طرز تھا  
 جب تک جنونِ عشق سے نا آشنا رہا      میں مبتلائے فنِ کَرِ نشیب و فراز تھا  
 جب تک نہ رازِ عالمِ مستی سمجھ سکا      میں بھی اسیرِ سلسلہٴ حرص و آرز تھا

اہلِ کرم کو اُس سے شکایت ہی مدم

صہبائی ایک مست تھا اور بے نیاز تھا  
 اثرِ صہبائی

# خواہشات کا مصرف

انسانی روح کو اپنی تکمیل تک پہنچنے کے لئے تین جداگانہ حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے اول حالت حیوانی جس میں انسان اپنی حواس کی خواہشات کو پورا کر کے مطمئن رہتا ہے اور علم گناہ سے اور اس حقیقت سے کہ اس کا مبداء خود خدا ہے بے بہرہ ہوتا ہے۔ اس حالت میں انسان اپنی پاکیزہ اور بلند روحانی ممکنات کو نہیں دیکھ سکتا دوم حالت دوگونگی جس میں انسانی دماغ روحانی اور حیوانی میلانات سے باخبر تو ہوتا ہے لیکن وہ ایک لائحہ عمل اختیار کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں کی اہمیت کو سمجھتا ہے لیکن شش و پنج میں مبتلا رہتا ہے۔ ترقی روح کی اس حالت میں خواہشات عمل پیرا ہوتی ہیں۔ اس حالت میں انسان ایک لامتناہی اندرونی سلسلہ جنگ میں مشغول رہتا ہے وہ کبھی بندی و رقت پر پہنچ جاتا ہے اور کبھی فخر گناہ میں گر پڑتا ہے۔ وہ گناہ کرتا ہے اور اپنے کئے پر شیمان ہوتا ہے باوجود اس کے کہ حظ نفس کو ترک کرتے ہوئے اپنے میلان طبع کے خلاف عمل کرتا ہے تاہم وہ پاکیزگی نفس اور تکمیل روحانی کے لئے بے قرار رہتا ہے۔

اس کی روحانیت سے اثر پذیر ہو کر بالآخر یہ حالت بھی انتہائی غم اور کھفت کی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان اس حالت سے گذر کر تیسری حالت میں جا پہنچتا ہے یہ حالت ”علم“ ہے جس میں وہ گناہ اور خواہشات انسانی سے بلند تر ہو کر ایک پرامن خطہ میں قدم رکھتا ہے۔

جس طرح وہ خوشی جو گناہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے عارضی ہوتی ہے اسی طرح خواہشات نفسانی بھی دیرپا نہیں ہوتیں۔ باوجود اس امر کے کہ یہ فانی ہوتی ہیں انسانی روح کو ان کا تجربہ لازمی ہے۔ لیکن یہ امر کہ ایک انسان ان خواہشات کی حدود سے بچے کامیابی کے ساتھ جاکھڑا ہو، پاکیزگی اور سکون دوام سے ہمکنار ہو جائے خود اس کی دماغی اور روحانی کیفیات کی قوت پر منحصر ہے۔ اس کی ریاضت اور اس کا جوش طبعی، جن سے وہ حقیقت کا متلاشی ہے اسے اس منزل پر پہنچا سکتی ہیں۔

خواہشات مع ان کھفتوں کے جو ان سے پیدا ہوتی ہیں ہر وقت اور ہر صورت میں زیر کی جا سکتی ہیں لیکن اس کے لئے ”علم“ لازمی ہے۔ ایک روح جواشعہ حقیقت سے منور ہے تمام خواہشات کا مقابلہ کر سکتی ہے جب ایک انسان خواہشات کے مبداء اس کی اصلیت اس کے معنی کا مکمل طور سے ادراک کرے وہ اسی لمحہ انہیں شکست دے سکتا ہے لیکن جب

نہک جہالت اور نادانیت کی تیرگی اسے گھیرے ہوئے ہے اُس وقت تک کوئی مذہبی تعلیم، کوئی روحانی تربیت اسے سکون نہیں دے سکتی۔

فرض کیجئے کہ کوئی انسان اپنے دشمن پر فتح حاصل کرنے چلا ہے اور اپنے دشمن کی قوت، اس کے جیل اور کمین گاہ سے واقف نہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے نہ صرف ایک پسپا کر دینے والی شکست ہی اٹھانی پڑے گی بلکہ وہ خود بھی سرعت کے ساتھ اس کے دام میں پھنس جائے گا۔ اپنے دشمن پر قابو پانے کے لئے اولین فرض یہ ہے کہ اس کی جائے پناہ، اس کی قیام گاہ کے متعلق پوری پوری واقفیت بہم پہنچائی جائے اور اصرار اپنے قلعہ اور جائے پناہ اور خصوصاً غیر محفوظ راستوں کی نگہداشت کی جائے جن میں سے دشمن کے اندر داخل ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے۔

اس کے لئے پیہم غور، فکر، لائنناہی دید بانی اور ایک ثابت، راسخ اور شدید کشف الباطن کی ضرورت ہے جس سے اُس کے دل کی آنکھوں کے سامنے اس کی روح کی تمام بے سود خود کامیاب ظاہر ہو جائیں۔ ابراہار کی یہی جنگ ہے اور اسی پاکیزہ جنگ میں روح حیوانی اشغال کی لمبی نیند سے بیدار ہو کر آمادہ پیکار ہوتی ہے۔

لوگ کس لئے کامیاب نہیں ہوتے، اور یہ جنگ کس لئے ایک مدت تک ختم نہیں ہونے پاتی؟ اس کی دو وجوہ ہیں۔ وہ دو باطل خیالات کے زیر اثر کوششیں کرتے ہیں۔ اول یہ کہ تمام خواہشات خارجی ماحول کا نتیجہ ہیں۔ دوم یہ کہ خواہشات اُن پر اس طرح اثر کرتی ہیں کہ وہ فطرتاً تسلیم و رضا کے پابند واقع ہوئے ہیں۔ اُس وقت تک انسان ترقی نہیں کر سکتا جب تک ان خیالات نے اُس کے دل و دماغ پر تسلط جاری رکھا ہے جب وہ ان کی تردید میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ فتح پر فتح حاصل کرتا ہے اور آخر کار روحانی لذت اور سکون سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔

ان بطلان امیز خیالات کو چھوڑ کر دو حقائق کو جبکہ دینا لازمی ہے۔ اول یہ کہ تمام خواہشات اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔ دوم یہ کہ انسان کا خواہشات سے متاثر ہونا اس کے اندرونی شرف و فساد کا باعث ہے۔ یہ خیال کہ خدا یا شیطان یا دیگر خارجی اثرات سے خواہشات پیدا ہوتی ہیں دور کر دینا چاہئے۔ اندرونی میلانات ہی تمام خواہشات کا باعث اور مبداء ہیں۔ اور جب انہیں میلانات میں پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہو جاتی ہے تو کسی قسم کے خارجی اثرات اور بیرونی قوتیں روح کو خواہشات یا گناہ کی جانب نہیں لے جاسکتیں۔ خواہشات کا سبب اور وجہ حیات خارجی اشیا نہیں خود ممتا را میلان طبع ہے۔ بالفرض اگر یہ نہ ہوتا تو تمام انسانوں میں ایک ہی روش پر خواہشات پیدا ہوا کرتیں وہ کبھی قابو میں آہنی نہ سکتیں اور ہم سب ایک جا وداں اذیت اور بدبختی میں مبتلا ہتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انسان اس روحانی کلفت سے نجات پانے کا علاج اپنے پاس رکھتا ہے اور وہ کامیاب ہو سکتا ہے

بشرطیکہ وہ ان میلانات کو پاکیزہ بنالے۔ ہم پر خواہشات اس لئے اثر کرتی ہیں کہ ہم میں چند اس قسم کے رجحانات اور دماغی حالتیں موجود ہیں جنہیں ہم گناہ آلود سمجھتے ہیں۔ یہ رجحانات ممکن ہے بہت عرصے تک خوابیدہ ہی رہیں اور انسان یہ سمجھے کہ اس نے ان سے نجات پالی ہے لیکن ایک معمولی سے خارجی اثر سے متاثر ہو کر یہ جاگ اٹھتے ہیں انسان انہیں مطمئن کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے۔ اور یہی کیفیت خواہشات کی کیفیت ہے۔ نیکی کبھی خواہشات سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان میں نیکی کا وجود خواہشات کے لئے پیغام مرگ ہے۔ یہ صرف شرکی موجودگی اور اس کی بیداری ہی جو انسان کو خواہشات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ایک انسان کی خواہشات بقدر اس کے فقدانِ تقدس کے ہو کرتی ہیں۔ جوں جوں وہ اپنے آئینہ دل کو صاف بناتا جاتا ہے خواہشات کا خاتمہ ہوتا جاتا ہے۔ جب ایک ناجائز خواہش دل سے باہر نکال پھینک دی جاتی ہے تو وہ شے جس نے اسے پہلے متاثر کیا تھا اب نہیں کر سکتی، وہ مردہ اور بے قوت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دل میں وہ مواد موجود نہیں ہوتا جو اس کی آواز پر لبیک کہے + ایک دیانت دار آدمی کے دل میں چری کی خواہش پیدا نہیں ہو سکتی خواہ اس امر کی تکمیل کے لئے کیسا ہی موقع ہو۔ ایک ذوقِ سلیم کا مالک پر خرمی اور بادہ آشامی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ خواہ اس کے سامنے دنیا بھر کی نعمتیں جمع ہوں اور شراب کتنی ہی اچھی طرح کشیدگی گئی ہو۔ ایک روشن دماغ، پرسکون اور اندرونی قوت سے بہرہ اندوز انسان، غصہ، زود بھجی، کینہ و بغض کی جانب کبھی مائل نہیں ہو سکتا اور ایک حسن آرزو انگیز کی سحر آگین ادائیں اس کے پاکیزہ دل کے لئے بے معنی ثابت ہوتی ہیں۔

خواہشات یہ واضح کر دیا کرتی ہیں کہ انسان کس طرح اور کہاں سے کمزور ہے۔ وہ اسے معرفت اور پاکیزگی کی بلندیوں پر لے جاتی ہیں + خواہشات نہ ہوتیں تو روح میں بالیدگی اور قوت پیدا نہ ہو سکتی، دانشمندی اور حقیقی حسن نہ ہوتا۔ اگرچہ موت و سبات ضرور ہوتیں لیکن امن سکون اور کمال پیدا ہونا ممکن تھا جب خواہشات کا ادراک اور ان پر فتح یہ دو چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو تکمیل ایک یقینی امر ہو جاتا ہے اور یہ ہر ایک انسان کے حیطہ امکان میں داخل ہے کہ وہ ہر معرض اور غیر طاہر خواہش کا ازالہ کر دے۔ اور ایثار و معرفت کی آگ میں کود پڑے + آئیے، اور اس پر دے کو جس نے حقیقت کو چھپا رکھا ہے تن دہی اور جانفشانی سے اتار پھینکیں، یہ جانتے ہوئے کہ جب تک ہم خواہشات کے زیر اثر ہیں ہم حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے اور ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔

تمہیں جاننا چاہئے کہ تم پر خواہشات اس لئے غلبہ پالیتی ہیں کہ تم اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتے کیونکہ ”لذاتِ نفس ہی انسان کی گمراہی کا باعث ہوتی ہیں“ تم اس لئے خواہشات کے غلام ہو جاتے ہو کہ تم ان حیوانی میلانات کو جو تم میں موجود ہیں بڑی طرح چھپے ہوئے ہو اور خود میں یہ صلاحیت محسوس نہیں کر رہے کہ ان سے نجات پاسکو گے۔ تم اُس کا ذب اور فانی نفسانیت میں زندگی بسر کر رہے ہو جو عرفانِ حقیقی سے بے بہرہ ہے جو کچھ نہیں جانتی اور جسے سوائے اپنی بھجت کے کسی شتم کی تلاش نہیں۔ وہ حقیقت، ہر قانونِ الہی سے بے لہجہ ہے۔ اس نفسانیت سے چھپے ہوئے تمہیں تین جداگانہ اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے: خواہشات کی اذیت۔ ان کے امتلا کی اذیت اور پشیمانی کی اذیت۔

اس نفسانیت میں ہر تکلیف کا بیج ہر امید کی شکست اور ہر کلفت کا سامان پایا جاتا ہے۔ جب تم اسے چھوڑ دینے کے متمنی ہوتے ہو اور جب تم میں یہ ارادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو اس کی تمام خود غرضی آلودگی اور بے نصبری کے ساتھ اپنی آنکھوں کے سامنے برہنہ دیکھ لو اور اس کی ضلالت کو تسلیم کر لو اُس وقت تم ایک ایسی زندگی میں قدم رکھتے ہو جو علمِ نفس اور رزانت کی روشنی سے منور ہوتی ہے۔ اُس وقت تم میں وہ شانِ ربوبیت وہ الہی فطرت پیدا ہو جاتی ہے جو ہر شتم کی احتیاج سے بلند تر ہو کر ایک ایسے خطہ میں مقام رکھتی ہے جس میں امن و راحت کو پائیدگی ہے، جہاں رنج و کلفت کا دخل نہیں اور جہاں خواہشاتِ نفسانی کا قیام ناممکن ہے۔

محمد شفیع

(ترجمہ)

ہم خدا کے سارے باغ میں اسی پھل کے ٹوڑنے کو جھپٹ پڑنا چاہتے ہیں جو کئی سردیاں اور کئی گرمیاں گزرے پر کہیں بڑی دیر میں جا کر پکتا ہے!

جب کوئی شخص مجھے پیارا لگنے لگتا ہے تو میں گویا خوش قسمتی کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہوں!

اؤ ہم خاموش ہو جائیں تاکہ یوں ہم ربانی سرگوشیوں کو خوب سُن سکیں!

گلچیں

# بے مانگی

نہیں ہے جاہ و شوکت پاس میرے      نہیں ہے علم و حکمت پاس میرے  
نہیں ہے دیں کی دولت پاس میرے      نہ کوئی قابلیت پاس میرے  
تری چاہت کا پھر میں دم بھروں کیا  
محبت کا تری دعوے کروں کیا

مجھے بے مانگی کا اپنی غم ہے      خجالت سے سر مجبور خم ہے  
ستم ہے اے گل خوبی ستم ہے      کہ ہستی خار سے بھی اپنی کم ہے  
تری چاہت کا پھر میں دم بھروں کیا  
محبت کا تری دعوے کروں کیا

انگیں اٹھ کے سو جاتی ہیں دل میں      امیدیں مردہ ہو جاتی ہیں دل میں  
تمنائیں جو کھو جاتی ہیں دل میں      وہ کانٹے غم کے ہو جاتی ہیں دل میں  
تری چاہت کا پھر میں دم بھروں کیا  
محبت کا تری دعوے کروں کیا

نہ پنہاں اس قدر پایا کسی کو      نہ پایا بے غرض ایسا کسی کو  
نہ دیکھا اتنا بے پروا کسی کو      نہ دیکھا اتنا نیاز اتنا کسی کو  
تری چاہت کا پھر میں دم بھروں کیا  
محبت کا تری دعوے کروں کیا

# سوء اتفاق

لکھنؤ کی طرف جانے والی آخری گاڑی نکل چکی تھی۔ اب ریل کا وقت باقی نہ تھا۔ اور مجھے آج ہی رات لکھنؤ پہنچنا تھا۔ اسٹی میل کی مسافت، اگر کوئی برق رفتار گھوڑا مل جاتا تو شاید طے بھی ہو جاتی، لیکن فیض آباد میں تو اگلے ہی تھے اور وہ بھی چوک میں گھومنے والے۔ میں اسی الجھن میں گرفتار تھا اور کوئی تدبیر ذہن میں نہ آتی تھی کہ میرے کاروباری دوست عبدالکریم صاحب آپہنچے۔ میں نے اُن سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو وہ فوراً بولے ”اگر ٹیکسی کا بندوبست ہو جائے تو کیا اعتراض ہے؟“

”کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ بہت ہی اچھا ہے۔“

فیض آباد اور لکھنؤ کے درمیان کرایہ پر موٹر چلانے کا رواج نہیں تھا اس لئے ٹیکسی ملنے میں بہت دقت پیش آئی۔ لیکن دو تین گھنٹے کی دوڑ دھوپ اور ذاتی اثر و رسوخ کو کام میں لاکر کریم صاحب ایک فورڈ لے آئے۔ اب صورت یہ تھی کہ میں اکیلا جانے والا اور سالم موٹر۔ میں نے کفایت شعاری کا خیال کر کے شو فر سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو ایک آدمی لڑی آور لے لو۔ اُس نے بہت روکھے پن سے جواب دیا ”صاحب، یہاں سواری کہاں سچ پوچھتے تو میں بھی ٹھیکہ دار صاحب کے کہنے سے جا رہا ہوں ورنہ اس جاڑے میں کوئی شخص رات کا سفر نہیں کرتا۔“

وہ بھی سچا تھا۔ فیض آباد ایسے پس ماندہ و دور افتادہ مقام سے کون دسمبر کی یخ بستہ رات کو موٹر میں نکلنا پسند کرتا تھا۔ قبر درویش برجان درویش پوری موٹر پچاس روپے میں کر کے میں روانہ ہوا۔ مکمل بستر موجود تھا۔ ایڑھا ٹیڑھا کر کے پچھلی نشست پر بچھایا اور لحاف لپیٹ کر میں دراز ہو گیا۔ شو فر کلینر اور تین کل تین اشخاص تھے۔ شو فر جو بظاہر اپنے کام سے خوب واقف معلوم ہوتا تھا خاموش سا آدمی تھا۔ لیکن کلینر اتنا باتونی کہ خدا کی پناہ۔ گفتگو کے ہر مذہب و غیر مذہب متعلق و غیر متعلق موضوع پر چھوٹے، سچے تجربات سنا نا اُس کے باتیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ موسم کی خنکی کا ذکر آیا تو جھٹ گلرگ ونبنی تال کا قصہ لے بیٹھا۔ رات کی تاریکی کا نام لیا تو فوراً داستان شروع کر دی کہ کیونکہ ایک دفعہ اپنے گاؤں کو جاتا ہوا وہ رات کی ہولناک تاریکی میں چوروں کے مسلح دستہ سے دوچار ہو گیا اور پھر کس ترکیب سے جان و مال سلامت لے کر اُن کے چنگل سے نکل بھاگا۔ میں اس کی ہرزہ سرائی سے تنگ آ کر سختی کے ساتھ اُسے ٹوکنے والا تھا کہ شو فر اس سے کچھ گانے کی فرمائش کر بیٹھا اور پھر شاید بایں خیال کہ اُس



کی یہ فرمائش میرے آرام میں مغل ہوگی اُس نے مجھ سے اجازت بھی طلب کی ”اگر آپ کچھ دیر جاگنا چاہیں تو خیراتی کا گانا ہی سن لیجئے“

میں نے متائل ہو کر پوچھا کچھ اچھا گاتا ہے؟

”ہاں صاحب خاصا ہے“

میں نے کہا ”لیکن اگر وہ گانے میں بھی ایسی ہی بے پرکی ہانکتا رہا تو میں ایک لفظ نہیں سنوں گا“

اس بات پر وہ دونوں ہنس پڑے۔ خیراتی نے ہندی کی دو، ایک چیزیں مزے سے گائیں۔ آواز اچھی تھی گو فن سے واقف نہ تھا۔ سنان رات کی خاموشی میں جب کہ موٹر فرلٹے بھرتی ہوئی فاصلہ کی دوری کو نگلتی چلی جا رہی تھی اس کی بلند آواز کانوں کو بہت خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ نیند کا فرشتہ پر پھیلا رہا تھا۔ میں نے شو فر سے خوب ہوشیار رہنے کی ناکید کی اور خود بستری میں مٹ لپیٹ کر سو گیا۔

زوردار دھماکے کے ساتھ یک لخت موٹر رک گئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف اجاڑ میدان تھا جس پر گھٹا ٹوپ اندھیرا مسلط تھا۔ صرف موٹر کے دو لمپ فضا کے بسیدہ کی پڑھول تاریکی سے تھکے ہوئے پہلوں کی طرح جنگ کر رہے تھے۔ ایک خطرہ مہوم کا احساس کرتے ہوئے میں نے چھوٹے ہی پوچھا ”کیا ہوا خیر تو ہے؟“ میرا مخاطب شو فر تھا لیکن وہ مشین کی دیکھ بھال میں انجان بن کر چپکا ہو رہا۔ میں نے درشتی سے پوچھا۔

”خیراتی بولتے کیوں نہیں۔ کیا ہو گیا ہے؟“

”حضور مائے بھٹ گیا“

میرے منہ سے عالم بے اختیار میں کلمہ غیر نکلا اور انتنائے کوفت کے ساتھ کھڑکی کھول کر میں کبل اوڑھ نیچے اتر آیا۔ وہ دونوں جیبی لائٹیں کی مدد سے پیہوں کا بغور ملاحظہ کر رہے تھے۔ میں نے پھر سوال کیا ”کوئی فالتو مائے ہے؟“

نہایت مایوسانہ جواب تھا ”جی نہیں“

میں رنج و غصہ کی شدت کے ضبط نہ کر سکا ”نم عجیب ہیودہ انسان ہو جب تمہیں علم تھا کہ اسی میل کا ٹوپی سفر ہے۔ رات کا وقت ہے۔ غیر آباد راہ سے گزر رہے پھر تم گھر سے مکمل سامان لے کر کیوں نہیں چلے اب سرحد میں جان سے مارو گے۔ بتاؤ فاصلہ کتنا طے کر چکے ہو؟“

”جناب ردولی سے گزر آئے ہیں“

”الاماں! ابھی ردولی ہی میں ہو؟ میرا خیال تھا بارہ بنکی کے قریب قریب پہنچ چکے ہونگے۔“ میں نے جیسے گھڑی بھالی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ میرے دل و دماغ میں سخت اذیت کا احساس ہونے لگا۔ ایسی سردی میں سفر اختیار کیا، اتنی تکلیف برداشت کی، معقول معاوضہ بھی ادا کیا اور پھر بروقت منزل مقصود پر پہنچ سکا۔ وہ دونوں متعدد اوزار سنبھالے موٹر کے مختلف حصوں کو کھولتے، بند کرتے اور الٹے پلٹتے رہے۔ میں صبر شکن انتظار کے ساتھ امید و سیم کی لہروں سے ڈانواں ڈولُن کی کارروائی مضطرب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نصف گھنٹہ کی تنگ و دو کے بعد انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ ٹائر اس بری طرح پھٹا ہے کہ موٹر اب دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔ ان الفاظ نے میرے اندر دہشت و حراس کے وہی جذبات پیدا کر دیئے جو ایک خونی مجرم عدالت سے فیصلہ موت صادر کئے جانے پر محسوس کرتا ہے۔ میں مغلوب المنضب ہو رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ شو فر کو جان سے اردو اس کی ملک غفلت نے میرا قیمتی پروگرام تنس ہنس کر ڈالا تھا۔ کمبخت کو اتنا معلوم نہیں تھا کہ فالٹو ٹائر کسے سفر کرنا سراسر حماقت ہے۔ کبھی اپنی کاہلی پر افسوس کرتا کہ اگر شام کی ٹرین مل جاتی تو کیسے آرام و اطمینان کے گھنٹے پہنچ گیا ہوتا۔ اب یہ حالت تھی کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن یعنی مارا دیا وغیرہ میں مجھ کو وطن سے دور۔ میرے گھر و پیش تمام بجز سرزمین تھی۔ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ گیدڑوں کی خوفناک آوازیں رات کی سیاہی سے مل کر گڑھ ہوا میں ہولناک گونج پیدا کر رہی تھیں۔ میں عجب شش و پنج میں مبتلا موٹر کا سہارا لئے خالی نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اس ابتلا سے نکلنے کی کوئی تجویز نہ سوجھتی تھی۔ شو فر سمجھا ہوا ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے کوک کر پوچھا ”اب کیا ارادہ ہے؟“

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ ”حضور مجھے معاف کر دیجئے۔ میری غلطی کی وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔ یہاں سے دو میل پر راؤ۔۔۔۔۔ صاحب کا گاؤں ہے۔ راؤ صاحب یہاں کے بہت بڑے رئیس اور تعلقہ دار ہیں۔ کئی بار میں انہیں موٹر پر لکھنؤ لے گیا ہوں۔ مجھ پر ہمیشہ مہربانی کرتے ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کا سامان اٹھا کر ان کے یہاں لے چلوں۔ آپ رات وہیں آرام فرمائیے۔“ میں نے اس تجویز کو پسند کیا مگر پھر سوچا کہ آدھی رات کے وقت راؤ صاحب کو بے آرام کرنا بھی مداخلت بے جا سے کم نہیں۔ ممکن ہے وہ مجھے مہمانِ ناخواندہ سمجھ کر ناک بھون چڑھائیں۔ پھر خیال آیا کہ میں کون سا اُن کے ہاں مہینوں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو طلوع آفتاب تک چھت کا سایہ اور چار پائی درکار رہے۔ قصہ مختصر میں نے رضامندی کا اظہار کیا اور شو فر میرا اسباب سرپرہ رکھ کر روانہ ہو گیا اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔ خیراتی کو لنگرانی کے لئے موٹر میں چھوڑ گئے۔ ہون، ایک گھنٹہ کے چل چلا

کے بعد ہم ”دیس نگر“ پہنچے۔ راؤ صاحب کی عظیم الشان کوٹھی اور وسیع پائیں باغ واقعی ان کی امارت و ثروت کی شہادت دے رہے تھے۔ شو فر نے شاگرد پیشہ مکانات کی طرف جا کر کسی ملازم کو جگایا اور غالباً میرے متعلق کچھ کہا ملازم پہلے تو بہت بڑا اتار ہا پھر مجھے بغور گھورتا ہوا کوٹھی کے اندرونی حصہ میں داخل ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا کہ بے وقت ایسے معزز صاحب خانہ کو تکلیف دی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد نوکر برآمد ہوا اور بہت غیر شگفتہ لہجے میں بولا ”چلئے جناب، راؤ صاحب نے یاد فرمایا ہے“

میں نے جبرت سے کہا ”راؤ صاحب کیا جاگ رہے تھے؟“  
 ”جی نہیں۔ وہ تو سو چکے تھے۔ میں نے جا کر جگایا ہے۔“  
 ”افوہ کتنی تکلیف ہوئی ان کو“

میں ملازم کے ہمراہ راؤ صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ وسیع و عریض کمرہ بہت نفیس سامان آرائش سے سجا ہوا تھا اور پانگ کے قریب آرام کرسی پر وہ خود تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ پچاس پچپن سال کا سن ہو گا لیکن چہرہ پر جوانی کی سرخی موجود تھی۔ بالوں میں بھی کمبیں سفیدی نمودار ہوئی تھی۔ گفتگو شروع کرتے ہی میں نے تکلیف دہی کی معذرت طلب کی جس کے لئے حقیقتاً میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے بہت شفقت سے کہا ”آپ بھی غصہ کرنے ہیں۔ موٹر کا بگڑ جانا تو عینیت ہو آ کہ میں آپ کے درشن ہو گئے۔ آپ تکلیف وغیرہ کا ذکر نہ کیجئے میری تو عمر ہی دوستوں کی خدمت میں بسر ہوئی ہر اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کھانے کا اصرار کر رہے تھے لیکن مجھے مطلق اشتیاء نہ تھی۔ ان کے ملازمین نے کوٹھی کے مردانہ حصہ میں میرے سونے کا انتظام کر دیا اور میں تغظیم ادا کر کے دل میں اُس شخص کی شرافت کا گہرا نقش لئے ہوئے آکر دروازہ ہو گیا۔

مجھے سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ کوٹھی کے احاطے میں ایک کمرہ بچ گیا۔ ڈاکو ڈاکو پکڑو۔ مار دیا“ کی مخلوط آوازیں اور خوفناک چیخیں میرے کان میں پڑیں تو میں سراسیمہ ہو کر جاگ اٹھا اور واقعے کی اصلیت معلوم کرنے کو باہر دوڑا۔ میری آنکھوں نے عجب منظر دیکھا۔ راؤ صاحب خود، ان کے لواحقین اور ملازم پانچ سات اشخاص کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ رات کی منہج تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہ دیتا تھا۔ حقیقت حال سے باخبر ہوئے بغیر لیکن موقع کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے میں ان کے پیچھے بھاگ اٹھا یہاں نے تیزی سے ایک شخص کو جا پکڑا لیکن جونہی اس کے جسم کو چھوا اُس نے برق آسا پھرتی کے ساتھ تلوار کا

ایک ایسا وار میرے ہاتھ پر کیا کہ میرا پونچا کٹ کر زمین پر گر گیا۔ اور میں بے ساختہ چیخ کے ساتھ وہیں بٹھی گیا۔ حملہ آوروں کے پاس موٹر تھی جس میں سوار ہو کر وہ چشم زدن میں ہماری نگاہوں سے غائب ہو گئے۔ راؤ صاحب اور ان کے متعلقین نے میرے گرد گھیرا ڈال دیا۔ خون بے تحاشا میرے زخم سے بہہ رہا تھا اور میں اگرچہ صبر کئے تھا لیکن جو اس ایک جانکاہ اذیت میں مبتلا تھے۔ مجھے ایک شخص کندھوں پر اٹھا کر واپس کوٹھی میں لایا۔ طبی امداد تو وہاں کیا پہنچ سکتی تھی، بچاے راؤ صاحب دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے اور کچھ دن نہ پڑتا تھا۔ کپڑے پانی میں بھگو بھگو کر میرے زخم پر رکھتے تھے لیکن خون کی دھار تھی کہ بند ہونے میں نہ آتی تھی۔ اسی پریشانی میں رات تمام ہو گئی۔ زنا خانہ کے اندر سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں سمجھا شاید کوئی سخت حادثہ ہو گیا ہے۔ صبح ہوئی تو ایک نوکر نے ڈرتے ڈرتے رک رک کر مجھ سے کہا ”آپ کو نہیں معلوم؟ رات وہ شخص سرکار کی صاحبزادی کو اٹھا کر لے گئے“

”راؤ صاحب کی صاحبزادی کو؟“

”جی ہاں“

یہ افسوسناک خبر بجلی کی طرح مجھ پر گری جس نے مجھے اپنی سب تکلیف بھلا دی۔ میں حیران و ششدر رہ گیا۔ کئی واقعات اپنے دماغ میں دہرائے لگا۔ اجاڑ بیابان میں موٹر کا پھٹ جانا۔ راؤ صاحب کے ہاں آمد۔ ادھی رات کو ڈکیتی۔ میرا ہاتھ کٹ گیا اور راؤ صاحب کی صاحبزادی کا اغوا۔ ایک حیرت انگیز ڈراما تھا۔ یقیناً وہ بہت ہی منحوس گھڑی ہوگی جب میں نے سفر کی نیت کی تھی۔ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ تاریک اور غیر یقینی چیز مستقبل ہے۔ اگر مجھے ان مصائب کا ہلکا سا علم بھی ہوتا تو میں گھر سے نہ نکلتا، لیکن اب جب کہ تیرکان سے نکل چکا تھا چھپتا بالکل بے سود تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں چندے وہاں ٹھہرا ہوا تو وہ شیطانی طاقتیں جو برسہا برس پکاری تھیں اور جنہوں نے میرے عزائم کو میا میٹ کر کے مجھے سخت جسمانی و روحانی عذاب میں مبتلا کر دیا تھا مزید گزند پہنچانے سے باز نہ رہیں گی۔ میں جلد از جلد اس چار دیواری سے بھاگنا چاہتا تھا۔ راؤ صاحب مخلصانہ اصرار کرتے تھے کہ میں چند روز اور قیام کروں اور جب تک زخم کی حالت بہتر نہ ہو جائے ان کے پاس سے نہ جاؤں۔ وہ باتیں کرتے تھے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ وہ آنسو رنج و غم اور شرم و ندامت کے آنسو تھے۔ وہ سوچتے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی چند گھنٹوں کے لئے ہمارے کی حیثیت سے اُن کے ہاں آیا اور معاوضہ میں اپنا ایک ہاتھ دے چلا۔ اُن خیالات کو جو میری روانگی کے وقت ان کے نیک دل میں موجزن تھے میں خوب سمجھتا تھا۔ لیکن اس محل و بردبار انسان نے اپنے ذاتی نقصان اور رنج و غم

کا اشارۂ بھی اظہار مناسب نہ سمجھا۔ اُن کی دعائے خیر لے کر اور آئندہ ملاقات کا وعدہ کر کے میں اُن سے رخصت ہوا اور واپس فیض آباد آ گیا۔ لیکن تمام راہ میں مجھے یہی خیال رہا کہ راؤ صاحب کی صاحبزادی کا اغوا غالباً کسی بہت بڑے راز کا حامل تھا۔ معرین کے گھروں میں جب ایسے حادثات ظور پذیر ہوتے ہیں تو تلاش و تفتیش اُن کی خانگی زندگی کے سنسنی پیدا کر دینے والے حالات سے پردہ اٹھا دیتی ہے۔ کیا راؤ صاحب بھی پولیس میں اطلاع کر کے اپنی ذات کو اخبارات کی آراء و قیاسات کا مرکز بنانا پسند کریں گے ؟

دو ہفتے کی مرہم پٹی سے میرا زخم تو بالکل مندمل ہو گیا لیکن کٹا ہوا ہاتھ ایسا بد نما معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اس کو ہمیشہ کوٹ یا پتلون کی حبیب میں رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ علاوہ ازیں میں روزمرہ کی کاروباری زندگی میں ایک ہاتھ کی اعانت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا تھا اور اس محرومی کو ہر لحظہ شدت سے محسوس کرتا تھا۔ یہ نقصان ایسا ناقابل تلافی ثابت ہوا کہ لکھنؤ کے قابل ترین سرجن نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ ”ہندوستان میں تو اس درد کی دوا میسر آنا قریب قریب ناممکن ہے۔ ہاں یورپ میں بعض ایسے ماہرینِ عضویات ہیں جو مصنوعی ہاتھ اس خوبی سے تیار کر دیتے ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہو، کیونکہ جنگ عظیم کے بعد وہاں جراحی کے اس شعبہ کو کافی طور پر بہت تقویت ملی ہے“ لیکن آہ یورپ! میری پہنچ سے بالکل باہر تھا۔

چند ماہ کی مصروفیت کے بعد میرا آب و دانہ پھر پنجاب کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس دوران میں میں نے شمالی کے بہترین اطباء سے استصواب کیا۔ مگر سبھی اس معاملہ میں عاجز نظر آتے تھے۔ میرے ایک عزیز نے مجھے بتایا کہ بمبئی میں دو ایک ڈاکٹر ایسے ہیں جو انگلستان اور جرمنی سے فنِ جراحی میں مہارت نامہ حاصل کر کے آئے ہیں اور عضویات کی اس شاخ کے معالج خصوصی ہیں۔ اگر اُن سے مشورہ کیا جائے تو ممکن ہے بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ مجھے یوں بھی بہ سلسلہ روزگار بمبئی ضرور جانا تھا اور اب تو سمندرِ شوق کو اکاوتنا زیانہ ہوا چنانچہ بعض کاموں کو ادھورا چھوڑ کر میں عازمِ بمبئی ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اپنی اولین فرصت میں میں نے ان ڈاکٹروں کا پتہ چلا کی کوشش کی اور مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ میرے اُس عزیز کی اطلاع بے بنیاد نہ تھی۔ ڈاکٹر رائے اور ڈاکٹر سیال دونام تھے جو متعدد حضرات کی زبانی میں نے سنے۔ ان میں ڈاکٹر رائے کا نام میرے احباب بہت عوام و وثوق سے لیتے تھے۔ بلکہ سرجری میں اُن کے چند کارہائے نمایاں کو تو لوگ معجزات سے تعبیر کرتے تھے میں بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تیس، پینتیس سال کی عمر ہوگی۔ مضبوط جسم، لانا بقا، نہایت خوبصورت ہنس مکھ آدمی تھا۔ شکل و شبہا ہتھ شمالی ہندوستان کا باشندہ معلوم ہوتا تھا اور جب گفتگو شروع ہوئی تو لب و لہجہ نے

بتا دیا کہ اسے خاکِ پاکِ اودھ سے نسبتِ وطن حاصل تھی۔ رسمی تعارف اور مزاج پرسی کے بعد میں نے اپنی آمد کی غرض بتائی۔ پہلے تو میرے بازو کو مدت تک بغور دیکھتے رہے پھر ایک خاص قسم کے چشے سے ملاحظہ کیا۔ اور یوں گویا ہوئے۔ ”آپ کا ہاتھ کسی تیز دھار آلہ سے کٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں یہ زخم آپ کو کیسے پہنچا؟“ میں نے عرض کیا ”ایک حادثہ ہو گیا تھا“

وہ مسکرائے ”آپ چال ڈھال سے فوجی سپاہی تو معلوم نہیں ہوتے اور نہ وضع قطع یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ اُس غیر ذمہ دار بازاری طبقہ سے ہیں جہاں صبح و شام جنگ و پیکار کا بازار گرم رہتا ہے۔ پھر آپ کو حادثات کیسے پیش آ گئے؟“

مجھے اُن کے اس سوال سے جس سے وہ بال کی کھال نکالنا چاہتے تھے کچھ ناگوار سا احساس ہوا میں نے کہا ”آپ حادثہ کی نوعیت کی طرف نہ جائیے۔ بس آپ کی تشفی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تیز دھار آلہ سے یہ پونچا کٹ گیا تھا“

میرے اس گول مول جواب سے ان کے شوقِ جستجو میں نئی تحریک پیدا ہوئی۔ اور میرا ہاتھ چھوڑ کر وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ”آپ جاننے! ایک معالج کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ دوا تجویز کر دے۔ دفعِ امراض کے سلسلہ میں تجویز دوا آخری مرحلہ ہے جس تک پہنچنے کے لئے بہت سے دریافتِ طلب امور کا حل نہایت ضروری ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زخم میں تیز دھار آلہ کا استعمال ہوا تھا لیکن یہ جاننا کہ وہ کیونکر ہوا اور کن حالات میں ہوا میرے علاج کو مکمل و موثر بنانے کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے آپ براہِ عنایت حالات کے انکشاف میں غل سے کام نہ لیں۔“

میں حیران تھا یہ کس قسم کا ڈاکٹر ہے جو زندگی کے خفیہ واقعات کرید کرید کر پوچھ رہا ہے۔ اگر اصل حالات کو چھپا ہوں تو اُس کے ناراض ہو جانے کا ڈر ہے اور اگر الف سے یہ تک سب قصہ بیان کر دوں تو ایک معزز رئیس کی شرافت و عزت پر حرف آنے کا احتمال ہے۔ میری چشمِ تصور کے سامنے راؤ صاحب کی محبوب و مکرم شخصیت آ گئی اور دل نے کہا کہ ایسے شریفانہ و ست کے راز کو رسوا کرنا آمین مروت سے بعید ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب کے ہنسنے کی آواز آئی ”راجی صاحب آپ کس گہری سوچ میں پڑ گئے۔ دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے راز کہا جاسکے۔ ہر انسان کی زندگی ایک کھلا ہوا مرقع ہے جسے تمام دنیا بیک وقت پڑھ لیتی ہے۔ آپ کیوں تذبذب میں پڑ گئے؟ ایک مریض کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے مرض کے تمام امور متعلقہ مجھ سے صاف صاف بیان کر دیں۔“

ورنہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔

میں نے یہی جانا کہ اب زیادہ رکن نامناسب نہیں۔ چنانچہ تمام داستان ازاول تا آخر اُن کے بیان کر دی میں لال رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب پھر میں نے لٹے ہوئے بت کی مانند حیرت و استعجاب سے بھیٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ تنگی لگائے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہر لحظہ اُن کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ جب قصہ ختم ہو چکا تو وہ حیرت انگیز تبسم کے ساتھ جس سے اُن کے رخساروں پر پھر سرخی دوڑ گئی تھی کھڑے ہو کر مجھ سے پٹ گئے۔ ”آئیے آئیے اندر چلیے۔ آپ تو اپنے ہی آدمی نکل آئے“ وہ مجھے مطب سے کھینچ کر محقق مکان کے سکونتی حصہ میں لے گئے۔ میں تیرن و ششدر یہ سب کارروائی دیکھ رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ معاملہ کیا ہے۔ گول کرے میں مجھے ایک کونے میں بٹھا کر ڈاکٹر صاحب نے اونچی آواز میں پکارا ”سوشیلا سوشیلا“ بغل دالے کمرے کے دروازہ کا پردہ اُسکا اور ایک نہایت دل فریب صورت نمودار ہوئی۔ ریشمین ساڑھی میں لبوس، ماؤتیاں کی سی پُرضیا پیشانی پر نقشہ لگا یہ پری و ش بے دھڑک کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں تعظیماً اپنی جگہ سے اٹھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور میری جانب اشارہ کر کے کہا ”آپ سے ملو، یہ ہمارے بہت بڑے محسن ہیں“ ہم دونوں نے مصافحہ کیا اور مختلف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مخاطب کیا ”حضرت یہی وہ خاتون ہیں جنہیں چھڑنے میں آپ نے اپنا ہاتھ کھو دیا تھا۔“

”واقعی؟“ انکا اور فور حیرت سے میری زبان گنگ ہو گئی اور آنکھیں اُس نازنین کے چہرے پر گڑ گئیں۔ میری حیرانی کا یہ عالم تھا کہ وہ مکان میری نگاہوں میں ایک جادو گھر نظر آنے لگا اور ڈاکٹر صاحب کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں میں سراسر قاصر تھا۔ نووارد خاتون ندامت آلود نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ چند منٹ کے مرگ آسا سکوت کے بعد ڈاکٹر صاحب بولے ”ہم میں سے ہر شخص طلسم ہوش ربا کی کافی سیر کر چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اب حقیقت سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ سوشیلا مجھے ان صاحبے ذرا تخیلیہ میں باتیں کرنا ہے۔ تم۔۔۔“ ابھی فقرہ ختم نہ ہوا تھا کہ سوشیلا موج رنگ و لہو کی طرح ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کرسی میرے قریب کر لی۔ ”آپ سمجھ گئے ہونگے سوشیلا میری بیوی ہے۔ دیس نگر کی اُس مہنگا مہیز رات کو جب بد قسمتی سے آپ کو یہ حادثہ پیش آیا میں اور میرے چند جاں نثار دوست ہی حملہ آوروں کی صورت میں نمودار ہوئے تھے۔ راول صاحب کی جس صاحبزادی کا اغوا ہوا وہ سوشیلا ہی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل سننے کے آپ یقیناً مشتاق ہونگے، اس لئے میں واقعہ کو ابتدا سے بیان کئے دیتا ہوں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں محبت اور جنگ میں سب طریقے مستعمل

ہوتے ہیں اور پھر اُس جنگ میں جس کا انعام سوشیلا ایسی ہمہ صفت موصوفہ پری ہو۔ اس لئے اپنے طرز عمل کی مدافعت کی میں چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بزرگوں کے دیرینہ مراسم کی وجہ سے میں اور سوشیلا بچپن میں اکٹھے کھیلے، ایک ہی ماحول میں پرورش پائی اور حسن اتفاق سے مذاق بھی یکساں تھے۔ سن بلوغ کو پہنچ کر کچھ فطری حجاب اور کچھ تعلیمی مشاغل نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔ لیکن بچپن کی طبعی موانست میں اب محبت کے جذبہ رنگین نے ٹککھاریاں شروع کر دیں۔ اور یہ جذبہ ہر کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا گیا۔ سوشیلا کی والدہ کے فراہم کردہ داروں میں ایک شخص پرکاش صاحب تھے جنہیں دنیوی وجاہت اور زمینداری کے ٹھاٹھ نے بہت بر خود غلط بنا رکھا تھا۔ اُن کے متول نے سوشیلا کی والدہ کی آنکھوں کو خیرہ بنا دیا تھا اور اُن کا ذاتی ارادہ ہی تھا کہ وہ سوشیلا کو اُس کے حوالہ کریں گی۔ لیکن سوشیلا کے والد زمانہ شناس آدمی تھے۔ اُن کی نگاہ دور بین میں امارت کی ظاہری رونق کی بہ نسبت تعلیم اور ذاتی اخلاق کو بہت زیادہ وقعت حاصل تھی۔ پرکاش صاحب بظاہر نکستوں میں طالب علم تھے لیکن اُن کے وقت کا زیادہ حصہ سیر و شکار ہی میں گزرتا تھا۔ اس دوران میں نے کالج کی تعلیم کامیابی کے ساتھ ختم کر لی تو میرے والد نے مجھے انگلستان بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن اس ارادہ کی تکمیل سے قبل وہ مجھے علاقہ دنیوی کا پابند بنا دینا چاہتے تھے تاکہ مغرب کی مغرب اخلاق آزادی سے محفوظ رہ سکوں۔ میرا اسید جس آتش سوزاں کامرتے شکار ہو رہا تھا اُس کے اخبار کا وقت آپہنچا تھا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر سوشیلا میری رفیق زندگی بننے سے انکار کر دیا تو میں ساری عمر تنہا ہی بسر کروں گا۔ اُدھر سوشیلا کی والدہ کو یہ چڑھتی کہ وہ اپنی لڑکی پرکاش کو دے گی۔ راؤ صاحب یوں تو دانا اور روشن خیال بزرگ ہیں لیکن گھریں بیوی کے سامنے بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ اُن کی یہ حالت بہت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ انہوں نے بیوی کو بہت سمجھایا کہ ”پرکاش کی دولت اُس کی فضول خرچیوں کی کب تک تکمیل ہو سکے گی۔ زمانہ کی روش کی طرف دیکھو۔ ذاتی حصّہ مٹاؤ علم کا لازوال خزانہ انسان کی سب سے بڑی ملک ہے۔“ لیکن وہ کج فہم اور ضدی عورت۔ ان حقائق کو سمجھنے سے عاجز تھی۔ راؤ صاحب نہ ریا ہٹ سے مجبور ہو گئے تو انہوں نے کہا بہتر ہے پرکاش بھی انگلستان جلسے اور دونوں امیدواروں میں سے جو پانچ سال کے بعد واکٹر بن کر واپس آئے گا میں اپنی بیٹی اس کو دوں گا۔“ پرکاش شخص جذبہ زقا سے متاثر ہو کر اپنی متلع علم کا جائزہ لئے بغیر عازم انگلستان ہو گئے۔ راؤ صاحب کا یہ فیصلہ حقیقتہً میرے حق میں کیا گیا تھا۔ میں آئیڈلزم میں اپنے داخلہ کا انتظام پہلے ہی سے کر چکا تھا۔ چنانچہ پانچ سال جس باغی محنت و زہنت میں میں نے گزارے اُس کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں۔ صرف سوشیلا کا عشق میرے گرتے ہوئے قدموں کو سنبھالا



رہا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ زمانہ مفارقت ختم ہوا اور میں اُس کڑی آزمائش میں سے گذرن بن کر نکلا۔ کامیاب و  
 باہر آدمی واپس وطن آیا۔ پرکاش صاحب بیچارے ابتدائی امتحانات سے بھی عمدہ برائے ہو سکے تھے لیکن  
 میری واپسی کی خبر سن کر وہ بھی ہندوستان لوٹ آئے اور پھر قسمت آزمائی شروع کر دی۔ میرا پڑا بھاری تھا یہ  
 عائد کردہ شرط پوری کر چکا تھا، اس لئے موعودہ الغام کا حقدار تھا۔ لیکن سوشیلا کی والدہ نے پھر میرا سناہ روک  
 لیا۔ وہ مُصر تھی کہ خواہ ادھر کی ادھر کی دھڑکیوں نہ ہو جائے وہ اپنی بیٹی پرکاش کو دے گی۔ حالات کی یہ باپوس کُن  
 منزل تھی جب میں نے آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ پر تھی راج شاہ دہلی کی مثال میرے سامنے تھی کہ کیونکر اُس  
 نے سنجوگتا کو حاصل کرنے میں اپنی جان جو کھوں میں ڈال دی تھی۔ آخر میں بھی راجپوت ہوں۔ میری رگوں میں  
 بھی وہی خون جاری ہے۔ میں جلتی آگ میں کودنے سے کیوں گھبراتا؟ میں نے سوشیلا کو اپنے ارادے سے مطلع  
 کیا تو شکر ہے وہ میدانِ عشق میں ثابت قدم نکلی۔ خنیہ نامہ و پیام سے دقت مقرر کر لیا گیا اور اپنے چند جاں نثار دوستوں  
 کے ساتھ میں نے دھاوا بول دیا۔ تعین مقام میں کچھ غلط فہمی ہو گئی۔ اس لئے راؤ صاحب کے چند ملازم جاگ اٹھے  
 اور خلافِ توقع وہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔“  
 ڈاکٹر صاحب کی مسحور کن تقریر ختم ہوئی، گویا طلسم ٹوٹا۔ اور مجھے زندگی میں دوسری مرتبہ اس بات کا  
 احساس ہوا کہ حقیقت افسانہ سے زیادہ دلکش اور حیرت انگیز ہوتی ہے۔

عاشقِ بٹالوی

## التجائے بیمار

بیمار ہوں، تنہا رستی و صحت بھیج      نادار ہوں، یہ گئی ہوئی دولت بھیج  
 اقبال گنہ کا بھی یہی مطلب ہے      حقدار ہوں، جلدی کرم و رحمت بھیج

آزاد

# زندگی

(اُردو میں ایک سانیٹ)

ہماری زندگی بھی کس قدر ویران منزل ہے،  
 شبِ تاریک ہے رستے سے ہم نا آشنا بھی ہیں،  
 مسافتِ دور کی ہے شکوہِ سنج ”رہنما“ بھی ہیں،  
 بیاباں ہے ہلاکی تیرگی، سنسان منزل ہے!  
 خدا جانے ہمارے اس سفر کا مدعا کیا ہے؟  
 ”وطن“ اپنے وطن سے دور، ایسی سرزمین میں ہم؛  
 اُڑے جاتے ہیں اس تاریکی ہول آفریں میں ہم!  
 ہماری آرزو کیا ہے، ہمارا منتہا کیا ہے؟

یہ تاریکی یہ ستاٹا یہ دہشت خیز ویرانی  
 کمالِ خشگی سے پاؤں کی طاقت رہی جائے  
 رہا جائے الہی! حوصلہ بھی دمبدم اپنا!

اگر ہو اس قدر سامانِ لغزش کی فراوانی  
 تو اس حالت میں ہم سے کس طرح امید کی جائے؛  
 بے اک، حادثہ موہوم پر ثابت قدم اپنا!

راشد و جہدی

## وادی کا سوار

اپنی عمر میں صرف تین بار میں نے اُسے دیکھا تھا — اُسے جس کا نام بھی مجھے معلوم نہیں۔  
اگرچہ ہماری تینوں ملاقاتیں عجیب سے عجیب تھیں لیکن آخری کا تصور بھی دل میں لانے ہوئے اب تک مجھ پر  
کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

سردیوں کا اختتام تھا اور رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں اپنے قصبے کو بہت پیچھے چھوڑ کر مغرب  
کی سمت سفر کر رہا تھا۔ رات کی خاموشی میں شاہراہ پر صرف میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بلند ہوتی تھی اور وہیں صحرا  
کی تاریک وسعت میں جسے میرا گھوڑا پیچھے چھوڑ چکا ہوتا بھٹکتی ہوئی غائب ہو جاتی تھی۔ چاند ابھی ابھی ڈوبا تھا  
اور میں اپنی نگاہیں شفق پر جھائے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر ساکت بیٹھا تھا۔

میں اُسے خوف سے تعبیر نہیں کر سکتا لیکن ایک تنہائی سی ضرور مجھے محسوس ہو رہی تھی جب میں نے ایک  
دوسرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اپنے پیچھے سنی — وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا قدم بہ قدم اُسی راہ کو پا ل کرتا ہوا  
جس پے سے میرا گھوڑا گزر جاتا تھا معلوم نہیں کیوں میرے دل میں ایک خوف سا اٹھا۔ میرا خیال لمبے بھر کے لئے مجھے نشانہ  
پسے اٹھا کر بھوت پریت کی بستی میں جا داخل ہوا۔ وہ انسان کو نابود کر دینے کے لئے کئی کئی سوانگ بھر رہے تھے۔  
لیکن ان متوہم تصورات کو جلد میں نے وہیں چھوڑ دیا اور اب میرے دل میں اپنے ہمراہی کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔  
میں نے رفتہ رفتہ اپنے گھوڑے کی رفتار ہلکی کر دی تاکہ وہ مجھ سے آگے نکل جائے۔ لیکن مجھے تعجب ہوا جب اُس نے  
بھی اُسی آہستگی کے ساتھ تاریکی میں اپنے گھوڑے کی رفتار کو ہلکا کر لیا۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر پیچھے  
رہنا چاہتا ہے۔ اور اُس کے اس طرز عمل کو دیکھ کر مجھ پر سے خیالات اُس کی نسبت شبہ میں تبدیل ہو گئے کبھی وہ  
ایک پھلائے کی شکل اختیار کر لیتا جا انسان کے ہمیس میں میرا تعاقب کر رہا تھا۔ اور کبھی وہ ایک قاتل کی صورت  
میں تلوار کھینچ کر پیچھے سے مجھ پر حملہ کرنے پر آمادہ معلوم ہوتا۔ اور کبھی میرا تصور اُسے ایک ڈاکو کی شکل میں میرے سنا  
لے آتا جو مجھ سے میرا گھوڑا اور بٹوا طلب کر رہا تھا۔

لیکن جب صبح کی روشنی اچھی طرح پھیل گئی اور میں نے مڑ کر اُس کے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی تو اپنے تمام  
گذشتہ شبہات پر مجھے مذاہرت سی ہوئی۔ سانولے رنگ کا ایک وجیہہ نوجوان جس کا چہرہ نجدہ لیکن مسرور تھا

نگے سر اپنے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اُس نے گھوڑے کو وادی کی طرف موڑتے ہوئے مجھے سلام کیا اور کہا ”دوست شاید ہم کبھی ملیں گے اس کے بعد اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پہاڑی کے پیچھے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کے گھوڑے کا بال مشرق کی سمت سے چلنے والی نسیم میں بہتے ہوئے اس قدر دلغریب نظر آئے کہ اُس وقت اُس کا برہنہ سر ہوتا تھا بالکل قدرتی معلوم ہوا۔ اور کئی میل آگے نکل جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ٹوپی پہنے ہوئے نہ تھا۔ میں نے خیال کیا یہ شخص عجیب و غریب ہے۔ کاش میں نے اُس سے اُس کا نام پوچھ لیا ہوتا۔ سال بھر میں کئی بار مجھے اس راہ سے گزرنے کا اتفاق ہوا لیکن پھر کبھی تصور میں بھی نہیں نے اُس نوجوان کو نہ دیکھا جو رات کا ایک پہر میرا ہم سفر رہا تھا۔

خزاں کے موسم میں پھر ایک بار مجھے اپنا وہی سفر درپیش ہوا۔ دوپہر کے وقت جب سفر کا سیدھا اور رضا رائے ختم ہو چکا تھا میرا گھوڑا چکر دار ڈھلوانوں اور پتھری وادیوں میں سے تھکا ہوا غیر معمولی سست رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ اور خود میرے ہاتھ پاؤں بھی سفر کی کوفت سے ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ ایک بے جان بوجھ کی طرح میں اپنے تھکے ہوئے جسم کو گھوڑے کی پیٹھ پر لادے ہوئے جا رہا تھا اور تعجب ہے کہ مجھ سا صحرا نورد انسان بھی اُن لوگوں کی حالت پر رشک کئے بغیر نہ رہ سکا جو اس وقت اپنے علاقہ کی ریل گاڑیوں میں آرام سے بیٹھے دنوں کا سفر نونوں میں طے کر رہے تھے۔

اگر دفعۃً اپنے گھوڑے کا پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے میں نیچے اترنے پر مجبور نہ ہو جاتا تو یقیناً اس سنان وادی میں جہاں کو سوں تک آبادی کا نشان نہ تھا میں کبھی ٹھہر کر سستانے کا خیال بھی نہ کرتا لیکن اب اپنے گھوڑے کو تھوڑی دیر کے لئے کھلا چھوڑ کر میں ایک بڑے سے پتھر کے سہارے زمین پر بیٹھ گیا کبھی کبھی پہاڑی درختوں کا کوئی خزاں زدہ پتہ شاخ سے جھڑک میرے قریب گر جاتا اور اس سنان وادی میں جہاں موت کی سی خاموشی طاری تھی یہی ہلکی سی آواز زندگی کی کشمکش کا سب سے نمایاں ثبوت معلوم ہوتی تھی۔ اس تنہا مقام میں جس کا سکون خود میرے دل کے تمام ہنگاموں کو بھی سرزد کر چکا تھا معلوم نہیں کیوں میری چشم تصور دفعۃً اُسی سانولے چہرے والے نوجوان کو میرے سامنے لے آئی ہیں اُسے بھول چکا تھا کیونکہ بھول جانا بہ نسبت یاد رکھنے کے ہمیشہ آسان ثابت ہوا ہے۔

اُس نے صرف ایک بار رات کی تاریکی میں میرے ساتھ چند گھنٹے بسر کئے تھے لیکن وہ جو میرے ساتھ عمر

بسر کر چکے تھے معلوم نہیں کیوں اس وقت اُن کی بجائے اُس نے میرے تصور میں جگہ لے لی میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر تاریکی میں میرا گھوڑا اسی شاہراہ پر جا رہا تھا اور میرے پیچھے پیچھے اُسی طرح کچھ فاصلے پر اُس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اب وہ ڈاکو تھانہ قاتل اور نہ چھلاوہ۔ بلکہ ایک ایسا اجنبی فوجوان جس کے عجیب و غریب انداز کا میرے دل میں احترام تھا۔ اُس کے الفاظ حرف بہ حرف مجھے یاد آگئے ”دوست! شاید ہم پھر کبھی ملیں۔ لیکن پھر ابھی تک وہ مجھ سے نہ ملا تھا اور یقیناً مجھے اُسی طرح بھلا چکا تھا جیسے میں اُسے آج تک بھول رہا ہوں۔ نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور دور تک اُن راستوں پر نگاہ ڈالی جن سے گذر کر میں آ رہا تھا۔ اور میں نے خیال کیا اگر اس وقت وہ یہاں آجائے تو میرا اور اُس کا اگرچہ کوئی بھی تعلق نہیں لیکن میں ضرور اس سب کو لرزہ دے دوں گا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ میں وہ مرنے تو نہیں چکا؟ اور جس طرح ایک غیر کی موت کے متعلق ہم سوچ سکتے ہیں اُسی بے دردی کے ساتھ میں نے اس کی موت کے امکانات پر غور کرنا شروع کیا۔

مجھ پر غنودگی سی طاری ہوئے لگی اور میں تھوڑی دیر کے لئے وہیں سو گیا۔ خواب میں پھر میرا گھوڑا وادی میں سے سرسبز دوڑتا ہوا جا رہا تھا اسی طرح میرے نکلے ہوئے جسم کو اٹھائے ہوئے جس میں اب نہ کھنک کے علاوہ نقابت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ گھوڑا معمول سے بہت زیادہ تیزی کے ساتھ جا رہا تھا اور اُس کی رفتار کے انداز میں ایک وحشت تھی جس نے مجھے خوفزدہ بنا دیا۔ میں اُسے روکنے کی بے حاصل کوشش کرتا رہا لیکن وہ دیوانہ وار مجھ سے باگیں چھڑا کر بھاگ نکلا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور گھوڑا اسی بے پناہ رفتار کے ساتھ پہاڑ کے دامن میں پتھروں اور اونچے نیچے ٹیلوں کو پھانڈتا ہوا منوشت انداز میں بھاگا جا رہا تھا۔ پھر دفعۃً ایک جھیل کے کنارے وہ دھڑام سے میرے سمیت زمین پر آ رہا۔ اور گرنے لگے میرا نیزہ سیدھا میرے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ جھیل کا پانی آئینہ کی طرح روشن تھا اور اس کی سطح پر مجھے اپنا عکس تیرتا ہوا نظر آیا۔ لیکن ایک سانولا چہرہ، برہنہ سر، اور سیاہ چمکیلے بال جن کے باریک باریک چکر ہو میں دلغریب انداز کے ساتھ مل رہے تھے۔

میں جاگ اٹھا لیکن خواب کا اثر کچھ دیر تک مجھ پر اس طرح مسلط رہا کہ اپنی بیداری خواب اور اپنا خواب مجھے بیدار معلوم ہونے لگا۔ جنگل میں چاروں طرف وہی بھیا نک خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کچھ دور سے میرے گھوڑے کے خشک گھاس چبانے اور کبھی کبھی آہستہ سے ہنسنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بہت سے خشک پتوں کے درمیان ایک کانٹا میرے پہلو کے قریب کپڑوں میں اٹکا ہوا تھا اور میرا نیزہ میرے قریب زمین پر پڑا تھا۔

میں دوبارہ سفر پر روانہ ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن ابھی تک میرے دل پر پشیمانی سی طاری تھی۔ چنڈیل

کا فاصلہ طے کر لینے کے بعد مجھے اونچے اونچے بے برگ و بار درختوں کے درمیان پانی کی ایک تحصیل نظر آئی۔ میں نے اپنے گھوڑے کا رخ اُدھر پھیر لیا اور جب ہم پانی کے قریب پہنچ رہے تھے میرا گھوڑا وحشتناک آواز میں چیخ اُٹھا اور اُس کے قدم وہیں زمین پر جم گئے۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر تحصیل کے کنارے ایک بڑے سے پتھر کے قریب جو کچھ مجھے نظر آیا اب بھی اُس خوف اور دہشت کے اثر کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے شانوں کو زور سے حرکت دی۔ مجھے شک ہونے لگا کہ میں کہیں پھر سو تو نہیں گیا؟

وہ عجیب و غریب نوجوان جسے صرف ایک بائیں نے صبح کی روشنی میں دیکھا تھا اور جس کی یاد آج دفعتاً میرے خواب اور میرے خیال میں بیدار ہو گئی تھی سامنے زمین پر چپٹ لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے پہلو کے عین درمیان ایک نیزہ پیوست تھا، اور اُس کے آس پاس کی زمین پر کئی سرخ نشان تھے۔ اور ایک سیاہ گھوڑا جس کے سفید دانت باہر نکل آئے تھے اپنا زخمی سر جھکائے اُس کے قریب کھڑا تھا۔

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن یوں محسوس ہوا گویا عمر بھر کے لئے میری قوت گویائی سلب ہو چکی ہے۔ پھر اُس نے خود ہی سر کے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ اُس کا رنگ زرد تھا اور اُس کے چہرے پر نزع کی تکلیف ظاہر ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یوں ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت کوئی ایسا خیال اُس کی روح پر طاری جس کے مقابلے میں وہ اس تکلیف کو بھی بھول چکا ہے۔

اُس نے بغیر کراہنے کے دھیمی اور صاف آواز میں کہنا شروع کیا ”دوست! تم بہت دیر سے آئے۔ اپنے جلد میرے پہلو سے کھینچ لو، میرے جسم کو یہیں چھوڑ دو اور ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کے بغیر یہاں سے جنوب کی سمت جاؤ۔ شام کے قریب سب سے پہلی بستی نہیں ملے گی اور اس میں داخل ہونے سے پہلے پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا مکان ہو گا۔ اُس کی کین کو شام سے پہلے پہلے میرے مرنے کی اطلاع دے دینا۔“

میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ”کوئی ایسا نشان بتا دو جس سے اس کی شناخت میں مجھے زیادہ سی زیادہ آسانی ہو جائے۔“ اُس نے کہا ”اُس کا نشان؟ اور پھر دفعتاً اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس کی آواز جو دھیمی پڑ چکی تھی پہلے سے بہت زیادہ صاف اور بلند ہوتی گئی اُس کے دل کے تمام جذبات تصویر کی طرح کھینچ کر اُس کے چہرے پر اتر آئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے دل اور اپنی روح سے بول رہا ہو۔ ”وہ دنیا میں صرف ایک ہے تنہا۔ جس کا دل اس تھیل کے شفاف پانی سے زیادہ روشن، زیادہ پاک، اور زیادہ بے لوث ہو جس کے دل میں محبت آسمان کے نیلے سمندر کی طرح بے پایاں ہے اور جس کی وفاس پڑ سکون و اداسی سکوت سے زیادہ خاموش، زیادہ پائیدار ہو اور جس کا چہرہ اس چمکتے ہوئے روز روشن کہیں زیادہ حسین اور پیارا ہے۔“

پھر اُس نے کمزور آواز میں کہا میں نے آج تک کبھی اُس سے وعدہ خلافی نہ کی تھی میں اپنی موت کو زیادہ آسا سمجھتا ہوں نسبت اس کے کہ اُسے اپنی عمر میں ایک دن کے لئے بھی میری وفا میں شبہ ہو یا آخر اُس کی زبان راک گئی اور اُس نے اپنی آنکھیں آہستہ آہستہ بند کر لیں۔

میں نے اپنا کانپٹا ہوا ہاتھ اُس نیزے پر ڈالا جو اس کے پہلو کو چیر کر آگے نکل گیا تھا اور اپنی غصہ بھری بہت قوت کو جو اُس وقت میرے جسم میں باقی رہ گئی تھی اکٹھا کر کے میں نے نیزہ اوپر کو کھینچ لیا۔ نیزے کا چھوٹا سا سرا اُس کے پہلو کے اندر ہی ٹوٹ کر رہ گیا اور خون کا ایک سیلاب ابل کر پھیل کے کنارے پھیلنے لگا۔ میں نے جھک کر اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالی، لیکن شاید اسی وقت جب میں نیزے کو اُس کے جسم سے علیحدہ کر رہا تھا اس کی روح پر داز کر چکی تھی۔

میں نے اپنے گھوڑے کی باگیں جنوب کی سمت موڑ لیں۔ میرا گھوڑا تیز جا رہا تھا اور خیالات کے جوتم میرا سرا آگے کو جھکا ہوا تھا۔

شام کے قریب پہاڑ کے دامن میں میں نے اُس چھوٹے سے مکان کو پالیا۔ اُسکی دیواریں سرسبز سرسبز کی عجیب بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں جن کے پتوں کا رنگ سبزی کی بجائے آم کی کونپل کے مانند سرخی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اور سرخ پتوں کے درمیان سفید پھولوں کے بڑے بڑے گچھے کھلے ہوئے تھے۔ مکان کا دروازہ بالکل کھلا تھا اس طرح جیسے کسی کو پہلے ہی وہاں میرا انتظار ہو۔ اور اس سے پہلے کہ میں اندر داخل ہوتا مجھے ایک نوخیز لڑکی دروازے میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ مرنے والے کے الفاظ میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ واقعی وہ حیرت انگیز طور پر حسین تھی۔ اتنی کہ جب میں نے اُس کے چہرے کی طرف نگاہ اٹھائی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں جن کا کوئی ایسا جادو ہے جس سے میں ابھی مسحور ہو جاؤں گا۔ خود بخود میری نگاہیں اُس کے سامنے جھک گئیں۔ اور اب بھی اگر کوئی الگ الگ اُس کے خدو خال کی نسبت مجھ سے سوال کرے تو میں سولے اس کے کچھ نہ کہہ سکوں گا کہ وہ نور کا ایک پیکر تھی جسے کسی سحر نے انسانی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔

میں اُس کے لئے کس قدر بُری خبر لے کر آیا تھا۔ میرا دل کانپ گیا۔ اُسے اُس نوجوان کی موت کی خبر سنا مجھے اتنا ہی دشوار معلوم ہونے لگا جیسے کوئی قاتل قتل کے بعد اپنے سنگین جرم کا اقرار کر رہا ہو۔

اُس نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا "شاید آپ یہاں رات بسر کرنے کے لئے آئے ہیں لیکن سستی میں آپ کو یہاں کی نسبت بہت زیادہ آرام ملے گا۔ مجھے یوں معلوم ہوا کہ اُس کی آنکھوں کا سحر اثر کر اب اُس کی

آوازیں ساری ہو گیا ہے۔ میں نے رکتی ہوئی آوازیں کہاں آپ ہی کے پاس ایک پیغام لے کر آیا ہوں اور یہ پیغام اُس شخص کا ہے جو آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔“

اُس نے میری بات سن کر اس طرح اپنے سر کو جنبش دی جیسے اُسے میری بات مضحکہ خیز طور پر ناقابل یقین معلوم ہوئی ہے اور بولی ”پیغام؟ نہیں وہ خود آج یہاں آنے والا ہے۔“ میری زبان سے اس کے جواب میں ایک حرف بھی ادا نہ ہو سکا گویا واقعی میں جھوٹ بول رہا تھا۔ اپنے دل کی دھڑکن کو روکتے ہوئے میں پھر بولا ”افسوس میں ایک بہت بُری خبر لے کر آیا ہوں۔“

اُس نے ذرا گھبرا کر لیکن بظاہر دلچسپی سے کہا ”اُس کی زندگی میں دنیا کی کوئی بری خبر مجھے تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔“ لیکن آج وہ مر چکا ہے۔۔۔ مجھے خود بھی معلوم نہ ہوا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور جب الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے تو خود میرے کانوں نے ان کو اس طرح سنا جیسے کہنے والا کوئی اور تھا۔

اُس نے مجھ پر ایک ایسی نگاہ ڈالی جو سراپا تر خوف، جوش اور دیوانگی سے معمور تھی۔ پھر ایسی آوازیں جسے آواز کی بجائے چیخ کہنا زیادہ موزون ہوگا اُس نے کہا ”سچ کہتے ہو؟“

میں نے کہا ”ہاں میرے الفاظ میں اتنی ہی سچائی ہے جتنا وہ اپنی محبت میں صادق تھا۔ اور میرے دل میں اُس کی شرافت کا اتنا ہی احترام ہے جس کے قابل اُسے خدا نے بنایا تھا۔“

پھر میں نے جلد جلد اُسے سب کچھ بتا دیا اور یہ سب سن کر وہ بولی ”کیا اُس نے پھر یہاں آنے کے متعلق تم سے کچھ نہیں کہا؟“

اس انوکھے سوال کا مطلب سوائے جنون کے میں کچھ نہ سمجھ سکا اور خود اُس کے چہرے سے بھی ظاہر تھا کہ یہ جملہ بلا ارادہ اُس کے منہ سے نکل گیا ہے میں نے کہا ”اس کی وصیت کے مطابق میں نے اُس کے جسم کو وہیں چھوڑ دیا اور اب سے پہلے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ لیکن اُس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

جس طرح ہم ڈوبتے ہوئے سورج پر آسانی سے نگاہ ڈال سکتے ہیں اُسی طرح پھر میں نے ایک نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالنے کی کوشش کی اور کہا ”میرا خیال ہے اُسے جنگل میں کوئی ایسا حادثہ پیش آگیا جس میں کسی دشمن کا دخل نہیں۔“ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہی اور پھر اُس نے کہا ”مجھے اس کا یقین ہے اس کا دوست کوئی نہیں تھا اور اُس کا دشمن بھی کوئی نہیں تھا۔“ پھر وہ وہاں سے چلی گئی۔

میں چاہتا تھا کہ وہ روئے اور انتم کرے جس طرح عام انسانوں کا قاعدہ ہے اور مجھ سے ذرا ذرا سی بات بھی اس کے متعلق پوچھ لے۔ میں اُسے صبر کی تلقین کروں اور جو کچھ میں سمجھنا چاہتا ہوں، سب اُس سے پوچھ سکوں لیکن ان میں سے ایک



بات بھی نہ ہوئی۔ خلاف توقع نہ تو وہ روئی اور نہ بے ہوش ہوئی اور نہ پھر اُس نے اس کے متعلق مجھ پر کوئی استفسار کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ غم سے بالکل دیوانی ہو گئی ہے، اور اس وقت اُس سے کوئی بات کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ اب نہ وہ خود بخود بھتی تھی اور نہ میری کوئی بات سنتی تھی۔

سُبحِ غروب ہو گیا اور میرے اعضا اُس وقت اس قدر تھکے ہوئے اور بیرادل اتنا افسردہ تھا کہ کہیں اور جا کر رات بسر کرنے کی جگہ تلاش کرنا یا کسی سے بات تک بھی کرنا مجھے سخت دشوار معلوم ہوتا تھا۔ آخر میں نے وہیں مکان کے دو کمروں میں سے ایک میں ات بسر کرنے کی اجازت چاہل کر لی جہاں بستر اور روشنی کے علاوہ مجھے کھانے پینے کی بھی چند چیزیں مل گئیں۔

پہلے پہل اُس کے چہرے سے جس دیوانہ وار غم کا اظہار ہوا تھا اُس کی جگہ اب اطمینان لے چکا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی اور مختلف کاموں میں اس سرگرمی سے مشغول تھی جیسے کوئی کسی خاص تیاری میں ہو کھیں وہ آہستہ آہستہ گانے لگتی اور کبھی خود ہی مسکرا پڑتی ہیں اُس کے اس عجیب و غریب طرزِ عمل سے حیرت زدہ تھا۔ نہ میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ بالکل دیوانی ہو گئی ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ اُس نے اُس غریب نوجوان کو اپنی وفا اور محبت کے متعلق محض دھوکے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آخر میں انہیں خیالوں میں اپنے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

معلوم نہیں رات کتنی گزر چکی اور میں کب سے سو رہا تھا جب خواب کی سی حالت میں مجھے محسوس ہوا کہ آہستہ سے کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے بعد روشنی گُل ہو گئی۔ کوئی میرے ہنیکہ کے قریب جھکا اور پھر اُسی آہستگی سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد میں شاید تھوڑی دیر کے لئے بے خبر ہو گیا لیکن دفعۃً پھر مجھ پر وہی نیم بیداری کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ دُور سے کسی گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آ رہی تھی اور دُور ہونے کی بجائے یہ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی چلی آئی گھوڑا شاید وہیں آ کر ٹک گیا کیونکہ آخری ٹاپ کی آواز عین میرے کمرے کی پچھلی دیوار کے قریب سنائی دیا۔ پھر نیند مجھ پر پورا غلبہ پالینے کو تھی جب میں نے دوسرے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے ایک آواز سن کر دروازہ نہایت آہستگی سے کھلا اور پھر اُسی آہستگی سے بند ہو گیا۔

اب میں پوری طرح جاگ اُٹھا تھا۔ دوسرے کمرے سے مسلسل اور آہستہ آہستہ کوئی آواز اُٹھ رہی تھی۔ میں نے کانا لگا کر سننا شروع کیا کوئی ہلکی ہلکی سسکیاں اُٹھا رہی تھیں اور دوسری اس میں زیادہ ہلکی اور بہم ایک آواز تھی جسے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ پھر بے اختیار ہو کر میں اپنے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس پراسرار لڑکی کے پاس جو تمام دنیا سے بیگانہ معلوم ہوتی تھی اس وقت کون آیا ہے۔ میرے تارک کمرے اور دوسرے کمرے کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی

لیکن ان کے درمیان دروازہ کوئی نہ تھا۔ میں رات نہ ٹول کر باہر نکل آیا۔ دوسرے کمرے میں روشنی جل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ لہنے اور سسکیاں بھرنے کی آواز اب صاف سنائی دینے لگی۔ چپک کر دیکھنا شاید بزدلی سمجھا جائے لیکن اس پر اسرار ماحول میں یہ بزدلی بھی مردانگی سے کم نہ تھی۔ میں نے دروازے میں سے بہت کوشش کے بعد ایک باریک سی درز ڈھونڈ لی اور اندر کی طرف جھانکے لگا۔ کوئی شخص دروازے کی طرف بیٹھ پھیرے بستر کے قریب بیٹھا تھا اور وہ لڑکی گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی اُس کے کپڑوں میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے سیاہ اور لمبے بال پریشانی سے اُس کے شانوں پر بکھر گئے تھے اور اس شخص کا ایک ہاتھ اُس کے سر پر تھا۔ پھر میں نے اُسے جلتے ہوئے سنا لیکن ایسا آہستہ کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کے جواب میں لڑکی نے اپنا سر اوپر اٹھالیا اور روتی ہوئی بولی۔ ”آہ اب ایک لمحہ بھی میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ پھر اس شخص نے پہلے سے بھی زیادہ دھیمی آوازیں کچھ کہا اور لڑکی سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ ”مجھے اس کی پروا نہیں، چلو کیونکہ اب وقت بہت تھوڑا باقی ہے۔“

میں خود بخود دروازے سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرا خون جوش سے میرے جسم میں کھولنے لگا میں نے سوچا آؤ وہ بھولا نوجوان اس عورت کے لئے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا تھا۔ اُس کی انتہائی وفا کا ثبوت اُس کا بے گورکھن جسم اب بھی جنگل میں پڑا ہے لیکن وہ عورت جس کی وفاداری پر اُسے اپنی وفا سے بھی زیادہ اعتقاد تھا لیکن جو اُس کی موت پر ایک آنسو بھی نہ نکال سکی تھی اب کسی دوسرے کے سامنے کس بے تابی سے رو رہی ہے۔ اور اب بھی ان آنسوؤں میں اُس کی یاد شامل نہ تھی۔ کیا سب عورتوں کی فطرت اسی طرح ہوتی ہے؟ میں خوف اور نفرت سے کانپ اُٹھا۔

کمرے کے اندر سے ایک ہلکی سی چیخ کی آواز بلند ہوئی اور دفعۃً دروازہ کھل گیا جو کچھ مجھے نظر آیا اُسے دیکھ کر اگر اُس وقت میری جان بھی نکل گئی ہوتی تو تعجب نہ تھا۔ وہ سانولے چہرے والا نوجوان جس نے جنگل میں جھیل کے کنارے میرے سامنے جان دی تھی برہنہ سر میرے سامنے گزرتا گیا۔ اب بھی اُس کا پہلو خون سے سرخ ہو رہا تھا اور اُس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی اس کے ساتھ ساتھ ایک اور سایہ تھا۔ ایک عورت کا سپولی۔ اور اس کے پہلو پر بھی ٹھیک اسی جگہ مجھے ایک سرخ دھبہ نظر آیا۔

شاید اُس نے بھی میری طرف دیکھ لیا۔ اور اس کے بعد وہ دونوں میری آنکھوں سے اچھل ہو گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا اور کہاں رہا مجھے کچھ معلوم نہیں۔

دن کو جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر بندھا لیا ہوا تھا۔ سورج شاید بہت دیر کا نکل آیا تھا کیونکہ تیز دھوپ پہاڑ کے دامن میں چاروں طرف خوب پھیل چکی تھی اور پہاڑ پر سے کول کی کائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں اپنے بستر سے اٹھ بیٹھا۔ دن کی روشنی میں جب ہر چیز پہلے کی طرح مجھے حقیقی شکل میں نظر آئی تو رات کا عجیب و غریب



# خمریات

(۱)  
اے شاد پور شوخ دل کے دریائے میں آ  
اے بادۂ تابسم سے چلنے میں آ  
اے ابرسیاہ، داغِ عصیاں وضو سے  
اے حرکتِ کمرنگار منجانیے میں آ

(۳)  
سورمہ خواہنے سے دل شاد ہو جا  
صد شکر غم سے سر آواز ہو جا  
منجانیے میں آ اگر نہ رہا ہوتا  
خانی و بدی کا علم برباد ہو جا

(۲)  
شے سے فنا ہوئے ہیں تیری کے غدا  
جہا پیرِ راحت اثرِ جامِ شراب  
معلوم ہو تو کہے کہ ہم میں یہ دم  
معلوم ہو تو کہے کہ یہ عالم خواب

(۴)  
جو نہ نہ تو جو حیرت سے وہ نوید نہ ہو  
بہشتی اور غیرت سے یہ شرب نہ ہو  
گم کر مہرِ سحر نہ ہو اگر جب ہم شرب  
منجانیے میں آ تم کو بھی عیب نہ ہو

تاقب  
کا پوری

# بازیافت

آاے محبوب عشق کی منزل کو وہیں سے شروع کر دیں جہاں ہم نے اسے چھوڑ دیا تھا؛  
 آاُس خواب کے رشتوں کو از سر نو استوار کریں جسے گزشتے میں ہو گئیں؛ اور پھر ایک دوسرے سے  
 محبت کریں اور خوش ہو جائیں خواہ دنیا اس محبت کی تضییع ہی کیوں نہ کرے۔  
 آجذبات کی ان قبروں کو جو ہمارے ہجر اور ہمارے وصال کے درمیان حائل ہیں؛ اور اُن آنسوؤں کو جنہوں  
 نے وقت کی زرکاریوں کو زنگ آلو کر دیا ہے؛ اور اُس کمر کو جو ہماری امید کے چمن پر چھا گیا ہے یکسر بھلا دیں۔  
 آہم اُس سرد مہر اور کینہ ورتقدیر کو بھول جائیں جس نے ہمارے محبت کرنے والے دلوں کو اپنا کھلو بنا لیا؛ او  
 ایک مرتبہ پھر سرور محبت کے عیش و نشاط میں زندگی بسر کریں۔  
 نہیں، ابھی وقت بیت نہیں گیا!

میرے چہرے کی بڑی بڑی جھریوں کو بھول جا؛ میرے سفید سفید بالوں کو بھلا دے؛ میری آنکھوں میں کچھ  
 لے محبوب! تیری محبت وہاں پہلے سے زیادہ روشن چمک رہی ہے۔

نیری پیاری آنکھوں کی کوئل گہرائیوں میں اپنی جوانی کی کھوئی ہوئی یاد مجھے نظر آرہی ہے؛  
 وہ یاد جو تیری وفا کی مقدس روشنی سے منور ہے؛ اور جس میں ہمارے شفاف آسمانوں کا نیل جھلک  
 رہا ہے۔

ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑ لے اور آہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے پیچھے کی طرف روانہ ہوں، نہیں آگے کی  
 کی طرف۔۔۔۔۔ مستقبل کے اُس روشن ملک کی طرف جو ہمارا ماضی تھا۔

عبدالعزیز

(ایلا ویلر ولکاکس)

# رحمن کی ایک غزل

تیری خواب آلود آنکھیں میری نیند اڑا لے گئیں  
 تیرے ہونٹوں نے مئے ناب کی لذت کو مات کر دیا۔  
 نہ آنکھوں میں آنسو باقی رہے اور نہ صبر کی کوئی صورت رہی  
 میری بے صبری نے آنکھوں سے پانی کو خشک کر دیا۔  
 میرے دل کو مطرب کے نغموں نے چھلنی کر دیا  
 او عقل کو ساقیوں کی شراب نے گم کر دیا۔  
 ایک ساقی اور یا دوسرے مطرب نے مل کر  
 میرے جوف سینہ سے دل کو اڑا لیا۔  
 میں تجھ پر نثار کیا ہوا کہ تو میرے دل کو چھین لے گیا  
 میں مطمئن ہوں، آخر میرے محبوب کے سوا اے کوئی اور تو نہیں لے گیا۔  
 تیرا خط تیرے مصحفِ رخ کے سیاہ حروف ہیں  
 اس کتاب کے شغل نے مجھ پر خور و خواب حرام کر دیا۔  
 زہد و پرہیزگاری کا جو سراپا بھی میرے پاس تھا  
 اُسے تیرے حن کا سیلاب بہا لے گیا۔  
 رحمن نے اپنے دل پر محراب کا نقش بنایا تھا  
 لیکن تیرے نقشِ ابرو نے اُسے بھی محو کر دیا۔

پروانہ اور بلبل دونوں کی حالت دیکھ کر حیران ہوں  
 کہ تیرا رخ انور شمع ہے یا پھول!

(پشتو)

# محفل ادب

## عربی خون کا ایک گرم قطرہ

اسپین میں جب مسلمانوں کی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہوا تو اس انتشار کی حالت میں کچھ مسلمان افریقہ چلے گئے، کچھ اسپین ہی میں رہ کر عیسائیوں کے مظالم سننے لگے، اور کچھ لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر کے ان مظالم سے نجات حاصل کر لی، اور عیسائی سلاطین کے مقربین میں داخل ہو گئے، انہی عیسائیوں میں اموی خاندان کا ایک بہادر بھی شامل تھا جس کا اسلامی نام محمد بن امیہ تھا، لیکن عیسائی ہونے کے بعد الدن السنطونیو مولائی دی قرطبہ ذقار کے نام کر پکارا گیا۔ اس کی صلب سے تین لڑکے پیدا ہوئے جن میں ایک کا نام فرٹنڈو، دوسرے کا مارٹین اور تیسرے کا لوئس تھا۔ الدن فرٹنڈو جو خاندانی لقب سے ممتاز تھا نہایت آزاد اور سہل عشری شخص تھا اور غرناطہ کی مجلس امرا کا ممبر منتخب ہو گیا تھا۔ اس تعلق سے وہ ۱۵۶۷ء میں یعنی فتح غرناطہ کے ستر سال بعد ایک بار مجلس امرا میں جب کہ اُس کی عمر ۲۲ سال کی تھی شریک ہونے کے لئے گیا، اور جیسا کہ تمام امرا کا دستور تھا، اپنی تلوار دروازے پر رکھ دی، لیکن اپنے خنجر کو اپنے پاس سے جدا کرنا پسند نہیں کیا۔ اُس کی یہ روش صدر مجلس کو پسند نہیں آئی، اور اہج اُس نے سختی کے ساتھ اس کو سرزنش کی فرٹنڈو نے اس کے یہ سخت الفاظ سنے تو اس کا عربی خون کھولنے لگا، اور اس نے ان الفاظ میں اس کا جواب دیا،

میں جس طرح چاہوں گا مجلس میں شریک ہوں گا کیونکہ میں سلاطین بنو امیہ کی اولاد ہوں، اور میرے آبا و

اجداد اس ملک کے بادشاہ تھے۔

اب صدر مجلس نے اور بھی سخت الفاظ استعمال کئے، اور اُس کو ایک وحشی قوم کا فروزاں دیا، اس پر فرٹنڈو کا غصہ اور تیز ہوا اور اس نے دفعۃً اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد تمام امرا نے اُس پر متفقہ حملہ کیا تو اُس نے اپنے خنجر سے سب کا مقابلہ کیا، اور دروازے تک اُن کو دھکیلتا ہوا چلا آیا، دروازے پر پہنچ کر اپنی تلوار بھی ہاتھ میں لے لی، اور ایک خاص محلے میں جس میں عرب خاندان آباد تھے نکل آیا۔ چند ہی دنوں میں ان عربوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کی شریک کار ہو گئی، اور اس نے ان کی ایک فوج مرتب کی اور ان کو لے کر پہاڑ کی طرف روانہ ہوا جہاں بہت سے عرب آباد تھے۔ یہ سب کے سب عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آکر اس پہاڑ کے دامن میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔

سب کی پشت پناہی حاصل کرنے کے بعد اُس نے اپنی بادشاہی کے ساتھ اسپینی سلطنت کے خلاف عام جہاد کا اعلان کیا اور اس کے جھنڈے کے نیچے عربوں کی ایک معتد بہ جماعت جمع ہو گئی، جن کے سینے اسپینیوں کے بغض و عداوت کا آشکدہ بنے ہوئے تھے۔ اس جماعت کو لے کر اُس نے اسپینیوں پر حملہ کیا اور اُن کے خون کا دریا بہا دیا۔ اسپینی سلطنت نے بھی بڑے عزم و استقلال کے ساتھ اس پُر جوش اسلامی جماعت کا مقابلہ کیا، لیکن ایک مدت تک ناکام رہی۔ بد قسمتی سے فرٹنڈو کا ایک چچا زاد بھائی جس کا نام ابن امیہ تھا، اور جو ان عربوں پر حکومت کرنے کا خواہشمند تھا اس کا رقیب بن گیا۔ اُس نے سازش کر کے اس کو دھوکے سے قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن کر دوبارہ اسپینیوں کے ساتھ جہاد شروع کیا، لیکن اس کے اعوان و انصار کو رشوت دے کر اسپینیوں نے اُس کو قتل کر دیا، اور اُس کے قتل ہو جانے کے بعد تمام عرب حملہ آور منتشر ہو گئے اور چار سال کی جنگ کے بعد اسپینیوں نے ان پر قابو پالیا۔ فرٹنڈو کا باپ اپنے بیٹے کی موت کے بعد مدِ رید میں پناہ گزین ہو گیا تھا اور ایک فوجی سردار کی سفارش سے سلطنت نے بھی اس کو اور اس کی اولاد کو معافی دے دی تھی۔ اس معافی کے بعد اس کا دوسرا فرزند الدن مارٹین خاندانی لقب سے ممتاز ہوا لیکن اُس نے اپنے تیسرے بھائی الدن لوئس کے ہاتھ اپنی تمام جائیداد فروخت کر دی اور اب اس کا لقب الدن لوئس اسی اینیسیا، غواروس قرار پایا۔ لیکن لوئس کے دوسرے بھائی مارٹین کا لقب صرف مارٹین دی والورباتی رہ گیا۔

اسپین میں اب تک یہ معزز خاندان اپنی قدیم وجاہت کے ساتھ قائم ہے اور اس کی تاریخ کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس وقت اسپین میں انہی دونوں مقصود فریقوں کی یادگار آج کل ایک مشہور اسپینی شاعر ہے جس کا نام فیلا سبا سا ہے۔ والورجو مارٹین کے لقب کا ایک جزو ہے، اس شاعر کی ماں کے خاندان کا نام ہے، اور اس کا باپ جنرل فیلا سبا سا کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، جس نے اسپینیوں کی طرف سے الدن فرٹنڈو کا مقابلہ کیا تھا، اس مشہور شاعر یعنی فیلا سبا سا کی ولادت ٹھیک اُسی مکان میں ہوئی ہے جس میں اس کا اسلامی اور عربی دادا فرٹنڈو دھوکے سے مار ڈالا گیا تھا۔ حریر کی جس سبز رنگ چادر میں فرٹنڈو قتل کیا گیا تھا وہ فیلا سبا سا کی ماں کے پاس بطور ایک یادگار کے محفوظ تھی، لیکن فیلا سبا سا نے چودہ برس کی عمر میں ایک تنہوار کے دل اس کو استعمال کیا تو بلجیم کے ایک شخص نے اس کو خریدنا چاہا اور اس سے اس کے فروخت کرنے کی درخواست کی۔ پہلے تو فیلا سبا سا نے انکار کیا، بعد کو اس کے اصرار سے مجبور ہو کر بلا قیمت ہدیہ دے دی۔ اب اُس کے خاندان میں اس چادر کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا محفوظ رہ گیا ہے۔



اس عبرتناک واقعہ پر اب اگرچہ صدیاں گزر گئی ہیں اور خود مسلمان اپنی اسپینی شان و شوکت کا افسانہ بھول چکے ہیں، لیکن اس شاعر کی رگوں میں اب تک عربی خون دوڑ رہا ہے، اور وہ بار بار اپنے اشعار میں اس بھولے ہوئے افسانے کو دہراتا رہتا ہے۔

چند روز ہوئے ایک عیسائی عرب سیاح نے امریکہ میں بمقام سان باولو اس سے ملاقات کی ہے، اور اس کے حالات، سوانح، معاشرت اور کلام پر ایک شاعرانہ ریویو کیا ہے جو المقتطف نومبر ۱۹۲۹ء میں چھاپی اور جس سے تلخیص ماخوذ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس شاعر کی عمر ۵۵ سال سے زائد نہیں ہے، وہ سگریٹ پیتا ہے اور کھانے پینے کی پرواہ نہ کرتا ہے، ہمیشہ شاعرانہ تخیلات میں غرق رہتا ہے، اور یہ استغراق اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ شور و غل سے اُس کے شاعرانہ خیالات میں کوئی خلل نہیں واقع ہوتا، وہ شعر لکھتا رہتا ہے اور اس کے بچے اُس کے گرد کھیلتے کودتے اور شور مچاتے رہتے ہیں، اُس کی تصنیفات کی تعداد اس وقت تک ۵۸۰ تک پہنچ چکی ہے۔ اگرچہ کثرت تصنیف کسی مصنف کی کوئی خاص فضیلت نہیں ہے، لیکن اس شاعر نے کثرت تصنیف کے ساتھ خوبی تصنیف کی فضیلت بھی حاصل کر لی ہے، اور نظم و نثر دونوں میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کی تصنیفات کی برسے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اکثر کا موضوع عرب اور عربیت ہے۔ اس کے ایک ناول کا نام ”قصر لولو“ ہے جس میں اُس نے ابن احرر کے زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے جو غرناطہ میں پیش آیا تھا۔ ایک ناول میں جس کا نام ”ابن امیہ“ ہے، وہ واقعات لکھے ہیں جو فتح غرناطہ کے ستر سال بعد وہاں کے بچے کچھ عربوں کو پیش آئے۔ ایک ناول میں جو ”بادیہ“ کے نام سے مشہور ہے، وہ واقعات لکھے ہیں جو صحرا میں پیش آئے۔ اور ان واقعات کے سلسلے میں اہل عرب کی شجاعت، فیاضی اور مہمان نوازی وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ غرض اس کے تمام ناولوں کے کیکرٹ اور میر و عرب ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرب، آثار عرب اور ان کی اندلس کی معاشی و اخلاقی زندگی کی تاریخ سے کس قدر واقف ہے۔ اس کا کلام تمام انواع شاعری کا جامع ہے۔ وہ کبھی ہنستا ہے، کبھی روتا ہے، کبھی ریختہ ہوتا ہے، کبھی خوش ہوتا ہے جس منظر کی تصویر کھینچتا ہے وہ آنکھ کے سامنے مجسم ہو کر آ جاتا ہے۔ نہروں کی روانی کا نقشہ دکھاتا ہے تو کانوں میں پانی کے گرنے کی آواز آ جاتی ہے، ابھی ایک پُر سکون نہر کے کنارے کھڑا ہے کہ دفعہ ایک مولج سمندر کے کنارے پہنچ جاتا ہے، ابھی تم اس کو زمین پر دیکھ رہے تھے کہ چشم زدن میں آسمان پر نظر آنے لگتا ہے۔

وہ عربی زبان کا شیدائی ہے۔ ایک بار وہ صاحب فراش تھا، میں اس کی عیادت کو گیا تو اس نے کہا کہ ”بیٹھو اور سنو“ اس کے بعد اس نے ایک قصیدے کے چار بند مجھ کو سنائے، اور انہی سے اس کی شاعرانہ توسلکا ان ازمہ، انما سے، ذخا الخ ۱۱۰ کے بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

غزناطہ ! آہ غزناطہ  
تیری شان و شوکت میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا،  
تیری نمرود میں سے آسودوں کے سوا اور کیا رہ گیا ہے؟ جو تیری سلطنت کے کھنڈروں پر یہ رہتے ہیں

تیری نسیم صبح  
صرف آہ سرد ہے

غزناطہ ! آہ غزناطہ  
تو صرف ایک ویران کھنڈر ہے،  
سمنوں کے لوگ  
تیرے مصیبت زدہ فرزندوں کو افریقہ لے جاتے ہیں

اور وہاں تیرے فرزند اُن کے خوف سے  
روتے ہیں، نہیں اپنی ناامیدی ہوتے ہیں

غزناطہ ! آہ غزناطہ  
موج اُن کے لئے روتی اور آہ سرد بھرتی ہے جب اُس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اُن کو نظر آتی ہیں،  
اُس نے میرے سامنے یہ اشعار پڑھے تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور جب وہ اُن کو ختم کر چکا تو ہم پر ایک خاموشی طاری ہو گئی، جو رنج و غم سے لبریز تھی۔ اس کو خود یہ قصیدہ بہت محبوب ہے، اور جو جلسے اُس کے اعزاز میں کئے جاتے ہیں، اُن میں اس کو باوازی بلند پڑھتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اس عربی جوش و تفاخر کا اظہار صرف اہل عرب کے سامنے کرتا ہے، بلکہ وہ تمام مجالس میں اہل عرب کی یاد دہانی کرتا ہے، اور لومۃ لائیم کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ میں نے جب اس کو اپنی تصویروں اور اس پر پرنگاری زبان میں جس کو وہ سمجھتا ہے بطور تہنید و تقدیم کے کچھ الفاظ لکھنے چاہے، تو اُس نے اس کو گوارا نہیں کیا، اور عربی زبان میں جو اس کو بہت محبوب ہے، ان الفاظ کے لکھنے کی خواہش کی۔ مجھ کو اس کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ اہل عرب کے ساتھ اس کی محبت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ ایک بار میں نے اُس کو دیکھا کہ مدبریدی سڑکوں پر عربی لباس پہنے ہوئے گھوم رہا ہے۔ عام طور پر اگرچہ وہ مغربی وضع میں رہتا ہے، لیکن اس کے اندر عربی دل کی دھڑک محسوس ہوتی ہے، اُس نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ اسپین پہنچ کر ہر ممکن کوشش اس غرض کے لئے کرے گا کہ غزناطہ میں عربی ادب و تاریخ کی تعلیم کے لئے ایک عظیم الشان یونیورسٹی قائم کی جائے۔

”معارف“

### روح نشاط

یہ راز ہے میری زندگی کا  
پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا  
پھر فشر غم سے چھڑتے ہیں  
اک طرز سے یہ ہم، دل دی کا

کوئین پہ اک نگاہِ نفیریں      اللہ سے دماغ بے دلی کا  
 پھر ڈھونڈ رہا ہوں بے خود تپیں      کھویا مٹوا لطفِ آگہی کا  
 اولفظ و بیاں میں چھپنے والے      اب قصد ہے اور خامشی کا  
 مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات      جینا ہے کمالِ منتہی کا  
 عالم پہ ہے اک سکونِ بینا      یا عکس ہے میری خامشی کا  
 یاس ایک جنونِ ہوشیاری      امید فریبِ زندگی کا

”جامعہ“

## پیغام

صبح تیرے لئے مبارک ہو! اے آتشیں رکاب کے سوار! تیرا سفر کامیاب ہو!  
 اگر اُس حسین پر پی چہرہ کے پاس تیرا گدڑ ہو تو میرے آقا! اُس کی ابرو سے خمدار کا حال ضرور پوچھنا! آہ!! اب وہ  
 میرے لئے آپس نہیں بھرتی!  
 اُس کی فراموش گاری ایک سنگِ مزار ہے، جو میری آرزوؤں کی لغش پر غضب کر دیا گیا ہے! اے سوار! اُس  
 سے التجا کرنا کہ وہ مجھے اس قیدِ مرقد سے رہا کر دے!

اُس سے کہنا کہ میں غزل سرا ہوں

اُس کے جسم کا، جو آبِ رواں میں شلخِ نیلو فر کی طرح جھک جاتا ہے!  
 اُس کے رخسارِ آتشیں کا، جو شمیمِ ارغوانی کی طرح شوخ رنگ ہے!  
 اُس کے ہلالِ ابرو کا، جس پر کاجل کی تھر تھر عقل و دانش کو مسح کر دیتی ہے!

خدارا اُس سے کہنا کہ میں گیت گاتا ہوں

اُس کے پیلے لبوں کی شان میں، جو ایسے سرخ ہیں جیسے کسی شمع کے شعلے کا عکس شہدِ پرنالچ رہا ہو!  
 یا شربِ لالہ رنگ کی صراحی آگ کی روشنی میں جھلک جھلک کر دل کو بدھوش بنا رہی ہو!

اُس سے کہنا کہ میں توصیف کرتا ہوں

اُس کی گردنِ بتوریں کی، جس کے گرد بھمتِ پاش پھولوں کے ہار لپٹے ہوں!

”نیزنگ خیال“

# نئی کتابیں

**مرقع ادب** - حصہ دوم، مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری۔ اس کتاب میں اُن نایاب خطوط کا مجموعہ ہے جنہیں ملک کے ادیبوں نے ایک دوسرے کے نام لکھا۔ ان خطوط سے بعض شعر اور مشاہیر کے سوانح زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اکثر خطوط میں شاعرانہ نکات و حقائق پر بحث ہوئی ہے۔ لکھنے والوں میں مرزا غالب، علامہ شبلی، مولانا حالی، حضرت اکبر الہ آبادی، حضرت امیر مینائی، مولانا شرار اور حضرت ریاض کے نام قابل ذکر ہیں۔ حجم ۳۱۲ صفحات، قیمت دو روپے۔ پتہ۔

صدیق بک ڈپو، امین آباد پارک، لکھنؤ

**ڈالی کا جوگ** - از پروفیسر حامد الد صاحب انٹرمیڈیٹ بی اے۔ اس مجموعہ میں "ڈالی کا جوگ" اور دس دوسرے افسانے شامل ہیں جن میں سے نو طبع زاد ہیں اور دو ماخوذ ہیں۔ شروع میں تیرہ صفحے کا ایک مقدمہ ہے جس میں افسانے کی ابتدا اس کی ترقی اور اس کے اصول سے بحث کی گئی ہے۔ حجم ۲۲ صفحات، قیمت درج نہیں۔ انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

**کائنات ادب**، مولفہ محمد عبد الحمید صاحب حمید میٹھی سابق ایڈیٹر "نظارہ"۔ یہ کتاب میٹرک پولیشن کے نصاب کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اس میں اردو زبان کے مسلم الثبوت ادبا و فضلا کے مکتوبات، مضامین اور نظمیں درج ہیں آخر میں تمام اہل قلم کے مختصر سوانح حیات بھی دیے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتخاب موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق نہایت اچھا ہے۔ حجم ۳۳ صفحات، پتہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، سول لائنز، علی گڑھ۔

**اسرار شریانیہ** - مع مجربات انصاریہ، مصنفہ حکیم محمد عبد الوہاب صاحب انصاری ہلوی۔ اس میں فاضل نے نبض کے متعلق بصیرت افروز مجتہدانہ مقالات لکھے ہیں اور اپنے سینکڑوں مجربات افادہ عام کے لئے پیش کر دیے ہیں۔ حکیم صاحب کی اس بے غرضانہ اور مخلصانہ خدمت کی قوم کو قدر کرنی چاہئے۔ حجم ۳۴ صفحات، قیمت تین روپے۔ حکیم محمد عبد الحمید صاحب انصاری، جامع مسجد، دہلی سے طلب فرمائیے۔

**مجموعہ رواق** - مصنفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول۔ یہ نان کو آپریشن کے زمانے کا ایک افسانہ ہے جسے سلیس اور دلکش انداز میں لکھا گیا ہے۔ حجم ۶۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ چار آنے، مینجر لیڈر پریس، الہ آباد سے منگائیے۔

**تحفہ ہندو پورپ** - مصنفہ مولوی نعمت الدین صاحب گوہری، اے۔ اس کتاب میں بعض مجاہد القوت

تاریخی و علمی استدلال کئے گئے ہیں۔ مثلاً سامی اور آریہ اقوام میں نسلی اعتبار سے غیریت نہیں اور مذہب اور پہلوی اور اور انگریزی وغیرہ زبانوں کی اصل عربی ہے۔ حجم ۹۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے، ناشر چودھری عبدالرحمان صفائی، آد، قادیان۔

**ماڈرن بک کیپنگ**، مصنفہ سید ہادی حسین صاحب رضوی۔ اردو زبان میں حساب نویسی کی مختصر لیکن جامع کتاب ہے۔ حجم ۷۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ ناشر حکیم غلام مصطفیٰ صاحب بک سیلر، حکیم منزل، محلہ کندہ گراں، لاہور۔

**اسلام اور بیش نلزم**۔ از حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حجم ۸۴ صفحات، قیمت چار آنے، ناشر مہتمم البلاغ بک ایجنسی، نمبر ۵، گوال منڈی، لاہور۔

**اسلام اور غیر مسلم**۔ از مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب، حجم ۷۲ صفحے، قیمت آٹھ آنے، ناشر مسلم بک پوبلشرز شریف ضلع پٹنہ۔

**نعمۃ اور سلام**۔ حجم ۷۴ صفحے، قیمت بارہ آنے، مصنفہ ناشر مولوی محمد علی شاہ صاحب میکش، میوہ کٹڑہ، اگرہ خیر البشر۔ مرتبہ حکیم ایم اے زیدی صاحب، حجم ۸۴ صفحے، قیمت دو روپیہ، ناشر نظم تبلیغ ہاؤس، کچا باغ، دہلی۔  
**مسلمانوں کی ایجا دیں**۔ از مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب، حجم ۸ صفحے، قیمت تین روپیہ، ناشر مسلم بک پوبلشرز شریف ضلع پٹنہ۔  
**خط لاتین بجائے فارسی**۔ تقریر آغا بی محمد علی صاحب پروفیسر نظام کلج، حجم ۲۸ صفحے، قیمت چار آنے، ناشر شعبہ جامعہ معارف ایران، حیدر آباد (دکن)۔

**سلیقہ تحریر**۔ اردو میں خط نویسی، مضمون نگاری کی تعلیم از جناب محمد مسلم صاحب ایم اے۔ ایم اے ایل، پروفیسر سینٹ کولہاڑ کلج، ہزاری باغ، (صوبہ بہار)، حجم ۱۶۰ صفحے، قیمت ایک روپیہ۔

**روح کی پوجا**۔ کلمہ گو زمینداران پنجاب سے دو دو باتیں، از شیخ عبدالرحیم صاحب بی اے ایڈووکیٹ، حجم ۱۶ صفحے، قیمت درج نہیں۔

**ماضی و حال مدرسۃ العلوم**، منظرہ حسن مارہروی، لکچرار انٹر میڈیٹ کلج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ حجم ۳۲ صفحے، قیمت چار آنے۔

**عراق کے تاریخی مقامات**، سیر عراق کے متعلق ضروری معلومات کی تفصیل، ناشر نارتھ ویسٹرن ریپبلک، مہید کوارٹر آفس، لاہور۔

# بہترین ادبی کتابیں

**ادبستان :-** یہ کتاب حضرت خلیفۃ دہلوی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے خلیفۃ صاحب کی انشاء کے لطیف ایسی ندرت کاریوں کی حامل ہے جن کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہئے لطافت بیان کے ساتھ سلاست زبان آپ ہی کا حصہ ہے اکثر مضامین کو اصلاح اخلاق و معاشرت کے مقصد کے تحت ایسے موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا تحسین کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تذبذب نزل 'مخلص' قصہ 'مجبور گناہ'، درہ موت، اندرتِ ذوق و نظر، سورہ یوگی، انسانیت و شعریت تو خاص طور پر ایسے مضامین ہیں کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت بہتر نہیں ہوتی اور ایسا گداز پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اصلاحِ فاعاٹص کی بہت ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ریاضِ قصا ویر اور حضرت اختر شیرانی مدبر خیالستان، لاہور کا ایک نکش مفید شریک شاعت ہیں جس میں انہوں نے مختلف افکارِ نظر سے مصنف کی ادبی خصوصیات پر تنقید کی ہے۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی یہ ایک قابلِ دید کتاب ہے۔

اربابِ ذوق نے اس ساس قدر پسند کیا ہے کہ مدبر صحیفہ نمایاؤں لاہور نے ادبستان کی اشاعت کو ایک رانقہ رخصت قرار دیتے ہوئے مہتمم کتب خانہ ناشر العلوم لاہور کو ان کے ذوق انتخاب پر مبارکباد دی ہے قیمت مجلہ نہری چار

**بہری داستان حیات** ایسی امریکی عجوبہ روزگار اندھی، بہری، گونگی گرجو ٹیٹ خاتون مس سہلین کیلر کی خود نوشت سوانحی کا اردو ترجمہ از مسٹر خادم جمی الدین بی بی اے بی بی ٹی ایم اے ڈی دلیڈ جس میں مس سہلین کیلر کے اُن حیرت انگیز کمالات کا ذکر ہے جو اُس نے مختلف علوم و فنون میں اپنے بہترین حواس اہل ہونے کے باوجود صرف چھوٹے کی قوت کی تربیت و ترقی سے حاصل کئے۔ مس سہلین کیلر کی زندگی اور کارناموں نے قولِ انسانی تربیت کے بابے میں نیا باب کھول دیا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے عام سیکل اور مدرسین کو ایسی معلومات حاصل ہونگی جن سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ یہ کتاب سکول لائبریریوں کے لئے ایک صاحبِ مدارس لاہور ڈویژن نے منظور فرمائی ہے قیمت مجلہ چار

**دنیا کے بہترین افسانے** :- اس کتاب میں دنیا کے تمام ممالک مثلاً ہندوستان، انگلستان، روس، فرانس، امریکہ، جرمنی، اٹلی، یونان، ہالینڈ، بلجیم، بلغاریہ، پولینڈ، یوگوسلاویہ، یوگوسلاویہ، عرب، یہودی، ترکی، ایران، چین اور جاپان کے ۳۴ بہترین افسانے درج کئے گئے ہیں۔ کتاب کی خوبیوں کے متعلق صرف اتنا کہ دینا کافی ہے کہ اس کے مرتب و مترجم منصور احمد ایڈیٹر، بہاول

ہیں جن کے طرز تحریر کو ادبی دنیا میں خاص وقعت حاصل ہے ان کی نظر انتخاب صرف انہی افسانوں پر پڑی جو موجودہ دگر نشہ زنی کے افسانہ نگاری کی جان سمجھے جاتے ہیں کتاب نہایت اعلیٰ کاغذ بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ تیار ہوئی ہے قیمت کا جلد عام کا مہیا بہ زندگی: ہندوستان میں ہر ایک شخص خواہ وہ مزدور ہو یا سربراہ وارانہا جرمو یا کارگر عام طور پر ناکامی و نامرادی اس کا پیچھا نہیں بھڑتی شکر ترقی اور بد حالی سایہ کی طرح ساتھ لگی رہتی ہے اس عام حالت کے خلاف جو جوان زندگی کی کشمکش میں کامیاب ہو کر شہرت و عظمت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی تڑپ رکھتے ہیں انہیں جو پدری غلام جید رخان صاحب سابق مدیر صداقت کلکتہ کی اس جدید کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو حقیقت ایک امریکن ماہر اقتصادیات کی انگریزی تصنیف کہ اردو ترجمہ ہے ان کے لئے یہ کتاب ایک مختصر رفیق کا کام دے گی۔ کامیابی اور ترقی کے جو نکتے اور گراں کتاب میں درج ہیں ان پر عمل کر کے ناکام نہیں ہو سکتے قریباً ہر الہامی افسانے نے انبیائے کرام کی زندگیوں کے حالات بہترین اسلوب اور لطیف اردو زبان میں پیش کئے گئے ہیں ہر مسلمان کو اس کتاب سے یہ اثر و نوازنا چاہئے۔ یہ کتاب حضرت میکش مدیر روزنامہ انصاف لاہور کی بہترین تصنیف ہے قیمت ۱۰

نارنج المشاہیر مولفہ قاضی محمد سلیمان صاحب پشترنج پٹیل جس میں سچا پس نامور بزرگوں، بادشاہوں، وزیروں اور شاعروں کے حالات درج ہیں۔ کتاب مجلد و مطالعہ قیمت عام

خطبات نبوی: حضرت محمد مصطفیٰ احمد حق تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام خطبات متبرکہ جو آپ نے مختلف موقعوں پر ارشاد فرمائے۔ ضروری حالات و واقعات۔ قیمت ۱۰

پارچہ بانی بالتصویر۔ اس کتاب میں زمانہ حال کی فن پارہ بانی کے متعلق لکھی ہوئی بہترین انگریزی کتب سے روٹی کی شہادت سے لے کر سون، تانہ، بھائی، کپڑا، بننے اور کپڑے کے مختلف فیہر این بنائے نمک کی جملہ معلومات درج کی گئی ہیں مطالب کو واضح کرنے کے لئے تصاویر بھی دی گئی ہیں قیمت عام گر کا گریس ارکان کو لکھی انگریزی کے سگری کی سفارش پر عمر گائے پیل اس کتاب میں گائے پیل کی سچا خرید اور پرورش کے متعلق بہت مفید معلومات درج ہیں اور ان کے جوارض کے انتباب، علامات اور علاج کے لئے آسان اور سہل الحصول نسخے بھی دیئے گئے ہیں مطالب کے متعلق سولہ تصاویر بھی دی گئی ہیں اس کتاب کا مطالعہ عام لوگوں بالخصوص کاشتکاروں اور ان لوگوں کے لئے بہت مفید ہے جن کو رات و ن گائے پیل کی خرید و فروخت اور پرورش سے سابقہ رہتا ہے قیمت ۱۰

رفعات اکبر یہ کتاب مولانا اکبر مرحوم کے رفعات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ہندوستان کے بہترین افراد کے نام لکھے ان رفعات میں حضرت اکبر کی جملہ خصوصیات، سادگی زبان، بے ساختہ پن، پر لطف انداز زبان، بہترین اشعار وغیرہ نمایاں ہیں سلیس پر مبنی اور لطیف و دلکش انشاء دیکھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے محکمہ تعلیم نے سچا طور پر اس کی قدر کی ہو قیمت ۱۰

ہفت پیکر یعنی ناک نامور شاعر حضرت حنیف کے سات طبعزاد اور دلکش افسانے جو جبرائیل تحسین طلب کرتے ہیں قیمت ۱۰

حجاب زندگی - اس کتاب کے متعلق مولانا سالک مدبر انقلاب لاہور کی رائے ہے کہ مصنف کتاب سید عابد علی صاحب عابد کا انداز بیان آپ کی قوت تحریر اور متانت اظہار خیالات نہایت قابل قدر ہے۔ اس مجموعہ میں بعض مضامین تو ایسے ہیں کہ کہ اردو زبان کے سرائے میں فخر کے ساتھ پیش کئے جائیں۔ داستان پارینہ، اسخطا شباب اور بنائے اشکال دیتینوں افسانے حجاب زندگی کے افسانوں میں درج ہیں (معمولی تحریریں نہیں) اردو ادب کے نہایت پاکیزہ جواہر ہیں قیمت ۱۲

نمرینات النجوم علم النحو کے متعلق جناب غلام سرور خالص صاحب پرنسپل اسسٹنٹ دائر کٹر سرگزشتہ تعلیم صوبہ سرحد کی قابل قدر تصنیف ہے جسے دہلی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں نے امتحان میٹرکولیشن کے لئے بطور نیکٹ ایک مقرر کیا قیمت ۸

لنگر اما مول - یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے جو سلیس اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ دیو پرلوں کے فرضی اور خلاف قیاس کی بجائے اس میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے جس کا طور میں آنا ممکن ہے۔ انداز بیان ایسا موثر ہے کہ انواع و اقسام پر نقش ہوتے جاتے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے حوصلہ جرات اور خطرے کے وقت گھبرانے کی بجائے اس سے بچنے کی تدبیر کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے بچوں کے اخلاق و عادات سنوارنے کے لئے بہت مفید ہے قیمت ۲

ولیم ٹیل یعنی ولیم ٹیل اور سوٹر لینڈ کی آزادی کی داستان جس میں ستم رسیدہ محکموں کے احساس ہباری، اقتدار لوکیت کے خلاف نفرت و سجان، انومی تحریک کی کامیابی اور لوکیت کی تباہی کی مکمل کیفیت پیش کی گئی ہے قیمت ۸

شہر شہری اور شہر تہ - یہ کتاب جناب حکیم احمد شجاع صاحب سیکرٹری پنجاب جیلڈیٹو کونسل کی تصنیف ہے جس میں ایک دوسرے کے ساتھ انسانوں کے تعاون، شہروں کے قیام اور تمام شہری ضروریات اور نظام کی ابتدائی تاریخ اور شہروں کے موجودہ نظام اور شہری زندگی کے لوازمات پر بحث کی گئی ہے جس سے واقف ہونا ہر نوعمر بچے کیلئے ضروری ہوگا

زرداد - یہ کتاب بھی حکیم احمد شجاع صاحب کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے شہنشاہ بابر کے حالات زندگی اور اس کے بہت جرات اور استقلال آموز زریں کارناموں کی کہانی اسکے بچپن کے دوت زرداد کی زبانی نہایت سلیس اور آسان اردو زبان میں بیان کی ہے طبیعت میں حوصلہ جرات اور استقلال پیدا کرنے کے لئے اس کتاب کو ضرور دیکھنا چاہئے۔ قیمت ۶

کیوں اور کس طرح - اس کتاب میں عام حادثات، واقعات اور مختلف صورتوں کے متعلق جو قدرتی طور پر دن رات ظہور میں آتی رہتی ہیں نہایت سلیس اور آسان اردو زبان میں ان کے وقوع ہونے کے اسباب بیان کئے گئے ہیں مثلاً پودے کیوں جلتے ہیں، زلزلے کیوں آتے ہیں، دن کو تارے کیوں نظر نہیں آتے، ہمیں خواب کیوں یاد رہتا ہے، مورس طرح معلوم کرتے ہیں کہ بارش ہونے والی ہے، عرض کذا ایسے میسجس سائل اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں بچوں کی عام استعداد بڑھانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت ۵

اساس القرآن - بچوں کو آسانی سے عربی زبان سکھانے اور قرآن شریف کو صحیح اور آسانی سے پڑھانے کیلئے بہترین قاعدہ ۴



## متفرقات

بہم کانسفہ	عم	فلسفہ الہیات	عم	کلیات دلی	صد	مثنوی خواب و خیال	عام	جاپان اور اسکا طبی نظم و نسق	۷
مشاہیر یونان و روم	۷	دریائے لطافت	مجلد عام	طبقات الارض	۷	علم المعیشت	مجلد ۷	اسلام و شیخزم	۷
نپولین اعظم پانچ حصے	۷	حقیقت اسلام	۱۲	تاریخ نجد	عم	رسالہ نباتات	۷	سیرۃ عمر بن ماس	عم
تاریخ فلسفہ اسلام	۷	عربوں کا تمدن	عام	صلاح کار	عم	اسباق القرآن	۷	سیرۃ النبی قسم اعلیٰ	۷
سیرۃ النبی قسم دوم	۷	کلیات شبلی اردو	۷	الغروق	عام	المأمون	۷	ابن الوقت	۷
روایت صادق	۷	مراۃ العروس	عم	اصلاح معیشت	۷	مکالمات برکے	۷	نقدون اسلام	عم
فلسفہ جذبات	۷	سیرۃ عائشہ صدیقہ	۷	بہادر خاتون اسلام	۷	سیر الصحابیات	۷	الغلاب لام	عام
سیرۃ عمر بن عبدالعزیز	۷	اسوہ صحابیات	عم	برکے اور اس کا فلسفہ	۷	بادۂ ناب	عم	لسان النیب یعنی شرح دیوان	۷
تین کمال	۷	سمنر کا چاند	۷	عروس کربلا	۷	طوفان حیات	۷	حافظ مہر حصہ فی حصہ	عام
صد پارہ دل	۷	شہید وفا	۱۰	تاریخ یہود	۷	حروب جلیبیہ	عام	سبع اور سبوت	۷
شوقین ملک	۷	روئے الکبر	۷	ملک احمد و درجہ	۷	فلورا فلورنڈا	۷	ملکہ زونبہ	۷
قیس و لبنی	۷	سکینہ بنت جبریل	۷	فردوس بریں	عم	خونگاہ محبت	۷	دیکش نندنی	۷
حسن بن صباح	۷	حسن انجلینا	۷	الافانہ	۱۲	مقدس زائین	۷	مفتوح فاتح	۷
جوابے نئی ہر دو حصے	۷	فلپانا	۷	عرب قبل از اسلام	۷	صفیقہ بین اسلام	۱۲	لببت چین	عم
شیریں ملک عجم	۷	بابک خرمی	۷	زوالی بغداد	۷	ماہ ملک	عام	فتح اندس	۷
یوسف نجمہ کمال	عام	عینب ان لہن	عم	گوہر مفقود	۷	سوکن کا جلاپہ	۷	گلدستہ عید	۱۲
سنوئی	۷	خمانہ مسجد	۱۰	الزہر	۱۲	نورۂ زندگی	۱۲	منازل ترقی	۷
محبوب خداوند	۱۲	سراب مغرب	۷	در شہوار	۱۰	امرت کی امیں	عم	شب زندگی	عم
منازل السارہ	عم	بنت الوقت	۷	صبح زندگی	۷	نشام زندگی	۷	تائبہ غیبی	۷
اسلام کا انجام	۷	خطوط اکبر	۷	یزید نامہ	۷	سفر نامہ مصر و شام	۷	اولاد کی شادی	عم
مکاتیب اکبر	عم	حکومت اور نگہب	۱۲	تجارت	۷	دنیا کے عجائبات	۷	محبت کا انتقام	عم
صبح وطن	۷	رستم و سہراب	۷	نصیحت کے پھول	۷	آئینہ عجب	۱۲	زین شہزادے	۷

# اگر آپ زبانِ عرب و محال نہ چاہتے ہیں تو

آج ہی ایک لغاتِ عربیہ "الطلب فرمائیے لغاتِ عربیہ موجودہ تمام اردو فارسی لغات میں سب سے زیادہ جامع اور نادر لغت ہے جو اہلِ اہل کی محنت اور عرقِ بزمی کے بعد تیار ہے۔ غالباً اب صدیوں تک بہادر مولانا محمد صیغیہ الرحمن خاں صاحب شرفانی صاحب المدد امور مذہبی کی استیصال کا دیکھ کر بعد ازاں انھوں نے اپنے فریضے بڑے علمدار صوفیاء اور اخبار کے مدیروں نے بھی اور پڑھ و لکھنے میں لغاتِ عربیہ میں تقریباً دس ہزار لغات قدیم و جدید عربی، فارسی، ترکی، الہی، مصری لغات کے علاوہ انگریزی، ہندی زبان کے بھی وہ الفاظ جو میانِ قسطنطنیہ وغیرہ میں مغرب مغرب ہو کر رائج ہو گئے ہیں جمع کئے گئے ہیں ہر لغت کے معنی اردو کی صاف اور سہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اس لئے ہمارا دعویٰ ہے کہ موجودہ تمام لغات میں فارسی کی کوئی لغت اس سے بہتر تو درکناس کے ہمسر بھی نہیں کوئی کتب خانہ کوئی تعلیم یافتہ گھر اس سے خالی نہ رہنا چاہئے۔

کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی دیدہ زیب صفحات ۶۲۰ تقطیع فلکیپ قیمت صرف چار روپیہ لکھہ آرڈر طلبہ بھیجئے۔ درجہ میں طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑے گا۔

المشترک

حاجی محمد سعید تاجرتب و مالک مطبع

نجیدی کا پیور



افسانہ نگاری کی دنیا میں انقلاب  
ادب لطیف اور انسانی سائیکالوجی کا بہترین مرقع

افسانہ نگاری

تہذیب کی سرگزشت

مندرجہ بالا عبارت بعض قریب خرد آدمی پیدا کرنے کے لئے تحریر نہیں کی گئی بلکہ حقیقتاً حضرت مسیح علیہ السلام کی حیرت انگیز داستان کا بیان ہے۔ افسانہ نگاری کی دنیا میں اسکی افادت نے پہلی مثال دی ہے۔ تہذیب کی سرگزشت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق و مغرب کے فلسفہ کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کی جاسکتی ہے۔ محبت کرنے کا اعلیٰ ترین اصول، مشرقیت اور مغربیت کا موازنہ کرتے ہوئے گہرا خطاب اگر آپ اردو زبان کے ترقی یافتہ ادب کو دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ افسانہ جو ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، مطالعہ کیے بغیر صرف بے حاصل ہوگا۔

ملنے کا پتہ استقلال ٹیکسٹ بکس بنی اسرائیل اسٹریٹ علی گڑھ



**نمونہ مفت** مسلمان لڑکیوں کے لیے علامہ راشد انجیری مدظلہ کا ماہوار مذہبی رسالہ بنات دہلی جاری کرائے پہلے نمونہ مفت منگا کر دیکھ سبجے۔

مصوغم علامہ اشرفی بخاری علیہ السلام کی مشہور تصنیف

# صالحات

جو تقریباً ۲۰ سال سے ناپید تھی اور کئی کئی گنی نیست پر بھی کہیں نہ ملتی تھی کئی سال کی کوششوں کے بعد

پھر چھپ کر چلتا رہے

علامہ محترم کی دوسری تصانیف کی طرح یہ بھی معاشرتی ناول ہے جس میں ایک نیک لڑکے کی زندگی کے دو واقعات بیان کیے گئے ہیں جو اکثر گھرانوں میں پیش آتے ہیں نہایت مؤثر پیرایہ میں بتایا گیا ہے کہ عاشق زار باپ کس طرح اولاد کی جان کا دشمن اور جاہل سوتیلی ماں کیونکر سوتیلی اولاد کے خون کی پیاسا ہو جاتی ہے۔ سلیقہ شعاریہ ویاں کس طرح شہر کی لالچ رکھتی اور سعادتمند بچیاں کیونکہ اپنے ایشارے دنیا کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ آج سے چالیس سال پہلے کے مسلمان گھرانوں کی معاشرت کا فرسٹ الفاف میں اس خوبی سے کینیچا گیا ہے کہ انسان داد و سے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ وہی نیکل تصنیف ہے جس کے متعلق شہسوار العلماء ڈاکٹر ذبیح السجیل مرحوم نے کہا تھا کہ قصص میں صالحات پہلی کتاب ہے جسے میں نے شروع سے آخر تک پڑھا اور اگر ابھی یقین کامل نہ ہوتا تو کہہ دیتا کہ صالحات سیری بھی ہوئی اور مسودہ جلدی گئی۔

ملک کے بایں ناز غلام موری منجمل حفظ ماحیام کی سائے ہے کہ صاحب  
کا مژدہ جسم ہی جیات ابوی سے بالا ہے۔ صاحبیات پر آج سے  
تیس سال پہلے کے تمام مشہور اخبارات نے نہایت شاذ اور یوں کہ تھے  
یہی دو کتاب ہے جس نے صنعت کے کمال انشا پر دازی کی ہاں  
تمام ملک میں بٹھا دی گئی، صاحبیات قلعہ معلیٰ کی بیگانی زبان میں  
لکھی گئی ہے۔ طرز تحریر سب سے مدثر اور مدیں ڈوبا ہوا کافز  
نہایت نفیس لکھا گیا اعلیٰ درجہ کی قیمت صرف ۱۰۰

عصمتی دسترخوان

کھانے پکانے کی دُن تو کتنی ہی کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں مگر کسی میں وزن غلط ہے تو کسی میں ترکیبِ اڈیٹر صاحبِ عصمت کی اہلیہ محترمہ آمنہ نازلی صاحبہ ہندوستان کے قربانِ ہر حصہ کی ۸۰ مصحفی پہنوں کی مدد سے جو کتابِ عصمتی دستِ فرخان مرتب فرمائی ہے وہ اس موضوع کی تمام کتابوں پر بے شک غلبہ کیلئے کونکہ عصمتی دستِ فرخان میں تمام ترکیبیں تجربہ پر کرنے کے بعد درج کی گئی ہیں۔ انگریزی، جرمنی، ترکی، عربی، ایرانی، افغانی، گجراتی، شیشیری، مدراسی، جید آبادی، بہاری، بنگالی، برہاری اور ورنی لکھنؤ کے کھانوں کی صحیح ترکیبیں شمار ہیں۔ ۴۰۰ سے بھی زیادہ ایک ایک قسم کا کیا گیا کئی طرح تیار کرنے کی استعداد تفصیل اور کسی کتاب میں نہ ملے گی۔ کھانے کے متعلق ضروری رہائات اور بادِ چرخہ نظام پر پختی مضامین نے کتاب کی خوبوں میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ عصمتی دستِ فرخان کی قیمت اسی غریبوں کے مقابلہ میں کبھی نہیں ہے۔

صرف دُرُودِ سَیِّدِ (عَالمِ) علاوہ محضولِ طَواک

**عصمتی کریشیا** کریشیا شرفین ہند کے لیے نہایت کارآمد خدۂ ۲۵ عصمتی ہند نے جرمن

نیازی میں حصہ لیا ہے۔ اور جسے مفید ہائیں لکھ کر فنِ کوشش کی شہرہ  
ہر محترمہ فاطمہ بیگم قاضی محمد حسین صاحب بنگلہ کے رتب کی ہے۔ خادم  
اوس، پچھ پیچ و دوکان، جامع مسجد ملی، تاج محل، شیرپور، گلستانہ،  
آک بنگلہ، بنگلہ ناگاری، پردار گورٹے، گلہ طبع، عید مبارک،  
غیرہ وغیرہ ۸۵ ایچ ایچ نمونے ہیں جن میں ۱۱ دلا دیز چار ایچ  
۹ غلبہ دت کرنے نفیس امرشن ہی قیمت ۱۰۰ روپے

سوفی

موسیقی محترمہ مغز، ہندوں، مرزا، امرا کے ایسے کا کھلے ہوا دل کا پیر  
اخلاقی ناول سورت کے لیے جس میں ایران کی معاشرت  
ہماز داری، زہر خانہ، شادی، بیاد، رسم و رواج، جی کھنے کے لیے تیار ہونے والا

ملکہ آمنہ رضی اللہ عنہا سالہ عصمت کے گرجے میں

آج تقریباً پچاس برس کے بعد بھی وہی قد اور صورت اور اوصاف ہیں

## جویدالش کے روز تھے

آپ خیال نہ کریں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ یوم پیدائش اور آج کی صورت میں کوئی فرق کیوں ہو گا۔ آپ خود قبول کر لیں گے۔ جہانگیر کاٹھیاواڑ میں پیدا ہو کر تمام مذاہب و فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور و معروف ہونے کے ساتھ ہندوؤں کی حفاظت کرنا اپنا فرض بنالیا۔ ہندوؤں کے ساتھ یکساں سلوک کرنا اس کا خاص حق۔ دو متوں کو سہرا اندھ کر کے میں لانا ان کی عین دشمنی کو ذرا بھی اذیت دینا اس کی عادت تھی۔ آپ نے یہ ہیں مقویات سربراہ عالم آیتنگ پورہ گولیاں! جنکو تمام ملک کا ٹھیکہ دار کے وید شاستری ہنسی ٹنکر گووند جی نے آج سے پچاس برس قبل ایجاد کر کے مقویات میں تنہا پیدا کر دیا۔ گولیاں اس طرح مقبول ہوئیں کہ ہندوستان اور مالک سے ان کی مالک افزوں ترقی پر ہے۔ یہ گولیاں فیض بدھنی دل داغ معدہ کی کردی خون کی خرابی اور عملاً امراض مخصوصہ کے دور کرنے میں پوری فتح حاصل کر چکی ہیں۔ آپ ایک قدمہ ہمتاں کریں گے تو تعریف کے بغیر نہ رہیں گے اسی جو بیک ہوتے ہوئے بھی قیمت اس لئے کم رکھی گئی ہے کہ ہر مریض مستفید ہو سکے۔ گولیاں کی دیا ایک ڈیمہ پانچ ڈیمہ چار روپیہ بال مترو گولیاں (بمدر و اطفال) بچوں کی ناسا و طبیعت کو والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور بڑے روٹی ہو جاتا ہے اسلئے بیمار بچوں کو سندرت اور سندرت کو طاقتور بنانے کیلئے بال مترو گولیاں استعمال کر لیں گے۔ گولیاں بچوں کی جملہ کھانسیوں سے کاربایدہ آناٹے کا ہونا تمام کا بڑھنا جہاں بستی کا بلی ڈبلاؤں غیر مدد ہو کر پوری صحت حاصل ہوتی ہے قیمت۔ بیہ گولی کے ڈبہ کی ایک ڈیمہ (اسم) ملے کا پتہ۔ وید شاستری ہنسی ٹنکر جی گووند رام جی جہانگیر کاٹھیاواڑ

## مردہ عزیز دل سے

### ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نوا ایجاد آلہ برطرس درنگ پلانچٹ جس کے ذریعہ ہم خود اکیلے ہر ایک سوال کا جواب دے سکتے ہیں ایک امریکن داغ کی اختراع ہے۔ آلہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں۔ جو لسانی روح آپ چاہیں کہ میں حاضر ہو کر آپ کے سوالوں کا درست جواب دیں گی معمولی لکھا پڑھا ہر عمر اور ہر مذہب کا آدمی کام لے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور نہ ہی کسی چٹا کشی کی ضرورت ہے، عالم بالا کے حالات معلوم کرنا ہم شدہ کا پتہ لگانا چوری کا سراغ نکالنا دشمن سے بدل لینا مقدمات میں فتح پانا سخت سے سخت حاکم سے حسب نخواستہ کام نکلوانا اور دروازہ فاصلہ پر ایک سیکنڈ میں خبر بھیجنا حسب نخواستہ نوکری یا روزگار حاصل کرنا۔ بند لافوں کی عبارت پڑھنا مفصل صندوق یا مکان کے اندر کی اشیاء معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کے کام ہو سکتے ہیں اس نیا ایجاد پر کار گھر میں ہونا لازمی ہے اصل قیمت پانچ روپیہ۔ لیکن ٹھوڑے عرصہ کے لئے عمدہ محصول ڈاک صرف تین روپیہ لکھانے کے لئے۔ آگے ہدایت مفت ارسال ہوں گی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں لکھیں۔

کیمیکلز سنڈھیمپٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

طبعہ نسواں میں اس کارخانہ کا محلہ نہہنگ اور عروہ میں نہایت مقبول ہے۔

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔

ملفہ کا نمبر ۶۶۸ - ۵/۱۵۱۵ - ۵/۱۵۱۵ - ۵/۱۵۱۵

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کا خانہ کا تیار کردہ ہالو ہیرا پتھر استعمال کرتی ہیں۔



# قواعد

- ۱۔ ”ہمایوں“ بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔
- ۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشتر طمیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔
- ۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔
- ۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔
- ۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔
- ۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم ہفتہ صفحے ماہوار اور سائے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہو۔
- ۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور اسے پہلے پہنچ جانی چاہئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیثہ بھیجا جائے گا۔
- ۸۔ جواب طلب امور کے لئے اگر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔
- ۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے بشش ماہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ نمونہ ۶۔
- ۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل تپہ تحریر کیجئے۔
- ۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر تپہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبداللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم بنگلہ پریس ایڈیٹر، ہیکٹر خان لکھا

1547

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اٹھو ورنہ شہ نہیں ہوگا پھر کبھی  
دور و زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بِیَاكَارِ عَلَافِ ضِیَیْہِ اَنْزِیْبِ جَسَدِ سِتِّیْنِ مِیَا مُحَمَّدِآءِ صَبَاۃُ ہَمَا یُوْنِ

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمَا یُوْنِ

ایڈیٹر: بشیر احمد بی. اے (اسکسن) بیرسٹریٹ لا  
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد





# فہرست مضامین

جلد ۱۰ بابت ماہِ مئی ۱۹۳۰ء نمبر ۵

تصاویر { (۱) مولانا شبلی نعمانی مرحوم و مغفور  
(۲) بغداد میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	جہاں نما	~~~~~	۴۰۰
۲	شبلی بحیثیت مصنف	~~~~~	۴۰۴
	مولانا شبلی نعمانی مرحوم و مغفور	~~~~~	
	تصاویر { بغداد میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد	~~~~~	
۳	عکس تحریر مولانا شبلی مرحوم	~~~~~	۴۵۸
۴	راز و نیاز	~~~~~	۴۵۹
۵	رباعیات امجد	~~~~~	۴۶۰
۶	رباعیات فراق	~~~~~	۴۶۱
۷	چوکیدار (افسانہ)	~~~~~	۴۶۲
۸	غزل	~~~~~	۴۶۱
۹	لا علمی	~~~~~	۴۶۲
۱۰	نغمہ نامہ (نظم)	~~~~~	۴۶۵
۱۱	محفل ادب	~~~~~	۴۶۶
۱۲	مطبوعات جدیدہ	~~~~~	۴۶۹

# جہاں نما

## تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے والسرائے کی نصیحت

دہلی یونیورسٹی کی آٹھویں کانووکیشن کے موقع پر والسرائے نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران میں کہا۔  
”آج چند منٹ کے لئے میں آپ سے کہوں گا کہ آپ میرے ساتھ مل کر کتابوں کے متعلق کچھ غور و فکر کریں  
سوچیں کہ وہ ہمارے لئے کیا کچھ ہیں اور کیا کچھ ہو سکتی ہیں، اور اگر ہم عقل و دانش رکھتے ہیں تو معلوم کریں کہ ہماری  
زندگی کے معمولات میں انہیں کیا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔

مطالعہ جس کی طرف میں آج آپ لوگوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں ایک بہت بڑی خوبی اپنے اندر رکھتا  
ہے کہ اُس میں ایک ایسا غیر محدود و متنوع موجود ہے جس سے ہم اپنی طبیعت اور خواہش کے مطابق چیزیں انتخاب  
کر سکتے ہیں۔

بعض وقت ہم پر بے دلی اور پریشانی سی مسلط ہوتی ہے اور ہمارا دل اُس تسلی اور تشفی کو چاہتا ہے  
جو فطرت اور اُس کے تصرفات سے حاصل ہوتی ہے، وہ فطرت جو انسانی دنیا کے شور و غوغا کے درمیان رہ کر  
بھی اُس سے غیر متاثر رہتی ہے۔ کتابوں میں یہ چیز بھی موجود ہے، کیونکہ ہر ملک اور ہر زمانے میں فطرت نے مفکر  
قلوب پر اپنا جاودہ کیا ہے۔ ورجل کی تمثیلات جن میں ہمیں حقائق کا جلوہ بطور تمام نظر آتا ہے وہ ہیں جو ہماری  
زندگی کی معمولی اور سادہ چیزوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھیاں، زخمی سانپ، آندھی میں ایک بڑا  
درخت، مرجھایا ہوا پھول وغیرہ۔ پرندے پھول اور قدرتی مناظر پر انگریزی اُدبانے ایسی ایسی چیزیں لکھی ہیں کہ  
جب تک انگریزی زبان زندہ ہے وہ بھی زندہ رہیں گی۔

میں نے یہ کہتے ہوئے تقریر کی ابتدا کی تھی کہ میں اپنے سامعین میں سے نوجوانوں کو کچھ نصیحت کروں گا لیکن  
اب تک آپ کے فائدے سے زیادہ اپنی خوشی کے لئے میں اپنے حافظہ ہی کی وسعت میں بے مقصد فکر لگاتا رہا ہوں  
اب میں اپنی عملی نصیحت صرف دو فقرات میں کہہ دینا چاہتا ہوں۔ ”اپنے آپ کو فرصت کے قیمتی لمحوں میں مطالعہ کرنے  
کی عادت ڈالو۔ اور جب تم پڑھو تو جس چیز کو تم پڑھ رہے ہو اپنی بساط کے مطابق اُس کی قدر و قیمت کو پہچاننے  
کی پیہم کوشش کرو۔“

کہا گیا ہے کہ ایک اچھی کتاب ہاتھ میں نہیں بلکہ زانو پر ہونی چاہئے، تاکہ جو کچھ ہم پڑھیں اُسے سوچنے، سمجھنے اور اُس پر تنقید کرنے کے لئے اکثر و بیشتر ٹھہر سکیں۔ ہمیں کسی کتاب کو ختم کرنے سے پہلے چھوڑ دینے پر کسی تنگ دل کے قول کی پروا نہیں ہونی چاہئے۔ یہ سمجھ لینا کہ تمام کتابیں تمام طبیعتوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے نہیں ہوتیں اور کسی ایسی چیز کی طرف رجوع ہو جانا جس سے ہم صحیح طور پر مسرت حاصل کر سکتے ہوں بہت ہی اچھا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہم ایک آزاد مذاق پیدا کریں، وسیع مطالعہ کریں، اور اس طرح خیال اور علم کی حدود کو بڑھانے جائیں۔ ہمیں اس سے یقیناً بڑا فائدہ ہوگا، اور میں سچ کہتا ہوں ہم دیکھیں گے کہ ہماری عام زندگی کے بہت کم پہلو ایسے ہیں جن میں ہماری اس کوشش سے رنگینی اور دلچسپی پیدا نہیں ہو جاتی۔

### لبنن گراڈ لائبریری

ایڈمنسٹریٹو آف سائنس کی لائبریری روس میں سب سے پرانی اور سب سے عجیب لائبریری ہے۔ اس کے قیام کو آج پورے دو سو سال گزر چکے ہیں۔ حال ہی میں اس کی سالگرہ کے موقع پر ایک نمائش کی گئی تھی جس سے معلوم ہوا کہ اس میں نادر و نایاب کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

اس لائبریری کی سب سے چھوٹی کتاب کرافٹ کی حکایتوں کا مجموعہ ہے جسے ۱۸۵۵ء میں معمولی ڈاک کے ٹکٹ سے بھی چھوٹی تقطیع پر تیار کیا گیا تھا۔ اس کے بالمقابل وہاں ایسی بڑی بڑی کتابیں بھی موجود ہیں جو لمبائی میں تین فٹ اور چوڑائی میں دو فٹ سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ان چالیس لاکھ کتابوں اور مسودوں میں جو اس لائبریری کی زینت ہیں ایسے مسودے بھی ملتے ہیں جو چمڑے کے کاغذ پر لکھے گئے ہیں اور جن کا زمانہ تحریر کیا تھا اسے تیرھویں صدی تک ہے۔

لائبریری کی قدیم ترین تحریروں میں سے ایک وہ حکم نامہ ہے جو بلغیرین زرار آرسی نیوس ثانی نے ۱۲۳۱ء میں جاری کیا۔ بعض قدیم تحریروں سے کسی حد تک یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں دس میں غلامی کا رواج تھا۔ چنانچہ کسی بڑے زمیندار کا ایک اجازت نامہ ہے جو ایک کسان لڑکی کی شادی کے لئے حاصل کیا گیا تھا، اور نین رول کی ایک رسید ہے جو ایک تاتاری غلام کے لئے ادا کئے گئے تھے جسے بیچنے والے نے ایک کاسک سے خریدا تھا۔ کاسک ان دنوں کریمیا کے ترکوں اور تاتاریوں سے برسرِ جنگ تھے۔

ادبی نواد میں قابل ذکر پیٹر اعظم کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر ہے، ایک کیلنڈر ہے جسے ایک شخص برسات نے روس میں طباعت کے رواج کے شروع شروع میں ترتیب دیا تھا، ایک بہت بڑا قدیم نقشہ کہ جس میں بحر شرق کی حدود دکھائی گئی ہیں۔ یہ نقشہ پیٹر اعظم کے حکم سے ۱۷۱۰ء میں طبع کیا گیا تھا اور اُس زمانے کے چند روسی مدرسوں میں جغرافیہ کے نصاب کے طور پر رائج تھا۔

### حضرت مسیح کا نیا تصویر

مشہور فلم ایکٹر چارلی چپن کہتا ہے کہ ”اگر میں مسیح کی کہانی کی فلم تیار کروں تو میں اُس کی شخصیت کو نہایت قومی نہایت نمایاں اور نہایت شاندار صورت میں پیش کروں۔ ایسی صورت جس سے ظاہر ہو کہ لوگ اُس کی عظمت و شان کو دیکھ کر اُس کے گردیدہ ہو جاتے تھے۔ جدھر وہ جاکھلے میں مردوں، عورتوں اور بچوں کو خوشی کے لرزے لگاتے ہوئے اُس کا خیر مقدم کرتے دکھاؤں۔“

”میں اُن کو اُس سے زیادہ قریب ہونے کے لئے اور اُس کی مقناطیسیت کو محسوس کرنے کیلئے دھکا پل کرتے دکھاؤں۔ اُس کے آس پاس کھڑے ہونے والوں میں سے کوئی اداس نہ ہو، کوئی ٹمکین نہ ہو۔“

”میں اُس تثلیل میں کوئی ایسی بات شامل نہ کروں جس سے اُس کے متبعین کے دلوں میں کسی قسم کا خوف پیدا کر کے دکھایا جائے، بلکہ میں اُس کو لوگوں کے لئے انتہائی طمانیت، محبت، شرافت اور طافت کا پیکر بناؤں۔“

”مجھے امید نہیں کہ میں کبھی اس کہانی کو سینما کے پردے پر پیش کر سکوں کیونکہ یقیناً اُس سے تنقید و اعتراض کا ایک طوفان اسٹڈ پڑے گا، لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر ایک ایسی تصویر تیار کی جائے تو وہ مذہب کے لئے ناقابل بیان حد تک مفید ثابت ہو، وہ بتائے کہ مسیح یقیناً ایک ایسا شخص تھا کہ اس سے محبت کی جاتی اور وہ ایک حقیقی اور خوبصورت انسان تھا۔ میں نے ایک دفعہ مسیح کی ایک تصویر دیکھی۔ اب پھر میں اُسے نہیں دیکھنا چاہتا اُس میں حقیقت کا شبابہ بھی موجود نہ تھا۔“

### کیلنگ کی ایک کہانی

انگریزی زبان کے مشہور مصنف رڈ یارڈ کیلنگ کے اُس سفر کے دوران میں جس کا تذکرہ کتاب ”فرام سی ٹوسی“ میں موجود ہے جب وہ نیویارک پہنچے تو ہندوستانی کہانیوں کا ایک بھرا ہوا بستہ ان کے ساتھ

تھا۔ ان کمائیوں کو وہ بہت سے ناشرین کے پاس لے گئے۔ وہ انہیں بچا پاس ڈالر فی کمائی کے حساب سے فروخت کر دینے پر آمادہ تھے، لیکن ہر جگہ انہیں یہی جواب ملا کہ ہندوستان سے کسی کو کچھ دلچسپی نہیں مگر ایک ایڈیٹر کو سن کر شوق پیدا ہوا اور اُس نے ایک کمائی خرید لی، گو بعد میں اُسے اس پر افسوس ہوا۔ اُس نے مسودے کو بے کار سمجھ کر اپنی میز کی ایک دراز میں ڈال دیا اور شائع نہ کیا۔ چند سال کے بعد جب کپلنگ کی تصانیف مقبول ہوئیں اور ہر زبان پر اُسی کا چرچا ہونے لگا تو ایک استقبال کے سلسلہ میں اسی ایڈیٹر اور کپلنگ کی ملاقات پھر ہوئی۔ کپلنگ نے کہا ”ہم پہلے بھی ایک دفعہ ملے ہیں“ ایڈیٹر نے چونک کر کہا ”دک“ کپلنگ نے جب اُسے اچھی طرح بتایا تو وہ دوڑا ہوا اپنے دفتر میں گیا اور اُسی دن اُس کمائی کو نہایت شان سے چھپوا دیا۔

### دولت کا بہترین مصرف

آج تک کسی دولت مند نے اپنی دولت اُس سے بہتر مصرف کے لئے نہیں چھوڑی، جس کے لئے ملک سویڈن کا ایک انجینئر اور کیمیا دان الفریڈ بی نوبل اُسے چھوڑ گیا۔ اُس نے اپنی وفات سے پہلے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ موجودوں، مفکروں، مصنفوں اور حکیموں کو سال بہ سال انعامات دینے کے لئے وقف کر دیا اور آج دنیا اس کے مصرف سے دانش و حکمت میں ترقی کر رہی ہے۔

اس سال نوبل کا ادبی انعام مشہور جرمن مصنف تامس ہین کو ملا ہے جو اس کا بجا طور پر مستحق تھا۔ اُسے

۹۲۰۰ پونڈ ملے۔

نوبل کے انعامات اٹھائیس سال سے تقسیم ہو رہے ہیں لیکن یہ ایک عجیب دلچسپ بات ہے کہ اس تمام عرصے میں ایک دفعہ بھی ادبیات کا انعام کسی امریکا کے مصنف نے حاصل نہیں کیا۔

نوبل نے اٹھارہ لاکھ پونڈ اپنے پیچھے چھوڑے۔ ان کی آمدنی کا ۶۸ فی صدی ہر سال بہترین مفکروں کو انعامات دینے میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس سال پہلی دفعہ سویڈن کی حکومت نے نوبل فنڈ پر سے بہت سے محصولات اٹھا لئے ہیں جس سے انعامات کی رقم اب بڑھائی جاسکیں گی۔

# شبلی بحیثیت مصنف

کسی شخص یا کسی شے کو بخوبی جاننے پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ اول و بیشتر اُس کی خصوصیتوں اور خوبیوں پر نظر ڈالی جائے اور ابتداءً اُس سے قطع نظر کر لی جائے کہ اُس میں کون کون سی کیفیات اور نقائص ہیں اور یہی شخص کی خوبیاں کبھی نظر نہیں آسکتیں جب تک ہمیں اُس شخص سے پوری واقفیت نہ ہو جب تک ہم اُس کی زندگی میں دلچسپی نہیں لیں جب تک ہم اُس سے اک نوع کا خواہ عارضی ہی ہو لیکن اک سچا محبت و ہمدردی کا شری قائم نہ کر لیں + کارلائل اپنی کتاب ”ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ“ میں ”ہیر و بحیثیت پیغمبر“ کے تحت میں نکتہ چینوں کی معائب شماری کے جواب میں کتاب کے سچ بات تو یہ ہے کہ ہم قصور و عیوب پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں پھر پکا زنا سے قصور! میں کہتا ہوں کہ سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ انسان اپنے قصوروں سے آگاہ نہ ہو + اور پھر کہتا ہے کہ ”اگر نہ کسی کو جاننا چاہو تو اس کے محاسن کو دیکھو نہ کہ اُس کے عیوب کو“ فیصلہ رنگ جو دنیا کے عظیم ترین زندہ مفکروں میں شمار ہوتا ہے کہ ”بلاشبہ ہر فرد بشر قطعی طور پر زلا ہے“ پھر ایک اور جگہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ انسان صرف اُسی کو سمجھ سکتا ہے جسے وہ محبت کرے + بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی میں فرق یہ ہے کہ بڑے آدمی میں اُس کے زلاپن کا ظہور ہوتا ہے چھوٹے آدمی میں نہیں ہوتا + اس فطری نرالاپن کا اظہار کرنے والا اُسے عمدہ اپنی زندگی کا جزو بنانے والا اُسے بیشتر بڑے کارلانے والا آدمی ایک عظیم الشان انسان ہوتا ہے جس کی شخصیت کا اثر دور و نزدیک ہر جگہ پڑتا ہے +

شبلی ایک ایسا انسان تھا! آؤ دیکھیں کہ ہمارا شبلی کون تھا؟ اُس کے سوانح حیات پر نگاہ ڈالیں۔ وہ کیا تھا؟ اُس کی تصنیفات پر نگاہ ڈالیں۔ وہ کس لئے تھا؟ اُس کے مطبع نظر پر نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ اُس کے پیغام کے معنی ہمارے اور دنیا کے لئے کیا تھے اور کیا ہیں؟

حالاتِ زندگی - شبلی ۱۸۵۷ء یعنی بغاوتِ ہند کے سال میں صوبہ متحدہ کے ضلع اعظم گڑھ میں بنڈل کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایک معزز اور ممتاز خاندان تھا۔ اُن کے والد اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا۔ پہلے فارسی تعلیم پائی پھر عربی۔ اعظم گڑھ سے رام پور، رام پور سے لاہور اور لاہور سے سہانپور

جہاں جہاں کسی مشہور عالم کی درس گاہ تھی اُس میں جا کر جملہ فارسی و عربی علوم کی تحصیل کی۔ لاہور میں اُدو وقت میسٹر نہ آتا تو مولوی فیض الحسن سے اور نیل کلج سے آتے جاتے رہنے میں پڑھ لیا کرتے تھے + اپنے ایک خط میں جو ۲۳ ستمبر ۱۹۱۷ء کا نوشتہ ہے لکھتے ہیں :- ”علی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا۔ اور تمام بزرگ مصروف علم تھے۔ اس زمانہ کی طالب علمی بہت مشکل تھی۔ یکہ پر سفر کرتے تھے۔ پیدل بھی چلتا پڑتا تھا۔ یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا تھا۔ دودفعہ والد کی اجازت کے بغیر چکے نکل گیا۔ یہ خاص التزام رہا اور اس میں میں منفرد تھا کہ ہر فن مثلاً ادب۔ منطق۔ حدیث۔ اصول فقہ کے لئے انہی علما کے پاس دور و دراز کا سفر کر کے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے مثلاً حدیث کے لئے مولانا احمد علی سہارن پوری۔ ادب کے لئے مولانا فیض الحسن لاہور میں + والد بلکہ تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کے لئے چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کامیاب ہوا۔ چند روز وکالت کی۔ لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی اور علمی اشتغال میں مصروف ہوا اور اس لئے معمولی معاوضہ پر اول علی گڑھ کی پروفیسری کی لگایا، ماہوار پر۔

۱۸۷۶ء میں کہ ۱۹ سال کی عمر تھی حج کو گئے اور مکہ و مدینہ کے مناظر سے بغایت متاثر ہوئے۔ مدینہ کے کتب خانوں میں جا کر حدیث کی بعض نایاب کتابیں دیکھیں جو بعد میں کہیں نظر سے نہ گذریں +

واپس آ کر علم و شاعری کا مشغلہ لاحق ہو گیا۔ کتب بینی کی شروع سے عادت تھی۔ کہتے تھے کہ عظم گڑھ میں بہتا تھا تو ایک کتب فروش کی بازار میں دکان تھی وہاں جا کر اردو فارسی کے دیوان دیکھا کرتا تھا کبھی کبھی گھر لے آتا تھا + مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اور اُس وقت کے مشہور رسائل پیام یار اور اودھ پنچ کے پرچے بڑے شوق سے پڑھتے تھے + مشاعروں کے علاوہ اُن کا شغل غیر مقلدوں کی تردید اور تشدید مخالفت تھا۔ اُن کا قول تھا کہ ”انسان عیسائی ہو سکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا۔ اُن کا عربی رسالہ ”اسکات المعتمدی“ اسی زمانے اور اسی مذہبی جوش و تقصیب کی یادگار ہے + اُس وقت ہندی مسلمانوں میں جو خفیت و دہائیت کی جنگ برپا تھی۔ وہ اس جنگ میں بڑے شدو سے شریک تھے۔ شرر لکھتے ہیں کہ :-

”مولانا نے جن درس گاہوں میں تعلیم پائی تھی اور جن اساتذہ سے پڑھا اُن کی محبت نے ابتدا ہی میں

انہیں سخت جفا بنادیا تھا۔ اسی شوق میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ نمفانی کا لقب لکھنا شروع

کیا۔ جس کی وجہ سے بعض نادانف لوگوں نے انہیں غلطی میں پکڑ کر نبا نمفانی یعنی امام اعظم ابو حنیفہ کو نفی کی



نسل میں خیال کر لیا۔ مگر اس کی کوئی اصلیت و حقیقت نہیں ہے۔ وہ مشدّد حنفی تھے اور خفیّت میں اپنے آپ کو اوروں سے ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے۔“

وہ ایک مذہبی جابر تھے اور روایت ہے کہ بعض لڑکوں کو اس لئے کہ وہ آئندہ نماز پڑھنے کا وعدہ کریں انہوں نے دو دو گھنٹے مارا +

لیکن اس درس و تدریس اور فرقہ بندی اور مذہبی سختی سے گھر والوں کو تسلی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ شبلی کسی ایسے کام میں لگیں جو دنیاوی حیثیت سے بار آور ہو۔ پہلے زمینداری پھر وکالت پھر امانت کا کام نبھانا چاہا لیکن ایک شاعر مزاج مولانا سے یہ کام کیا سرانجام ہو سکتے؟ ناچار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر مطالعہ و تدریس میں مصروف ہو گئے اور قصائد و رسائل لکھنے شروع کئے +

۱۸۸۲ء میں ۲۵ سال کی عمر میں وہ علی گڑھ کالج کی عربی فارسی کی پروفیسری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے شرر لکھتے ہیں :-

”علی گڑھ میں سید صاحب نے انہیں اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی جو سب سے الگ بلکہ باہمہ اور بے ہمہ تھا اور ایک خاموش مقام تھا۔ اُن میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے اُن سے ربط و مقبض بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلاناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی + سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کے لئے انہیں اکثر حدیث و فقہ و تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انہوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا۔ اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعتِ نظر کے مولانا شبلی ذائل ہونے جانتے تھے اُس سے زیادہ سید صاحب اُن کی تلاش جستجو اور حلیبِ روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں مجھے بارہ مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرے اور اُن کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریکِ صحبت رہنے کا موقع ملا۔ مولانا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بے تکلفی تھی۔ اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دو لوگ کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر اُن کے مشورہ کے نہ کرتے اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں اُن کی سب سے پہلی نظم

جو ان دنوں شائع ہوئی تھی ”صبح امید“ ہے، جس میں انہوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی بکرت

سے ان کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پر لطف اور موثر الفاظ میں ظہر کیا ہے +

شبلی کا قول ہے کہ میں سید صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہو گیا + مصر و یورپ کی تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سچی ہوئی تھیں + وہ کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑے رہتے تھے اور کبھی تھک کر انہیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتے تھے +

اُس زمانے میں اُس دائرہ علمیہ میں جس کے مرکز سرسید تھے مولانا حالی اور مسٹر آرنلڈ بھی شریک صحبت تھے۔ سرسید کے بعد شبلی سب سے زیادہ مسٹر آرنلڈ کے علمی خیالات سے متاثر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ رادھر شبلی نے آرنلڈ کو ان کی کتاب ”دعوت اسلام“ کی تصنیف و تہذیب میں بہت مدد دی اور رادھر آرنلڈ نے شبلی کو مغربی علوم اور مغربی علمی تفتیش کے طریقوں سے آگاہ کیا۔ آرنلڈ نے شبلی سے عربی سیکھی تو شبلی نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان کا درس لیا +

۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء تک سولہ سال شبلی علی گڑھ کالج میں رہے + مارچ ۱۸۹۵ء میں سرسید نے انتقال کیا۔ مئی ۱۸۸۵ء میں شبلی نے کالج سے رخصت لی اور اعظم گڑھ پہنچ کر اپنا استعفا بھیج دیا + اس دوران میں قومی ترقی کی اس نئی فضا میں ان کے قلم سے متعدد تصنیفات شائع ہوئیں + ۱۸۸۴ء میں ”ثنوی صبح امید“ لکھی جس میں علاؤ الدینی و خلیفہ کے شبلی پر سرسید کے اثرات کا عکس صاف طور پر عیاں ہے + ۱۸۸۷ء میں محمدان ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں انہوں نے ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ پر ایک فاضلانہ خطبہ پڑھا جس میں اول اول ان کی علمیت اور اسلام محبت کا اظہار ہوا + ۱۸۸۹ء میں ”رائل بیروز آف اسلام“ کے سلسلے کی پہلی کڑی ”المامون“ جو ان کی سیرت نگاری کی پہلی زبردست کوشش تھی انہوں نے سرسید کی خدمت میں ہدیہ پیش کی + اور غالباً اس کے عین بعد ہی ”الجزیرۃ“ اور ”کتب خانہ اسکندریہ“ کے زمانے لکھے + ۱۸۹۲ء میں انہوں نے روم و مصر و شام کا سفر کیا جس کا محرک ان کا اسلامی اور علمی شوق تھا + ۱۸۹۳ء میں ”سیرۃ النعمان“ تکمیل کو پہنچی اور اس کے بعد دوستوں کے اصرار سے ”سفر نامہ روم و مصر و شام“ شائع ہوا + ۱۸۹۴ء میں ”رسائل شبلی“ ایک کتاب کی صورت میں طبع ہوئے + اسی سال مارچ میں سرسید کا انتقال ہوا اور اب علمی میں شبلی نے کالج سے رخصت لی اور اعظم گڑھ پہنچ کر پروفیسری سے استعفا لے دیا +

یہاں کے میٹل سکول کے انتظام و ترقی میں کچھ دیر شبلی نے حصہ لیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۹ء میں کشمیر گئے جہاں صحت بد سے بتر ہوئی گئی + ”الفاروق“ جو انہوں نے ”المامون“ کے بعد ہی لکھنی شروع کر دی تھی اور جس کے لئے علمی تحقیق کا خیال مصر و روم و شام کے سفر میں ان کو برابر لگا رہا تھا یہاں مکمل ہوئی جس روز اس مہتمم بالشان تصنیف کی آخری

سطر ان کے قلم نے لکھیں وہ بستر پر دراز تھے اور کھنٹوں تک بیہوشی کی حالت طاری تھی۔

غالباً اسی سال سید علی بلگرامی کی تحریک پر وہ ریاست حیدرآباد میں شعبہ علوم و فنون کے ناظم مقرر ہوئے ۱۹۲۶ء میں "الغزالی" اور اُس کے بعد "علم الکلام" چھپی۔ ۱۹۳۰ء میں "الکلام" اور پھر "موازنہ انیس و دہ" اور "سوانح مولانا روم" طبع ہوئیں +

اس کے بعد شبلی نے حیدرآباد چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ یہاں انہوں نے ندوۃ العلماء کے ساتھ جس کی تحریک ۱۹۲۴ء میں شروع ہوئی تھی اور جس کے متعلق ان کے متعلق انہیں کے خیال کے مطابق ۱۹۲۵ء میں قائم کیا گیا تھا اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔ ۱۹۳۱ء تک برابر نو سال شبلی نے ندوہ کی خدمت کی۔ جیسا کہ شبلی نے رسالہ "الندوہ" کے پرچے (۱۳۲۲ء بمطابق ۱۹۰۴ء) میں ظاہر کیا انہوں نے محسوس کیا کہ "جدید تعلیم کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ ہمارے علوم و فنون ہمارا مذہب، ہماری قومی خصوصیات مٹ نہ جانے پائیں۔" سچ یہ ہے کہ اگرچہ ندوۃ العلماء کے قیام کا یہی مقصد قرار دیا گیا لیکن فی الحقیقت شبلی کی زندگی کا نصب العین بھی یہی تھا اور شبلی وہ عالم تھا جس کی زندگی اس اصول پر عامل تھی کہ اسلام و اہل اسلام کی گئی گزری دنیاوی و روحانی و علمی عظمت کو از سر نو چمکا یا جلے + ندوہ کے لئے وہ در بدر پھرے۔ ہندوستانی ریاستوں اور دیگر ذرائع سے سرمایہ جمع کیا یہاں تک کہ ۱۹۰۹ء میں ندوہ کی عظیم الشان عمارت کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ لیکن اس تعمیر کے ساتھ تخریب کا کام بھی جاری تھا یعنی وہ علما جن کے اجتماع و تنظیم کا خواب ہمیشہ شبلی کے پیش نظر تھا ان کی قدامت پسندی اور شکوک و شبہات نے آخر کار شبلی کو مجبور و مایوس کر دیا۔ اور وہ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ چھوڑ کر اعظم گڑھ چلے گئے + شبلی میں مذہبی و ادبی میلانات پہلو بہ پہلو موجود تھے قیام ندوہ کے زمانے میں ہی انہوں نے اپنی مشہور تنقیدی تصنیف "شعر العجم" کا پہلا حصہ ۱۹۰۸ء میں شائع کیا اور اُن کا زیب عالمگیر "الاتساف" "الندوہ" میں شائع ہوتا رہا +

اعظم گڑھ پہنچ کر انہوں نے "شعر العجم" کا کام جاری رکھا اور اُس کا دوسرا حصہ اور چوتھا حصہ اردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کا پانچواں حصہ اُن کی وفات کے چار سال بعد شائع ہوا + ۱۹۱۴ء میں "شہرۃ آفاق کتاب سیرۃ النبی" زیر تصنیف تھی کہ ۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو موت اپنے مقررہ وقت پر آپہنچی + مولوی محمد کبھی تنہا لکھتے ہیں کہ "۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۵۷ ہی برس کی عمر پائی۔ ہنگامہ مشرق (غدر) میں فلوور کیا اور ہنگامہ مغرب (جنگ یورپ) میں مخفی ہوئے + "بدو الاسلام" سیرۃ نبوی سے پہلے تصنیف کی اور سیرۃ نبوی پر آخر آدم توڑا مرنے سے کچھ دنوں پہلے کیا خوب فرمایا تھا +

عجم کی طرح کی عباسیوں کی داستان لکھی مجھے چندے مقیم آستان غیب ہونا تھا  
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بخیر ہونا تھا

ان کی وفات کے بعد ۱۹۱۶ء میں مکانِ نبی شہلی حصہ اول ۱۹۱۷ء میں حصہ دوم ۱۹۱۸ء میں سیرۃ النبی  
حصہ اول ۱۹۲۰ء میں حصہ دوم دجن آخر اندر دو کتابوں میں کہیں کہیں نو سین میں سید سلیمان ندوی کے اضافات مندرج  
ہیں (شائع ہوئیں)۔ کلیاتِ شبلی اردو اور کلیاتِ شبلی فارسی اُن کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ البتہ ”مقالاتِ شبلی“  
کتابی صورت میں اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی +

دنیاوی حیثیت سے شبلی نے مختلف اطراف سے اپنی قابلیت کا اعتراف حاصل کیا + سفرِ روم کے دوران میں  
سلطانِ ترکی نے تمغہ مجیدی عطا کیا۔ دو سال بعد برٹش گورنمنٹ نے ٹرس العلماء کا خطاب دیا اور الہ آباد یونیورسٹی کا  
فیوٹربائیا۔ ۱۹۲۰ء میں امیر عبدالرحمن خان نے کابل میں ایک علمی خدمت پر بلایا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ متعدد  
بار کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں مدعو کئے گئے۔ حیدرآباد نے مدت تک اُن کی سرپرستی کی۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیرونی  
ممالک مصر و شام و ترکی و جزائرِ ملکہ انگلستان پیرس اور برلن سے علمی سوالات اُن کی رائے کے لئے اور بغرض استفادہ  
اکثر آ کر تے تھے +

قوم کی تمدنی و علمی ترقی ہمیشہ شبلی کے پیش نظر تھی۔ چنانچہ آخری عمر میں اُن سے دو بڑے کام سرانجام ہوئے +  
”قانونِ وقفِ اولاد“ انہیں کی مساعی سے منظور و نافذ ہوا اور انہوں نے مشہور علمی مجلس ”دار المصنفین“ کی بنیاد ڈالی  
اور اپنا مکان باغ اور کتب خانہ اس کے نشوونما اور قیام کے لئے وقف کر دیا +

وفات سے تقریباً دو سال پیش ایک خط (مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۷ء) میں اپنی پہلک زندگی کے متعلق یوں لکھتے ہیں :-  
”متعدد دفعہ حیدرآباد اور دیگر ریاستوں میں بیش قرار تنخواہ پر بلایا گیا لیکن علمی مشغلہ کو چھوڑ کر نہ گیا حیدرآباد

سچ چھوٹی وظیفہ مقرر ہے اُس پر قناعت کی + ریاستوں نے صلہ اور نذرانے دیئے اور دینے چاہے لیکن  
ہمیشہ انکار کیا اور واپس کر دیا + رائے میں ہمیشہ آزار دہا۔ سرسید کے ساتھ ۱۲ برس رہا لیکن پولیٹیکل مسائل  
میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بار بار بحثیں رہیں + سفرِ ترکی و مصر صرف  
علمی تحقیقات کے لئے کیا اور تمام مصارف خود گوارا کئے + ریاست رام پور نے مصارف دینے چاہے۔ انکار  
کیا۔ بزرگوں نے قسطنطنیہ روپے بھیجے وہ بھی واپس کر دیئے + ہمیشہ بڑے بڑے اہم مقاصد پیش نظر رہے + وطن

یعنی اعظم گڑھ میں مسلمانوں کا کوئی اسکول نہ تھا اور مسلمان انگریزی سے بالکل الگ تھے۔ میں نے نیشنل ہائی اسکول قائم کیا۔ اس کے اکثر مصارف خود ادا کئے + پھر نذرہ کی تحریک میں جنرل غالب رہا اور جب نذرہ بالکل مر گیا تھا تو اُس کو از سر نو زندہ کر کے ترقی دی۔ تصنیفات میں خاص یہ خیال رہا کہ مستقل شاخیں مکمل کر دوں۔ چنانچہ علم کلام، تاریخ، لٹریچر، موازنہ و شعرالحمیم، تین شاخوں پر سیریز تیار کر دی + فارسی شاعری میں زبان کو اہل زبان کے اصول پر برتا + ملازمت تو اکثر علی ہی اختیار کی لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور یہ فطرت تھی بچپن سے میری صحبت بچوں لوگوں میں تھی اور وہ لوگ ہمیشہ ان مشاغل کی تحریک کرتے تھے لیکن کبھی نالچ رنگ بلکہ گانے میں بھی شریک نہ ہوا + جب راجہ کرشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسب دستور نذرہ دینے گیا تو اُن کے ایڈی کا رنگ نے کہا کہ آپ نے تو نہنیت کا قصیدہ لکھا ہو گا میں نے کمایہ اُوروں کا پیشہ ہے میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر رد و بدل ہوئی اور میں نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ ”میں کسی کی مح نہیں کرتا + نقلی اور نایاب کتابیں بہت ہم پہنچا چیں اور کثرت سے مطالعہ کریں یہ سرسری بانیں لکھ دیں۔ خود اپنا اُٹھا کیا گاؤں؟“

شبلی ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء

شبلی کی زندگی کے مختصر حالات۔ یہ تو ہم سب کے سب کے سب ان حالات میں ہمیں اُن تغیرات کو ڈھونڈنا ہے جنہوں نے شبلی کو شبلی بنایا + اس دنیا میں جہاں حرکت زندگی ہے اور سکون موت، وہی شخص زیادہ زندہ وہی شخص زیادہ پر عظمت ہے جس کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ تحریک پائی جائے۔ شبلی کی زندگی میں کون سی تحریک یا تحریکیں تھیں اور اُس کے بیان کے محرکات کیا تھے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شروع شروع میں وہ ایک پرانی وضع کے متشرع مسلمان تھے اور اُن کی تنگ نظر اسلامیت اُن کے اس قول سے مترشح ہوتی تھی کہ ”انسان عیسائی ہو سکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا۔“ البتہ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ نئے نئے بلکہ اُن میں اسلام کے لئے ایک پُر جوش خلوص و عشق تھا جو ابھی اُس زمانے میں جب انہوں نے ۱۹ سال کی عمر میں فریضہ حج ادا کیا اور پھر مدینہ میں درگاہ رسول میں حاضر ہوئے اُن کے ہر قول و فعل سے ٹپک پڑتا تھا + لیکن پھر بھی قدامت پسندی نے ابھی انہیں گھیر رکھا تھا اور ابھی اُن میں وہ آرا و منشی اور زمانہ شناس کا جو ہر چمکا تھا جس کے اثر سے وہ کینائے علم و فن بن گئے + اعظم گڑھ کا حس نوجوان جب علی گڑھ پہنچا تو وہاں اُسے اُس مردِ خدا سے پلا پڑا جس نے گزشتہ بارہ سال سے مسلمانوں کی قوم کو خواب گراں سے جگلا نہیں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنے دل و دماغ کے سب جذبات و خیالات صرف کر دیئے تھے + سرسید کی صحبت و اثر نے شبلی کے تمام

اُن خوابیدہ اوصاف کو بیدار کر دیا جو فطرتاً اُن کی طبیعت میں موجود و مضر تھے + وہ برگزیدہ ہستیوں جو سرسید کے اثر سے مسلمانوں کی قوم میں اچھے اور بڑے کاموں پر آمادہ ہو گئیں اور جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام کی سچی روح پھونکنے میں اپنی زندگی وقف کر دی اُن میں ایک شعلی بھی تھے +

سرسید خود ایک زبردست قومی ضرورت سے متاثر تھے - انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان کے مسلمان تخت و تاج کھو کر حکومت وقت سے روٹھ کر قدامت پسندی زیاں کاری اور سہل الحارسی کی دلدلوں میں پھنسنے میں اور کسی طرح بھاگے نہیں نکلتے + انہوں نے اگ عرصہ اُن تجاویز پر غور کیا جن سے اس گرستہ قسمت قوم کو اس کی غفلت کے بے نتائج و کما حقہ آگاہ کر کے اسے ترقی و تہذیب کے رستے پر لگایا جائے + اکتوبر سنہ ۱۸۷۷ء میں وہ ولایت سے واپس آئے اور پہنچنے کے جلد بعد انہوں نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب سے مانوس کرنے اور اس کے ساتھ ہی اپنی قدیم تہذیب کے پھر پالنے کے لئے دو بڑے بڑے کام بیک وقت شروع کئے - ۲۴ - دسمبر کو تہذیب الاخلاق کا پہلا نمبر شائع ہوا اور ۲۶ - دسمبر کو کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان " قائم ہوئی - تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر اور اس کمیٹی کے سکریٹری سرسید بنے + تہذیب الاخلاق نے صرف مسلمانوں کے اخلاق کی تہذیب کا کام ہی نہیں کیا بلکہ اُس کے ذریعے سے مسلمانوں میں وہ مذہبی و قومی ترقی کی روح پھیلی جس کا نتیجہ آج اُن کی بدرجہا بہتر حالت میں عیاں ہے اور اردو زبان میں اُس مسلمانیت و متانیت ادب کی بنیاد پڑی جس پر آئندہ ساٹھ سال میں ایک خوش آئند عمارت قائم ہو گئی + اور کمیٹی مذکورہ کی مساعی کا نتیجہ آج علی گڑھ یونیورسٹی کے درو دیوار سے ظاہر ہے + سرسید کو قومی ترقی کی جو کوگی ہوئی تھی وہ اُس دل گداز واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے جسے نواب حسن الملک نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ

جس تاریخ کمیٹی مذکورہ کے انعقاد کے لئے جلسہ قرار پایا تھا اُس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا تھا - رات کو سرسید نے میرا ہنگام بھی اپنے ہی کمرے میں بچھو لیا تھا - گیارہ بارہ بجے تک - مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں - اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی - دو بجے کے قریب جو کچھ کھلی انویں نے سرسید کو اُن کے ہانگ پر نہ پایا میں اُن کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا - دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹل رہے ہیں اور زار قطار روٹے جاتے ہیں - میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدا انخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ پس نہ کر اور زیادہ روٹے لگے اور کہا کہ "اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان ہجرت گئے او

بگڑنے جاتے ہیں اور کوئی صورت اُن کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ پھر آپ ہی کہنے لگے کہ جو جلسہ کل ہوئے والا مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی ادھیڑ میں گزر گئی ہے کہ دیکھئے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں؟ نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ سرسید کی حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گزری اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور جو عظمت اس شخص کی اُس دن سے میرے دل میں بٹھی ہوئی ہے اُس کو میں ہی خوب جانتا ہوں۔“

ایک خط میں جو سرسید نے اپنے اس ہمدرد اور دلی دوست کو ولایت سے لکھا ایک عربی مدرسے کا جو کہیں دہلی میں قائم کیا گیا تھا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

”جانِ من و جنابِ من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اُن کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگھٹتے ہیں۔ ہائے افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اسے بھائی مددی کچھ نکر کر دو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیمِ اولاد کا کیا قاعدہ ہے؟ اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آں کر سب کچھ کوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کا فرمودہ، گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے کفر کی کتب میں چھاپنے والے کی کون سنے گا؟“

قوم نے طوعاً و کرہاً سرسید کی زبردست آواز سنی اور اُس پر جن چند صاحب دلوں نے بزورِ لیمبا کہی اُن میں ایک شبلی بھی تھے، وہ جوش و خروش و محبت و عقیدت کے جذبات جو سب کے سب سچائی اور نیک دلی پر مبنی تھے کس طرح ممکن تھا کہ وہ بے اثر و بے نتیجہ رہتے! علی گڑھ کالج میں دو سال پروفیسری کرنے کے بعد جو تئیسوی صبح امید کے نام سے انہوں نے لکھی اُس سے ظاہر ہے کہ سرسید کی تحریک کا اُن پر کیا کچھ اثر ہوا؟ زوالِ اسلام کا ایک پُر درد خاکہ کھینچنے کے بعد کہتے ہیں:-

ماتم متخا یہی کہ آئی ناگاہ اک سمت سے اک صدائے ہلکا  
اس شان سے تھی وہ آہ دلیگیر پہلو میں اثر، بے نسل میں تاثیر  
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی جادو تھی؟ فنون تھی؟ جانے کیا تھی

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں  
 صورت سے عیاں جلالِ شاہی  
 وہ ریش دراز کی پسیدی  
 وہ ملک پہ جان دینے والا  
 اٹھتے ہوئے جوش سے برقت  
 تا دیر وہ قوم کا فدائی  
 اٹھتے ہوئے جوشِ دل سے پیہم  
 افسانہ غم سنا کے ٹھہرا  
 جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر  
 باتوں میں اثر تھا کس بلا کا  
 امید کی بڑھ گئی تگ و تاز  
 خواہش کے بدل گئے ارادے  
 جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا  
 اب ملک کے ڈھنگ تھے نرا  
 تعلیم کے جا بجا وہ جلسے  
 بے تاب ہر ایک جزوِ عمل تھا  
 آیا نظر ایک پیرِ دیریں  
 چہرے پہ فردِ صبحا ہی  
 چٹکی ہوئی چاندنی سحر کی  
 وہ قوم کی ناؤ کھینے والا  
 ہے مرثیہ خوانِ قوم و ملت  
 وہ خضرِ طریقِ رہنمائی  
 عبرت کا دکھ راہِ تھا عالم  
 سوتوں کو جگا جگا کے ٹھہرا  
 ہونٹوں سے ٹپک ہی تھی تاثیر  
 راک بار جو رخ پھرا ہوا کا  
 اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز  
 ہمت نے قدم بڑھائے آگے  
 معذور بھی اب تو ہوش میں تھا  
 اخبار کہیں کہیں رسالے  
 گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے  
 ہر بار ”بڑھے چلو“ کا غل تھا

اخیر میں علمائے قوم کو خطاب کر کے تہدیداً کہتے ہیں ۔

اے مدعیانِ مہِ اسلام!  
 دعوے ہیں تو کچھ ہنہر دکھاؤ  
 موقع ہے یہی ہنہر دکھاؤ  
 کرد و جو گزشتہ کی تلافی  
 گود و رفلکٹ ہو ا دگرگوں  
 اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی  
 حجروں میں نواب کرو نہ آرام!  
 ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ!  
 جو کہتے تھے، آج کر دکھاؤ!  
 ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی!  
 پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں  
 اس راکھ میں کچھ شر ہیں اب بھی



اس جام میں ہے شراب باقی      اب تک ہے گرمی آب باقی  
گو خوار ہیں طرز و خود ہی ہے      مرجھا گئے پھول بوہی ہے  
هَذَا اَوْ لَقَدْ بَلَغْتَ اَتَصَاہ      فَاَسْعُوا اَوْ تَوَكَّلُوا عَلٰی اللّٰہ

شبلی کی پہلی اردو نثر کی تحریر وہ علمی اسلامی مضمون ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے عنوان سے مجلہ ان ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پڑھا۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کس طرح حاصل کئے اور پھر دنیا کی تمام قوموں کو ان علوم کی کیونکر تعلیم دی۔ اس مضمون کو ان فقروں پر ختم کرتے ہیں:-  
”میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آج سے  
تاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا یہ بھی اُس کے چہرے پر نہیں لکھتا۔ سلف کے  
مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں جب ہم نے خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ  
کیا تھا۔“

گزشتہ کز حریفانِ مبیش یا کم میتواں گفتن      نزد سنت تا چہ آید آخراں ہم میتواں گفتن  
اس کے ڈیڑھ دو سال بعد شبلی نے مسلمانوں کے گذشتہ کارنامے اک گری ہوئی قوم کے سامنے پیش کرنے پر تہیہ  
کیا اور رائل میروزائف اسلام یعنی نامور فرزانہ وایان اسلام کے سلسلے میں سب سے پہلی کتاب ”المامون“ لکھ کر اُس کا  
حق تعریف مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو لے دیا۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کے ساتھ جو اکتوبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا اس سید نے  
دیباچہ لکھا جس میں سلف کے کارناموں کو یاد رکھنے کی اہمیت جتا کر لکھتے ہیں:-

ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست مخدوم اور ہمارے مدرسۃ العلوم کے پروفیسر مولانا مولوی محمد شبلی  
نعمانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایک سلسلہ میروزائف اسلام کا لکھنا چاہا ہے۔ اسی سلسلے میں  
کی ایک کتاب یہ ہے جو ”المامون“ کے نام سے موسوم ہے۔ انہوں نے خلفائے نبی عباس میں سے، مامون الرشید  
ابن ہارون الرشید کو عباسی خلفا کا ہیرو قرار دیا ہے۔ اور اس کے عام کارنامے اچھے یا بُرے نہایت خوبی  
اور بے انتہا خوش اسلوبی سے اس میں لکھے ہیں۔“

الجزیرہ، کتب خانہ اسکندریہ، سیرۃ النعمان، سفرنامہ روم و مصر و شام، رسائل شبلی سب علی گڑھ کے زمانے کی  
یادگار ہیں۔ علی گڑھ کا زمانہ شبلی کی پہلک زندگی کا پہلا دور تھا علی گڑھ ہی میں اُن کی تصنیف و تالیف کی ابتدا ہوئی۔

وہیں سرسید کی صحبت میں اُن پر جدید قومی رنگ چڑھا۔ وہیں انہوں نے مشرقیت و مغربیت کے صحیح المزاج کی خوبی اور سودمندی دیکھی + اس ضمن میں اُن کے مذہبی خیالات میں بقول شراک نازک انقلاب واقع ہوا۔ شبلی جو اولاً نعمانی و حنفی تھے اب غیر مقلد معتزلی سرسید کے زیر اثر بغیر اس کے کہ غیر مقلد بنیں ”بلاد اسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں“ اس کے بعد شرک رکھتے ہیں:-

”اب اس کے ساتھ ہی اُن میں ایک دوسرا تغیر شروع ہوا۔ اُن میں باوجود انتہائی بے کے اخلاق کے خود داری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت علی گڑھ کالج کی مرجعیت اور اُن کی ذاتی قابلیت نے انہیں ابتداً اس حیثیت سے پہلے میں انٹرویو (متعارف) کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور اُن کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً صاحب و دوسرے صاحب کے ہمراہ رکاب حیدر آباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو بے پناہ ہونگئی ہو گئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خود داری اس حیثیت کو راز انہی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے مذودۃ العلماء میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعے میں علماء کا سرتاج اور شیخ الکمل بن کے اُس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی فوق ہے میں نے بارہا اُن کو اس خیال سے روکا اور اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ علمائیں آنے والے نہیں ہیں“

اس علیحدگی کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ سرسید کو اپنی عمر کے آخری حصے میں کالج سے کم تعلق تھا اور سید محمود کی بے تمون مزاجی بعض وقت خود ادا کام کرنے والوں کے لئے اک سوا بن روح ہو جاتی تھی + بہر حال وجہ کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ علی گڑھ کی فضا اب شبلی کے کام کے لئے ناکافی یا غیر موزوں ہو گئی تھی + وہ محض اک کالج کے پروفیسر بنے نہ پر راضی نہ تھے۔ اُن کی حد درجہ حساس اور خود دار اور انوکھی شخصیت اپنے اظہار و انعام کے لئے اور نئے نئے ذریعے ڈھونڈنا چاہتا تھی۔ کالج کو چھوڑ کر اول اول نو سال ڈیڑھ سال تک وہ سب بندشوں سے آزاد رہے اور اسی آزادی و علالت کے زمانے میں ”الغافل“ کی ہی زبردست تصنیف تکمیل کو پہنچائی + بعد میں وہ حیدر آباد کی علم نوازیار سے متعلق ہو گئے اور اُس کی سرپرستی میں انہوں نے تاریخ سے فلسفے اور فلسفے سے ادب کی طرف رجوع کیا + شبلی کی مصنفانہ زندگی کا دوسرا دور تھا + معلوم ہوتا ہے کہ اب اُن کی طبیعت محض تاریخی بیانات و تحقیقات سے سیر ہو چکی تھی اور اپنی جودت و اجتہاد کے لئے نئے نئے میدان ڈھونڈتی تھی۔ لہذا پہلے ”الغزالی“ پھر ”علم الکلام“ پھر ”الکلام“ لکھی گئیں اور ان کے بعد ادبیات نے دل میں

چٹکی لی تو پہلے ”سوانح مولانا روم“ اور پھر ”سوانح انیس و دہر“ تیار ہوئیں۔ لیکن یہ دوسرا دور جویوں علی گڑھ کی طرح اک تصنیف و تالیف کا دور تھا مگر جس میں علی گڑھ کی سی کوئی قومی تحریک اپنی لہر میں نہ لیتی تھی شبلی کی شخصیت کے زور اور پھیلاؤ کے لئے ایک علمی تنگ نائے ثابت ہوا اور اس لئے وہ چار سال کے بعد ہی حیدرآباد سے رخصت ہو کر چل دیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ شبلی ایک آزاد روش عالم تھے۔ سرسیت تھے جنہوں نے اُن کی آزاد منشی اور اجتہاد کو ابھارا اور علی گڑھ اور حیدرآباد میں اُن کی علمیت و قابلیت کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ضرور ملا لیکن اُن کی آزادی کی ایک نئی راہ بنانے اور بلا واسطہ خود کچھ کر سکنے کے لئے بے تاب تھی۔ بالآخر فکرِ ماش سے کچھ فارغ ہو کر انہوں نے اُس کام کو ہاتھ میں لیا جو انہیں جان و دل سے زیادہ عزیز تھا۔ یہ تھا ہندی مسلمانوں کے علما کو اک نئی راہ پر لے جانے اور نئے چلنے کا زبردست و نتیجہ خیز کام۔ شبلی نے محسوس کیا کہ وہ خاص اس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ سرسیت کو بغیر تعلیم کہہ کر پکارا گیا ہے شبلی مسلمان ہند کے مذہبی رہنما بننا چاہتے تھے۔ اک ایسے رہنما جس کی پُروردہ آواز دماغ نہیں بلکہ دل پر اپنا اثر پیدا کرے اور سچ یہ ہے کہ شبلی میں اس کام کی قابلیت بھی تھی۔

لیکن یہ کام اس قدر آسان نہ تھا جتنا وہ سمجھتے تھے۔ اس میں کچھ نہیں کر انہوں نے اس بابے میں سخت بلکہ انتہائی کوششیں کیں۔ دن رات محنت کی۔ ریاستوں سے روپیہ جمع کیا۔ در بدر گری کی۔ ندوہ کو ندوہ انہیں نے بنایا اور ایسے ایسے علما پیدا کر دیئے جن میں سے کسی کسی میں شرفیت و مغزیت دونوں کی جھلک یکجا پائی جانے لگی۔ اور اس کے ساتھ اُن کی رہنمائی کے انتظام و اہتمام اور اُن کے اخلاقی و اطوار پر ایک دقیق و بختہ رس نظر تھی غرض شبلی نے ہندوستان کے مذہب پرست مسلمانوں کو انہیں کے دل پر اندازوں سے ہر طرح مطیع و منقاد کرنا چاہا لیکن آخر میں علما کی امانیت اور کج روشی نے اُن کو مجبور کر دیا کہ اس کام سے تقاضی ہو رہی تھی۔ اس دوسرے دور میں علاوہ رسالہ الندوہ اور ندوہ کے دارالعلوم کو جو جو احسن چلانے کے انہوں نے ”شعر العجم“ کی تصنیف کی ابتدا کی، گوشتی کے کنائے ندوۃ العلماء کی شان و اعمارت آج تک اُن کی مساعی کو پکار پکار کر شکر کر رہی ہے۔

اس کے بعد شبلی پھر عظیم گڑھ چلے گئے۔ شعر العجم ختم کی لیکن طبیعت کو ڈار نہ تھا۔ چاہتے تھے کہ علاوہ اس انفرادی علمی کام کے کوئی اجتماعی قومی خدمت بھی سرانجام دیں۔ چنانچہ ایک طرف سیرۃ النبی کا مبارک کام ہاتھ میں لیا اور دوسری طرف اک زبردست ایثار کے ساتھ دارالمنفقین کی بنا ڈالی۔

زندگی کے دورِ مندرکہ بالابیان و ظاہر ہو گیا ہو گا کہ شبلی کی زندگی چھ حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ اول ۱۸۵۷ء سے

۱۸۸۲ء تک کا زمانہ جو تعلیم و تربیت اور تجوئے معاش کا زمانہ تھا۔ اس وقت خیالات میں پرانی روش قائم تھی + دوسرا سلسلہ ۱۸۹۸ء تک جب وہ سرسید کے زیر اثر آئے اور ان میں وہ جو ہر ابھرا جس سے ان کی شخصیت دنیا پر ہویدا ہونے والی تھی + تیسرا سلسلہ ۱۸۹۹ء سے ۱۸۹۹ء تک جب انہوں نے کچھ دیر علیحدگی میں تصنیف کا کام کیا + چوتھا سلسلہ ۱۹۰۴ء تک جب حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون کی حیثیت میں ان کو وسیلہ معاش ہی میں مشغول تصنیف حاصل ہو گیا اور وہ نظام کی اعانت میں اعلیٰان سے اپنا مصنفانہ کام کرتے رہے + پانچواں سلسلہ ۱۹۱۳ء تک جب انہوں نے علما کی تہذیب و تربیت کا دستور اکام اپنے ذمے لیا اور اس کو جہاں تک ممکن تھا خوش اسلوبی کے ساتھ بنایا + چھٹا اور آخری زمانہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۴ء تک جب وہ بظاہر سبک زندگی سے علیحدہ ہو گئے لیکن جب انہوں نے تصنیف میں سیرۃ النبی اور تنظیم میں دار المصنفین کی داغ بیل ڈالی جن کے نقش و نگار آج تک ہندوستان میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں + اس تمام عرصے میں شبلی کی شخصیت ہم کو چھ مختلف مقامات پر اپنا کام کرتی نظر آتی ہے۔ اعظم گڑھ۔ علی گڑھ۔ کشمیر۔ حیدرآباد۔ لکھنؤ اور پھر اعظم گڑھ!

**مصنفانہ زندگی کی تبدیلیاں**۔ اب دیکھو کہ شبلی کی مصنفانہ زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں شروع

قدیم رنگ کی محدود دینداری کا اظہار ہے چنانچہ اسکاٹل المعتمدی کا شورغل سنائی دیتا ہے + پھر علی گڑھ میں جا کر اسلامی وسیع نظری پیدا ہوتی ہے "صبح امید" میں امید افزائی ہے "گذشتہ تعلیم" میں علم کے عملی نمونے ہیں "المومن" میں اسلامی تمدن کے علم و فضل کا خاکہ ہے "الجزیرۃ" اور "کتب خانہ اسکندریہ" میں ثابت کیا ہے کہ اسلام میں انتظامی و ملکی و علمی بہبود کا خیال تھا وہ رنگ نظری نہ تھی جس کا الزام مخالفین نے اُس کے سر تنہو پائے + "سیرۃ النعمان" میں دکھایا ہے کہ حنفیت کیسی عقل پسندی اور توسیع خیال پر مبنی ہے + سفر نامہ میں بتایا ہے کہ کون سی اسلامی ملک میں ابھی قدامت پسندی کا رنگ غالب ہے اور کہاں نئی زندگی کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں + رسائل شبلی میں جا بجا اشارے ہیں کہ مسلمانوں نے گذشتہ زمانوں میں کیسے اُن علوم مثلاً میکینکس میں ترقی کی جو موجودہ مغربی تہذیب کا ماہ الامنیٰاں سمجھے جاتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کو پھر ادھر توجہ کرنی چاہئے + اس دور تصنیف کی بلند ترین چوٹی الفاروق ہے جس پر زیادہ تر یہی اعتراض کیا گیا ہے کہ اُس میں گذشتہ زمانے کے ملکی مالی اور فوجی انتظامات کو حال کے مغربی ادارات کے ہم پلہ ثابت کرنے کی مصیبتی کوشش کی گئی ہے + یہ تھا اُس انتہائی وسعت نظر کا نتیجہ جو اسلام کے دائرے میں رہ کر شبلی کو حاصل ہوئی + اس کے بعد خالص علمی دور ہے جب معقولات و فلسفۃ اسلام کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ "علم الکلام" زیر تزیین تھی کہ متکلمین کے حالات کے ضمن میں امام غزالی کے حالات زندگی اس قدر بسیط ہو گئے کہ ان کو پہلے ہی سے ایک کتاب

کی شکل میں یکجا پڑا۔ اس تاریخی ”علم الکلام“ کے بعد شبلی نے موجودہ زمانے کے افتضا کے مطابق ایک جدید علم الکلام کی عمارت کھڑی کر دی جس کے اندر رہ کر اُن کے نزدیک اسلام موجودہ متشکلیں اور مادیات کے حلوں سے محفوظ رہ سکتا ہے + اس کے بعد کا دور ایک خالص ادبی دور ہے + سولہ سچ مولانا روم“ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

”سلسلہ نگار یہ کہ یہ سچو تھا نمبر ہے۔ تین حصے (علم الکلام - الکلام - الغزالی) پہلے شائع ہو چکے ہیں -

مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے۔ اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں اُن کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے اُن کی سولہ سچ عمری لکھنا۔ لوگوں کو موجب تعجب ہو گا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقاید کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معانی اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دل نشین ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اُس کی نظیر مل سکتی ہے۔ اس لئے ان کو زمرہ متکلمین سے خارج کرنا نا انصافی ہے۔“

اس طریقے سے علم سے ادب کی طرف رجوع کیا + چنانچہ اس کے بعد ”موازنہ انیس و دہ“ لکھا جس میں ادب کو علم و فلسفہ سے مطلق کچھ سروکار نہیں۔ اس کتاب میں پہلے پہل ظاہر ہو کر شبلی نے سولہ سچ کے فلسفی نہیں نہ رہے ہیں اب وہیں تنقید سے بھی عمدہ براہونا چاہتے ہیں + چنانچہ ”شعر العجم“ جو تاریخی حیثیت سے ایک ناقص کتاب پکاری گئی ہے تنقیدی حیثیت سے ایک زبردست اور خیال انگیز تصنیف ہے جس کا وجود اردو ادب کے لئے فی الحقیقت مایہ ناز ہے +

آخری دور پھر ایک پاکیزہ و شستہ دین داری پر ختم ہوتا ہے جو ”سیرۃ النبی“ میں آئندہ ہے +

ہمد گیر می - شبلی کا ایک بڑا وصف اور اُن کی مصنفانہ عظمت کی اک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ادب کے مختلف النوع شعروا تقریباتی مساوی طور پر حاوی تھے + وہ عربی کے ایک جید عالم، فارسی کے ایک زبردست انشا پرداز، اردو کے ایک شاندار مصنف تھے۔ عربی فارسی، اردو و فلینوں زبانوں میں باسانی تقریر و تحریر اور خط و کتابت کرتے تھے۔ اردو مکاتیب کی جمع و اشاعت کے خیال کو تو عموماً انہوں نے ناپسندیدگی ہی کی نگاہ سے دیکھا ہاں اپنے فارسی خطوط کی ترتیب و تہذیب کا انہیں شوق تھا + اس کے ساتھ وہ تھوڑی سی انگریزی بھی جانتے تھے اور فرانسیسی زبان سیکھنے میں بھی انہوں نے کچھ وقت اور محنت صرف کی + انہوں نے مختلف موضوعات پر مضامین اور رسالے اور کتابیں لکھیں +

اس حیثیت سے انہوں نے جو کچھ لکھا وہ سوائے الکلام اور موازنہ انیس ودبیر اور منظومات کے سبھی ایک نقطہ نظر سے تاریخی سراپہ تھا وہ اول و بیشتر ایک مورخ ہی ہیں لیکن باعتبار موضوع نظر ڈالی جائے تو جو کچھ لکھا وہ بہت سے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے "گذشتہ تعلیم" زیادہ تر اسلامی مدارس اور قدیم تعلیم پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اسلامی شفا خانے، اسلامی کتب خانے، سیکلکس اور مسلمان، ہندوستان میں اسلامی حکومت، عبدالرحیم خان خاناں، ہمایوں، تزک جہانگیری، علائہ ابن تیمیہ کے مقالات تاریخی شذرات ہیں۔ حقوق الذمیں، جزیرہ، تراجم، مسلمانوں کی علمی بے نقصبی، موبدان مجوس اور سلطنت تیموریہ، برج بھاشا اور مسلمان، کتب خانہ اسکندریہ میں مسلمانوں کے تعلقات دوسری قوموں سے دکھائے ہیں کہ وہ کیسے فراخ دل اور عالی نظر تھے۔ "اورنگ زیب عالمگیر" اس بادشاہ پر جو اعتراضات کی بھرمار ہے اُس کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ خطبہ "درفہ ۱۵۹۵ء" میں ظاہر کیا ہے کہ مسلمان علما کے فرائض زمانہ موجودہ کے لحاظ سے کیا ہیں اور اُن کو کیسے قوم کی حالت کو سنوارنا چاہئے "ابن رشد"، "مغزلہ اور غزلہ" "منطق یونانی کی غلطیاں"، "علوم جدیدہ"، فلسفیانہ و متکلمانہ مضامین ہیں + "بداء الاسلام" ایک مختصر سی "سیرت النبی" ہے جو شبلی نے عربی میں لکھی اور جس کا بعد میں فارسی اور اردو میں ترجمہ کیا گیا +

یہ اُن کے بعض مختصر مضامین یا مقالات ہیں جو ایک کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں + "المامون" "سیرۃ النعمان" "الفاروق" "سوانح مولانا روم" "سیرۃ النبی" سوانح عمریاں ہیں اور تاریخ و سیرت کی کتابیں ہیں + "سیکن ان میں سیرۃ النعمان کو دوسری طرف فقہ سے تعلق ہے الغزالی کو علم کلام سے اور سوانح مولانا روم کو شعر و ادب سے "علم الکلام" تاریخی بھی ہے اور متکلمانہ بھی۔ الکلام اسلام کا جدید فلسفہ ہے + موازنہ انیس ودبیر اور شعر الجم شعر و ادب سے متعلق ہیں اور تنقید عالیہ کے قابل قدر نمونے ہیں۔ "سفرنامہ روم و مصر و شام" اور "مکاتیب شبلی" اور "خطوط شبلی" ہیں وہ ہمیں ایک معمولی انسان کی طرح چلتے پھرتے اور بولتے چلتے دکھائی سنائی دیتے ہیں۔

غرض شبلی صرف ایک مذہبی عالم و مصلح ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک مورخ و سوانح نگار بھی ایک اسلامی فقیہ و متکلم بھی ایک علمی و ادبی نقاد بھی ایک فارسی اردو کے فصیح شاعر بھی اور ایک بے تکلف آزاد رو انسان بھی تھے۔ اُن کی ہمہ گیری قابل غور ہے وہ محض تاریخ و مذہب کے سمندر کے پیراک ہی نہ تھے بلکہ شعر و ادب کی فضا کے ہوا باز بھی تھے! لیکن جہاں ہمیں اس ہمہ گیری پر ایک نظر ڈالنی پڑتی ہے جہاں ہم مجبور ہوتے ہیں کہ شبلی کے ہر شعبہ تصنیف پر ایک نظر ڈالیں وہاں ہمیں یہ بھی نہ بھول جانا چاہئے کہ ہمیں اُن کی کتابوں اور مختلف تصانیف کو ایک سلسلے میں منسلک کر کے بھی دیکھنا چاہئے کہ اُن کا مجموعی مدعا کیا تھا؟ جس طرح ایک کتاب کے مختلف ابواب اور تفصیل ہوتی ہیں اور اُن میں

سے ہر ایک میں ایک کم و بیش جداگانہ موضوع پر بحث ہوتی ہے لیکن وہ سب لکرا ایک ہی کتاب کا جزو ہوتی ہیں اسی طرح ایک مصنف کی مختلف کتابیں اُس کی شخصیت کے مختلف ابواب ہوتے ہیں جن کو الگ الگ اور یکے بعد دیگرے پڑھنے کے بعد ہم کو اُن پر ایک مجموعی نظر ڈالنی چاہئے کہ وہ ایک خاص مجموعہ کے اجزا ہیں اور وہ مجموعہ عبارت ہے اُس مصنف یا اُس کی شخصیت سے + اگر ہم شبلی کی کتابوں کو مجموعی طور پر دیکھیں یا یوں کہئے کہ اگر ہم ان کو ایک مجموعے میں یا ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے اُس کو نامزد کرنا چاہیں تو ہم اس کا نام غالباً یہ رکھیں ”مسلمان اور اُن کا عالم و ادب“ شبلی کی تصنیفات میں ہم اصلی اسلام کی ایک تصویر دیکھتے ہیں اُس کے متمدن میں اُس کے فلسفے میں اُس کے شعر و ادب میں!

### تصنیفات کی خصوصیات - شبلی کی تصنیفات کی خصوصیات کیا ہیں؟

مولوی محمد کبیری تنہا ایک جرمن مستشرق کی شبلی کے متعلق رائے نقل کر کے کہ اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں گویہ ایک گنہ اسلامی رنگ لئے جوتی ہیں“ اور یہ قرار دے کر کہ مولوی چراغ علی سرسید اور مولانا حالی کی تصنیفات ان کا نام خوبیوں سے بھری ہوئی ہیں، شبلی کی تصنیفات و تالیفات پر یہ رائے قائم کرنے میں کہ غلط

بلاشبہ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ استدلال و انداز کسی مستند یورپی تصنیف سے کم نہیں۔ آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت منہجی رائے اور منطقی استدلال ہے۔ اُن میں ایک قسم کی جہت بھی ہے اور طرزِ اداس دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ عالمانہ عبور و خور و شخص کی قوت، حسنِ درایت، علمی جانچ پر تال کی عادت اپنی طبیعت سے کسی شیخ پر ہنپنا، پچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تار یک جھاڑوں اور فارستان سے نکال کر سمجھانا اور پیچیدہ تقسیم و تحلیل کرنا، بعد ازاں اُسے اپنے طور سے ترتیب دینا کہ وہ اپنے اصلی حالت میں نظر آنے لگے یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا شبلی کو درجہ امتیاز بخشی ہیں۔ اسی کے ساتھ مولانا مرحوم میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پوند لگاتے ہیں کہ مطلقاً جنبیت باقی نہیں رہتی۔ معاملہ فہمی اور دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے۔

آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور خوبیوں اور برتریوں کا اندازہ ہوتا ہے، غیر اقوم پران کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہو جاتی ہیں۔ یہ کتابیں

سل پسندی عام فہمی اور دلاویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں +

آپ کا مذاق علمی مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف تو آپ سخت فلسفیانہ اور محققانہ پہلو لئے ہوئے ہیں دوسری طرف آپ بے سدینچر پرست واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی فارسی غزلیات سے جذبات لطیفہ درود عشق اور حسن و جمال کا پتہ چلتا ہے +

لیکن جہاں ہم مولانا سے مرحوم کی مقبول انام تصنیفات کے دلدادہ ہیں۔ وہاں اُن خیالات و آرا کا اظہار بھی ضروری ہے جو ارباب نظر اُن کی کتابوں کے متعلق رکھتے ہیں +

چونکہ آپ کی کتابیں زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں اور سوانح عمریاں بھی اکابر اسلام کی ہیں پس جن بزرگوں کے پاک ناموں کی ہمارے دلوں میں ضرورت سے زیادہ عزت و توقیر ہو اُن کی زندگی کے کارناموں کی نسبت ہمیں کبھی خیال نہیں ہو سکتا کہ فی الواقع اُس زمانہ میں وہ انجام بھی دیئے گئے یا نہیں۔ مثلاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی الفاروقی میں پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی شائستگی اور اُس زمانہ کے فقدان میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ حالانکہ تیرہ سو سال کے عرصہ میں زمانہ نے ہر شعبہ زندگی میں بے حد ترقی کی ہے۔ اور جو محکمے اور دفاتر موجودہ طرز حکومت کے لازمی عناصر ہیں کم و بیش وہ سب دربار خلافت کے ارکان پائے جاتے ہیں۔ جن کو درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی +

پھر لکھتے ہیں کہ شعر العجم پر بھی رسالہ اردو میں حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے اعتراضات شامل ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے کتاب مذکور لکھنے میں کبائی تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا + پروفیسر شیرانی خصوصاً پروفیسر اقبال کے اکثر اعتراضات کے جوابات فروری ۱۹۳۰ء کے محارف میں ریڈ سلیمان ندوی نے دیئے لیکن یہ تسلیم کیا کہ ہمارے معترض پروفیسروں کی نگاہ کے سامنے ادبیات ایران کا وہ پورا ذخیرہ موجود ہے جو یورپین مستشرقین نے اپنی تحقیق و کاوش سے پیدا کیا ہے اور جس پر ہمارے مشرق کو عموماً دسترس حاصل نہیں + ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ بقول ہمدی مرحوم "شعر العجم واقعات کی گھڑائی نہیں بلکہ حسن و عشق کا صحیفہ ہے" اور مولانا شریک ریڈ (مطبوعہ دگلدا انجمن) نے بھی نقل کر دی کہ شبلی مرحوم کی شعر العجم پر ایک نہایت محققانہ ریویو نکل رہا ہے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراضات تمام صحیح ہیں مگر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ خدا نے ان قابل ریویو نگاروں کو جتنا علم و فضل دیا ہے اتنا ہی ضبط و تحمل بھی عطا کرنا اور یہ کہ دنیا کی تحقیق صرف ایک مصنف کے قلم سے نہیں ہوتی تکمیل ہمیشہ ایک دوسرے کا نقد کرنے سے ہوتی ہے + علمی تحقیق - یہ شعر العجم کا حال ہے لیکن شبلی نے بالعموم جس موضوع پر قلم اٹھایا اُس کے متعلق بہت سے ماخذوں کی



چھان بین کی۔ اور پھر بصراحت دیا ہے کہ کتاب میں جا بجا اُن کے حوالے دیئے تاکہ ہر بیان کسی نہ کسی ثبوت پر مبنی نظر آئے۔ مثلاً سیرۃ النعمان کے دیباچے میں یہ لکھ کر کہ ”امام ابو حنیفہ کو اسلام میں جو رتبہ حاصل ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس کثرت سے اُن کی سوانح عمریاں لکھی گئیں کسی کی نہیں لکھی گئیں“ اور پھر ۲۵ ایسی سوانح عمریوں کا تفصیل نام کتاب، نام مصنف و کیفیت ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ افسوس ہے کہ یہ کتابیں ہمارے ملک میں ناپید ہیں۔ انہوں نے ان میں سے تین کتابوں کا مطالعہ کیا اور لکھا کہ ”عقود النجمان جو نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے میری تالیف کا عام فہم ہے“ پھر تصریح کی کہ ”امام ابو حنیفہ کے حالات میں تصنیف تو مجھ کو ایک ہی مل سکی لیکن رجال و تاریخ کی مستند کتابیں جن میں امام کا ذکر ہے اکثر میری نظر سے گزریں۔ یہاں نو کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میری کتاب کا پہلا حصہ جس میں امام ابو حنیفہ کے عام حالات ہیں انہیں تصنیفات سے ماخوذ ہے لیکن دوسرا حصہ جس میں امام صاحب کی طرز اچھا و اصول استنباط سے بحث ہے، اُس کے لئے یہ تمام دفتر بے کار تھا کیونکہ قدیم زمانہ میں سوانح عمریوں کا یہ ڈھنگ ہی نہ تھا کہ حالات زندگی کے ساتھ اس شخص کی تصنیفات یا مسائل سے بھی بحث کرتے۔“ پھر مثالیں دے کر اس بات کو واضح کیا ہے جو پھر بتا کر کہ امام صاحب کی زندگی کے مختلف یعنی تاریخی اور محدثانہ اور مجتہدانہ حصے ہیں صاف صاف بتا دیا ہے کہ اُس کتاب میں میں نے اُن مختلف حیثیتوں کا لحاظ رکھا ہے جو حالات تاریخ و متعلق ہیں ان میں شہادتیں کافی سمجھی ہیں جو عام مورخوں کے نزدیک سہم میں جو واقعہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اس میں زیادہ ترتیب کی ہے اور تمام نثران اصول سے کام لیا ہے جو محققین نے اخبار و روایت کے لئے قرار دیے ہیں عام ناظرین کو شاید ان بحثوں میں مزہ نہ آئے مگر ایسے ضروری حصے کو میں کمزور چھوڑ سکتا تھا عام تاریخی اوقات میں گورواۃ حدیث کی طرح بال کی کھال نہیں نکالی ہے۔ تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا جس کی سند موجود نہ ہو۔ ساتھ ہی اس کا التزام کیا ہے کہ ایسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے جو خود میری نظر سے نہ گزری ہو۔ کیونکہ نقل و نقل ہو کر اکثر روایتیں اپنی حالت پر قائم نہیں رہتیں۔ ان اقداروں کے ساتھ بھی ممکن بلکہ ضروری ہے کہ مجھ سے مسامحت اور غلطیاں ہوتی ہوں لیکن میں اس سے زیادہ اُور کیا کر سکتا تھا۔

وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى لَا يَكْفِيكَ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَنَعْمَ مَا تَبَيَّنَ

اسی طرح ”الغزالی“ کے دیباچے میں یہ لکھ کر کہ امام غزالی کی سوانح عمری میں کوئی مستقل کتاب تو غالباً لکھی نہیں گئی لیکن رجال اور تراجم کی کتابوں میں عموماً ان کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں وہاں دو کتابوں کا ذکر کیا ہے، پھر لکھا ہے کہ امام صاحب اس سب سے کہ شخص تھے کہ ایک مدت تک اُن کی تصانیف کا یورپ میں چرچا رہا بعض کتابیں خاص امام صاحب کی تصنیفات کے متعلق لکھی گئیں ان میں سے دو تصنیفیں میرے پاس موجود ہیں۔

(یہاں ان کتابوں کا ذکر ہے) پہلی کتاب جرمن زبان میں تھی اس لئے میں اُس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ دوسری کتاب سے (یہ فرانسیسی میں ہے) میں نے فائدہ اٹھایا ہے اور جا بجا اس کے حوالے دیئے ہیں؛ چنانچہ دیکھو لنزلی امام صاحب کی تصنیفات اور یورپ رفٹ نوٹ صفحہ ۵۴)

شبلی نے اپنی اکثر کتابوں میں یہ التزام رکھا ہے کہ جا بجا صفحات کے نیچے فٹ نوٹ دے کر ماخذوں کے حوالے دیئے ہیں اور متعدد مقامات پر بعض جگہ اتنی کہ سہل انگار کتاب خوان گھبرا جائے ان ماخذوں سے مفصل بحث کی ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک محقق یا محققین کے لئے شبلی کی تصنیفات کے یہی حصے بے اتنا دلچسپ اور سبق آموز ہیں؛ مثلاً ماخذوں کی چھان بین کے سلسلے میں جو ۲۲ صفحے الفاروق میں اور ۵۷ صفحے سیرۃ النبی کے شروع میں محققین کے سامنے پیش کئے گئے ہیں وہ علاوہ سودمند ہونے کے دلچسپ استدلالات اور دلکش بیانات سے لبریز ہیں؛ الفاروق میں پہلے قدم کی تصنیفات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ طبقات ابن سعد اور انساب الاشراف کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ ان کے قلمی نسخے اُن کی نظر سے گزرے ہیں؛ پھر متاخرین (مثلاً ابن الاثیر۔ ابوالفداء سیوطی وغیرہ) کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ ”ان لوگوں نے تاریخ کے ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا قدم کی جو خصوصیات تھیں کھودیں اور خود کوئی نئی بات پیدا نہیں کی“؛ پھر ابن خلدون اور اس کے شاگرد علامہ منقریزی کو اس عام بکتہ چینی سے مستثنیٰ قرار دیا ہے؛ اور بتا دیا ہے کہ ”بہر حال الفاروق کی تالیف کے لئے جو سرباہ کام آسکتا تھا وہ یہی قدم کی تصنیفات تھیں؛ اس کے بعد تاریخ اور فن تاریخ پر ایک زبردست مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس کے ضمن میں تاریخ کی دو تعریفیں نقل کر کے لکھا ہے کہ

”ان تعریفات کی بنا پر تاریخ کے لئے دو باتیں لازمی ہیں؛ ایک یہ کہ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کئے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب، ہر چیز کے متعلق معلومات کا سراہہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے؛ قدیم تاریخوں میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ رعایا کے اخلاق و عادات اور تمدن و معاشرت کا دوسرے سے ذکر ہی نہیں آتا۔ فراں روئے وقت کے حالات ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ نقص اسلامی تاریخوں تک محدود نہیں بلکہ کل ایشیائی تاریخوں کا یہی انداز تھا اور ایسا ہونا مقتضائے اسباب تھا“

واقعات کی صحت کے معیار کے متعلق لکھتے ہیں کہ واقعات کے جانچنے کے صرف دو طریقے ہیں روایت و تاریخ + پھر ان کی تعریف کر کے لکھا ہے کہ اس امر پر مسلمان بے شبہ فخر کر سکتے ہیں کہ روایت کے فن کے ساتھ انہوں نے جس

قدر اعتنا کیا کسی قوم نے نہیں کیا تھا، انہوں نے ہر قسم کی روایتوں میں مسلسل سند کی جستجو کی اور راویوں کے حالات اس تفصیل اور تلاش سے ہم پہنچائے کہ اُس کو ایک مستقل فن بنا دیا جو فن رجال کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تو ہر اور اہتمام اگر پہل میں احادیث نبوی کے لئے مشروع ہوا تھا لیکن فن تاریخ بھی اس سے محروم نہ رہا، طبری فتوح البلدان طبقات ابن سعد وغیرہ میں تمام واقعات بسند متصل مذکور ہیں۔ یورپ نے فن تاریخ کو کمال کے درجے پہنچا دیا ہے لیکن اس خاص امر میں وہ مسلمان مورخوں سے بہت پیچھے ہیں، اس سلسلے میں سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں کہ ”اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے اور اس زمانے میں کئے گئے جب تصنیف تالیف کا آغاز تھا۔ کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقاء میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہو سکتے ہیں؟“ قدانے یہ ذخیرہ کس طرح مہیا کیا۔ لکھنے کے فن نے کیونکر رواج پایا اس کے متعلق بعض دلچسپ واقعات درج کئے گئے ہیں، فن روایت کے سلسلے میں جہاں اسماء الرجال دیوگرافی کا ذکر ہے وہاں لکھا ہے کہ ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال دیوگرافی کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے، ”ملاحظہ ہو کہ شبلی نے شخص شہو جرمن عربی دان کا قول نقل نہیں کر دیا بلکہ اُسے بیان کر کے گویا اکٹھے پر صاف کرنے سے صاف طور پر اخذ کیا ہے جو اُن کے نزدیک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی، درایت کے اصول کے تحت میں روایتوں کے ناقابل اعتبار ہونے کی جو مثالیں نقل کی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں سبزہ زار آبِ اُداں اور خوبصورت چہرے کا دیکھنا یا کہ فلاں سند اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی کو پسند کرتا ہے یا کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے وغیرہ وغیرہ، فن سیرۃ کے تبصرہ میں سیرۃ ابن اسحاق و اقدی ابن سعد اور طبری کا ذکر کر کے لکھتے ہیں ”اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرۃ کا ذخیرہ کتب حدیث کا اہم پلہ نہیں البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اثر جائے وہ حجت اور امتداد کے قابل ہے، اس معیار کے انداز میں جن اصولوں کو قائم کیا ہے اُن میں دو ایک یہ ہیں، یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے؟“ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اُس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے؟“ آگے چل کر لکھتے ہیں ”اکابر صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ٹھٹھہ ہونے کے اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے

کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے؟

آخر میں یورپین تصنیفات کے نقائص کی وجہ بیان کر کے اپنے ”اصول تصنیف و ترتیب“ کے تحت میں لکھتے ہیں:

ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں اب ان کے نبٹنے کا وقت آ گیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے اُس کو رب پر مقدم رکھا ہے۔ یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں لی اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے (۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ احادیث صحیحہ کے سنی

سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں۔ جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، ارباب سیرت کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب

حدیث میں ان موقعوں پر ڈھونڈتے ہیں جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے ان کو درج ہونا چاہئے۔ اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں لیکن کتب حدیث

میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آ جاتے ہیں۔ اس لئے اگر عام مستشرق اور

نقص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں۔ ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر میل کئے جو

اہل سیرت کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے (۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں۔ لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں ان کے متعلق تنقید اور

تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کہ کاوش کی ہے اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے جن کی تعداد سینکڑوں سے

متجاوز ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا تاکہ جس سلسلہ روایت کی تحقیق مقصود ہو یہ آسانی ہو جائے۔ (۴) جن فرد گزشتوں کی تفصیل اور پرگزرجی ہے جہاں تک ممکن تھا ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

نبی کو علمی تحقیق کا اس قدر شوق تھا کہ روم و مصر و شام کا سفر اختیار کرنے کی بڑی وجہ اسلامی مذہبی اور خصوصاً تاریخی کتب کی تلاش تھی۔ سفر نامہ میں جہاں قسطنطنیہ کے کتب خانوں کا ذکر ہے وہاں اُن کی پانچ خصوصیتیں گنوانی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ قرنِ تاریخ و ادب میں بعض ایسی تصنیفات دیکھیں جن میں وہ جہت ہے جس کو میں مدت سے تلاش کرتا تھا اور یورپ کی تصنیفاتِ حال کے سوا اس قسم کی طرزِ تصنیف کا کہیں پتہ نہ لگتا تھا اور ایک یہ کہ مشہور حکما اور ائمہ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ امام غزالی بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کیا تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلدون وغیرہ کے ذریعہ سے معلوم ہیں اکثر یہاں موجود ہیں۔ اس تحقیق کے ساتھ قتل و درایت کے اصولوں پر براہِ عمل ہے چنانچہ سوانحِ مولانا روم میں مولانا سے شمس تبریزی کی ملاقات کے ذکر میں جو حکایتیں نقل کی ہیں مثلاً یہ کہ جب شمس تبریزی نے مولانا کی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کیا ہے اور انہوں نے کہا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے اور یہ کہنا تھا کہ دفعۃً کتابوں میں لگ گئی وغیرہ وغیرہ ان حکایتوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان میں سے بعض نہایت مستند کتابوں میں ہیں لیکن ایک بھی صحیح نہیں صرف اس وجہ سے کہ خارج از قیاس ہیں بلکہ اس لئے کہ جیسا کہ آگے آتا ہے صحیح روایت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح بیچو خاں کی فوج سے آگے مولانا کے مسئلہ بچا کر ٹٹ جانے اور باوجود تیروں وغیرہ کی بوجھاڑ کے زخمی ہونے کو محض خوش اعتقادی کے واسطے کہتے ہیں۔

مضبوطی رائے۔ اُن کی مضبوطی رائے اور استدلال کا اندازہ غزوہ بدر پر اُن کی محققانہ نظر سے ہوتا ہے جہاں سوال یہ درپیش ہے کہ غزوہ بدر کا مقصد کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملے کا دفاع۔ لکھتے ہیں کہ اس بات کا مجھ کو خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور اربابِ سیر میرے حریفِ مقابل ہیں۔ نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پاسکتا ہے۔ پھر تمام واقعہ کو بیان کر کے یوں استدلال کرتے ہیں کہ اس سے پہلے آنحضرت نے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سہا یا بھیجے اُن میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا۔ اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، علاوہ بریں چونکہ مدینہ سے نکلنے تک کے قبائل قریش کے زیر اثر تھے اور مدینہ سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر تھا اس بنا پر اگر قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آ رہے اور مسلمان بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں پانچ منزل تک کی طرف بڑھ جاتے ہیں، پھر واقعات بالترتیب درج کر کے لڑائی کا اصلی سبب یہ بتایا ہے کہ ایک سرے میں قریش کے ایک حلیف کا قتل وقوع میں آیا تھا جس سے

یہ سارا سلسلہ جنگ چھڑ گیا۔ الفاروق میں آنحضرت کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات کے سلسلے میں جہاں حضرت ابو بکر و عمر کے چلن کو ملکی مفاد کے اعتبار سے سراہا ہے وہاں حضرت عمر کی تندہی و زینب مزاحی کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی کتاب کے حصہ دوم میں فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ ڈالتے ہوئے جہاں یورپین مورخین کی رائے کے مطابق اسلامی فتوحات کے بیان کردہ اسباب کو مسترد کیا ہے وہاں بعد میں فتوحات کے اصلی سبب کو کس قدر اصابت رائے سے بیان کیا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سوال کا اصلی جواب صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں میں اُس وقت باقی اسلام کی بدولت جو جوش عزم استقلال بہت بلند و صلگی دلیری پیدا ہو گئی تھی اور جس کو حضرت عمر نے اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا روم و فارس کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اُس کی ٹکڑ نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ پھر تین اور اسباب کا بھی ذکر کیا ہے۔

صدق گوئی۔ شبلی کو اعتراف صداقت سے کبھی عداوت اگر پر نہیں۔ غزوات پر دوبارہ نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔ "امام غزالی کی شہرۃ آفاق تصنیف ایچا العلوم کا ابن مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق سے موازنہ کرتے ہوئے اُن کی عبارتیں (جو لفظاً و معنیاً مطابق ہیں) بالقابل نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ناظرین کو اختیار ہے کہ اس کو تواتر و قرار دیں یا نقل۔ یا اقتباس۔" الغزالی کے اخیر میں امام غزالی کی تصنیفات پر جو بعض نہایت سخت اعتراضات ہیں اُن کو ہنما نقل کیا ہے پھر لکھا ہے کہ خیر میں اس بات کا اعتراف بھی کرنا ضرور ہے کہ امام صاحب کی بعض تصنیفات میں وقتی بعض باتیں مواخذہ کے قابل ہیں۔ مثلاً ایچا العلوم میں احادیث کے نقل کرنے میں نہایت بے احتیاطی کی ہے۔ بزرگان سلف کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں اکثر دراز کار اور بعید از عقل ہیں۔ مصنف کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ "بہر حال امام صاحب امام تھے پیغمبر نہ تھے۔ مومن کے ملکی کارناموں اور علمی تذکروں کو فخریہ بیان کرنے کے بعد سیرت نگار نے اُس کی عشرتوں اور عیاشیوں کا بھی صاف صاف ذکر کر دیا ہے کہ ان کا اُسے چسکا پڑ گیا تھا۔" سورخ مولانا روم میں یہ لکھ کر کہ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی عراقی اور مولانا روم ہیں اعتراف کیا ہے کہ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل کو ترقی دینے والوں کی فہرست سے مولانا کا نام خارج نہیں کیا جاسکتا لیکن انصاف یہ ہے کہ غزل گوئی کی حیثیت سے مولانا کا سعدی اور عراقی کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ساتویں صدی ہجری کے فحش و بد تہذیبی کا سوا ذکر کر کے لکھا ہے کہ شیخ سعدی اس زمانے کے اخلاقی مفاد میں لیکن گلستان کے باب پنجم میں خود ایسی حکایتیں لکھی ہیں جو آج کسی مہذب آدمی کی زبان سے ادا نہیں ہو سکتیں۔ مولانا روم کی ثنوی "بہت قرآن در زبان پہلوی"

لیکن کینرک اور خاتون کا قصہ جعفر زلی کے نامہ اعمال میں داخل کرنے کی چیز ہے۔ "قسططنیہ پر یورپی اثر کا ذکر کر کے لکھتے ہیں" حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خیمہ بن گیا ہے، "دسفر نامہ" ابن رشد کے حالات میں لکھا ہے کہ یورپ کی یہ قیاض دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن دوسری طرف اُس نے بے تکلف مسلمانوں کے خان کرم سے زلہ ربائی شروع کر دی "موازنہ انیس و دہریہ میں یہ کہہ کر کہ اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پر داری کا دیا چڑ زوال میں" لکھتے ہیں کہ میرے ایک معزز دوست نے خود میرا نمب سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع و بدائع کو پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں لیکن آخر لکھنویں رہنا ہے تاہم میرا نمب نے یہ کیا کہ چونتیس محض لغو تھیں وہ نہایت کم برتیں۔ اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دہریہ نے انیس کے مرثیوں کا سرفہ کیا لیکن جب ثابت نہیں ہو سکتا تو ضروری معلومات ملاحظہ آ سکتے پر صاف کہہ دیا ہے کہ افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جدوجہد کے اس بارہ میں مجھ کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔

آزادگی۔ شبلی کی آزادگی اور آزاد منشی باوجود اُن کے زہد و تقویٰ کے جا بجا اُن کی تصنیفات میں مترشح ہو۔ "الکلام" میں لکھتے ہیں بے شبہ اگر مذہب اسی چیز یعنی علم اور حقیقت کے خلاف ہونے کا نام ہے تو وہ سنس کے مقابلہ میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا لیکن اسلام نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ استمرا علم بامود دنیا کہ یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو۔ انبیاء کی تعلیم و ہدایت کا طریقہ بتاتے ہوئے (ص ۱۰۵) شاہ ولی اللہ صاحب کے ضروری الذکر اصولوں میں پہلایہ بیان کرتے ہیں کہ "اُن کی (یعنی انبیاء کی) طرزِ تعلیم اور طریقہ ہدایت میں عوام کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے البتہ ہر جگہ ضمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں" پانچواں اصول یہ ہے کہ شریعت کا ایک حصہ خاص خاص قوموں یا ملکوں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے۔ آخری اصول کے ضمن میں یہ منقول ہے کہ "اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ شعائر، تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قسم کی عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی سنلوں پر اُن احکام کے متعلق چنداں سخت گیری بھی نہ کی جائے" اسلام کو تمدن ترقی کا مہیہ ثابت کرنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

"یورپ کے تمدن کے مہمات اصول حسب ذیل عنوان میں محدود کئے جاسکتے ہیں اور دنیا میں جب کبھی قوم نے تمدن میں ترقی کی ہوگی یا آئندہ کرے گی تو انہی اصول پر کی ہوگی اور کرے گی۔"

(۱) انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ خیال کرے کہ وہ اصلی ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے منتفع اٹھائے +

(۲) انسان کی تمام ترقیوں کی بنیاد یہ ہے کہ اُس کو یقین ہو کہ اس کے خیر و شر ترقی اور منزلِ عروج اور زوال کا مدار تمام تر اُس کی سعی اور کوشش پر ہے اور دنیا اور دین کی تمام کامیابیاں محض اُس کی کوششوں پر موقوف ہیں +

(۳) تمدن کی ترقی کا سب سے بڑا اصول مساوات کا اصول ہے یعنی یہ کہ تمام انسانوں کے حقوق مساوی ہیں۔

(۴) تمدن کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ اور ترقیِ تمدن کی بہت بڑی علامت مذہبی نفرت اور مذہبی جبر کا دور کرنا ہے +

(۵) ترقیِ تمدن کے بڑے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر قائم کئے جائیں +  
(۶) کسی قوم کی ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ اُس کے ہر فرد کو من حیث القوم سلفِ انزینی اپنی آپ عزت کا خیال دلایا جائے +

(۷) ترقی کا مقدم ترین اصول علم ہے +

(۸) ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ نظامِ حکومت جمہوریت کی بنا پر قائم کیا جائے +

(۹) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ تقسیمِ عمل کے اصول پر کام کیا جائے یعنی ہر فرقہ ایک خاص کام میں مشغول ہو تاکہ اس کام کو بوجہ خصوصیت کے نہایت اعلیٰ درجہ تک ترقی دے سکے۔

(۱۰) ہر زمانہ میں ایک گروہ ایسا ہوتا آیا ہے جس کی یہ رائے ہے کہ انسانوں کے افراد میں جو اختلاف مراتب ہے یہ برپا دیا جائے +

(۱۱) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ علمی ترقی کی کوئی انتہا نہ قرار دی جائے یعنی انسان ترقی کی کسی حد پہنچ کر قلع نہ ہو اور یہ خیال رکھے کہ ابھی ترقی کے اور منازل طے کرنے باقی ہیں +

ہر اصول کو بیان کر کے قرآنِ مجید کی آیتوں سے صاف صاف ثابت کر دیا ہے کہ اسلام میں ان اصولوں کے مطابق ہے بلکہ ان میں سے اکثر کا بانیِ مبنائی اسلام ہی ہے + علامہ ابن حزم کی مشہور کتاب الملل والنحل پر بحث کر کے اخیر میں کہتے ہیں کہ اس کتاب میں بعض خیالات بالکل جدید ہیں مثلاً ابن حزم کا دعویٰ ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں +



خیال ہے کہ عورتوں کا درجہ مردوں سے کم ہے لیکن علامہ ابن حزم اس کے خلاف ہیں۔ پھر لکھا ہے علامہ موصوف کا خیال صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات کے ہم خیال پہلے بھی موجود تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ شبلی ابن حزم کے ہم خیال ہی لیکن احتیاطاً خاموش ہیں!

شبلی کانگریس کے جانب دار اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ جہانگیر اور نزاک جہانگیری میں لکھتے ہیں: ”بے شبہ تیوریوں نے ہندوؤں کے ملک کو نہیں بلکہ دل کو فتح کر لیا تھا اور ہندوؤں کے اخلاص و محبت نے فاتح کو مفتوح بنا لیا تھا۔“

بہ لوج مشہر پر وادہ این رحم دیدم

کہ آتشے کہ مرا سوخت خویش را ہم سوخت

قومی اصلاح۔ شبلی اگرچہ بار بار بصراحت نہیں کہتے لیکن قوم کی اصلاح اور تربیت اخلاق ہر وقت اُن کے پیش نظر ہے۔ امام غزالی نے تربیت اطفال کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کو غایت درجہ سبق آموز پند نامہ نیز اُس ہدایت نامہ کو جو امام ابو حنیفہ نے قاضی ابویوسف کے نام لکھا زیادہ تر اس غرض سے بتفصیل درج کرتے ہیں کہ اس دور کے کج روش مسلمان اُن سے مستفید ہو سکیں اور دیکھیں کہ کیا کیا مہمات اصول تھے جو اُن کے بزرگوں نے قائم کئے تھے۔ لیکن جن پر اُن کا اک عرصے سے عمل نہ رہا۔ غزالی میں لکھتے ہیں: صدقات و وجوہ خیر کی نسبت امام صاحب نے جو لکھا ہمارے زمانے کے بالکل حسب حال ہے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں آج مسلمانوں کے تنزل کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ لاکھوں کروڑوں روپیہ بے جا وجوہ خیر پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ شہر میں سینکڑوں مسجدوں کے موجود ہوتے اور نئی مسجد بنتی جاتی ہیں اور جو روپیہ اسلام کے نہایت ضروری کاموں میں خرچ ہونا چاہیے تھا وہ اس میں صرف کر دیا جاتا ہے۔ پھر لکھا ہے: ”امام صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ہمارے زمانے سے اُس کو مطابق کرو تو گمان ہو گا کہ اسی زمانے کو دیکھ کر لکھا ہے۔“ تمام ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے اختلافات مذہبی پر نرا عین قائم ہیں، اخلاق کی اصلاح کے تحت میں لکھا ہے: ”اس بنا پر امام غزالی کے نزدیک تمام قوم کی یہ اخلاقی کے ذمہ دار علماء ہیں۔“ غزالی سلمۃ کی تصنیف ہے۔ ۱۹۵۰ء میں شبلی نے جو خطبہ ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں دیا اُس میں ہی رونا ہے۔ شبلی نے اپنی تصنیفات میں انہیں شخصیتوں کی طرف رجوع کیا ہے جن کے خیالات اُن کے خیالات سے مطابقت رکھتے تھے۔ جب اُن کو اپنے زمانے کے علماء میں ہم خیال نہ ملے تو انہوں نے گزشتہ مسلمانوں میں ایسے خلفاء و ائمہ کو ڈھونڈا جو اُن کے احساسات کی

تائید کریں +

اسلامی تاثرات - شبلی سزایا اسلامی تاثرات میں ڈوبے ہوئے ہیں + مصر میں جاکر جامع ازہر کی بڑی لٹریچر کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ مجھ کو اپنے سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بہنیتی کا یقین ہوا کسی چیز کا نہیں ہوا۔ تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اُس سے حوصلہ مندی بلند نظری جوش ہمت غرض تمام شرفیاء اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے + لہذا مون کی جامع مسجد کے قریب ایک کتب میں گئے۔ مولوی صاحب کے اشارے سے ایک لڑکے نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔ میرے دل پر عجیب اثر ہوا۔ خیال آتا تھا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان! کہاں بحیرہ روم کے دور دراز جزیرے۔ اس مقدس کلام (قرآن مجید) میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برقی قوت بن کر دوڑ گئی۔ اور آج تک باقی ہے۔ وہ محصور لڑکا خوش لحن بھی تھا اور اصول قرأت کے مطابق پڑھتا تھا۔ اتفاق سے آیتیں بھی موثر تھیں ان باتوں نے مجھ کو بالکل مبہوش کر دیا اور دیر تک ایک عجیب حالت طاری رہی +

اجیاد العلوم کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

اجیاد العلوم میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے۔ ہر فرقہ و نشتر کی طرح دل میں جھجھ جاتا ہے۔ ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے۔ ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زبان میں لکھی گئی خود امام صاحب تاثیر کے نشی میں مرثا تھے۔ بغداد میں اُن کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا۔ تمام مذاہب کو چھانا۔ کسی سے تسلی نہیں ہوئی۔ آخر تصوف کی طرف رخ کیا۔ لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی بلکہ سزا پا حال کا کام تھا۔ اور اُس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس تھا۔ امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدا راہ تھے۔ قبولیت عام۔ ناموری۔ جاہ و منزلت مناظر و مجاہدات اور تزکیہ نفس عشتان بئینہما۔ ع اس رہ کہ مے روی تو منزل نئے رود + آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کلی پہن بغداد سے نکلے اور دشت پیمائی شروع کی۔ سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزم زار تک رسائی پائی۔ یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے۔ لیکن ع بیاد آ رہے تھے۔ بادہ پیمارا کے لحاظ سے افادہ عام پر نظر پڑی۔ دیکھا تو آدے کا آد ا بگڑا ہوا ہے۔ امیر و غریب۔ عام و خاص۔ عالم و جاہل۔ رند و زاہد سب کے اخلاقی تباہ ہو چکے ہیں۔ اور مہوتے جاتے

میں علماء جو دلیلِ راہ میں سکتے تھے طلبِ جاہ میں معروف ہیں یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اسی حالت میں یہ کتاب لکھی۔ دیکھا کہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو بھالیا ہے اور سعادتِ اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں۔ علماء جو دلیلِ راہ تھے زمانہ اُن سے خالی ہوتا جاتا ہے جو رہ گئے ہیں وہ نام کے عالم ہیں جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے منظر (جو فخر اور نمود کا ذریعہ ہے) وعظ و پسند (جس میں عوام کی و نفرتی کے لئے رنگین اور صبح فخرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ دینا جو مقدمات کے فیصلہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ "باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے اور لوگ اُس کو بھول بھلا چکے" یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میری لٹ لٹ گئی۔

حضرت عمر کی سیرت میں شبلی کے قلم سے بعض ایسی سادہ لیکن مؤثر عبارتیں نکلی ہیں کہ ظاہر ہے کہ جس رنگ میں قارئین کو رنگنا چاہتے ہیں وہ پہلے کس طرح بے تکلفی سے خود اُن کے دل پر چڑھ گیا ہوگا۔ لکھتے ہیں تھے

"اُن کے اخلاق و عادات کے بیان میں مورخوں نے تواضع اور سادگی کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور درحقیقت اُن کی عظمت و شان کے تلج پر سادگی کا طرہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی زندگی کی تصویر کا ایک رخ یہ ہے کہ روم و شام پر فوجیں بھیج رہے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے معاملہ پیش ہے، غلام و امیر معاویہ سے باز پرس ہے، سعد و قاص، ابو موسیٰ اشجری، عمرو ابن العاص کے نام احکام لکھے جاتے ہیں۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ بدن پر بارہ پونہ کا کرتا ہے۔ سر پہ پٹھا سا عمامہ ہے پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہیں۔ پھر اس حالت میں یا تو کا ندھے پر منکاٹے جا رہے ہیں کہ بیوہ عورتوں کے گھر یا بیوہ یا مسجد کے گوشے میں فرشِ خاک پر لیٹے ہیں اس لئے کہ کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور زمین کی چھبکی سی آگئی ہے + بارہا مکہ سے مدینہ تک سفر کیا لیکن خیمہ یا شامیانہ کبھی ساتھ نہیں رہا۔ جہاں ٹھہرے کسی درخت پر چادر ڈال دی اور اُسی کے سایہ پر رہے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ اُن کا روزانہ خانگی خرچ دو درہم تھا جس کے کم بیش ۱۰ درہم ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ احف بن نفیس رومائے عرب کے ساتھ اُن کے ملنے کو گئے۔ دیکھا تو دامن چڑھائے ادھر ادھر دوڑنے پھرتے ہیں۔ احف کو دیکھ کر کہا آؤ تم بھی میرا ساتھ دو۔ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے۔ تم جاتے ہو ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق شامل ہے۔ ایک شخص نے کہا امیر المؤمنین! آپ کیوں تکلیف اٹھاتے

ہیں کسی غلام کو حکم دیجئے وہ ڈھونڈ لائے گا۔ فرمایا۔ اے مجاہدِ اُخبر! ”مینی“ یعنی مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟“

سادگی کے ایک اور عنوان سے لکھا ہے +

”ہنایت بے تکلفی اور سادگی سے رہتے تھے۔ کپڑوں میں اکثر پیوند ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دیر تک گھر میں رہے۔ باہر آئے تو لوگ انتظار کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ اس لئے انہی کپڑوں کو دھو کر کٹھن کو ڈال دیا تھا۔ خشک ہو گئے تو وہی پہن کر باہر نکلے۔“

**ادبیات**۔ تاریخ و سیرت، فلسفہ سے اب ہم خالص ادب کی طرف رجوع کرتے ہیں + موازنہ انیس و دسیر میں شہلی نے شاعری کا محض اجمال ذکر کیا ہے کہ شاعری کے دو جزو ہیں یادہ و صورت یعنی کیا کنا چاہئے اور کیونکر کنا چاہئے۔

”انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے جوش و سرور، عشق و محبت، درود و نوح، فخر و ناز، حیرت و استعجاب، طیش و غضب وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اُس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی بیوی ہے۔ ان کے سوا عالمِ قدس کے مناظر مثلاً گرمی، سردی، صبح و شام، بہار و خزاں، باغ و بہار، دشت و صحرا، کوہ و بیابان کی تصویر کھینچنا یا عام واقعات اور حالات کا بیان کرنا بھی اسی میں داخل ہے + لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے۔ یہ شاعری کا دوسرا جزو یعنی اُس کی صورت ہے اور انہی دونوں جزیوں کے مجموعہ کا نام شاعری ہے۔ باقی خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی، مبالغہ، صنائع و بدائع، شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں۔ اگرچہ بعض جگہ یہ چیزیں نقش و نگار اور زیب و زینت کا کام دیتی ہیں۔“

شاعرِ مجید چہارم کے شروع میں شاعری پر سو صفحہ کا ایک ایسا مبسوط اور جامع تبصرہ ہے کہ اردو زبان اُس کی دقت نظر، سلاست زبان اور پیرایہ بیان پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے + اگر کسی کو سمجھنا ہو کہ شاعری کیا ہے تو وہ اس تبصرہ کو اپنے جیب میں جگہ دے لے + پہلے شاعری کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اُس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے اُس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ

مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے، پھر احساس اور ادراک کو تیز کر کے بتایا ہے کہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں، پھر شاعری کو دوسری چیزوں سے الگ کر کے دکھایا ہے کہ ”جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی، مصوری، صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے“ سائنس اور شاعری میں یوں فرق بتایا ہے کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا براہِ تکبیر کرنا ہے، ”شاعری کا مخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے۔ سائنس استدلال کرتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے“ پھر موسیقی اور شعر تصویر اور شعر خطبہ اور شعر تاریخ اور شعر افسانہ اور شعر کے فرق کو واضح کیا ہے، پھر لکھتے ہیں ”اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو“ ”شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے“ شاعری کے عناصر وزن اور محاکات اور خیال بندی اور سادہ اور شیریں الفاظ اور صاف بندش اور جدید طرزِ ادا میں اور حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخیل۔ ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر املانے کا مستحق ہوگا، پھر محاکات اور تصویر کا مفاد بلکہ کیا ہے تخیل کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ دراصل قوتِ انحراف کا نام ہے، فلسفہ اور سائنس میں قوتِ تخیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ کو حل کر دیا جائے لیکن شاعری میں تخیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تخریک ہو، ”ایک پھول کو دیکھ کر سائنس دان تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے، اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے، اس کی غذا زمین کے کن اجزاء سے ہے، اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزاء ہیں یا صرف ایک کے؟ لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں پھول دیکھ کر بے اختیار اُس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے ع لے گل تنوخرِ سندم تو بونے کے داری، پھر محاکات اور تخیل تفصیلی بحث کی ہے جس میں جابجا دلکش اور عام فہم مثالوں سے اُن کی حقیقت واضح کر کے پیش کر دی ہے، محاکات کے کمال کے لئے عالمِ کائنات کی ہر قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، ”تخیل کا خاکہ یوں کھینچا ہے کہ شاعر کی نظر میں عالم کائنات قوتِ تخیل سے ایک اور عالم بن جاتا ہے“ ”آفتاب ماہِ مناب، ستارے صبح، شام، شفق، باغ، پھول، پتے سب اس سے ہمزبانی کرتے ہیں سب اُس کے راز دار ہیں، سب سے اُس کے تعلقات ہیں، وہ شب و صبح اور صبح و صبح سے یوں خطاب کرتا ہے“

اے شب اگر تہزار کا راستہ مرو

وے صبح اگر تہزار شادی است مخند

”واقعاتِ عالم پر جب وہ عبرت کی نظر ڈالتا ہے تو ایک ذرہ ناصح بن کر اُس کو اخلاق اور عظمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس عالم میں وہ گورِ غریباں میں جا نکلتا ہے تو بوسیدہ پڑیاں علانیہ اُس سے خطاب کرتی ہیں:۔  
کہ زہارا اگر مرے آہستہ تر

کہ چشم و ناگوشِ موعے است مر

قوتِ تخیل ایک چیز کو سود و فود دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اس کو اُس میں ایک نیا کرشمہ نظر آتا ہے، پھر تخیل کے بے جا استعمال کی مثالیں دی ہیں۔ اور مبالغہ کی بے اعتدالیاں دکھائی ہیں۔ لفظی تناسب اور ایہام کی بے بنیادی ظاہر کی ہے۔ استعارات اور تشبیہات کے استعمال میں احتیاط لازم قرار دی ہے اور بتایا ہے کہ فارسی میں متاخرین کی سخت غلطی جس سے اُن کی شاعری بالکل برباد ہو گئی یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخیل سے کام لیتے ہیں مثلاً  
زمانہ ایست کہ بفضل اگر نسیم وزید  
بسانِ غنچہ اش از انبساط خنداں کرد

پھر تشبیہ و استعارہ کا صحیح مصرف دکھایا اور اس بات کی ترغیب دلائی کہ شاعر نا در اور جدید تشبیہیں اور ہتکار ڈھونڈ کر پیدا کرے + جدت و لطیف اداس کے بعد حسن الفاظ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پر داری کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے۔ ”یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک عمدہ سے عمدہ خیال عمدہ سے عمدہ مضمون عمدہ سے عمدہ نظم اس وجہ سے برباد ہو جائے کہ اُس میں صرف ایک لفظ لپٹے دیے سے گر گیا“ + الفاظ کے انواع اور اُن کے مختلف اثر خوب ظاہر کئے ہیں کہ ”الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں بعض نازک، لطیف، شستہ، صاف، رواں اور شیریں اور بعض پُر شوکت، متین، بلند پستی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین کے ادا کرنے کے لئے موزون ہیں“ پھر کہا ہے کہ ”اس سے زیادہ مقدم الفاظ کا باہمی تعلق اور تناسب ہے۔“ الفاظ کے توافقی، تناسب، موزونی اور ہم آواری سے سلاست صفائی اور روانی پیدا ہوتی ہے پھر مترادف الفاظ کا باریک اور نازک معنوی فرق دکھایا + پھر سادگی، جلوں کے اجزا کی ترکیب اور واقعیت سے ایک لطیف بحث کی ہے + اخیر میں پھر شاعری اور جذبات کا تعلق واضح کیا ہے اور شاعری کے استعمال کا صحیح رستہ دکھایا ہے کہ ”شعر ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور سے کیا جائے۔“ شاعری کے جس قدر اقسام ہیں یعنی فلسفیانہ، اخلاقی، عشقیہ، تخیلی سب سے مفید کام لئے جاسکتے ہیں۔ فلسفیانہ شاعری دقیق خیالات کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کر سکتی ہے، اخلاقی شاعری اخلاق کو سنبھالتی ہے، عشقیہ شاعری سوزندہ دلی

اور تازگی روح پیدا ہوتی ہے۔ تخیل سے طبیعت کو ہتر اذوا انبساط ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر شعراء ایران نے شاعری کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ دیکھو کیونکر شبلی نے اصطلاحی کنبجکوں سے بچ کر یا ان کو سلجھا کر شاعری کے معنی اور اس کا مقصد ذہن نشین کر دیا ہے۔ تنقید و تبصرہ عموماً اک خشک بیابان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ شبلی نے ان کے بجائے ریزہ ریزہ کے واقعات اور روزوں اقتباسات سے ایک دلکش چمنستان کا سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے جس سے محض لطف اٹھانے والا لطف اٹھا سکتا ہے اور چمن بندی کرنے والا اپنے فن کی مناسب اصلاح کر سکتا ہے۔ باب دوم میں فارسی شاعری کی پیدائش، ارتقا، ترقی و تنزل، عربی شاعری کا اس پر اثر، نظام حکومت کا اثر، امر و پرستی کا اثر، مختلف قومی خصوصیتوں اور مختلف آب و ہوا اور مناظر قدرت کا مختلف ملکوں میں مختلف اثر ان سب پر ایک تاریخی ادبی نظر ڈالی ہے مثلاً لکھتے ہیں ”غزنین اور ہمدرد وغیرہ کے شعرا سچے گو اور سادہ گو ہیں بخلاف اس کے شیراز وغیرہ کے شعرا کا کلام لطافت اور نزاکت سے گویا عروس رعنا ہے۔ ہندوستان میں اگر ایرانی فحش گو بھی مذہب بن جاتے ہیں۔ ایران کے فطری خوبصورت اور رنگین مناظر کی وجہ سے رنگین سخن، رنگین نوائی، رنگین ادائی کے محاورات پیدا ہوئے۔ باب سوم میں عربی فارسی شاعری کا فرق دکھایا ہے پھر فارسی کے مختلف انواع پر تفصیلی تبصروہے۔ رشتوی، قصیدہ، عشقیہ شاعری، غزل، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری، فلسفیانہ شاعری، کو یکے بعد دیگرے لیا ہے اور نہ صرف ان کا ارتقا دکھایا ہے بلکہ شاعر کا شاعری مثلاً موازنہ کیا ہے اور اس طرح ضمناً جا بجا شاعری کے اصولوں سے بحث کرتے ہوئے لطیف و بلیغ اشعار سے اپنی عالمانہ تصنیف کو دلچسپ و دلکش بنا دیا ہے۔ تصوف کا اثر یوں دکھاتے ہیں کہ اول قصیدہ گوئی جو سربا پا خوشامد تخی موقوف ہو گئی، بادشاہ و وقت کا نام لینا لازم نہ رہا۔ زبان مذہب اور شائستہ ہو گئی اور وہ الفاظ جوندی اور عیاشی کے لئے خاص تھے حقائق اور اسرار کے ترجمان بن گئے۔ فلسفہ شاعری میں تصوف کی راہ سے آیا۔ تصوف کا اصلی مقام عشق و محبت ہے۔ اس عالم میں دشمن اور دوست کی تمیز اٹھ جاتی ہے ہر چیز میں اُسی کا جلوہ نظر آتا ہے ہر چیز کی طرف دل کھینچتا ہے، اس کا اخلاق پیرا اثر پڑا۔ عام محبت اور ہمدردی کے خیالات پھیل گئے اور یہ تعلیم ہوئے لگی کہ

در چیزم کہ دشمنی کفر و دیں چراست از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

گاندھیت ملاحظہ ہو

زمین عشق بہ کوئین صلح کل کردم تو خصم باش وز ما دوستی تماشا کن  
تصوف نے بہت سے نئے الفاظ اصطلاحات، تلمیحات زبان میں داخل کئے۔ عزت نفس کا خیال لوگوں

کے دل میں پیدا کر دیا یہاں تک کہ لکھا ہے

سرمد اگرش فاست خود می آید      درآمدش بجاست خود می آید  
بیہودہ چرا در پئے اوی گردی      سرمد اگر اوداست خود می آید

غرض شبلی نے صرف اصولوں سے خشک اصطلاحانہ بحث نہیں کی بلکہ صحیح محاکات کے اصول پر گویا اک جیتی جاگتی دنیا پیش کر دی ہے جس سے طبیعت میں اک تازگی آجاتی ہو۔ یہ ہے مصنف کا کمال کہ وہ جس بات کو اس انداز سے بیان کرے کہ اُس کی کیفیت آنکھوں میں پھر جائے اور دل میں سما جائے اور یہی ہے نقاد کا فرض کہ مصنف پر تبصرہ کرے تو خود مصنف کو بولنے دے اور قارئین یا سامع کو براہ راست مصنف سے دوچار ہونے دے کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر کہ چکے ہیں کسی شے یا کسی شخص کو بخوبی جاننے کے لئے لازم ہے کہ اُس سے براہ راست اور بے تکلف تعلق پیدا کیا جائے۔

شعر العجم میں ایک اور خوبی ہے کہ صرف ایک ہی مقام پر شاعری اور شعر کے حسن و قبح سے بحث نہیں کی بلکہ جا بجا ہر شاعر کے ذکر میں مختلف اصناف شاعری کے نکتے بیان کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ نقص تو ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ جا بجا تورا رد ہو گیا ہے لیکن اس نقص کی تلافی اس امر سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ عام پڑھنے والے کو مختلف شخصیتوں اور مختلف نمائندوں کے ذریعے سے شاعری کے اصول بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں، ہر فارسی شاعر کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کیا ہو پھر فارسی شاعری کے ان مختلف پہلوؤں پر علیحدہ تبصرہ بھی کیا ہے یعنی انہیں چیزوں پر پہلے جزئی نقطہ نظر سے اور پھر کلی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی ہے تبصرے کا یہ طریقہ نہایت موزوں و مناسب ہے۔

اس کے ساتھ ہی مختلف شعرا کا کلام بالمقابل رکھا ہے جس سے شعر کے مختلف درجوں اور خوبیوں کا بخوبی موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ حافظ کے مقابل میں سلمان کی بندش کی سستی دکھاتے ہیں۔

سلمان      حافظ

شو قم افروں شد و آرام کم و صبر نماند      عاشقان بندہ ارباب امانت باشند  
در فراق تو و لے عہد ہمان ست کہ بود      لاجرم چشم گہر بار ہمان است کہ بود  
یہ کہہ کر کہ در فراق تو کا موقع پہلے مصرع کے ابتدا میں کا ہے +

در ازل ہمیں نے لعل تو در جام افتاد      عکس ہوئے تو چو در آئینہ جام افتاد  
عاشق سوختہ دل در طبع خام افتاد      عارف از پر تو سے در طبع خام افتاد



درخم زلفِ نو آویخت دل از چاہِ نرغ  
آہ کز چاہِ برون آمد و در دام افت

غالب مشکین تو در عارضِ گندم گوں دید  
کے دم آمد نہ پئے دانہ و در دام افت  
اسی طرح انیس اور دیر کے اشعار کا موازنہ کیا ہے۔

انیس

گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

دبیر

گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پڑیو تھا

عالم ہے مکر کوئی دل صاف نہیں ہے  
اس عہد میں سب کچھ ہے پانصاف نہیں ہے

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے  
انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

کھلتی تھیں اور کھلتی تھیں آکھیں جاب کی

بندھنی تھی اور کھلتی تھی مٹھی جاب کی

شبلی کی شاعری۔ شبلی ہمیں "موازنہ" اور "شعر العجم" میں ایک زبردست نقاد بن کر نظر آتے ہیں لیکن اس سے مدتوں پہلے وہ ایک شاعر تھے چنانچہ اپنے اوائل عمر میں جب کہ ابھی اُن سے کوئی بڑا کام سرانجام نہ ہوا تھا جب کہ وہ بھی فقط ایک پکے مسلمان تھے وہ اکثر مسلمان نوجوانوں کی طرح شروع شروع کے مشتاق تھے اور اپنے وقت کا کچھ حصہ ان غیر عملیات میں صرف کرتے تھے + پھر جب اُن کو معاش کی فکر ہوئی اور جب علی گڑھ میں وہ ایک زبردست قومی تحریک سے دوچار ہوئے تو اگرچہ شروع شروع میں "صبح امید کی سی زبردست نظم اُن کے دل و قلم سے نکلی لیکن تحقیقی مشاغل میں مصروف ہو جانے کے ساتھ کچھ عرصے کے لئے اُن کی شاعری پر مہر خاموشی ثبت ہو گئی + لیکن شاعری دبائے دبنے والی چیز نہیں اور پھر ایک مسلمان کی شاعری! شاعری جذبات کی ترجمانی ہے اور مسلمان کیا ہوتا ہے جذبات کی ایک پوٹ، یہ دوسری بات ہے کہ یہ پوٹ پاکیزہ و نفیس ہے کہ نہیں + غرض شبلی ایک شاعر ضرور تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر سے بڑھ کر ایک نقاد تھے۔ اس حیثیت سے اُن کا مقابلہ انگریزی کے مشہور نقاد شاعر پیٹریک آرلڈ سے کیا جاسکتا ہے جس کی نقادیت کو اُس کی شاعری پر بدرجہا سبقت تھی + شبلی کے ہم عصر بتائیں کہ اُن کو فی الحقیقت فارسی کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے اور راقم نے سنا ہے کہ ایک موقع پر کیسے سید سجاد حیدر یلدرم نے بحالت طالب علمی دروانے کے ایک چھید میں سے "شبلی غزوه" کو شعر لکھنے کی دُھن میں چھت کی طرف ٹٹکی لگائے دیکھا + سوشلی شاعر تو ضرور تھے لیکن ایک نقاد شاعر تھے ایک مورخ شاعر تھے ایک محقق شاعر تھے ایک

سیاسی شاعر تھے اور اس لئے سوائے اُس وقت کے جب وہ بیدہی چلے جاتے تھے اور جب ”ہنگامہ“ خوابانہ زرتشتی“ سے جو ہم آئینہ از زلف و عارض ظلمت و ضور“ ”کنا را آبِ چو پانی و گلگشتِ اپالو“ پر جلوہ گر ہوتے وہ فطری طور پر متاثر ہو جایا کرتے اتنا کہ کم از کم فارسی تغزل کے لئے ایک خاصا سامان مہیا ہو جاتا باقی اوقات میں وہ تنقید و تحقیق و سنجیدگی و وقار کو ہاتھ سے نہ چھوڑ سکنے کے باعث ایک بے اختیار انسان یعنی صمیم معنوں میں ایک زبردست شاعر تھے + اور قوم کی خوش قسمتی تھی کہ شبلی کی شاعریت اُن کی علمیت کے نیچے دب کر رہ گئی اور فقط ایک وقتی مشغله بنی رہی ورنہ ”سنگ پر شیشہ“ تقویٰ زده ام ہاں زده ام“ کی دلکش صدائے جانکاہ اُنہیں اور اُن کے ذریعے سے بہت سے حساس مسلمان نوجوانوں کو عملی کاموں کے لئے کسی حد تک بریکار بنا دیتی + اور شبلی کی عدم المثال تحقیقات جذبات کے کہ میں کم ہو جائیں! تاریخی تحقیق کی روشنی کے آگے اُن کی شاعری کی چاندنی پھینکی پڑ گئی + کم از کم اُن کی اردو نظموں کو دیکھو کہ کس قدر بیانیہ ہیں۔ واقعات ہیں دلچسپ ضرور سچی کہانیاں ہیں دل آویز بھی اور زبان صاف ستھری اور پیرایہ بیان سدھرا ہوا اور سلجھا ہوا کلام میں روانی اور سلاست اور صفائی یہ سب کچھ لیکن تخیل کو ڈھونڈو تو شاید کہیں کہیں چھپی بیٹھی ہو اور موسیقیت بھی شاید کہیں کہیں کنگھیوں سے دیکھتی ہو۔ ایک مورخ واقعات کو نظم کر رہا ہے ایک مسلمان سلف کے قصے خوش الحانی سے ستار رہے اور چونکہ مسلمان ہی سننے والے ہیں لہذا ان کا اثر بھی ہونا ضرور ہے اور ان کے مفید ہونے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس لئے اسے شاعری کے زمرے سے خارج کرنا بھی نا انصافی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے اعلیٰ معیار کی شاعری نہیں کہہ سکتے + بلاشبہ ”صبح امید“ کی ثنوی کے بعض حصے نہایت موثر ہیں۔ اور بعض جگہ طنزیہ کلام سے بھی شبلی کی قدرتِ کلام ظاہر ہوتی ہے

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سن کر

کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنونِ احساں ہے

علاوہ بریں غزل کی شکل میں واقعات کو نظم کرنا اور تسلسل و محاکات کو یوں قائم رکھنا کہ ذرا مختلف معلوم ہو یہ شبلی کے اردو کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، ”اہل بیت رسول صلعم کی زندگی“ ”خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ“ ”عدلِ فاروقی کا ایک نمونہ“ تسلسل اور روانی کے بہترین نمونے ہیں، ”ہنگامہ طرابلس و بلقان“ سے متاثر ہو کر اہل یورپ کو یوں خطاب کرتے ہیں

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استاد! یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ شہر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزی طوفانِ بیدار دہلاتا کئے  
یہ مانتا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے  
یہ مانتا قصہ غم سے نہنہ راجی بہلتا ہے  
یہ مانتا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا  
سمجھ کر یہ کہ دھندلے ہو نشانِ رنگاں ہیں ہم  
شبلی کی سیاسی آزاد خیالی بھی فقط اُن کی نظموں ہی میں سے ظاہر ہوتی ہے ۛ

معاملاتِ حکومت میں دیجئے کچھ دخل  
برادرانِ وطن کہہ رہے ہیں کیا کب کچھ  
یہ کیا کہ قصہ پارینہ وفا کہئے  
کبھی تو آپ بھی افسانہ جفا کہئے

آپ اس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گئے کبھی  
دل سے جلے گا نہ تسلیمِ غلامی کا اثر

لاکھ آزاد ہی افکار کو روکا لیکن  
غیر کمبخت تو گشتِ تھے مدت سے مگر  
یہ وہ افسوں ہے کہ ہر شخص پہل جاتا ہے  
اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے

شبلی کی شاعری کا معراج اُن کی فارسی نظموں میں نظر آتا ہے ۛ

دوش این مژدہ بگوش گل و ریحاں آمد  
ابر گوہر ہم افشاں دگر بیاں بگذشت  
کہ بہار آمد و بسیار با ماں آمد  
گل ہمہ زہر پر گند چو خنداں آمد  
بس کہ دیوانہ دوش از طرفِ بیاں آمد  
سنبیل آشفتنہ تر از طرہ خواباں آمد

آب را سلسلہ بر پائے بہتند ز موج  
لالہ چوں منہ بچکاں چہرہ برا فروخت بباغ  
کشمیر کی تعریف میں لکھتے ہیں ۛ

در بن آب و دم سبزہ و نیلوفر و گل  
گر چہ نام کہ سخن خود بہ درازی بکشید  
قوتِ نامید بن گرز کجا تا بکجا است  
چہ توانا کرد سخن ہم زہر نشو و نماست  
جدید تعلیم والوں کو یوں تنہا کرتے ہیں ۛ  
اے کہ برآمدہ یورپ مہماں ہاشی  
حیف باشد اگر از جملہ ایشان ہاشی

حیف اگر از اثرِ فلسفہ مغربیاں منکرِ فلسفہ سنت و تراں باشی  
قیصران را ہمہ یک یک بشمارِ ز آغاز بے خبر از عمر و حیدر و عشاں باشی  
از خداوندِ جہاں یادِ نیاری گا ہے روز و شب خود بہرِ شائری سلطان باشی  
در پرسی کہ دریں کار چہ تدبیر بود دین و دنیا بہم آمیسن کہ اکسیر بود  
محبوبی کی تعریف میں بہت سی غزلیں ہیں۔ یہ مشہور ہے:۔

نثارِ محبتی کن بہرِ مستراح کہنہ و نور طائرِ مسندِ جمشید و فربہ تاجِ خسرو را  
تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو۔

من کہ در سینہ دلم دارم و شیدا چہ کنم میل بالالہ رخاں گر نہ کنم تا چہ کنم  
من نہ آنم کہ بہرِ شیوہ دل از دستِ ہم لیک با آن نگہ جوصلہ فرسا چہ کنم

عمرے ست عشق در زدم کارم تمام نیست ایں بادہ بخت نیز نہ شد کہ چہ خام نیست  
چشم ہر آنچہ دید نہ ہر دیدہ بنگرد نظارہ جمال تو عام ست عام نیست

وقتِ سحر عارض او بے نقاب بود در بزمِ اول آں کہ رسید آفتاب بود  
بزمِ شراب و شاہِ رنگین و بانگِ نئے ایں حرفے از فسانہٴ عمدِ شباب بود  
یہ بے شبلی کی عاشقی اور شبلی کی شاعری لیکن اس سے بعض نکتہ چینیوں کی طرح یہ نتیجہ نکالنا کہ شبلی کی زندگی کا  
ایک نہایت تاریک پہلو بھی تھا سخت نا انصافی اور پرلے درجے کی تنگ نظری ہے + ہاں متانت جن لوگوں کا  
مذہب ہے جو اسلام کو لطافت و فطرت کا دشمن سمجھتے ہیں جن کے نزدیک کسی خوبصورت چہرے کا دیکھ لینا اور پھر  
اُس کو خوبصورت سمجھ لینا یا خدا نخواستہ کہ دینا ایک گناہِ کبیرہ ہے جس کا کفارہ صرف دوزخ کی آگ میں جلنے سے ممکن  
ہے انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ شبلی کو جو نہیں معلوم کیوں اپنی ایک کتاب میں تھیٹر دیکھنا بھی معیوب سمجھتے ہیں ایک  
چھپاوار فتنہ مزاج عاشق سمجھ لیں ورنہ شبلی نے تو صاف بتا دیا ہے کہ

شبلیا نابلدہ کو چہ عشقِ دلمے دوستانِ تہمت ایں شیوہ بانیز کنند

اس سے یہاں مراد یہ نہیں کہ شبلی غرورِ عشق سے نابلدہ تھے لیکن اُن کو اصلی عشق اسلام اور تاریخ اسلام اور ادب

اور ادب اسلام اور اس لئے تحقیق اور تدقیق اور تنقید سے تھا نہ کہ خوابانہ زرتشتی سے یا کسی اور بے نقاب یا نقاب کے زلف و گیسو سے۔

**محاکات**۔ محاکات اور خوبی بیان کی مثالیں جا بجا شبلی کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ واقعہ نگاری کا کمال ذیل کی مثال سے واضح ہو گا۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں فادسیہ کی مشہور جنگ و فتح ۳۳ھ بمطابق ۶۵۴ء سے قبل جو نامہ پیام طرفین میں جاری ہے اُن میں سفارت رجبی کا یوں بیان کرتے ہیں:

”رستم چونکہ لوٹنے سے جی چڑھتا تھا ایک دفعہ اور صلح کی کوشش کی۔ سعد کے پاس پیغام بھیجا کہ تدار کوئی معتمد آدمی آئے تو صلح کے متعلق گفتگو کی جائے۔ سعد نے رجبی بن عامر کو اس خدمت پر مامور کیا۔

وہ عیب و عریب ہیئت سے چلے۔ عرق گیر کی زرہ بنائی، اور اسی کا ایک ٹکڑا سر سے لپیٹ لیا۔ کہ میں رسی کا پٹکا باندھا اور تلوار کے میان پر چلتی رہے لپیٹ لئے۔ اس ہیئت کذائی سے گھوڑے پر سوار ہو کر گئے۔ ادھر ایرانیوں نے بڑے سرداران سے دربار سجایا۔ دیا کلنوش۔ زریں کاونیکے۔ حریر کے پردے صدر میں مرصع تخت۔ رجبی تخت کے قریب آکر گھوڑے سے اترے اور باگ ڈور کو نیچے سے اٹھا دیا۔ درباری بے پروائی کی ادا سے اگرچہ کچھ نہ بولے تاہم دستور کے موافق ہتھیار رکھو لینا چاہا۔ انہوں نے کہا میں بلایا ہوا آیا ہوں۔ تم کو اس طرح میرا آنا منظور نہیں البتہ پھر جاتا ہوں۔ درباریوں نے رستم سے عرض کی۔ اُس نے اجازت دی۔ یہ نہایت بے پروائی کی ادا سے آہستہ آہستہ تخت کی طرف بڑھے۔ لیکن رجبی جس سے عصا کا کام لیتا تھا اُس کی انی کو اس طرح فرش میں چھوٹے جاتے تھے کہ پُرکھلف فرش اور قالین جو کچھ ہوئے تھے جا بجا سبکٹ پھٹ کر بے کار ہو گئے۔ تخت کے قریب پہنچ کر زمین پر نیزہ مارا جو فرش کو آ پار کر کے زمین میں گڑ گیا۔ رستم نے پوچھا کہ اس ملک میں کیوں آئے ہو؟ انہوں نے کہا: ”اس لئے کہ مخلوق کے بجائے خالق کی عبادت کی جائے۔“ رستم نے کہا: ”میں ارکان سلطنت سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔“ درباری بار بار رجبی کے پاس آکر اُن کے ہتھیار دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اسی سامان پر ایران کی فتح کا ارادہ ہے؛ لیکن جب رجبی نے تلوار میان سے نکالی تو آنکھوں میں بجلی سی کو نہ گئی اور جب اُس کی کاٹ کی آزمائش کے لئے ڈھالیں پیش کی گئیں تو رجبی نے اُن کے بھکڑے اڑا دیئے۔

یہ موم ۳۳ھ بمطابق ۶۵۴ء کی فیصلہ کن جنگ کے دوران میں حکمران کی شجاعت کو یوں بیان کرتے ہیں

حکمر نے جو اوجہل کے فرزند تھے اور اسلام لانے سے پہلے اکثر کفار کے ساتھ رہ کر لڑے تھے

گھوڑا آگے بڑھایا اور کہا عیسائیو! میں کسی زمانہ میں (کفر کی حالت میں) خود رسول اللہ سے لڑ چکا ہوں کیا آج تمہارے مقابلے میں میرا پاؤں پیچھے پڑ سکتا ہے؟ یہ کہہ کر فوج کی طرف دیکھا اور کہا مرنے پر کون بیعت کرتا ہے؟ چار شخصوں نے جن میں ضرار بن ازور بھی تھے مرنے پر بیعت کی اور اس ثابت قدمی سے لڑے کہ قریباً سب کے سب وہیں کٹ کر رہ گئے۔ عکرمہ کی لاش مقتولوں کے ڈھیر میں ملی، کچھ کچھ دم باقی تھا۔ خالد نے اپنے زانو پر اُن کا سر رکھا اور گلے میں پانی ٹپکا کر کہا۔ ”خدا کی قسم عمر کا گمان غلط تھا کہ ہم شہید ہو کر نہ مریں گے“

شبلی نے اپنی تاریخی کتابوں کو متعدد دلچسپ حکایتوں سے زینت دی ہے جن کے پڑھنے سے زمانہ گزشتہ کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے اور اسلامی تمدن کی جیتی جاگتی تصویر نظر آنے لگتی ہے الفاروق کے اخیر میں لکھتے ہیں

”اسلم (حضرت عمر کا غلام تھا) کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رات کو گشت کے لئے نکلے۔ مدینہ سے تین میل پر صرار ایک مقام ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکار رہی ہے اور تین بچے روتے ہیں۔ پاس جا کر حقیقت حال دریافت کی۔ اُس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے اُن کے بیلنے کے لئے خالی ہانڈی پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ حضرت عمر اُسی وقت اُٹھے۔ مدینہ میں آ کر بیٹ المال سے آٹا، گوشت، گھی، اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ میری بیٹی پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا میں لئے چلتا ہوں۔ فرمایا ہاں لیکن قیامت میں میرا بار تم نہیں اٹھاؤ گے۔ غرض سب چیزیں خود لا کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اُس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چٹھائی۔ حضرت عمر خود چولہا بھونکتے جاتے تھے۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمر دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ عورت نے کہا خدا تم کو جزائے خیر دے، سچ یہ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ عمر؟“

زبان و طرز بیان۔ شبلی کی زبان و طرز بیان عالمانہ اور پُر شوکت ہے لیکن یہ تو عام انداز ہے یوں جہاں جس قسم کا مضمون ہو اُن کی انشا پردازی اُس کے دوش بدوش چلتی ہے، سرسید نے جو بلاشبہ اردو میں موجودہ طرز انشا پردازی کے موجد اعلیٰ تھے۔ شبلی کی اولین تصنیف ”المامون“ کے دیباچے میں اُن کی زبان کی بابت یہ لفظ لکھے ہیں

”یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و سستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی دالوں کو بھی اس پر رشک آئے گا۔ اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر

فن کے لئے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برابر دیکرنا ہے + لارڈ مکالی جو انگریزی زبان کا بے نظیر ادیب ہے اس کے تاریخانہ ایسے اعتبار نفاخت و بلاغت کے اپنا نظیر نہیں رکھتے مگر ایشیائی اور شاعرانہ طرز ادا سے تاریخانہ اصلیت کو بہت کچھ نقصان پہنچانے والے ہیں + ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے۔ نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔

سیرۃ النبی میں آنحضرت کی ہجرت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں

”گھرانے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے اُن کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے۔ کعبہ کو دیکھا اور فرمایا: ”کہ اُنہو کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے“ حضرت ابوبکر سے پہلے قرارداد ہو چکی تھی دونوں صاحبِ بیتِ جبل ثمر کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوتے یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسنگاہِ خلافت ہے حضرت ابوبکر کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح نہ اندھیرے شرچلے جاتے اور تپہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں؟ جو کچھ خبر ملتی شام کو اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کرتے حضرت ابوبکر کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا۔ آپ اور حضرت ابوبکر ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک بس یہی غذا تھی لیکن ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماء گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں + صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بجائے جناب امیر تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اکیلی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آگئے، آہٹ پکر حضرت ابوبکر غمزدہ ہوئے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کی کہ دشمن اس قدر قریب آگئے کہ اگر اپنے قدم پر اُن کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپ نے فرمایا لَا تُخَوِّنَنَّ اِنَّ اللہَ مَعَنَا دَائِمًا نہیں

خدا ہمارے ساتھ ہے ۴

فتح مکہ کے بعد خطبہ فتح میں آنحضرت نے صرف اہل مکہ نہیں بلکہ تمام عالم کو خطاب کیا۔ شبلی لکھتے ہیں:۔  
 ”خطبہ کے بعد آپ نے جمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سبکے پیشرو تھے۔ وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسا کر تھیں۔ وہ بھی تھے جن کے تیغ و سنان نے پیکرِ قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سو اسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ بھی تھے جن کے حلوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آگڑ کر نکلتا تھا۔ وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی لکڑی پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہر لگایا کرتے تھے، رحمتِ عالم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا ”تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟“ یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاجِ فحاش تھے پکار اٹھے کہ اَحْکَرُکُمْ وَاَبْنُ اَیْحَکَرِکُمْ۔ تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے۔ ارشاد ہوا لَا تُثْرِبْ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْ هَبُوا فَاَنْتُمْ الطُّلُفَاءُ تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو“

فتح و پیغمبر کا امتیاز یوں دکھایا ہے:۔

”جہاد کے معرکوں میں آپ کے ہاتھ میں گوتیخ و سپر اور جسم مبارک پر خود و منفرد ہوتا تھا لیکن اُس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا، عین اُس وقت جب کہ معرکہ کا رزا گرم ہو، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، دھات اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسمِ خزاں میں پتے جھڑتے ہیں۔ دشمنوں کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آ رہی ہیں عین اُسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے۔ جنگ آوہ باہم نہ دانا ہیں اور سر مبارک سجدہٴ نیاز میں ہے۔ معرکہ بدویں حضرت علی عین شدتِ جنگ میں تین بار زخمی ہوئے۔ اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقبضِ پیشانی خاک پر ہے۔ فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ فتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھا لیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینک دیتا ہے



دفعۃً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے، جنین میں دشمن نے دفعۃً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکٹھے گئے۔ ۱۲۰۰۰ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی پہلو میں نہیں۔ سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیرہ سائے آرہے ہیں لیکن مرکز حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پرجلال آواز آرہی ہے انا النبی لا کذب۔ میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں، عین اُس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہات پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر پھے جاتے ہیں، مرث کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آ جاتا ہے، دفعۃً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوف نمازیں، رجز کے بجائے الحمد کی صدائیں بلند ہیں۔ جوش و خروش، تہور و جاناہازی، غیظ و غضب، اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے۔ صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں۔ اُن کی بجائے لڑنے والے نمازیں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت سہمہ واپس چلے جاتے ہیں۔ اور مشغولین جنگ اگر بقیہ نماز پوری کر لیتے ہیں لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں۔ امام (رسول) اول سے آخر تک عبادت الہی میں مصروف ہے، تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے۔ عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں جُور ہیں، مال غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں ایک صعبانی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں۔ یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت سے جس قدر فائدہ اٹھایا کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہات آئے۔“ (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپ فرماتے ہیں کہ میں اس سے بھی زیادہ نفع بناؤں؟ وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں کیا؟ ارشاد ہوتا ہے۔ نماز فرض کے بعد دو رکعتیں۔“

مصنفین اردو اور شبلی۔ سرسید کے زمانے کے انشا پر دازوں نے اردو کو اردو بنایا + سرسید پہلے لکھنے والے تھے جنہوں نے زبان کو لفظوں کی بے معنی بھرمار اور صنائع و بدائع کے مصنوعی بار اور اس قسم کی دیگر آکاشوں سے پاک کیا۔ اُن کی تحریر میں احساس اور صداقت اپنی فطری عربیائی میں نظر آتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں دل میں جگہ پالیتا ہے کیونکہ وہ براہِ راست دل سے نکلا ہے + حالی سرسید کے بڑے چیلے تھے حالی گو یا نظم کے سرسید تھے، سادگی اصلیت متانت اُن کی تحریر کے جوہر ہیں + ہندیر احمد اصلاح کے علم بردار مسلمانوں

کی جمعیت کو اپنی پُر عرب آواز سے پکارتے ہیں۔ دہلی کی بامحاورہ زبان کے چٹپٹے اور روزمرہ سے وہ حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں، آزاد سب تھریکوں سے آزاد میں پرانی لکیر کے فقیر نہیں لیکن نہ نئی ڈگر کے مسافر ہیں اپنی راہ آپ بناتے ہیں اور اُسے اپنے ہی طبع زاد پھولوں پتوں سے سجاتے ہیں، ان سب کی انشا کے نمونے اپنی اپنی جگہ دلکش و دلپذیر ہیں اور ذوقِ سلیم پر بار ہے کہ ہم اس موقع پر ان کے نقائص کی طرف متوجہ ہوں، ان شیریں زبانوں کے دہن سے بعض ایسے ایسے جملے نکل گئے ہیں کہ کبھی بے ساختہ منہ سے داد نکل جاتی ہے اور کبھی زبانِ مزے لے لے کر اُنہیں دہرائے جاتی ہے، کون بخت مسلمان ہے جس نے اپنے نبی کے ظہورِ قدسی کا یہ خطبہ شبلی کی زبان سے نہیں سنا۔

”چمنستان دہریں بار بار روح پرور بہاویں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سرو سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کمن سالِ دہرے کروڑوں برس صوف کرئیے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشمِ براہ تھے۔ چرخِ کمن مدتِ مائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کر دہیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزمِ آرائیاں، عناصر کی جدتِ طرازیں، ماہ و خورشید کی فروغِ انگیزاں، ابرو باد کی ترددِ ستیاں عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجزِ طرازی مونی جہاں نوازیِ مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاعِ مائے گراں آرزو شاہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔ آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ بہاویں، وہی دورِ فرخِ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایہ بیانِ زبان میں لکھتے ہیں کہ ”آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ہم انگڑے کر گئے، آتشکدہٗ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، پہنچ چین کے قہر مائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جہمِ شر، آتشکدہٗ کفر آذرکدہٗ گمری سرو ہو کر رہ گئے، صنمِ خاؤں میں خاک اڑنے لگی، بہت کدے خاک میں مل گئے، شیرازہٗ مجوسیت بجھ گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے، توحید کا غلفہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہارِ انگیزی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پر تو قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیم عبد اللہ، مگر گوشہٗ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شاہنشاہِ کونین

شمسِ زمزمِ بہت اختران ختمِ رسلِ خاتمِ پینبراں

احمد مرسل کہ خروغاک است ہر دو جہاں بستہ فتراک است  
 امی و گویا بزبان فصیح از الف آدم و میم مسیح  
 رسم ترنج هست کہ در روزگاہ پیش دید میوہ پس آرد بہار  
 عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و جلال ہو اللہم صل علیہ و علیٰ آلہ  
 و اصحابہ وسلم

حق یہ ہے کہ یہ پیرایہ بیان مورخ و نقاد شبلی کا نہیں بلکہ شاعر و عاشق رسول شبلی کا ہے مصنف روایت دیتا  
 کے اصولوں کو عبور کر چکا ہے بحث و تنازعہ کے مرحلے طے کر چکا ہے اور ایک ایسے مقام پر پہنچا ہے جس کے  
 لئے وہ کبھی سے ساعی فبے تاب تھا اور ایک ایسے وقت سے رُوبہ رُوبہ جس کا وہ مدتوں سے منتظر تھا او  
 ایک ایسے وجود سے دوچار ہونے کو ہے جس کے جلوے کے لئے اُس کی ساری زندگی گویا اک تیار سی تھی۔  
 وہ بے اختیار ہو جاتا ہے وہ اس وقت دنیا میں یا اُس وجود کا احساس کرتا ہے یا اپنا۔ یہ ہیں اُس کے خیالات  
 تنہائی میں یہاں تک کہ اُس کا محبوب جب اُس کے سامنے آجاتا ہے تو وہ یہ بہیمیش کرتا ہے جس کا سر نامہ ان  
 لفظوں سے عبارت ہے:-

”ایک گدائے بے نوا شنشہ کو نین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے۔“

”حشتم آسینیں بردار و گوہر آتما شکن“

حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان خواہ اُس کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کے بعد اس تصنیف پر کلمتہ صغنی  
 کے لئے کیا قلم اٹھا سکتا ہے!

پیرایہ بیان میں تغیرات - دیکھو ۱۸۸۹ء سے ۱۹۱۴ء تک ۲۵ برس میں شبلی کی انشا پر دازی اور  
 اس کے پیرایہ بیان میں کیا کیا تغیرات آئے ہیں + ذرا المامون کے ابتدائی و انتہائی صنمے کو سیرۃ النبی کے ابتدائی  
 انتہائی صفحات کے مقابل میں رکھ کر دیکھو تو فرق واضح ہو جائے گا + اُس وقت کا مورخ شبلی شاعر شبلی سے پہلو بچا  
 کرتا رنج و سیرت پر قلم اٹھاتا ہے۔ اس وقت کا سیرت نگار شبلی حقیقت کو شریعت سے جدا نہیں کر سکتا، نہیں کرنا  
 چاہتا + اُس وقت کا شبلی سیرۃ المامون کو یوں شروع کرتا ہے

”زمانہ کے انقلاب سے مسلمانوں کی قومی خاصیتیں گو بہت کچھ بدل گئیں اور بدلتی جاتی ہیں تاہم بنی

اپنی قومی تاریخ کے ساتھ جو دلچسپی اور شغف اُن کو پہلے تھا اب بھی ہے۔ جس طرح قومی روایتوں کو محفوظ رکھنے میں وہ ہمیشہ نام آور رہے ہیں آج بھی اپنی گذشتہ تاریخ کی طرف اُن کو وہ جوش التفات ہے کہ اُس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

اس وقت کا شبلی سیرۃ النبی کو "تالیف کی ضرورت" کے عنوان سے لیکن یوں شروع کرتا ہے۔

عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

خطوط۔ یہاں گنجائش نہیں کہ اُن کے خطوط پر تبصرہ کیا جائے لیکن چند اقتباسات دیتے جاتے ہیں کہ اُن کی شخصیت اور ادبیت پر کچھ روشنی پڑے اور ظاہر ہو کہ جہاں وہ مصنف بن کر نہ نکلتے تھے وہاں کس خلوص و شستگی کے مالک تھے، ایک خط میں جو مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام ہے لکھتے ہیں

ع آنچہ استاد ازل گفت ہماں سے گویم۔ آپ نے دیکھا ادھر اوقاتِ اسلامی کی تحریک شروع ہوئی اُدھر گورنمنٹ نے یادداشتِ شائع کی اور ایک کانفرنس اسی عینہ میں بٹانے والی ہے۔ خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑا دینا ہے۔ ع آگے نصیب ہے، جسے پروردگار دے، ہاں دارالمصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا۔ آپ بے بڑھ کر اس کی شرکت کا کس کو حق ہے۔ میں اس عمارت کو انشاء اللہ پورا کر کے رہوں گا۔ اور شاید وہی میرا دفن بھی ہو۔ ۲۴ سے پہلے علی گڑھ پہنچوں گا۔

شبلی ۱۶۔ فروری ۱۹۱۲ء

سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

عزیزی! تم نے اپنی حالت کے متعلق جہاں طریقہ میں اظہارِ خواہش کیا ہے عزیز یزایا اس کے کہنے کی حاجت ہے تم ہر وقت میری آنکھوں میں ہو اور میں موقعِ ڈھونڈتا رہتا ہوں لیکن اتنی جلدی کون کامیاب ہوا ہے۔ میاں حمید اُس لیاقت پر جو زمانہ کے موافق بھی تھی کتنے دنوں کے بعد ٹھکانے لگے خود میرا کیا حال ہوا، عمارت کی کس حالت میں ہیں؟

بہشتی سے ایک خط میں اُن کو لکھتے ہیں :-

”یہ تو سووم لکھنؤ میں مجلس رہا تھا یا یہاں بہشت کی ہوائیں آرہی ہیں تمام دن اور تمام رات اس قدر ہوا کے جھوکے آتے ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ شاید اب کی زیادہ رہوں + ہاں اب لندہ یوں چلتا نظر نہیں آتا پھر تم اپنے ہاتھ میں لو۔ جو شرطیں پیش کرو گے منظور کروں گا۔ مجھ کو لندہ سے کوئی غرض نہیں لیکن وہ درحقیقت ندہ کا ایک اعلان ہے اس کو مٹانا نہیں چاہئے + ... غریب ہو رہی ہیں لیکن پھکی کہاں تک۔؟ آخر عمر اور سن کا بھی کچھ تقاضا ہے +

شبلی ۲۹ مئی ۱۹۱۱ء بمبئی

زہرا فیضی صاحبہ کو ایک خط (مورخہ ۵ فروری ۱۹۰۹ء) میں لکھتے ہیں۔ نزاکت خیال اور شوخی بیان

ملاحظہ ہو :-

”خاتونِ محترمہ اعنایت نامہ پہنچا۔ آپ نے مختصر نویسی کی شکایت کی ہے لیکن انصاف فرمائیے اگر ایک کاغذ بالکل سادہ ہو اور ایک پر دو ہی حرف ہوں تو آپ کس کو مختصر کہیں گی میں نے تو سلام علیکم بھی لکھا لیکن آپ صاحبوں نے تمہارا نام یاد ہی نہیں کیا۔ شاید آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ میں بارِ خاطر ہونے سے بہت پرہیز کرتا ہوں۔ جب میں وہاں تھا یا جب کبھی آپ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے کہ میری ملاقات سے آپ گھبرانے لگی ہوں۔ یہی حالت خطوط لکھنے کی ہے۔ اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ آپ صاحبوں کے خطوط کبھی ابتداء نہیں آتے بلکہ میرے جواب میں آتے ہیں تو سمجھ لیتا ہوں کہ کیوں بار بار رحمتِ دوں اور زبردستی آپ سے جواب حاصل کروں۔ بہر حال مختصر نویسی کا یہ سبب ہے ورنہ میں تو دفتر لکھ کر بھی سیر نہ ہوں۔“

شبلی کے اسلوبِ بیان کا اثر۔ آزاد کے مقابل میں شبلی کے اسلوبِ بیان میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا نتیجہ سہل ہے حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ بیس چالیس سال میں شبلی کے اسلوبِ بیان نے اردو کے اسالیبِ بیان پر بے اتہنا اثر ڈالا ہے اور جو لوگ اب سلامت روی کے ساتھ تاریخ و سیر پر قلم اٹھاتے ہیں اُن کی تحریر میں جا بجا شبلیانہ طرزِ بیان کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں + اُن کا اسلوبِ گفتگو ہونے کے ساتھ شوکت و متانتِ بیان کا پہلو لئے ہوتا ہے۔ تاریخ و فلسفہ میں اُن کے خاص عربی مفرد مرکب الفاظ اور ترکیبیں اب مدت سے اردو کے اخبار و رسالوں میں رائج ہو چکی ہیں۔ وہ اُن زبردست مصنفوں میں ہیں جنہوں نے اردو زبان کو اُس زمانے میں جب

پہلی بار اُسے سادہ و سہل بنانے کی کوششیں جاری تھیں بہت سے ایسے نئے الفاظ سے روشناس کرایا جان سے وسعت بیان میں آسانیاں پیدا ہو گئیں + تاریخ و سیرت کے پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین اگر آج عام فہم طور پر اردو میں ادا کئے جاسکتے ہیں تو اس مشکل کو آسان کرنے والا پہلا شخص بلاشبہ شبلی ہی تھا +

**ترتیب کتاب** - پیرایہ بیان کی یہ سہل نگاری دراصل اُس نظم و ترتیب کا ایک نتیجہ ہے جو لازم طور پر شبلی کی طبیعت کا ایک جزو ہوگی - راقم شبلی کے ذاتی روزمرہ کے حالات و عادات سے مطلق واقف نہیں لیکن وہ اُن کے اقوال، اُن کے پیرایہ بیان، ترتیب و تنظیم واقعات اور تحلیل و تقسیم موضوعات میں اُس صفائی اور سادگی اور نفاست پسندی کی ایک جھلک دیکھ سکتا ہے جو شبلی کی زندگی کا ایک لازمہ ہوگا + مثال کے طور پر الفاروق کو لو - یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں ٹائیپنگ خانہ میں شائع ہوئی اور اس لحاظ سے اس کی ظاہری صورت نہایت پسندیدہ ہے اور لکھائی چھپائی بھی حسبِ حال ہے - شروع میں فہرست مضامین ہے جس سے تقسیم و ترتیب مضمون کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے + پہلے تاریخ، عربی تاریخ، اصول فن تاریخ، تاریخی طریقہ تحریر اور اس خاص کتاب کی ترتیب و حوالہ جات پر ۲۲ صفحے کا ایک دیباچہ ہے - اگلا عنوان ہے حضرت عمر کا نام و نسب - سن رشد و تربیت - پھر قبول اسلام جس سے اُن کی زندگی میں ایک انقلاب آیا - پھر ہجرت جس سے اسلام کی تاریخ میں ایک انقلاب آیا پھر آنحضرت کے زمانے کے واقعات و وفات - پھر سفیہ بنی ساعدہ کا جھگڑا اور حضرت ابو بکر کی خلافت - اس کے بعد حضرت عمر کی خلافت اور فتوحات - فتوحات کی الگ الگ فصلیں ہیں یعنی عراق - واقعہ بویب - قادسیہ کی جنگ فتوحات شام - فتح دمشق - حمل - حمص - جنگ یرموک - حضرت عمر بیت المقدس میں - حمص کی دوسری لڑائی - خالد کی معزولی - عمواس کی و باقیساریہ و جزیرہ - خوزستان - عراق عجم - ایران پر عام لشکر کشی - آذربایجان - طبرستان - آرمینیا - فارس - کرمان - سیستان - مکران - خراسان - مصر - اسکندریہ کی فتوحات - اخیر میں ۱۰ برس چھ مہینہ ۴ دن کی خلافت کے بعد حضرت عمر کی شہادت - یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے جس میں حضرت عمر کے مختصر ابتدائی حالات اور فتوحات اسلام کا ذکر ہے + دوسرے حصے میں جو اس مہتمم بالشان تصنیف کی روح و رواں ہے - ملکی و مذہبی نظام پر ایک غائر نظر ڈالی ہے اور حضرت عمر کے ذاتی حالات و واقعات درج ہیں جن سے اُن کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے - اس حصے کے عنوانات یہ ہیں - فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ - نظام حکومت (جس میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عمر کی حکومت صحیح جمہوری اصولوں پر مبنی تھی) ملک کی تقسیم، صوبجات اور اضلاع، عمدہ داران ملکی - صنیعہ محاصل - صنیعہ عدالت - افتاء و جداری اور پولیس - بیت المال یا خزانہ - پبلک ورکس

یا نظامتِ نافذہ - شہروں کا آباد کرنا - صیغہ فوج - صیغہ تعلیم - صیغہ مذہبی متفرق انتظامات - ذمی رعایا کے حقوق غلامی کا رواج کم کرنا - سیاست و تدبیر - عدل و انصاف - امامت اور اجتہاد - اس کے بعد میں ذاتی حالات اور اخلاق و عادات (جن کے پڑھنے میں ایک افسانے کا لطف آتا ہے) ازواج و اولاد - خاتمہ - واقعات کو الگ الگ کر دیا ہے - جہاں ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کے بعد یا جس کی وجہ سے آسنے والے واقعات کا رنگ پلٹ گیا وہاں سے ایک الگ فصل شروع کر دی ہے - ضمناً ملکی حالات کے ساتھ معتبر روایات کو نقل کیا ہے جس سے کتاب کمیں خشک یا غیر دلچسپ نہیں ہونے پاتی - سفارتوں کے مکالمے - میدان جنگ کے سفر کے اور حادثے تاریخ کو ادنیٰ کی طرح دلکش بنا دیتے ہیں - ساتھ ہی ساتھ بحث طلب امور پر تحقیق و تفتیش سے غور کیا ہے اور گتھیوں کو ساتھ ساتھ سلجھا دیا ہے - دوسرے حصے میں جملہ نظامات حکومت پر یکے بعد دیگرے نگاہ دوڑائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم کسی موجودہ دولتِ متحدہ کا حال کسی علمی جریدہ میں پڑھ رہے ہیں - یہی اس حصے کا جزوی نقص بھی ہے مگر تاکہ حضرت عمر کے زمانے میں وہ ترقیاں بروئے کار آئیں وہ ملکی و مذہبی ایجادات و اختراعات ہوئیں وہ ادارات قائم ہوتے جن میں سے اکثر کا پہلے وجود نہ تھا اور جو اکثر جزو اسلام بن گئے بنے بے لیکن ان تمام حالات بیان کرنا اس طرح پیش کرنا چاہئے تھا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ مورخ یہ ثابت کرنے کے درپے ہے کہ حضرت عمر کا زمانہ یورپ کی انیسویں صدی کا زمانہ ہے - لیکن ایک اس فرگذاشت کے علاوہ اس حصہ کتاب میں بظاہر کوئی کمی نہیں - مصنف نے دریافت حالات میں کمال تحقیق اور بیان میں کمال وضاحت سے کام لیا ہے - یقیناً "الفاروق" اردو کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے اور وہ شبلی کی بہترین تصنیف ہے -

مصنفانہ طریق کار - شبلی کے مصنفانہ طریق کار کے متعلق "سیر المصنفین" میں لکھا ہے کہ مولانا شبلی کی زندگی میں چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک یہ کہ باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے کے کثیر التصانیف ہونے کے وہ کسی دن بھی فلسفہ کی دو باتیں صغی سے زیادہ نہیں لکھتے تھے - زیادہ وقت مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے - لکھنے دیر میں اور سوچ کر مگر اس میں کاٹ پھانس بہت کم ہوتی تھی - ہمیشہ ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے - خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا آخر عمر تک خوشنویسی کی شان اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف حروف کی خوبصورتی کی اس قدر پروا کرتا ہو - ایک خاص بات ان کی طبیعت میں یہ تھی کہ جو تعلیم اور علمی

مناکرہ و مباحث کے اور کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ غالباً ۷۰ برس کی عمر سے ۵۰ برس کی عمر تک اُن کے پورے ۲۰ سال خالص علمی زندگی میں بسر ہوئے یعنی زندگی بھی محض تعلیمی و رقی گردانی نہ تھی اور نہ صرف بے کار معلومات کا دماغ میں جمع کرنا اس کا مقصد تھا بلکہ وہ اس کے ذریعہ روشنی اور آزادی پھیلانا چاہتے تھے۔

**مقبولیّت**۔ شبلی کی تصنیفات کو جو مقبولیت تعلیم و تمدن یافتہ طبقہ میں حاصل ہوئی وہ بہت کم اور مصنفین کی تصنیفات کو ہوئی۔ آزاد کی بعض تصنیفات اور حالی کی مسدّس کو چھوڑ کر غالباً مسلمانوں کو کسی حال کے مصنف سے اس قدر رغبت نہیں ہوئی جتنی شبلی سے + شبلی نے تاریخ اور فلسفہ کو جدّت کے رنگ اور ادب کی زبان میں لکھا، جو کچھ کما تحقیق کے بعد کہا اور اس کے کہنے میں متانت اور سنجیدگی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ الفاروق نے خاص و عام کے دلوں پر قابو پالیا۔ الکلام نے بہت سے یورپ زدہ مسلمانوں کی مرسم پٹی کی اور کامیابی کے ساتھ کی۔ الغزالی کے متعلق الکلام کی تہنید (ترجمہ) میر کاظم علی میں لکھا ہے کہ یہ خاص طرح پر ذکر کے قابل ہے کہ سال رواں (۱۹۳۹ء) میں ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی انتظامی رپورٹ کے صفحہ (۶۰) میں الغزالی کو جو اسی سرشتہ (علوم و فنون) حیدر آباد کن کی تصنیف شدہ ہے تمام کتابوں پر ترجیح دی ہے اور نہایت مدحیہ الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

موازنہ انیس و دبیر اور شعر البیہ اکثر نوجوان اردو شاعروں اور ادیبوں اور طالب علموں کے زیر مطالعہ رہتے ہیں اور اُن سے اور حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے تنقید کے اصول واضح ہو کر ادب و شعر روز بروز جلا پا رہے ہیں + شبلی کی آخری تصنیف سیرۃ النبی کو جو مقبولیت عامہ حاصل ہوئی وہ گزشتہ چند سالوں سے کسی تصنیف کو نہیں ہوئی۔ اکثر مسلمان گھروں میں اور اکثر مسلمان نوجوانوں کے پاس اس عزیز و محبوب تصنیف کی ایک جلد ضرور موجود ہے اور جس تعلیم یافتہ مسلمان نے اس کا مطالعہ نہیں کیا اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے تساہل کی وجہ سے بزم ادب میں شرمسار نظر آتا ہے + اس سے ظاہر ہے کہ شبلی کی تصنیفات کو اُن کی زندگی میں اور اُن کے بعد کس قدر مقبولیت حاصل ہوئی اور کیسے اُن کا نام ہندی مسلمانوں کی مذہبی و علمی زندگی میں ہر دل عزیز اور ممتاز ہے۔

کیمیاں۔ شبلی میں بلاشبہ جیثیت مصنف متعدد خوبیاں اور وصف ہیں جن میں سے اکثر صریحاً یا اشارتاً بیان ہو چکے لیکن آخر اُن میں کیمیاں بھی تو ہونگی + اُن کی خوبیوں کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کیمیوں پر





شعبی علم جہاں اصطلاحی تمدن کی خوبیاں دکھائی ہیں وہاں ملکی تنظیم و تنسیق اور سیاسی ادارات کا اس طریقے سے ذکر کیا ہے اور ان کی تفصیلات ایسے پرلٹے میں بیان کی ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ بالکل آج کل کے مغربی نظامات سے مشابہ تھے، مثلاً حضرت عمرؓ کی جمہوری حکومت کے انداز کو یا اس کے ضمن میں انگریزی الفاظ کونسل اور پبلک وکس اور پولیس کو اس طرح استعمال کیا ہے گویا اُس وقت کے ادارے بالکل آج کل کے اداروں کی مانند تھے، دوسرے جہاں مسلمان حکمرانوں کو متعصب مجتہدینوں سے بچانے کی کامیاب کوشش کی ہے وہاں بعض چیزوں کو خواہ مخواہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے مثلاً ذمیوں کی وضع کو مسلمانوں کی وضع سے الگ رکھنے کا اصول جو حضرت عمرؓ نے قائم کیا تھا اُس کو بنظر استحسان دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں بالخصوص جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے عام طور پر ذمیوں کے حقوق کا ہر ایک طرح خیال رکھا یہاں تک کہ اپنی وصیت میں یہ خاص طور پر بتایا کہ ذمیوں سے جو عہد کئے گئے اُن کا خیال رکھا جائے اور انہیں اُن کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہ دی جائے، اسی طرح اوزنگ زیب کے بعض فقہ گروں کے مندر دھانیے پر صادر کرنا شبلی کے شایانِ شان نہیں تیسرے بعض مقامات پر مبالغہ بیان سے کام لیا ہے مثلاً الغزالی میں جہاں بیان کیا ہے کہ امام صاحب نے فلسفہ اخلاق پر کیا اضافہ کیا وہاں لکھا ہے کہ اخلاق میں انہوں نے نفس فن کو اس قدر وسعت دی کہ یونانیوں کا فلسفہ اخلاق اُس کے مقابلے میں قطرہ و دریا کی نسبت رکھتا ہے، اسی طرح علم الکلام میں شاہ ولی اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ اُن کی مکتبہ سنجیوں کے آگے غزالی رازی ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے، الفاروق میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فوجی نظم و نسق کو اس قدر مرتب اور منظم کر دیا کہ غالباً اس عہد تک کہیں اُوکھی نہیں ہوا تھا، شعر العجم میں فیضی کے متعلق لکھا ہے کہ فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوش بیان ہے جس کا وہ موجب بھی ہے اور خاتم بھی، کتاب کے خاتمے پر فلسفیانہ شاعری کے تحت میں لکھتے ہیں کہ فارسی شاعری میں فلسفیانہ خیالات کا جس قدر ذخیرہ ہے کسی زبان میں نہیں، اس قسم کے بیانات میں اگر ذرا زیادہ محتاط الفاظ استعمال کئے جاتے تو بہتر ہوتا ورنہ ان میں کوئی ایسی فاش غلطی نہیں کہ ان کو قطعی انور قرار دیا جائے، چوتھے مذہبی اعتقاد کی بنا پر بعض جگہ واقعات کو اصولِ درایت کی نگاہ سے

نہیں دیکھا مثلاً امام غزالی کی وفات پر بروایت ابن جوزی لکھتے ہیں کہ ”پیر کے دن امام صاحب صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا ”آقا کا حکم سر آنکھوں پر“ یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ لوگوں نے دیکھا تو دم نہ تھا“ اس قسم کی روایتوں پر شبلی عموماً یقین نہیں کرتے اور عموماً ان کی ایسی تاویل کرتے ہیں کہ روایت کے خول کے اندر سے اصل واقعہ ظاہر ہو جاتا ہے لیکن کہیں کہیں ایسے تسامحات ہیں جن سے شبہ پڑتا ہے کہ قوت تنقید زور اعتقاد کے نیچے دب گئی + پانچویں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگرچہ شبلی نے بالعموم مسلمانوں کے مذہب اور معاشرت میں آزادی اور حریت اور عقل پسندی کے اصولوں کو برتا، اک نیا عظیم کلام مرتب کیا جس سے عقل و محبت کے ذرائع سے انہوں نے یورپ کی دہریت اور الحاد کی ایک بڑی مدت تک روک تھام کی یہاں تک کہ نیا طبقہ ان سے خوش ہو گیا اور علما کی جماعت کے اکثر افراد ان سے برگشتہ ہوتے گئے لیکن پھر کبھی بعض باتوں میں انہوں نے حالات سے متاثر ہو کر پوری وسیع نظری سے کام نہیں لیا + مثلاً زہرہ فیضی صاحبہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجاہد عام ہیں تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آچکی ہیں اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجے پر ہو“ یہاں تک کہ ان کے ساتھ ولایت جانے پر بھی نیم آمادہ ہو جاتے ہیں یہ کہہ کر کہ یورپ کی ہم سفری بھی چنداں بعید نہیں ممکن ہے ہمت پیدا ہو اور ساتھ چل سکوں“ اس کے ساتھ ہی مقالات شبلی میں گلبدن بیگم کے ذکر میں ناپردہ داروں پر چوٹ کر گئے ہیں اور سفر نامہ میں تھئیٹر میں جانے کو معیوب کہا ہے لیکن خیر یہ مدت ہوئی اس وقت کی رائے ہے + اصل یہ ہے کہ شبلی کم از کم اواخر عمر میں پردے کی ہی پرانی رسوم کے دل میں ضرور مخالف ہونگے اور اسی طرح تھئیٹر کو ”وقار و شائستگی کے خلاف“ نہ سمجھتے ہوئے لیکن اکثر ایسی باتوں میں ان کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ قدیم وضع کے علما و فضلا کے ہوتے علانیہ اپنی نئی رایوں کا اظہار کرتے اور ہدف ملامت بنتے + چنانچہ ایک خط میں عطیہ بیگم صاحبہ کو کم ہمتی کے الزام کے جواب میں لکھتے ہیں ”تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے“ اس سے ظاہر ہے کہ شبلی ایک نیک دل مصلح و مدبر تھے جو زمانے کی مصلحتوں پر نظر رکھتے تھے لیکن ایک مجدد یا مہتما نہ تھے کہ وقتی بندشوں کو بے دھڑلے توڑ سکتے اور جان و مال و عزت سب کو صداقت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے +

شبلی بحیثیت مصنف - اخیر میں ہمیں شبلی کی بہت سی خوبیوں اور تھوڑی سی کمیوں سے قطع نظر کے

یہ دیکھنا ہے کہ شبلی بحیثیت مصنف کیا کچھ تھا؟ اس سوال کا جواب اُس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک ہم اُس کی تصنیفات کو جو سات ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں پس پشت ڈال کر یہ نہ سوچیں کہ شبلی بحیثیت انسان کیا کچھ تھا؟ شبلی اُس وقت ہندوستان میں پیدا ہوا جو اب یہاں کے مسلمان تعزذات میں گرا دیئے گئے تھے، جب حکومت جہانپور کے ساتھ اُن کی شجاعت و بہمت اور ایثار و خود داری بھی رخصت ہو چکی تھیں۔ وہ ایک ایسی فضا میں پیدا ہوا جس میں مغربیت کی مخالفت قدامت و تعصب کی بجلی بن کر مضرت تھی۔ لیکن حسن اتفاق سے زمانہ اُسے ایک ایسے اصلاح یافتہ اسلامی ماحول میں ملے گیا جہاں مشرقیت و مغربیت کے صحیح امتزاج نے ظلمتِ زوال میں نورِ کمال کا عالم پیدا کر دیا تھا۔ اُس کی طبیعت کے جوہر اس نئی روشنی میں چمکے، اُس کی جوہر طبع کی کرنیں دور و نزدیک پڑنے لگیں اور آخر اس تابش میں اُس نے اپنے لئے ایک نیا جادہ علم و اعتقاد وضع کر لیا۔ وہ اس امر کا متنی مؤا کہ علماء کی تہذیب و تنظیم کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو پھر قرونِ اولیٰ کی شان دار زندگی کی طرف لے جائے لیکن مواد تیار نہ تھا کہ اُس سے یہ عالی شان قصر تعمیر ہو۔ مجبوراً شبلی کو اس سود مند کام سے ہٹا اٹھا نا پڑا۔ وہ اپنے وطن کو واپس چلا گیا لیکن اُس کی فطرت اُسے بچلانا بیٹھنے دیتی تھی۔ اُس نے تنظیم کی نئی راہیں تلاش کیں اور پایان کار ایک خود ساختہ راہ پر ایک علمی گروہ کو لئے ہوئے چل نکلا تھا کہ داعی اجل نے پروانہ رحلت لاپیش کیا!

اس راہ کا پہلا چلنے والا نہ رہا لیکن راہ قائم ہے اور روز بروز خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو رہی ہے اور اسلامی روش پر چلنے والوں کو ہر لمحہ خیر مقدم کہنے کے لئے تیار ہے۔

شبلی ایک بڑا مصنف تھا لیکن اس کے ساتھ وہ ایک بچکا مسلمان بھی تھا وہی اُس کے اوصاف ہیں جو ایک بچے راست باز مسلمان کے ہو سکتے ہیں اور وہی اُس کی کہیاں ہیں جو ایک بچے راست باز مسلمان میں عموماً پائی جائیں گی!

کون سا پیغام تھا جو شبلی نے کرایا؟ اہل اسلام کا اسلام مکتد رہا تھا۔ نوجوان مسلمان مذہب سے منحرف ہو رہے تھے۔ یورپ آزاد خیالی اور عقل پسندی کا غرہ بلند کر رہا تھا۔ شبلی نے اس کے مقابل میں اسلامی حریت و معقولیت کا آواز بلند کیا، بجھکے ہوؤں کو واپس بلایا کہ جس عقل کے جوہر کو تم غیروں کے ہاں ڈھونڈنے جاتے ہو وہ ہمیں تمہاری فوجی خس و خاشاک میں چھپا پڑا ہے آؤ اور اسے علم و تنقید کے ہاتھوں سے کھود نکالو!

شبلی دربارِ رسول کا عقیدت مند ہے وہ اسلام کا علم بردار ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اسلام کی آنکھوں سے جو کچھ کہتا ہے اسلام کی زبان سے اور جو کچھ سنتا ہے اسلام کے کانوں سے اسلام اُس کی روح ہے اور اسی سوز

کی دیکھنے اور بولنے اور سننے کی قوتیں برقرار ہیں۔ اس لئے اگر ایک غیر مسلم اعتراض کرے کہ شبلی چیزوں اور باتوں کو محض ایک مسلم بن کر دیکھ سکتا ہے تو اعتراض بجا ہے لیکن پھر اگر شبلی دنیا و مافیہا کو ایک مسلم کی نظر سے نہ دیکھے تو قوت یہ ہے کہ وہ اس کو مطلق دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اُس کی بینائی کو سرٹہ اسلام لازم ہے۔ کیا اب ہم کہیں کہ وہ اس سے مد نہ لے؟ اس کے معنی ہونگے کہ اُس جسم سے روح نکل جائے اُس جوہر سے چمک جاتی ہے اُس شخصیت سے اُس کی انفرادیت چھین لی جائے!

کارلائل نے خوب کہا ہے کہ ایمان بڑی چیز ہے ایمان زندگی بخش ہے! وہ ایمان ہی تھا جس نے عرب کو اردو دہلی اور اُدھر غرناطہ تک پہنچا دیا!

شبلی کا ایمان اسلام ہے اس لئے شبلی کی زندگی اسلام سے ہے اور اُس کا جو پیغام ہے وہ فی الحقیقت اسلام کا پیغام ہے! سچ یہ ہے کہ اسلام کا احیا اگر دنیا میں پھر ہو سکتا ہے، اہل اسلام کے مردہ جسم کی یہ روح اگر پھر زندہ ہو سکتی ہے تو محض ایسے ہی پُر خلوص و پُر جوش نفوس کی ہمت و کارپردازی سے! کیا ہم شبلی سے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ فاروقِ اعظم اور پیغمبرِ اسلام کی شخصیتوں کے متعلق تکتہ چینی کا قلم اٹھائے؟ یہ امید ایسی ہی ہے جیسی ایک یہ امید کہ ایک ننھا بچہ اپنی ہی ماں سے محبت نہ کرے لپٹ نہ جائے اُس کی نگاہوں میں اپنی خوشیوں کی جنت نہ ڈھونڈ کرے بلکہ غیروں سے اُس کی برائی سنے یا کسی کے سامنے بلکہ اپنے آگے اپنے دل میں بھی اُس کو اک ذرا سا برا بھلا ہی کہہ سکے۔

اردو کے دوسرے بڑے مصنفین سے شبلی کا مقابلہ نہ صرف غلط ہوگا بلکہ لا حاصل۔ شبلی میں اپنی خوبیاں تھیں اُن میں اپنی بہر شخص اور ہر شے کو اپنی جگہ دیکھو کہ ہر گلے رازنگ و بولے دیگر است

ہاں خالص تصنیفی حیثیت سے الگ ہو کر محض انسانی و تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو ظاہر ہے کہ اردو بین میں شبلی ہی تنہا وہ مصنف ہے جس نے اک دار المصنفین اپنی یادگار چھوڑا!

بشیر احمد

# عکس تحریر مولانا شبلی مرقوم

نول

آن شوق بکبر با پیشش بند است

به شمعش بر دل در دهند است

خود در شوق با بس گری با هم بجای نامد

با آن که کار اعلیٰ خود بند است

بگر نه دل هم گریه ای او که دل

صدای مردم خود و مان در کنند است

راز صحبت خودی به با آن فکیر  
یارب کدام با ساری شده چنانچه

نبیه ایم فشانگر به تا شش

کعب نیزه آتش طرازش بند است

ای رشت شوق رحمت بی صبر نهی بری

دانشه کرد و این باز نش بند است

می بینم این که نیست دل ناکی شوخ کند

بدره زمین که زنجیر نایع نه بند است

تو بدی نگاه نمان کردی در ما

سرایه که بویخته دل شمشیر است

شیر بموی ذوق و زلفی رایت

شکرت نیم به زبان شمشیر است

۱۵

## راز و نیاز

تم کہاں ہو میرے جیوں دھن درمیاں زندگی ہو کیا نہ لو گے؟ سچ بچ نہ لو گے؟ اس زندگی میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے امید کی جوانی ٹھک کر چراغِ سوئی کی طرح ہو چلی ہے۔

دیکھو زیادہ نہیں صرف ایک مرتبہ۔ صرف ایک بار تم مجھے اتنا بتا دو کہ تم میرے ہو۔ مجھے چاہتے ہو پھر میں فریاد کی طرح، اجنبیوں کی طرح تمہیں ڈھونڈوں گا۔ جنگل جنگل پتے پتے میں ڈھونڈوں گا اور تمہیں تلاش کر لوں گا۔ آہ! تم بولتے کیوں نہیں۔ دیکھو تمہارے ہاتھ کا کھلونا یہ چند ماہ بس بس کر کیسی پریم رس کی بارش کر رہا ہے۔

لیکن تم چپ ہو۔  
لوگ تم کو منصف اور رحمدل کہتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے بالکل جھوٹ ہے۔ تم کیا ہو یہ میرے دل سے پوچھو۔ تم بے رحم ہو، سنگ دل ہو۔ ہاں پتھر ہو۔ بالکل پتھر۔

میں دیکھتا ہوں تم مجھ سے ناراض سے لہتے ہو۔ اور ناراض ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں تم مجھ سے دشمنی بھی رکھتے ہو۔ میں جتنا تمہارے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں تم اتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتے ہو۔ میں تمہارے درشن کا پیاسا ہوں اور تم مجھ سے چھپتے پھرتے ہو۔ میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور تم میرے لئے معائنہ جاتے ہو۔ کیا کہا؟ میں بُرا ہوں! واقعی میں بُرا ہوں بہت بُرا ہوں۔ اچھا تو میرے اچھے صاحب! تم مجھ کو بھی اچھا کیوں نہیں بنادیتے۔ تم نے مجھے بُرا بننے ہی کیوں دیا۔

اگر تم مجھ سے بولو اچھے اپنا درشن دو، مجھے اپنے چرنوں کے پاس بیٹھنے دو، تو کیا میں کبھی اچھا نہ بن جاؤں گا؟

میں دیکھتا ہوں اے میرے ہر دلشور! تم دراززل سے مجھے اچھا بنانے کی فکر میں ہو۔  
ہائے تم نے کتنی خوشامدیں کیں۔ کتنا ڈرایا اور دھکا یا لیکن تمہارا یہ غلام تمہارے قابو میں نہ آیا۔  
تمہاری خوشی کے سامنے مجھے جنت کی نعمت اور دنیا کی دولت کی کچھ پروا نہیں۔  
جنت اور نجات! آہ یہ تو تھکے ہوئے بچوں کو بہلانے کے کھلونے ہیں۔

میں تو تمہیں چھوڑ چھوڑ کر تمہاری توجہ ہمیشہ اپنے ہی اوپر مبذول رکھنا چاہتا ہوں میری دلی خواہش یہی ہے کہ میں تم میں کھپ جاؤں تم مجھ میں سما جاؤ۔

اور دیکھو پر تیم! میرے ان بے شمار گناہوں کو اپنی رحم دلی سے کیسے معاف نہ کرنے لگنا!  
اعظم کریمی  
(ذریعہ از بگراتی)

## رباعیاتِ امجد

اللہ اکبر اللہ اکبر  
مخل سے بے حال  
مخل سے بے حال  
مخل سے بے حال  
مخل سے بے حال  
مخل سے بے حال  
مخل سے بے حال  
مخل سے بے حال  
مخل سے بے حال  
مخل سے بے حال

خود نائی  
خود نائی  
خود نائی  
خود نائی  
خود نائی  
خود نائی  
خود نائی  
خود نائی  
خود نائی  
خود نائی

سابقہ صفات  
گم ہوئی  
نہ ہنستا ہے کہ اس  
اظہارِ کمال میں ہر اک  
سب کی جی خواہش ہے کہ ہم کو  
لے قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي

مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے  
مخل غنیمتیں میں بھی غنیمت ہے

امجد

# رباعیاتِ فراق

(۱)  
 فُردوں کی نظر سے باوقاباں کی طرف  
 پریشانے کی آنکھ سے چراغاں کی طرف  
 ہے جو چوچال دوستِ بزمِ مستی  
 میری بھی نظر سے جانوں کی طرف

(۲)  
 مونسِ دلوں کو کب جگمگاتی دنیا  
 افسانے تھکے کون سے بے نانی دنیا  
 دنیا کا بھر م لالہ پوچھو گے  
 جب آنکھ اٹھلی تو دیکھی جانی دنیا

(۳)  
 کمنوں کو بس اچکی مثبت تیری  
 کمنوں کو بس اچکی مثبت تیری  
 شے نہیں ہیں بھی گشتِ عمر کیسے  
 افسانہ بنا اچکی مثبت تیری

(۴)  
 دل کیا تھا کوئی شمعِ شبانہ چشت  
 اندھیرا ہوا بجھتی کھنکھ کی شبت  
 دل ہی تھا کہ جس لمحہ تیرے پہلے  
 بچھوٹے لوہے کی شبت  
 فراق



# چوکیدار

غضب کی سردی تھی اور ہوائے طوفان چار کھانچا۔ کئی دنوں سے ایسا اندھیرا چھا رہا تھا کہ لوگ بھوکے گئے تھے کہ انہوں نے دن کی روشنی، دُھوپ اور صاف شفاف آسمان آخری بار کب دیکھا تھا۔ ہوا بے طرح چل رہی تھی! اُس کی ٹائے دھوپیں ایسی دہشت و ہیبت ملی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ موت کے شر سے آرہی ہے۔ وہ برف کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اپنے ہلاکت آفرین سانس کے ساتھ ہر چیز کو چاٹ رہی تھی۔

سرد ہوائے انسانوں ہی پر لرزہ طاری نہ کر رکھا تھا بلکہ گاؤں کے تمام جھونپڑے گھاس کے ٹوٹے اور لکڑی کے ڈھیر بھی کانپ رہے تھے اور تاریک سیالوں میں دیکے جا رہے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سردی سے ٹھٹھرتے تھے یا خوف سے لرز رہے تھے؟ گاؤں کا گاؤں خوف کے پنجے میں اسیر تھا۔

یہ بادل، بیجلی، یہ آندھی اور یہ طوفان گاؤں والوں کے نزدیک عناصر کا کوئی بے معنی اور بے ہودہ کھیل نہ تھا بلکہ ایک آسمانی تازیانہ تھا جو کسی خاص مقصد کو لے کر نازل ہوا تھا۔ اور انہیں اس کا یقین تھا۔ پھر کیوں وہ اس سے نہ کانپتے؟ خدا کا خیال بجلی کے خوف کو دور کر سکتا ہے، لیکن جب باہر برفانی ہوا چل رہی ہو تو قہر خانے کی گرم فضا ہی میں گھستے بنتی ہے۔

بار بار ہوا میں سے ”ہو۔ ہو۔ ہو“ کی آوازیں نکلتیں، اور اس مہیب آواز کے ہر عادی پر ملک شان کے قہر خانے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ اپنی گفتگو بند کر دیتے اور حقے چھوڑ کر ایک دوسرے کے چہروں کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگتے پھر ایک دوسرے سے اور قریب ہو جاتے۔

کوئی پکارا اٹھا دیا الٹی ابرٹ تو ہوئی اور سردی بھی اپنی جگہ پر درست ہے لیکن یہ تیز و تند ہوا ہمیں کیا پیغام دینا چاہتی ہے؟ مگر عناصر کے اس المناک گیت کے معنی بیان کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی، مگر ہر شخص جانتا تھا کہ یہ ایک ہاتھی راگ ہے جسے ہوائے دنیا کے غم و ہجوم، کمزوروں کی آہ و بکا، مصیبت زدوں کی ٹائے و ہوا، غریبوں کے آنسو اور حاجت مندوں کی التجاؤں سے ترتیب دیا ہے۔

درد سے بھلا ہوا ایک سانس بھی فضا میں ضائع نہیں ہوتا۔ ایک بی ہوئی بے آواز آہ سے لے کر دل کو چیر کے گزر جانے والی چیخ تک فریاد کی ہر نئی کو ہوا اکٹھا کر کے اپنے سینے میں رکھ لیتی ہو کہ اس سوز دنیا کے سنج و سخن کی ایک لازوال شہادت تیار کرے۔ وہ ان آہوں اور زاریوں کو پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر لے جاتی ہے اور تاریک غاروں کی عمیق گہرائیوں میں ٹھونس دیتی ہے تاکہ کسی وقت ایک لخت کھول کر انہیں پھر زمین پر نازل کرے اور لوگ خوف و مصیبت کی چیخوں کو اور نہ ٹپکنے والی تقدیر کی سرگوشیوں اور دھمکیوں کو سنیں۔

یہ تھا اُن دیہاتیوں کا خیال جو اس وقت قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اس اتنی راگ کو سن رہے تھے جس کے الفاظ مرے ہوؤں کی آہیں، شیطانوں کی چیمیں اور گیدڑوں کے نعرے تھے۔ کیا طوفان اور جھکڑیں یہ سب آوازیں اپنے اپنے مسکنوں سے نکل نہیں آتیں اور اپنے غیر زمینی شور و غل سے فطرت کو اور زیادہ ہیبت ناک نہیں بنادیتیں؟ ان کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، زبان خشک ہو جاتی ہے، گلا گھٹنے لگتا ہے۔

”ہو۔ ہو۔ ہو“ طوفان اور تندہی سے چلنے لگا۔ قہوہ خانے کی چھت کو کڑا آنے لگی جیسے اس پر کوئی بھاری قدموں سے چل رہا ہو۔

ایک شخص نے یوں ہی بات کرنے کے لئے کہا ”اوہ! باہر تو جہنم ہے! میرا دشمن کہیں پہاڑوں پر ٹھہر رہا ہو؟“ دوسرے نے کہا ”پہاڑوں کو چھوڑو، ذرا جرات ہے تو تانکستان تک جا کر دکھاؤ“ کسی نے کہا ”آسمان اور زمین کشتی لڑ رہے ہیں“ پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ غور و فکر کا موقع تھا۔

باہر کا دروازہ کھلا، تمام نگاہیں اُس طرف اٹھ گئیں۔ دھندلی سی روشنی میں ایک آدمی کی شکل نظر آئی جس کا لمبا کوٹ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں باہر طوفان میں رہا تھا۔ نو وارد نے برف کو جھاڑتے ہوئے سلام کیا۔

ایک شخص نے سلام کا جواب دے کر کہا ”جی! آؤ آؤ، اندر آ جاؤ۔ ادھو تم تو سردی سے جم گئے ہو گے؟“ اور دوسرے نے نہایت ہمدردی سے کہا ”اے بیٹھنے کے لئے جگہ دو“

نو وارد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ”ہاں، والد، میں تو جم گیا! مجھ سے نواب باہر ٹھیرا نہیں گیا۔ آسمان ٹوٹ ٹوٹ پڑتا ہے۔ انسان اُس کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ کتنا طوفان ہے! کیسا جھکڑ ہے! مجھے گرم ہونے کے لئے قہوہ خانے میں آنا ہی پڑا۔ میں ابھی پھر باہر چلا جاؤں گا“

انگلیشی کے اوپر ایک چھوٹے سے مٹی کے ڈیے میں جوزیتون کے تیل سے بھرا ہوا تھا ایک باریک سی تیلی جل رہی تھی اور اس کا بے نور سا شعلہ ہوا میں لہرا رہا تھا اور ٹٹا رہا تھا۔ یہ بھی طوفان کے خوف سے دجکا جاتا تھا لیکن پھر بھی اس سے ایک دھیمی دھیمی روشنی نکل کر اُن چہروں کو نمایاں کر رہی تھی جو بوجھل استراخان ٹوپوں کے نیچے سے جھانک رہے تھے، اور چند باریک اور زرد کرنیں نووارد کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ یہ چہرہ ایک کسان کا چہرہ تھا جس پر غمت اور شفقت نے اپنے گہرے نقوش ثبت کر رکھے تھے۔ عمر کے لحاظ سے وہ جوان تھا لیکن تجربے کے لحاظ سے وہ بوڑھا نظر آتا تھا۔ اُس کی گھنی مچھلیوں کے نیچے اُس کے مضبوطی سے ملے ہوئے ہونٹ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ایک زبردست ارادے کا مالک ہے۔ اُس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن بے قرار اور شریر رہتھیں۔ وہ گاؤں میں رات کو پہرہ دیکر آتا تھا۔

اُس کا نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ سب اُسے جی کہتے تھے جو ارمی کے لئے ایک دوسرا لفظ ہے۔ گو کہنے والے بھی ارمی تھے لیکن وہ چونکہ ایک دوسرے گاؤں سے آیا تھا اس لئے اُسے جی کہہ لینا آسان تھا۔ یہی جی تھا جو اب ایک لڑنے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ گاؤں میں اُس کے بہت سے ساتھی آئے تھے لیکن اب وہ تمام اُس سے جدا ہو چکے تھے اور وہ ایک بھڑی ہوئی کوچ کی طرح باقی رہ گیا تھا۔ اُسے بھیک مانگنے سے نفرت تھی اسی لئے وہ گاؤں کا چوکیدار بن گیا تھا۔

فتوہ خانے میں کیسا امن تھا! باہر طوفان ٹھننے میں نہ آتا تھا۔ ہوا ایک زخمی درندے کی طرح شور مچا رہی تھی۔ رئیس کیوان نے کہا ”بس ایسی ہی رات تھی جب وہ بیچارہ موت کے منہ میں جا پڑا“ اُس کا اشارہ اسی گاؤں کے ایک شخص کی طرف تھا جو تھوڑے ہی دن ہوئے طوفان کے چنگل میں پھنس کر اپنی جان کھو بیٹھا تھا۔ ایک اوشخص بولا ”کتنی دفعہ ہم نے اُس سے کہا باہر نہ جاؤ، اس برف و باد میں آوارہ نہ پھرو، اپنے بیوی بچوں کا خیال کرو۔“

ملک نے کہا ”کیسی جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہو! یہ تو اُس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ وہ باہر نکلے اور مر جائے۔“  
تقدیر سے اُسے کون بچا سکتا تھا؟

ایک نے کہا ”ملک تم نے سچ کہا،“ دوسرا بولا ”تقدیر کے لکھے کون مٹا سکتا ہے؟“  
تقدیر، قادر مطلق تقدیر! ایسی مصیب رات میں اور اس زمیں و زور قبوہ خانے کے اندر جب کہ باہر طوفان کے تھپیڑے دل میں غم انگیز کہانیوں کی یاد تازہ کر رہے ہوں گفتگو کے لئے اس اندھی طاقت کے سوا کون سا موضوع زیادہ موزون ہو سکتا ہے؟

ہر شخص نے تقدیر کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا اور سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ تمام انسانی اسباب اور کوششیں تقدیر کے سامنے عاجز ہیں۔

کمرے کے ایک کونے سے آواز آئی ”میں تقدیر کا ذرا بھی قائل نہیں ہوں“  
تمام نگاہیں اُس طرف اٹھ گئیں۔

ملک نے حجویہ انداز میں کہا ”یہ اژدہا کہاں سے بولا؟“  
اسی دوازنے ذرا اور مضبوط لہجے میں جواب دیا، ”یہ میں ہوں، ملک، تمہارا خادم۔ میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں“  
لوگ نہ جانتے تھے کہ اُس پرہنسیں یا ناراض ہوں۔ یہ جو تقدیر کی زبردست طاقت کا قائل نہ تھا رات کو کافل میں پہرہ دینے والا مغلوک الحال چوکیدار تھا۔

چوکیدار کے اس زعم نے سب کے دلوں کو سخت تکلیف پہنچائی۔ امیر اور طاقتور ملک تقدیر کا قائل تھا اور اُس سے ڈرتا تھا۔ رئیس کیوان جس کے ڈنڈے کے سامنے سب سوکھے پتے کی طرح کانپتے تھے، وہ بھی تقدیر سے سخت خائف تھا۔ امام اپنے ہر وعظ میں تقدیر کی طاقت کا ذکر کیا کرتا تھا۔ غرض کہ سب پر تقدیر نے اپنی مہیبت بٹھا رکھی تھی، لیکن یہ بے برگ و نوا انسان نہ اس کا قائل تھا اور نہ اس سے ڈرتا تھا۔

اُس نے دیکھا کہ وہ سب اُس کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اُس نے پھر ایک دفعہ ذرا آواز سے کہا ”میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں۔ اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں درست کہہ رہا ہوں لیکن افسوس ہے کہ مجھے اب گاؤں کے گرد ایک چکر لگانا ہے“ وہ اٹھ کر جانے لگا۔

کئی پرشوق آوازیں یک دم بلند ہوئیں ”ٹھیرو، ٹھیرو، جی ٹھیرو! رئیس اس سے کہو کہ ٹھیر جائے، گاؤں کو آج رات کوئی خطرہ نہیں“

رئیس کے کہنے پر جی پھر بیٹھ گیا۔ سب لوگ منتظر نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ شخص جو تقدیر کا اس سختی سے انکار کرتا ہے اپنی کمافی کب شروع کرے گا۔

اُس نے اپنی سرگزشت شروع کی ”اُس سال ہماری ٹولی میں دس آدمی تھے — دس ولیا اور جری آدمی۔ ہم کئی کئی مہینے ایک ریگستان سے دوسرے ریگستان، ایک وادی سے دوسری وادی اور ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ میں پھرا کرتے تھے۔ جہاں سانپ پانی پیتے تھے وہیں ہم بھی پیتے تھے، جن پتھروں کے نیچے سانپ چھپے ہوئے تھے اُن کے اوپر ہم سوتے تھے۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ ہم نے اپنے وقار کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ہم نے

اپنے صبر کی کوئی انتہا نہ رکھی تھی لیکن ہمارے دشمنوں کے ظلم کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُن کے سنگ دلائے ظلم کی بہار پاس کھانے کو روٹی نہ تھی اور جو تھی نوکھانے کے قابل نہ تھی۔ وہ زہر کی طرح ترش ہو گئی تھی۔ اس لئے ہم نے اپنے گھربار بیوی بچوں کو چھوڑ دیا تھا اور اپنی بندوقیں کندھوں پر رکھ کر ہم اپنی عزت کے دامن سے دھتے چھڑانے کے لئے نکل پڑے تھے۔

”ہم نے یہ اچھا کیا تھا۔ اب ہم آزاد تھے۔ آہ! جب کسی کو ہماری طرح مصیبتیں پیش آئیں، جب اُس کی بہن، اُس کی بیوی، اُس کی ماں کی توہین کی جائے، جب اُس کے بیٹے کو مار دیا جائے اور اُس کے باپ کو گالیاں دی جائیں تو اُس کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا۔“ بندوق کے سوائے کچھ نہیں۔

مذکر اور کُرد ہمیں فتاویٰ (واجب القتل) کہتے تھے، لیکن ارمنی ہمیں منتقم شیاطین کے نام سے پکارتے تھے۔ ہمارا خوف ہمارے آگے آگے چلتا تھا اور اپنے پیچھے ہم موت کو چھوڑتے جاتے تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر عقابوں کے گھوسلوں کے پاس ہمارا مسکن ہوتا تھا۔ آہ! ہم نے کہاں کہاں کا سفر کیا! کتنے ترک اور کُرد ہم نے مار ڈالے اور اُن کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا دیا! انہوں نے ہر جگہ ہمیں تلاش کیا مگر ہماری ہستیاں غیر مرئی ہستیاں تھیں۔ ہم ہر کہیں موجود تھے اور پھر کہیں بھی نہ تھے کسی فتاویٰ کا سرخ نکالنا آسان کام نہیں اور اُس سے دوچار ہونا تو خطرہ عظیم کے مرادف ہے۔ یہ ہمارا حال تھا اور ہم اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔ تقدیر پر ہمارا پورا ایمان تھا۔

”ہم کو وسم پر رہا کرتے تھے جب ایک دن ہمارے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہا۔ خوراک مٹیا کرنے کے لئے قرعہ میرے نام نکلا۔ میں اس علاقے کے دیہات سے واقف تھا۔ دن دھاڑے بغیر کسی ہتھیار کے میں نے اپنی کہیں گاہ سے نکل کر پہاڑ سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ میں نے خیال کیا اول تو میں دشمن کی نظر بچا کر نکل جاؤں گا اور کسی کا سامنا ہو بھی گیا تو میرا خالی ہاتھ ہونا ہی میری نجات کے لئے کافی ہو گا۔ لیکن اگر میں مارا گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ میری قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔ چنانچہ میں گیا۔

”کچھ عرصے تک مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے وادی تک پہنچنے کے لئے ایک پہاڑ کو عبور کرنا تھا۔ جب میں اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو وہاں میں نے ایک کُرد سپاہی کو دیکھا جو پورے طور پر مسلح تھا۔

”میں نے بے پروائی سے کہا ”سلام کرو! (آقا)“

”نکر دے جواب میں کہا ”سلام فلا! پرستار زادے!“ لیکن وہ گزرنے لگا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ ”مگر میں نہ ٹھیرا۔ میں اُسی طرح چلتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ وہیں کھڑا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے

اپنی رفتار ذرا بھی تیز نہ کی تاکہ اُس کے دل میں میری طرف سے کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو۔

”اتنے میں اُس نے آواز دی، ”او فلا ٹھہر جاؤ“ میں ٹھہر گیا اور پیچھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا ”میری تقدیر آپہنچی“ مجھے پہلے ہی امید تھی کہ میری تقدیر مجھے ایک ایسے ہی گُرد کی صورت میں آ لے گی۔ اُس کی بندوق اُس کے کندھے پر تھی، اُس کی تلوار اُس کے پہلو میں لٹک رہی تھی اور اُس کا ہاتھی دانت کے دستے والا خنجر اُس کے کمر بند میں آویزاں تھا۔ اُس کے چہرے سے شیطنت برس رہی تھی اور اُس کی آنکھیں ایک جھوٹے بھڑپے کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ وہ میرے پاس آ گیا۔ ..

”کردنے کہا، آج کل ان علاقوں میں کسی فلا کو آنے کی جرات نہیں۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟“

”میں نے کہا، ”اے گُرد، ہم پر بڑا بُرا وقت آپڑا ہے۔ مگر ہم تمہارے ہمسائے ہیں میں غوطے سے آیا ہوں۔ ہمارے علاقے میں قحط پڑ گیا ہے، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے میں طریشان میں اپنے بچوں کے لئے روٹی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنے راستے پر جانے دو۔“

”نہیں فلا تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے،“

”گُرد، خدا کو مانو۔ تم دیکھتے ہو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ میرے پاس چاقو تک نہیں۔ دو خالی ہاتھوں کے ساتھ میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے گُرد جانے دو۔“

”میرے آگے آگے چلو میں تمہیں گورنر کے پاس لے جاؤں گا۔“

”گورنر کے پاس اگر نر کے پاس جانا مجھے بھلا معلوم نہ ہو۔“

”گُرد، مجھے گورنر کے پاس نہ لے جاؤ۔ وہ مجھے کچھ کہے گا تو نہیں لیکن مجھے دیر ہو جائے گی۔ میرے چھوٹے

چھوٹے بچوں پر رحم کرو۔ وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ گُرد، خدا کے لئے مجھے جانے دو۔“

”مگر گُرد کو ذرا رحم نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا یہ میری تقدیر ہے، اور سر جھکا کر اُس کے

آگے آگے چل پڑا۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ میں اُس کے قبضے میں تھا۔ بندوق اُس کے کندھے پر تھی، تلوار اُس کے پہلو میں اور خنجر اُس کے کمر بند میں۔ ہم چلتے رہے۔

”ہمارے آس پاس ہر چیز پر خُش چھایا ہوا تھا۔ آفتاب روشن تھا۔ آسمان صاف تھا۔ پہاڑیاں سرسبز

تھیں۔ پھول ہمک رہے تھے۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہر طرف زندگی اور مسرت کا دور دورہ تھا۔ دُور

آسمان پر ایک کلنگ آزاد اور بے کھٹکے اُڑ رہا تھا۔ میں اُس کے دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ کچھ دیر کے لئے اپنے متعلق مجھے کسی قسم کا خوف نہ رہا۔ کیا اُس کی آزادی پر مجھے رشک آ رہا تھا یا کوئی اور بات تھی جس نے میری توجہ کو یوں اپنی طرف منحطف کر رکھا تھا؟ مجھے معلوم نہیں کیوں میں اُس میں کھو گیا تھا۔ جب کلنگ عین ہمارے سر کے اوپر پہنچ گیا تو یکایک اُس نے نیچے کی طرف رخ کیا اور ایک قریب کے ٹیلے پر اتر گیا۔ میں نے قیافے سے معلوم کر لیا کہ وہاں سانپ ہے جسے کلنگ نے اوپر سے دیکھا ہے۔ اُس کے پردوں کی آواز سن کر سانپ نے اپنا منہ اپنے پچھوں میں چھپا لیا۔ اس کے بعد خوب لڑائی شروع ہوئی۔ ہم دونوں دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

”گردنے کہا، دیکھئے ہو؟ سانپ ایک فلا ہے اور اسی طرح اُس کا غارت کر دینا لازم ہے۔“

”میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ کلنگ ایک طرف ہٹ گیا۔ اُس نے اپنی چونچ سانپ کے جسم میں گھونپ دی اور پھر ایک طرف ہٹ گیا۔ سانپ نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے پیچوں کو کھولتا اُس کے مہیب دشمن نے اُس پر حملہ کیا۔ سانپ پھر اکٹھا ہو گیا اور اُس نے اپنا سر چھپا لیا۔ میبل خیل غلط تھا کہ اب اُس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔ رفتہ رفتہ کلنگ زیادہ دلیر بن گیا۔ وہ اب زیادہ سرعت اور زیادہ شدت سے حملے کرنے لگا۔ آخر جب اُس نے سمجھا کہ سانپ کی سب طاقت زائل ہو چکی ہے تو وہ اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تاکہ ایک آخری حملہ کر کے اُس کا کام تمام کرے۔ سانپ نے اب تک اپنا سر باہر نہ نکالا تھا اور نہ مدافعت کی کوشش کی تھی۔ اب کلنگ اُس کے بالکل قریب تھا۔ یکایک ایک حیرت انگیز بات طور پر پذیر ہوئی۔ قریب المرگ سانپ نے آخری بار اپنی قوت کو مجتمع کیا، سر اٹھایا، جسم کو کھول دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک ہی دفعہ اُس نے کلنگ کی لمبی گردن کو اپنے پیچوں میں جکڑ لیا۔ کلنگ نے بہت کوشش کی مگر وہ اپنے آپ کو اس موت انگیز نرم آغوشی سے جدا نہ کر سکا۔ اُس کے پر لٹک کر زمین پر آ گئے۔ اُس کی چونچ مٹی سے آلود ہو گئی۔ وہ بہت شیشایا۔ اُس نے اُڑنے کی کوشش کی، لیکن اُس کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ سانپ کا بے اندیشانہ غصہ خطرناک تھا۔ اُس کے پیچ اُپر سخت ہوتے گئے، اور آخر کار کلنگ بے جان ہو کر زمین پر آ رہا۔ سانپ نے اپنی گرفت چھوڑ دی اور چلا گیا۔

”گردنے کچھ نہ کہا۔ اُس نے صرف میری طرف دیکھا اور ایک طویل لمحے کے لئے ہماری نگاہیں ایک دوسرے پر جمی رہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں کے دل

میں ایک دوسرے کے لئے خطرناک خیالات گزر رہے تھے۔ اور ہماری آنکھوں سے صاف اُن خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کلنگ پر سانپ کی غیر متوقع فتح نے گرد کو ہوشیار کر دیا ہے اور وہ میرے قتل کا فیصلہ کر چکا ہے۔ لیکن میں بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ سانپ اور کلنگ کی اس لڑائی نے مجھ میں بھی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ میں نے یہ کبھی نہ سنا تھا کہ سانپ نے کلنگ کو زیر کیا ہو۔ کلنگ سانپ کا جانی دشمن ہے، اس کی تقدیر کا مالک۔ مگر آج یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ اُس کی تقدیر اُس پر غلبہ نہ پاسکی؟ کیا وہ خدا جس نے اس بے بسا سانپ کو کلنگ کا ناحق شکار نہ ہونے دیا میری تقدیر کا فیصلہ اس گرد کے ہاتھوں دیکھنا گوارا کرے گا؟ نہیں، میں نے کہا، میں غلطی پر تھا۔ انسان کو نجات کی راہ ڈھونڈنی چاہئے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی راہ نکل آئے۔ مگر وہ راہ کون سی ہو سکتی ہے؟ میرے پاس تو ایک چاقو بھی نہیں تھا۔ اُسی وقت میری نظر اُس خنجر پر پڑی جو گرد کے کمر بند میں اچکا ہوا تھا۔ آہ! کاش میرے پاس یہ خنجر ہوتا۔ صرف یہ خنجر!

”گرد نے گرج کر کہا: چلے چلو! تم کھڑے کیوں ہو گئے؟“

”میں چلتا رہا۔ ہم ایک تنہا اور تاریک وادی میں داخل ہو رہے تھے کہ گرد نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ اُس نے بدوق اپنے کندھے سے نیچے اتاری لیکن پھر وہیں رکھ دی۔ میں نے خیال کیا کہ اب انجام نزدیک ہے۔ لیکن میں ابھی مزناں چاہتا تھا۔ اگر ایک سانپ زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے تو انسان کو یہ حق اُس سے بہت زیادہ ملنا چاہئے! میری رفتار سست ہو گئی۔ مجھے خیال آیا کہ گرد کے آگے آگے چلنا یقیناً میرے لئے خطرے کا باعث ہے۔“

”گرد نے کہا: تیز چلو، تیز! وہ مجھے اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں اُس کے پہلو پہ پہلو چلنا چاہتا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا اور ہمارے درمیان ایک خاموش جنگ جاری ہو گئی۔ ایک ہلاکت آفریں جنگ، جس کے پوشیدہ منصوبے دہشت انگیز طور پر خطرناک تھے۔“

”یہ ایک میں کھڑا ہو گیا۔ میری کھڑاؤں کے تسمے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ گرد میرے پاس آہنچا اور وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ میری داہنی طرف کھڑا تھا اور اُس کے خنجر کا سفید دستانہ اُس کے کمر بند میں آگے کو نکلا ہوا تھا۔“

”مجھے سست دیکھ کر وہ غصے سے پکارا: جلدی کرو فلان! جلدی کرو!“

”میں بجلی کی طرح اٹھا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے کوئی حرکت کرے میں نے اُس



کا خنجر نکال کر اُس کے سینے میں گھونپ دیا۔ اُس نے ایک دفعہ ہائے کیا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں بچ گیا تھا۔ دیکھو جس خنجر نے مجھے بچایا تھا وہ یہ ہے!

چوکیدار نے ہاتھی دانت کے دستے والا ایک خنجر اپنے کمر بند سے نکالا اور سامعین کو دکھایا۔ سب نے جھک جھک کر اُس بھیانک ہتھیار کو دیکھنا شروع کیا جس نے ایک شخص کو تقدیر کے پیچ و پریچ دام سے آزاد کرایا تھا۔ جی، وہ معمولی سا آدمی اب حقیقت میں سب کی نظروں میں ایک اژدہ بن گیا تھا۔ اُس نے تقدیر پر غلبہ پالیا تھا۔ تقدیر اُس کے آگے پیچ تھی۔ وہ خنجر بچا تھا۔

جی نے پھر کہا ”میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں“ مگر اُس دفعہ کسی نے اُس کی ہنسی نہیں اڑائی۔ بلکہ سب نے اُس کی بات اخترام امیر خاموشی کے ساتھ سن لی۔

اُس نے خنجر اٹھا کر اپنے کمر بند میں رکھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ کوئی اُسے روک نہ سکا۔ باہر اسی طرح ہوا چل رہی تھی، مگر اب اُس میں تقدیر کی دل ہلا دینے والی دہشت موجود نہ تھی۔ ہوا کی کثیر تعداد آوازوں میں اب ایک آواز یہ بھی آرہی تھی ”آزادی کے لئے لڑو“۔

(ترجمہ)

منصور احمد

انسان کے لئے صرف ایک ہی صراط المستقیم ہے اور وہ یہ کہ ہستی مطلق سے بغاوت پیدا کرے اور بھولے بھالے ایٹم (Atom) سے راہ و رسم پیدا کرے یعنی اگر وہ اس قدر بد قسمت ہو کہ اس کو کسی کی آنکھوں، کسی کے بالوں کے تصور سے فرصت ہو

فلک پیم

ذرا اُن گھومتی ہوئی نگاہوں کی زبان تو پڑھو۔ بس دل ہی جانتا ہے!

صرف ستارہ ہی ٹھیک چمکتا ہے سیارے کی کرن ہوتی ہے تو غصہ ٹپکی ٹپکی ندیم سی! گلچیں

# غزل

چہرہ مئے شباب سے گلزار ہو چلا      فتنہ جو سوراہا تھا سو بیدار ہو چلا  
دل آرزو کے نام سے بیزار ہو چلا      دیوانہ اپنے کام میں ہشیار ہو چلا  
مدت کی مشق میں دل رنگیں کا خون شوق      سب فتنہ رفتہ رنگِ رخسار ہو چلا  
کچھ اس ادا سے عشق نے چھیڑا بابِ غم      جس نے سنا وہ غم کا طلب گار ہو چلا  
اس عقل ہرزہ کار کو ٹھکرا کے آج میں      پھر دامِ رنگ و بو میں گرفتار ہو چلا  
اتنی اٹھائی ہیں غم سراں کی لذتیں      اب عرضِ مدعا بھی مجھے عار ہو چلا  
پھونکا وہ چشمِ شوخ نے افسونِ التفات      کبخت دل بھی اُن کا طرفدار ہو چلا

ذوقی یہ شانِ حُسنِ تلون نہیں تو کیا؛

انکار کر دیا کبھی افسار ہو چلا

ذوقی

# لا علمی

علم اور واقفیت ایک نعمت ہے اس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی لیکن اگر غور کر کے دیکھو تو لا علمی اور عدم واقفیت اس سے بھی بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر زندگی کی تکمیل نہیں ہوتی، جو کچھ ہم جانتے ہیں اور جن چیزوں سے ہمیں واقفیت ہے اس سے کہیں زیادہ اہمیت ان چیزوں کو حاصل ہے جن کا ہمیں مطلق علم نہیں،

زندگی صد بار انہوں کا مخزن ہے، خود زندگی ایک راز ہے جتنا علم بڑھتا جاتا ہے واقفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی زندگی کا لطف کم ہو جاتا ہے، عدم واقفیت اور لا علمی زندگی کا سہارا ہے جب ہمیں کسی چیز سے واقفیت ہو جاتی ہے تو اس چیز کے اندر بچھ جائے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی، اپنے بچپن کا زمانہ یاد کرو، تین بار ہا ایسا اتفاق ہوا ہوگا کہ رات کے وقت گھر واپس آتے ہوئے اندھیرے میں کچھ سفید سفید چیز متحرک نظر آرہی ہے، جب تک ہمیں یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کیا چیز ہے دل میں کیسے عجیب و غریب ہر کے محسوس ہوتے ہوئے ممکن ہے کوئی بھوت ہو ممکن ہے کوئی آدمی چھپا کھڑا ہو لیکن جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ درخت کی ایک انچی شاخ پر کسی نے دھوٹی سوکھنے کے لئے لٹکا دی ہے جو ہوا سے بل ہی ہے تو ہمارا دلچسپی زائل ہو گئی،

تم ایک شجرہ باز کا تماشا دیکھتے ہو وہ لو کر ہی میں کہو تر بند کر دیتا ہے اور جب لو کر ہی اٹھاتا ہے تو کہو تر غائب ہوتا ہے مٹھی میں نہتا ہے سامنے ایک روپیہ رکھتا ہے اور جب مٹھی کھولتا ہے روپیہ نہیں ہوتا، ہمیں ان حرکتوں میں صرف اس لئے لطف آتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ یہ سب کیونکر کرتا ہے، اگر ہمیں ان شجروں کی ترکیب معلوم ہو جائے تو پھر کوئی دلچسپی باقی نہ رہے اور تم اس کے حیرت انگیز کارنامے دیکھنے کے لئے روپیہ صرف نہ کرو،

زندگی کے ہر دور میں جن چیزوں سے ہم واقف نہیں ان کی اہمیت ان چیزوں سے کہیں زیادہ ہے جن سے ہم واقف ہیں کوئی نہیں جانتا کہ خدا جلنے کل کیا واقع ہونے والا ہے، کاروبار میں تجارت میں کسی بڑے سے بڑے ماہر کو بھی معلوم نہیں کہ کل بازار کا کیا رنگ ہوگا، کون جانتا ہے کہ موسم کی کیفیت اگلے دن کیا ہوگی۔ کہے معلوم ہے کہ اب ہوا کا کل کیا حال ہے گا؟ ہم دوست بناتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ وہ کیسے ثابت ہوئے ہم ان سے نباہ بھی سکیں گے یا نہیں، ہم شادی کرتے ہیں لیکن نہیں کہہ سکتے کہ وہ خاۓ آبادی کا سبب ہوگی یا خانہ بربادی کا زندگی کا اعتبار نہیں، موت کا راز کسی کو معلوم نہیں موت کے بعد کون جانتا ہے کیا ہوگا، پس ایک غیر محدود سلسلہ ان اشیاء کا ہمیشہ ہمیں گھیرے ہوئے ہے جن سے ہم بالکل واقف نہیں، ہمارا معلوم اشیاء سے لوگ ڈرتے ہیں کہ پردہ غیب سے خدا جانے کیا ظہور میں آئے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ خداوند کریم نے دنیا میں معلوم اشیاء کی نسبت ہمارا معلوم اشیاء زیادہ پیدا کی ہیں پس ہونہیں سکتا کہ وہ انسان کی بہتری کے لئے

نہوں، اگر ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ زندگی میں جس قدر بہتر اور راحت بخشنے والی چیزیں ہیں ان سب کی بناء عدم واقفیت پر ہے اور وہ سب پردہ غیب سے ظہور میں آتی ہیں، صحیح معنوں میں عقلمند اور دانا وہی شخص ہے جو نامعلوم اشیاء کی اہمیت سے آگاہ ہے نہ وہ جو اپنے علم اور واقفیت پر نازاں ہو، اس کا سبب یہ ہے کہ جب انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ جتنا علم ہمیں ہے جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابل میں کچھ بھی نہیں جو ہم نہیں جانتے تو اس میں عجز و انکسار پیدا ہو جاتا ہے اور یہی علم اور عرفان کی طرف پہلا قدم ہے،

عدم واقفیت کا احساس عقل و دانائی کی ابتداء ہے بالکل ایسے ہی جیسے واقفیت پر غرور دماغی ترقی کے لئے آخری حد ہے، تم نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ سطحی سمجھتے ہیں اور جن کا دماغی سرمایہ جمالت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا وہی سب سے زیادہ اپنے علم و عقل پر غرور کرتے ہیں اور بانگ بیل اس کا اعلان کرتے ہیں اور جنہیں خدا نے صحیح معنوں میں علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جو اس دولت سے مالا مال ہیں وہی سب سے پہلے اپنی تنک سہا مانی اپنی تہی دستی اور اپنی محدود واقفیت کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نظر آئیں گے،

شاید دنیا میں سب سے بڑا عقلمند مفرط تھا اور جانتے ہو اس کا تکیہ کلام کیا تھا "میں تو کچھ بھی نہیں جانتا" کبھی تم نے کشش ثقل کے مسئلہ پر عالمانہ غرور سے جدارہ کر غور کیا ہے، مادہ کے ہر ذرہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو مادہ کے ہر ذرہ کے ذرہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یہی چیز ہی قوت اجسام فلکی کو ایک نظام میں وابستہ کئے ہوئے ہے اور خدا کی زمین کے ہر جزو پر اپنا تسلط اور قبضہ جملے ہوئے ہے، لیکن نیوٹن بھی جس نے ہمیں بتایا کہ سیب زمین پر اس لئے گر رہا ہے کہ ہرادی چیز دوسری مادی چیز کو اپنے حجم اپنے وزن اور قاصدے کی نسبت سے اپنی طرف کھینچتی ہے اس امر سے واقف نہیں ہے کہ یہ قوت اصل میں ہے کیا؟ بالکل اسی طرح جس طرح وہ بچہ اس قوت سے آگاہ نہیں جو کتنا ہے کہ سیب اس لئے زمین پر گر رہا ہے کہ وہ بھاری ہے اور شاخ اس کا بار نہیں سنبھال سکتی،

آج کل گھر گھر بجلی سے کام لیا جاتا ہے، ہم اس سے گاڑیاں چلاتے ہیں، پنکھے چلاتے ہیں روشنی حاصل کرتے ہیں، ایک منزل سے دوسری منزل پر دوسری منزل سے تیسری پر اور ایسی ہی میں میں منزلوں تک پہنچ جاتے ہیں، ایک تار لگا کر صد ہا کوس کے فاصلے پر گھر بیٹھے بات چیت کرتے ہیں، یہی نہیں بلکہ بے تار لگائے بھی گفتگو کرتے ہیں، ہزار ہا کوس کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تقریر کرتے ہیں، موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، غرض بجلی نجات جاوید کی روح رواں ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ بجلی ہے کیا چیز؟ زندگی ایک قوت ہے، ایک طاقت ہے اور ایسی چیز ہے جس سے زیادہ اور کوئی چیز ہم سے قریب نہیں لیکن کون جانتا ہے کہ زندگی ہے کیا چیز؟ وہ کہاں سے آتی ہے اور پھر کہاں کو چلی جاتی ہے، آج تک کوئی سائنس دان زندگی کو ظہور میں نہیں لاسکا کسی نے ایک حقیر سے حقیر کھرا بھی پیدا کر کے نہیں دکھایا، اور نہ کبھی دکھائے گا،

زندگی سرسبز رازوں والی قوت کا وہ سرچشمہ ہے جو عدم واقفیت اور لاعلمی کی نامعلوم وسعت سے ہم تک پہنچتا ہے، جب تک کہ ہمارے جسم میں ہے ہم بڑھتے رہتے ہیں جس وقت وہ ہمارے جسم کو چھوڑ دیتی ہے وہ سڑ جاتا ہے، ہم اُسے اپنے جسم سے ایک چاقو یا زہر کے ذریعہ خارج کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے ہم اُسے بڑھا گھٹا بھی سکتے ہیں، لیکن ہم زندگی کو پیدا نہیں کر سکتے۔ پس یہ سب چیزیں جن پر دنیا کی مشین چل رہی ہے۔ کشش ثقل، بجلی، زندگی ہمارے لئے ایک مقام ہیں ہم ان کی بابت کچھ نہیں جانتے لیکن اس کے باوجود یہی دنیا کی اہم ترین چیزیں ہیں انہیں پرنسپل انسانی کا دار و مدار ہے، جن چیزوں کا ہمیں پورا علم ہے وہ نہایت غیر اہم معمولی اور سطحی ہیں، مثلاً ہم جانتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس کا جاننا مفید سی لیکن بے اثر ہے اگر نہ جانیں تو بھی زندہ رہ سکتے ہیں، تم یہ جانتے ہو کہ اس مضمون میں کل کتنے الفاظ ہیں لیکن کس کو غرض پڑی ہے جو ان باتوں کی طرف توجہ کرے اور اگر توجہ کرے بھی تو کیا حاصل ہے؟

زندگی کی ساری دلچسپیاں سائے دل نشین دھڑکے لاعلمی اور عدم واقفیت سے حاصل ہوتے ہیں، آنے والی کل ایک نامعلوم اور غیر دریافت شدہ ملک ہے جو خدا جانے کتنی سمات کی سرایہ دار ہے اور ہم سب کو لبس کی طرح "آج" کے جہاز پر کھڑے ہیں اور مستقبل کے نامعلوم اور تاریک سمندر کے سفر پر کمر بستہ ہیں، جوانی میں کیفے دلچسپی ہے بڑھاپے میں کوئی لطف نہیں کوئی دلچسپی نہیں صرف اس لئے کہ جوان کے سامنے مستقبل کی ایک نامعلوم وسعت ہے، اس لئے کہ بوڑھے آدمیوں کی معلومات زیادہ ہے وہ بہت سی چیزوں سے واقف ہیں یا کم سے کم وہ سمجھتے ہیں کہ واقف ہیں۔ اسی لئے وہ نامعلوم اشیاء میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں، اور اسی لئے زندگی کا سارا لطف غارت ہو جاتا ہے۔

موت بھی نامعلوم وسعتوں کا ایک روازہ ہے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس دروازہ کے اُس طرف کیا ہے، اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ موت ہمارے متعلق ہمارے لئے تمام چیزوں کا خاتمہ ہے یا فرض کرو ہمارے لئے ڈنٹے کا بہشت یا گہم کا نوان ہے تو موت کے سرسبز رازوں اور اس کی پوشیدہ قوتوں کا ہم پر کوئی اثر نہ رہے اور ہم اسے ایک معمولی چیز سمجھنے لگیں صرف اس لئے کہ ہم موت کے متعلق کچھ نہیں جانتے اس سے باہل واقف نہیں ہیں صرف اس لئے کہ ہم موت کے دروازہ سے نامعلوم وسعتوں کی سرزمین میں داخل ہوتے ہیں ہمارے لئے وہ ایک زبردست مہم ہے، کسی قدیم یونانی حکیم کا مقولہ ہے "کے معلوم ہے کہ یہ زندگی اہل میں موت ہی ہو اور جبے ہم موت کہتے ہیں وہ زندگی ہو"

حامد اللہ افسر

# نغمہ ناہید

کسی وفانا آشتنا کے حضور میں

میری خاموش التجاؤں کی سماعت ہونہ ہو تیرے اندازِ تغافل کی نہایت ہونہ ہو  
میرے حالِ زار پر چشمِ عنایت ہونہ ہو اے وفانا آشتنا تجھ کو محبت ہونہ ہو

عشق میرا سب سے رنگینی ایسا ہے

آنکھ مجھ جستجو ہے دل میں ذوقِ دید ہے

عشق تیرا ہے بہشتِ جاوداں میرے لئے یاد تیری ہے نشاطِ کامراں میرے لئے

رنج تیرا ہے دردِ پیکرِ اں میرے لئے تیرے جلوے حاصلِ کوئی مکاں میرے لئے

باوجودِ نامرادی عشرتِ جاوید کا

میرے ارمانوں کی دنیا میں ہمیشہ عیش ہے

مجھ کو تجھ سے خواہشِ لطف و کرم کوئی نہیں یہ ترا جو روستم جو روستم کوئی نہیں

شوق میں تیرے مجھے رنج و الم کوئی نہیں مجھ کو تیری بے وفائی کی قسم کوئی نہیں

جامِ غم و اندھ مجھ کو ساغرِ خورشید ہے

نالبہ حسرتِ سرودِ نغمہ ناہید ہے

جلال الدین اکبر

# محفلِ ادب

## نغمہ چین

چینیوں کی عشقیہ شاعری اُن کی متاعِ ذہنی کا نہایت اہم جزو ہے چینی لوگ اپنے پچھلے شاعروں کے عشقیہ کلام سے عام طور پر واقف ہوئے ہیں۔ آج بھی بی، تائی، پو کے اشعار جو ہزار سال سے اوپر ہوئے لکھے گئے تھے ہر طبقے کے لوگوں میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ آپ چین میں بدست عشاق کی زبان سے بھی انہیں سن سکتے ہیں اور شام کو اپنے کھیت پر کسان بھی اب تک انہیں گاتا ہے۔

چین کے سب سے بڑے شاعر عشقیہ شاعری کرتے تھے۔ ڈراما یا مینیہ نظمیں چینیوں کی نظریں دوسرے درجے کی چیز ہیں۔

چینی شاعری کے سب سے قدیم نمونے کوئی ۳ ہزار سال پرانے ہیں اور اس طرح چینی شاعری ہندوستانی اور عربی شاعری کے ساتھ ساتھ دنیا کی سب سے قدیم شاعری کہی جاسکتی ہے۔ قوم میں اس کا عام رواج اب تک اس لئے ہے کہ اس طویل زمانے میں چین میں تقریباً کوئی تغیر نہیں ہوا۔

چینی شاعری کے عروج کا زمانہ وہ ہے جسے اُس وقت کے حکمران خاندان کے نام پر عہدِ تھانگ کہتے ہیں یعنی ولادتِ مسیح کے بعد کی ساتویں سے نویں صدی تک کا زمانہ۔

اس عہد کے دو سب سے مشہور شاعر، تائی، ہو اور تھو، فو ہیں۔ لی عرصہ تک شاہِ متنگ ہوا تک تی کے دربار میں رہا۔ بادشاہ نے ہر طرح اس کا اعزاز و احترام کیا لیکن اس کی طبیعت بے چین تھی۔ بچلا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ دربار کو چھوڑ چل کھڑا ہوا اور سارے ملک میں پھر پھر کر لوگوں کو اپنے اشعار سے مسحور کرتا رہا۔ ۶۱ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ چینیوں نے اس کی موت کا ایک افسانہ بنا لیا ہے جس سے تقریباً ہر چینی واقف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لی ایک دفعہ کشتی میں بیٹھا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ اور یہ لپٹے شعر گارہا تھا کہ یکایک ایک عجیب سی موسیقی سنائی دی جس کا تعلق اس دنیا سے نہ تھا۔ اس موسیقی کو سن کر پانی سے ہریوں کی ایک فوج نکل آئی اور آسمان سے دو فرشتے

اُترے۔ ان دونوں نے آئی کو ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یہ ایک پری کے کندھے پر بیٹھ کر دونوں فرشتوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ اور افاق تک پہنچ کر سنہری فضا میں غائب ہو گیا۔

نٹو فوجی کے بعد اس عہد کا سب سے مشہور شاعر ہے، آئی سے کوئی ۱۲ سال چھوٹا تھا۔ یہ دونوں بڑے دوست تھے۔ پہلے اس کا تعلق بھی دربار سے تھا لیکن پھر اسے جلا وطن کر دیا گیا۔ جلا وطنی میں اس نے درد اور شوق سے بھری ہوئی نظمیں لکھی ہیں۔ ۵۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

پچھلے ہزار سال میں بھی چینی شاعروں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں، لیکن آٹھویں صدی کی سی خوبی پھر پیدا ہوئی۔ ہندوئیں اور تیرھویں صدی میں بھی چین میں بڑا ادبی چرچا رہا۔ لیکن زیادہ تر کام نشر میں ہوا۔ آخری زمانے میں چینی شاعروں پر علمی رنگ زیادہ غالب ہو گیا لیکن اب بھی عشقیہ شاعری کے اچھے نمونے کچھ بہت کیاب نہیں ہیں۔

## نقد بر آدم

(کاتنگ - فو - سے) (۵۵۱ تا ۴۷۸ ق م)

ہر روز نئی دھوپ نکلتی ہے، ہر آن دریا کا پانی بدلتا ہے۔

مگر آدمی اسے بس ایک مرتبہ زندگی عطا ہوتی ہے۔  
نیز مڑ کر دیکھتا ہے نہ لوٹ کر آتا ہے۔

اس کی ہستی ایک جا ہے۔ ٹوٹا اور ختم ہو گیا۔

اس کی زندگی کا حاصل؟ لاچارو بے بس مٹی کا ایک

چھوٹا سا ڈھیر جس پر گھاس اگتی ہے!

خزاں کی خشکی کے بعد موسم گرما کی حدت آتی ہے۔  
برف سے ڈھکے ہوئے میدانوں پر بہار کے پھول

سیج سجاتے ہیں۔

سورج جب صبح کو سو کر اٹھتا ہے تو سرخرو۔

جب شام کو سونے جاتا ہے تو سرخرو۔

چھوٹے چھوٹے چشمے سمندر سے جالتے ہیں۔

زمانہ ہر گھڑی اپنی تجدید میں مصروف ہے۔

## دیوتاؤں کا قرض

(دی - تائی - پو) (۲۰۳ تا ۱۷۶ء)

درد کی شدت سے میں نے اپنی زمر دین بانسری کا  
سرخ آسمان کی طرف کر دیا۔

اور اپنے گیت کا تحفہ دیوتاؤں کو پیش کر دیا۔

دیوتا مسرت ہو گئے اور روشنی سے دھکتے ہوئے

دل میں درد کا ایک طوفان اٹھا،

میں نے اپنی زمر دین بانسری سے انسانوں کو

ایک گیت سنایا!

وہ ہنسنے اور کسی نے میرے دکھ کو نہ سمجھا۔



اور جب میں اپنی زمر دین بالسنری سے گاتا ہوں تو  
یہ میرا گیت سمجھتے بھی ہیں۔

بادلوں پر میرا گیت سن سن کر نہ چنے لگے۔  
اب کیا ہے، اب میں آدمیوں کا دل بہلانے کے  
لئے بھی اپنا گیت سناتا ہوں۔

## آتشزدہ مکان

(تو۔ نو) (۱۷۷۷ تا ۱۷۷۸ء)

مدفون ہے جہاں پہلے کبھی میرا مکان تھا!  
میں نے موت کی دعا مانگی۔ میرا چہرہ زرد تھا۔  
سمندر کے کنارے بس اپنے کو موجوں کے سپرد  
کرنے کے لئے تیار تھا کہ میرے پاس سے ایک ننھی  
سی کشتی گذری!  
پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کشتی نہیں، پانی میں چاند کا عکس ہے!  
لیکن نہیں، یہ ایک ننھی سی سفید کشتی ہی تھی۔  
جسے ایک عورت چلا رہی تھی!  
اے تو، اے تو، کیا قسمت تھی کہ اس وقت میری  
آنکھ نے تجھے دیکھا اس وقت اپنی زندگی کی سب سے  
پُر درد و پُر یاس گھڑی میں۔

اب میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، کہ میرے  
درد کا درماں کہاں ملے گا۔

اب میرا ایک مقصد ہے: تجھے پانا!  
اے میری بچانے والی، مجھے پناہ دینے والی!  
اب میں تیرے دل میں اپنا مکان بناؤں گا۔

”جامعہ“

میرا پارا مکان جس میں میں پیدا ہوا تھا، شعلوں  
کی نذر ہو چکا۔  
جہاں یہ مکان تھا، آج کچھ رکھ ہے کچھ کوئلے۔  
نغمین تھکا ماندہ، میں ایک سنری کشتی میں بیٹھ گیا۔  
کہ شاید دنیا کی رنگینی دیکھ کر اپنا غم غلط کر سکوں۔  
رات کا وقت تھا، میں نے اپنی بالسنری پر ایک  
گیت گایا ایسا کہ چاند تک پہنچ جائے۔  
ایک شوق و تمنا سے لبریز گیت۔  
آہ۔ میرا گیت سن کر چاند بھی غلین ہو گیا  
اور اس نے بھی اپنے بوڑھے چہرہ کو ایک بڑے سے  
بادل سے ڈھانپ لیا۔

ناچار، میں پہاڑوں کے پاس گیا۔  
ان کے پاس بھی میرے درد کا درماں نہ تھا۔  
میں نے اپنی ساری داستان ان سے کہی مگر بے کا  
اب تو میں سمجھا کہ میری خوشی، میرا چین،  
میرے بچپن کی ساری یاد، رکھ کے اس انبار میں

# مطبوعاتِ جدیدہ

## کتاب

**قرآن اور پردہ**۔ مصنف مرزا عظیم بیگ صاحب ابی لے، ایل ایل بی، علیگ۔ اس کتاب میں پردے کے مسئلہ کو اسلامی نقطہ نظر سے حل کیا گیا ہے اور استدلال صرف قرآن مجید کی آیات سے کیا گیا ہے ہاں تفسیر کے طور پر احادیث بھی شامل کی ہیں اور ان کی شرح کے لئے مسئلہ اور مستند محدثین و مفسرین کی کتب کے حوالے دیئے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس میں ثابت کیا ہے کہ پردہ ایامِ جہالت کی یادگار ہے اور اسلام پر دے کا مخالف ہے۔ پھر دکھایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرام نے پردے کی سخت مخالفت کی ہے اور مسلمانوں نے پردہ کفار سے لے لیا ہے۔ پھر ائمہ اور مفسرین کے وہ اقوال درج کئے ہیں جو پردے کی مخالفت میں ہیں۔ جو لوگ موجودہ رواجی پردے کی خرابیوں سے آگاہ ہونا چاہیں ان کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ ابتدا میں شاہ محمد سلیمان صاحب ایل ایل ڈی چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ حجم ۳۴ صفحے قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ پتہ، اظہر حسین صاحب عثمانی، آنریری سکریٹری انجمن اصلاح پردہ کھانڈیالہ جودھ پور، ریاست مارواڑ (راجپوتانہ)

**زاد البیہل**۔ محترمہ راحیل شروانیہ صاحبہ بنت حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتا ولی کا دلچسپ و سبق آموز سفر نامہ حجاز و شام و عراق ہے، جس میں جا بجا نظمیں اور سفر کے متعلق دوسرے مفید تاریخی و معاشرتی مضامین درج ہیں حجم ۳۳۸ صفحے لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ان تینوں پتوں سے مل سکتی ہے (۱) مشرف منزل علی گڑھ (۲) دفتر دہلی سب سب سوال، لاہور (۳) دفتر رسالہ ”نور جہاں“، لاہور۔

**مقالات**۔ ۴۴ صفحے کے اس رسالے میں جناب احمد الدین احمد صاحب مارہروی ایم اے کے مندرجہ ذیل پانچ محققانہ مضامین ہیں: (۱) کیا اورنگ زیب سلطنتِ غلیہ کے زوال کا باعث تھا؟ (۲) کیا فیروز تغلق غاصب تھا؟ (۳) نور جہاں اور جمائیک کے تعلقات پر ایک نظر۔ (۴) علاؤ الدین اور پرہیزی (۵) کیا محمد تغلق درحقیقت پاگل تھا؟ قیمت چھ آنے مقرر کی گئی ہے طلباء سے نصف قیمت لی جاتی ہے۔ سفیر بک ایجنسی الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

**سادھوا اور بیسوا**۔ مصنفہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ممبر سروسز انسٹاڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔ ایک دلچسپ ناول ہے جس میں دو خرافاتی بیسویں کی سرگرمیوں کی سرگرمیوں کی زبان صاف اور تھری ہے۔ انداز بیان شگفتہ ہے۔ حجم ۲۰۳ صفحے

قیمت بارہ آنے۔ انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

غلط فہمی۔ جناب بصیر ایم لے کا ڈراما ہے۔ حجم ۸۴ صفحے قیمت آٹھ آنے۔ پتہ شمس الاسلام بک فوڈ بی۔  
کشکول سخن۔ اس میں بزم ادب شملہ کے مشاعرے کی غزلیں اور نظمیں ہیں۔ شروع میں ان پر تنقید اور تبصرہ بھی کیا گیا ہے قیمت چھ آنے۔ سکرٹری بزم ادب شملہ سے منگائیے۔

انگلش ٹرانسلیشن اینڈ کمپوزیشن۔ از ایم۔ ایچ غازی صاحب۔ اس کتاب میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ کرنے کے طریقے اور صحیح اور باغیاورہ انگریزی لکھنے کے قاعدے بتائے گئے ہیں حجم ۶۶ صفحے قیمت چودہ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ جی آر دیوی چند ہندو رائیڈ سنز، بک سیلرز، پچاؤنگہ، جوں

## رسائل

”چاند“ یہ ماہوار رسالہ منشی کنیالال صاحب ایم لے، ایل ایل بی کی ادارت میں دہلی سے نکلتا شروع ہوا ہے۔ چونکہ حجم ڈیڑھ سو صفحے کے قریب ہے اس لئے مضامین میں خوب تنوع ہوتا ہے تقویریں بھی غالباً سب اردو رسالوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اپریل کے پرچے میں سترہ تصاویر ہیں۔ سالانہ چندہ آٹھ روپے مقرر ہے مئی جو رسالہ چاند، ۲۸ ایڈمنسٹریٹو، چندرلوک، الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

”ساقی“ یہ علمی ادبی رسالہ سید شاہ احمد صاحب بی لے آنرز کی ادارت میں دہلی سے نکلا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت دہلی کی ہمسائی زبان ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ادب اردو کی نشر و اشاعت میں قابل قدر خدمات انجام دے گا۔ حجم ۶۲ صفحے اور قیمت تین روپے چھ آنے سالانہ مقرر ہے۔ پتہ، مہتمم رسالہ ”ساقی“، کھاری باولی، دہلی۔  
”اعجاز“ یہ ماہوار رسالہ لسان الملک حضرت ریاض کا کلام اس کے اوراق کی زینت ہے۔ حجم ۶۴ صفحے اور سالانہ قیمت چار روپے ہے مقرر ہے۔ دفتر ”اعجاز“ بارہ بکی سے طلب کیجئے۔

”ادب“ سید اعظم حسین صاحب کی ادارت میں ہر ماہ لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں بہت اچھے ادبی تنقیدی مضامین درج ہوتے ہیں۔ زبان بھی خوب ہوتی ہے۔ حجم ۶۴ صفحے۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ ملنے کا پتہ، دفتر ”ادب“، چوراہا کھلی گنج، لکھنؤ۔  
”عورتوں کا اخبار“ یہ مہینہ وار اخبار خواجہ حسن نظامی صاحب نے ہندوستانی عورتوں کے لئے دہلی سے جاری کیا ہے۔ اس میں عوامی تائیدی اور تمدنی و معاشرتی مضامین شائع ہوتے ہیں عورتوں میں آزادی خیال پیدا کرنے کے لئے یہ اخبار ضروری نہایت ہوگا۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ پتہ، دفتر ”عورتوں کا اخبار“، دہلی۔

آج تقریباً پچاس برس کے بعد بھی وہی قد اور صورت اور اوصاف ہیں

# جویدائش کے روز تھے

آپ خیال نہ کریں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ یوم پیدائش اور آج کی صورت میں کوئی فرق کیوں نہ ہوگا۔ آپ ذرا قبل کر لیں گے۔ جام نگر کا ٹھیاواڑ میں پیدا ہوا تو تمام مذاہب و فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور معروف ہونے کے ساتھ ہر فرد بشر کی حفاظت کرنا اپنا فرض بنا لیا، خواہ مسلمان ہو یا عیسائی سنہ ۱۸۴۸ء میں ہوا چار جتنی کہ ہر انسان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا اس کا خواہش ہو۔ دو سنوں کو بہرہ اندوز کرنے میں لاثانی لیکن دشمن کو ذرا بھی اذیت نہ دینا اس کی عادت ہے، اس لئے یہ میں مقویات سترج عالم آنگ سگرہ گولیاں، اجکو نام نگر کا ٹھیاواڑ کے ویدناستری منی شنکر گووند جی نے آج سے پچاس برس قبل ایجاد کر کے نکلے پیدا کر دیا گولیاں اس طرح مقبول ہوئیں کہ ہندوستان اور ممالک غیر سے انکی ہائٹ زافونوں تی چڑ یہ گولیاں نبض بھینچنے والی داغ معدی کر دیتی خون کی خرابی اور جملہ امراض مخصوصہ کے دور کرنے میں بڑی فستح حاصل کر چکی ہیں آپ ایک نو استعمال کریں گے تو تعریف کے بغیر نہیں گئے اسی خوبیوں کے ہوتے ہیں بھی قیمت اس لئے کم کھی گئی ہے کہ ہر ایڑر سیستینہ ہو سکیں گے گولیوں کی بیا ایک روپیہ۔ پانچ روپیہ چار روپیہ۔

بال منتر گولیاں (بمذہ اطفال) بچوں کی ناساز طبیعت کے والدین کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور دھڑلے رفتی ہو جاتا ہوا سستے بیمار بچوں کو تندرست اور تندرست کو طاقتور بنانے کیلئے بال منتر گولیوں کا استعمال کر دیتے گولیاں بچوں کی جلد شکایتوں دست کا زیادہ آتاتے کا ہونا، شکم کا بڑھنا جسم کا زرد پڑ جانا طبی ہستی کاملی دہا پین وغیرہ دور ہو کر پوری صحت حاصل ہوتی ہے قیمت ۳۰ گولی کے ڈبر کی ایک روپیہ (معدر)

لے کا پتہ ویدناستری منی شنکر جی گووند رام جی جام نگر کا ٹھیاواڑ (

## مردہ عزیزوں سے

### ملاقات اور بات چیت گھر بیٹھے کر لو

یہ نوا ایجاد آلہ پیرٹس درکنگ پلانچٹ جس کے ذریعہ ہم خود کیلئے ہر ایک سوال کا جواب دے سکتے ہیں ایک امرکینی داغ کی اختراع ہوا کہ کے استعمال میں کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں۔ جوشی روح آپ چاہیں کہ میں حاضر ہو کر آپ کے سوالوں کا درست جواب دے گی معمولی لکھا پڑھا ہر عمر اور ہر مذہب کا آدمی کام لے سکتا ہے نہ کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور نہ ہی جگہ کشی کی ضرورت ہے، عالم بالا کے حالات معلوم کرنا کم شدہ کا پتہ لگانا چوری کا سرخ کھانا، دشمن سے بدلہ لینا مقدمات میں فتح پانا سخت سے سخت حاکم سے حسب نواہ کام بھلوانا اور دراز فاصلہ پر ایک سیکڑ میں خبر بھیجنا، حسب نواہ لو کر می یاروزگار حاصل کرنا۔ بدلہ فوں کی عبارت پڑھنا، مقتول صندوق یا مکان کے اندر کی اشیاء معلوم کرنا وغیرہ ہزاروں کام ہو سکتے ہیں اس نایاب چیز کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے اہلی قیمت پانچ روپیہ لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے معرہ حصول ڈاک صرف تین روپیہ آٹھ آنے لئے جا دیں گے ہدایات مفت ارسال ہوگی۔ اپنا پتہ صاف انگریزی یا اردو میں لکھیں۔

کیمیکلز سنڈ بیٹ (H) جالندھر شہر (پنجاب)

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سرس لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ باؤسیر آریل استعمال کرتی ہیں۔ یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے سنیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔



# قواعد

- ۱۔ ”ہمایوں“ بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔
- ۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔
- ۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔
- ۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کانٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔
- ۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔
- ۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم ہفتہ صفحے ماہوار اور ساڑھے نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔
- ۷۔ رسالہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۷ اسے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔  
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہ بھیجا جائے گا۔
- ۸۔ جواب طلب امور کے لئے ارکانٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔
- ۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ہفت شاہی تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ نمونہ ۶ ر۔
- ۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل تپہ تحریر کیجئے۔
- ۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر تپہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبداللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے سلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اٹھو وگرنہ شہر نہیں ہوگا پھر کبھی  
دو روز مانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بِیَاكَارِ عَلَا فِضْلِہٖ اَنْزِلَ جِسْمُ مِیَا مُحَمَّدٍ صَبَاؤُہُمْ حُبُّوہُمْ

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمَا یُون

ایڈیٹر: بشیر احمد بی. اے (اسکسن) بیرسٹریٹ لا  
جائنٹ ایڈیٹر: منصور احمد





כִּי

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	کالی گوری چڑیا (نظم)	ب	۴۸۲
۲	جہاں نما		۴۸۳
۳	نصویر: - نختا تیر انداز		
۴	آفرینش عالم	جناب مولانا محمد خالد صاحب دہلوی	۴۸۸
۵	آخری دعا (نظم)	جناب سید احمد حسین صاحب امجد	۵۰۴
۶	پھول والوں کی سیر	جناب مخترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ، دہلی	۵۰۵
۷	مشاہدات و ارادات (نظم)	جناب سید علی اختر صاحب اختر	۵۰۸
۸	مصری کورٹ شپ (افسانہ)	جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے، ایل ایل بی (علیگ)	۵۰۹
۹	غزل	جناب شام موہن لال صاحب جگر بریلوی	۵۱۸
۱۰	میزبان نوازی	جناب سید شاہد حسین صاحب	۵۱۹
۱۱	ہندی جذبات (نظم)	حضرت ہدیت اجتہادی	۵۲۷
۱۲	سیاہ نقاب (افسانہ)	جناب فادرم حسین صاحب بٹالوی	۵۲۸
۱۳	تجلیات (نظم)	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال انصہ بانی ایم اے کوئل سیالکوٹ	۵۳۸
۱۴	کشت لالہ و گل (نظم)	جناب سراج الدین صاحب ظفر	۵۳۹
۱۵	کولیس سے پہلے امریکہ میں عربیت	جناب مولوی بدر الدین صاحب بدر اصلاحی	۵۴۱
۱۶	مسلم خاتون کی حالت زار (نظم)	جناب مخترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ	۵۴۲
۱۷	مہماں نوازی	جناب پنڈت شو زان صاحب شمیم، ایڈووکیٹ لاہور	۵۴۳
۱۸	غزلیات	جناب آتی گوکھروی، جناب تیار دہلوی مخترمہ بی بی صدیقہ صاحبہ	۵۴۴
۱۹	محفل ادب		۵۴۵
۲۰	نئی کتابیں		۵۵۰

# کالی گوری چڑیا

آنا جانا تیرا تانا بانا تیرا  
 اس جا اُس جا کس جا تو تھی دیکھا جس جا  
 اونچے اُڑ کر پھرنا نیچے مڑ کر گرنا  
 ننھی مُنی چنچل واہری تیری چھل بل  
 کالی گوری چڑیا  
 پیاری موری چڑیا

کالی گوری چڑیا  
 پیاری موری چڑیا  
 پھر کر گلشن گلشن بھایا تجھ کو "اُرجن"  
 چپا چرب چکی چپا تجھ سے مکی  
 کالی گوری چڑیا  
 پیاری موری چڑیا

پیاری موری چڑیا کالی گوری چڑیا  
 جگ کارہنہ سنا دو دن کا ہے گنا  
 جینا کوئی دم ہے فرصت تجھ کو کم ہے  
 کرنا ہے جو کر لے دامن اپنا بھر لے  
 لے چل کلیاں چُن کر گانا گا سر دھن کر  
 اپنی دھن میں گالے  
 حق کو کھو کر پالے

اُڑتی اُڑتی مڑ کر مڑتی مڑتی اُڑ کر  
 پھولوں میں تو آئی پتوں پر تو چھائی  
 ٹہنی ٹہنی کودی ٹہنی ٹہنی اُچھلی  
 ٹہنی ٹہنی کھیلی ٹہنی ٹہنی ناچی  
 کالی گوری چڑیا  
 پیاری موری چڑیا

# جہاں نما

## اشتراکیت اور مذہب کی جنگ

”مذہب انسان کے لئے بمنزلہ افیون کے ہے۔ یہ وہ فقرہ ہے جو نہایت کثرت کے ساتھ سوویٹ روس کی سرکاری عمارات پر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ روس میں اس قول کو لینن سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ قول کارل ماکس کا ہے، لینن نے اس کی دوسری بہت سی تعلیمات کی طرح اسے بھی اپنے عقائد میں شامل کر لیا۔ اس مضمون میں جہاں سے یہ فقرہ اخذ کیا گیا ہے ماکس یہ بھی کہتا ہے کہ اس تمدن و معاشرت کو مٹا ڈالو جس کی روحانی نمک مذہب ہے، مذہب خود مٹ جائے گا۔۔۔۔۔ مذہب وہ پھول ہے جو زنجیروں کو چھپائے ہوئے ہے، پھولوں کو مسل کر پھینک دو، زنجیریں ظاہر ہو جائیں گی!“

ڈاکٹر جان ڈیوئی نے جو کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر اور امریکہ کے ایک بہت بڑے مفکر میں اشتراکیت پر ایک مذہب کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ انہوں نے کوئی ایک پہلو اختیار نہیں کیا بلکہ ایک فلسفی کی طرح ممکن الحصول شہادتوں سے نتیجہ نکالا ہے کہ اشتراکیت اور مسیحیت کیوں برسرِ جنگ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

”اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ماکس کی ان سطروں میں دو خیال ادا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ معاشی سیاسی نظام کی تخریب یقیناً مذہب کے زوال کا باعث ہوگی۔ اور دوسرا خیال یہ ہے کہ خود مذہب کی تخریب کا نتیجہ یہ ہو گا کہ موجودہ نظام کی ”زنجیریں“ نمایاں ہو جائیں گی، اور اس سے ایک نیا نظام معرض وجود میں آجائے گا۔ روس اس دونوں قسم کی تخریب میں بڑی شدت سے مصروف ہے۔

”ایک طرف تو روسی اس عقیدے پر عمل پیرا ہیں کہ ایک اشتراکی تمدن کی تخلیق خود بخود مذہبی عقیدوں اور رتنوں کا شیرازہ بکھیر دے گی اور ان قوتوں کو جو بالشویکی نقطہ نظر سے فوق فطرتی اور غیر معاشرتی جادوں پر پڑ کر سیدھی راہ سے بھٹک گئی ہیں ایک صحیح معاشرتی اور انسانی راہ پر لا ڈالے گی۔ دوسری طرف لینن نے محسوس کیا اور بلاشبہ اپنے مقاصد کے پیش نظر صحیح محسوس کیا کہ موجودہ مذہب نئے نظام کا جس کی وہ طرح ڈال رہا تھا ایک رقیب ہے۔

”سابق معاشی حکومت اور سیاسی زاریت کا مذہب کے ساتھ ایسا قریب کا رشتہ تھا کہ لینن کی تنہا ویرکے پورا ہونے کے لئے اس کا وجود ایک بڑا خطرہ تھا۔ خیال کے ان دونوں پہلوؤں کا خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکیت

خود ایک مذہب بن گئی ہے جو کسی دوسرے رقیب مذہب کو برداشت نہیں کر سکتی اور اشتراکیوں کو کسی ادارتی مذہب کا اپنے پیروں کے معاشرتی معاملات میں حکومت جتنا نا ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے اُن کے مقابلے میں ایک اور سیاسی نظام تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جب میں اشتراکیت کی مذہبیت کا ذکر کرتا ہوں تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پیروں میں اس کی نسبت وہی جذبہ اور جوش جاری و ساری ہے جو ایک مذہب کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اشتراکیت ذہنی طور پر بھی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ کوئی خیال کوئی عمل ایسا نہیں جس پر اس کا اثر نہ ہو جس طرح ایک مذہب کے مقررہ اور معینہ اصول و عقائد ہوتے ہیں اسی طرح اس کے بھی اصول و عقائد ہیں۔ جو شخص اسے خاص سیاسی طاقت کا ایک دباؤ سمجھتا ہے وہ کبھی اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکے گا۔ اس کے حقیقی معنی سمجھنے کے لئے ہمیں اس کو اُن مذاہب کی صف میں کھڑا کرنا پڑے گا جن کی حریفانہ کش مکش نے انہیں تاریخ میں نمایاں جگہ دی ہے۔

موجودہ روس کے حاکموں نے کبھی اپنی مذہب دشمنی کو جس کی بنیاد خدا کا انکار ہے نہیں چھپایا، نہ انہوں نے اُن ذرائع کو پوشیدہ رکھا ہے جنہیں وہ خدا اور تمام فوق انسانی طاقتوں کے عقیدے کو بیخ و بن سوا کھاؤ میں استعمال کر رہے ہیں، مثلاً مدارس، مطابع، انصاویر وغیرہ۔

”یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ سائنس اور مذہب کی جنگ ضروری ہے اور مذہب کی فتح اُسی وقت ہو سکتی ہے جب جہالت، سادہ لوحی اور اسی قسم کی دوسری معاشرتی کمیاں قوم پر مسلط ہوں ہر قسم کے تشبیلی ذرائع کام میں لائے جاتے ہیں۔ اپنے مخصوص سیاسی مقصد کے قطع نظر اس میں شک نہیں کہ روس کے حاکم روسی کسانوں کی پستی کے لئے یونانی کلیسا کو ذمہ وار گردانتے ہیں، اور روس میں کسانوں کا طبقہ ہی ایک ایسا طبقہ ہے جو وہاں کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔“

”اشتراکیوں کو معلوم ہو گیا ہے یا وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ مذہبی عقیدہ جب وہ اشتراکی گروہ کے کسی رکن میں پایا جائے تو ایک ٹی رکاوٹ ہوتا ہے، جو مذہب اشتراکیت کی تبلیغ میں اُن کی کوششوں کو پوری شدت سے عمل میں نہیں آنے دیتا۔ ایسے لوگوں کو بے دریغ گروہ میں سے محال دیا جاتا ہے۔ ذاتی اور غیر ادارتی مذہب کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ روس کی تعمیر کے عظیم کام سے لوگوں کے خیال اور عمل کا رخ موڑ لیتا ہے۔“

”لینن کی اپنی شخصیت اور تعلیمات بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اُس کے نزدیک منطقی مادیت کا



## ترکی میں گراں بہا کتب کا ذخیرہ

امید کی جاتی ہے کہ قسطنطنیہ کی وہ گراں بہا قلمی کتب جو آج کل بشر کی ہمیں یا ہمیں سے بھی زائد مساجد میں منتشر ہیں۔ مسجد سلطان احمد میں ایک لائبریری کی صورت میں جمع کر دی جائیں گی۔ ہر سال تمام اطرافِ عالم سے شائقینِ علم فتوحاتِ ترکی کے ان ثمرات سے استفادہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ان کتب کا مطالعہ صرف مساجد کی چھوٹی سی لائبریری میں کیا جاسکتا ہے جس کا منتظم مسجد کا امام ہوتا ہے۔ ان علمی ذخائر کا کچھ حصہ سلطنتِ ترکیہ کے فیاض امرانے ان مساجد کو عطا کیا تھا، کچھ شاہی محلات سے لیا گیا اور کچھ ترکی کی فتح مند افواج نے بغداد، دمشق، قاہرہ اور تبریز کی لائبریریوں سے مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کیا تھا۔ ہر کتاب ایک شاہکار ہے جسے کسی پیشہ ور خطاط نے کسی امیر کے لئے یا خود مصنف کے لئے لکھا ہے۔ ہر کتاب کے معنی کا نام کتاب پر درج ہے اور اس طرح خود کتابیں اپنی تاریخ بتا رہی ہیں۔ ان کتب کے نقل کرنے والے بھی امراتھے جن کی سرپرستی سلطان یا امیر کرتے تھے۔ قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں کتابیں عاریتہ دینے کا رواج نہیں ہے، کیونکہ بیشتر کتب اس قدر قیمتی ہیں کہ ان کا عجائب خانے کی نادرات کی طرح محفوظ رہنا ہی بہتر ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ منتظم کو ہلکا پھسلا کر رات کی رات کے لئے کتاب عاریتہ لی گئی اور جب واپس کی گئی تو منتظم نے بظاہر کوئی تبدیلی نہ پا کر کتاب رکھ لی، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ کتاب کے کئی اوراق اڑا لئے گئے ہیں اور ان کی بجائے نہایت چالاک سے مصنوعی اوراق لگا دیئے گئے ہیں اور اس طرح صنّاعی کے کئی بیش قیمت نمونے ضائع ہو گئے۔ چنانچہ یوسٹن کے عجائب خانے میں ایک ورق موجود ہے جو آج سے پچیس سال قبل تیرھویں صدی کی ایک صنعتی کتاب میں سے چڑایا گیا تھا۔ ان کتب کی مکمل فہرست صرف انگلورہ میں موجود ہے جسے حکومت نے مرتب کرایا ہے کیونکہ اب تمام کتب خانے تعلیمی وزارت کی تحویل میں ہیں۔ یہ فہرست بھی کتب خانوں کی فہرست کے اصول پر نہیں ہے کیونکہ اس میں بلا لحاظ ان کے نفسِ مضمون کے صرف کتابوں کے نام درج ہیں۔

ترکی کی تمام کتابیں بہت قدیم ہیں اور ان میں سے اکثر ایسی ہیں جن کی دوسری کاپی کیسے بھی موجود نہیں۔ ان میں جغرافیہ، نجوم، ہیئت، قانون، حکمت، مذہب اور مذہبی شاعری کی کتابیں ہیں۔ بعض ممتاز افراد کے خطوط کے مجموعے بھی ہیں۔

ان میں طبی کتب بھی ہیں جنہیں کافی اہمیت دی جاسکتی ہے طبی کتب میں پودوں اور بوٹیوں کی تصویریں دی گئی ہیں۔ بعض میں جسمِ انسانی کے خاکے ہیں جن میں دورانِ خون دکھایا گیا ہے۔ ان کتب کی تصنیف کے

وقت میسوپوٹیمیا میں سائنس نے یورپ کی بہ نسبت کافی ترقی کر لی تھی۔ یہ لوگ اُن دنوں نہایت کامیابی سے عملِ جراحی کر لیا کرتے تھے جب کہ شمالی ممالک میں ابھی اس کی ابتدا بھی نہ ہوئی تھی۔

دماغی مریضوں کے علاج میں مسلمانوں نے ہی سبقت کی۔ شمالی علاقے میں ایسے مریضوں کو مغضوب و غضب آئی سمجھا جاتا تھا حالانکہ اسلامی ممالک میں ایسے مریضوں کے ہسپتال موجود تھے اور موسیقی کے ذریعہ سے اُن کا کامیاب علاج کیا جاتا تھا۔

ابتدائی زمانے میں ترکی میں جغرافیہ دانوں کی بھی کمی نہ تھی۔ دنیا کا سب سے پہلا نقشہ ایک عرب ادیبی نامی نے ۱۲۷۱ھ میں تیار کیا تھا۔ یہ نقشہ ایک چاندی کی چوکی پر ایک نارمن بادشاہ کے لئے بنایا گیا تھا جس نے عربوں سے سسلی کو فتح کیا تھا۔ اس بادشاہ کے دربار میں کچھ عرب تھے جنہیں اُس نے اس کام کے لئے روپیہ اور سامان مہیا کیا تھا۔ ادیبی نے اپنے کام کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی جس میں زمین کو چھٹا اور سمندر کو اُس کے اطراف پر محیط بتایا ہے۔ قسطنطنیہ کی کتب میں ادیبی کی اس کتاب کے چند نسخے موجود ہیں۔

ایک اور مشہور ترک جغرافیہ دان نے ساتویں صدی میں اپنی سیاحتِ یورپ کے متعلق ایک کتاب بارہ جلدوں میں لکھی۔ چند سال ہوئے ہیر نامی ایک جرمن نے اس کی پہلی جلد کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ یہ نہایت حیرت انگیز کتاب سمجھی جاتی ہے۔

مختلف سلاطین کے تین نادرِ روزگار کتب خانے ٹاپ کیپو کے محل میں جمع کئے گئے ہیں۔ کلہز محل کا کتب خانہ استنبول کی یونیورسٹی لائبریری کو دے دیا گیا ہے۔ یہ ذخیرہ نہایت اہم ہے۔ گزشتہ پانچ سال کے عرصہ میں درویشوں کی خانقاہوں میں سے قریباً دس کتب خانے مسجدِ سلیمانہ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ عجائب خانہ ابوگاگ کا کتب خانہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے جہاں کے ابھرے ہوئے طلاکار کام کو دیکھ کر بڑے بڑے گھاگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

بعض حلقوں میں افواہ ہے کہ حکومت ان ذخائر کو انگورہ میں منتقل کرنے والی ہے لیکن بیرونی مستشرقین چاہتے ہیں کہ انہیں موجودہ جگہ پر ہی رہنے دیا جائے۔ ان مسجدی کتب خانوں نے علومِ قدیمہ کے دلدادوں کو اس قدر مسحور کر رکھا ہے کہ اکثر نے مستقل طور پر استنبول میں اقامت اختیار کر لی ہے اور اپنی بقایا زندگی وہیں گزارنے کا نتیجہ کر لیا ہے۔



# آفرینش عالم

## بقول اہل بابل

ہر بچے کی زندگی میں ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ وہ نہ صرف دنیا بلکہ کل کائنات کے وجود پر نظر ڈال کر متحیر ہوتا ہے اور پریشان ہو کر سوال کرتا ہے کہ اس کائنات کا صانع کون ہے؟ آخر آسمان، زمین، سورج، چاند اور ستاروں کا بنانے والا کون ہے؟ سمندر، پہاڑ، درخت، پھول وغیرہ عالم وجود میں کس طرح آئے؟ اُس کے بزرگ جواب دیتے ہیں کہ قادرِ مطلق ان کا صانع ہے اور اُس کے ہی حکم سے کل کائنات عالمِ حقیقی میں آئی۔ اس کے بعد جب بچہ دوسرا سوال کرتا ہے کہ کس طرح خالق ان کو عالمِ ہستی میں لایا تو اس کے جواب میں پیدائشِ عالم کی مختصر کیفیت بیان کی جاتی ہے اور ساتھ ہی سمجھا دیا جاتا ہے کہ اس کے سمجھنے کے واسطے ایک زمانہ درکار ہے اور مختلف علوم پر کافی عبور ہونا لازمی ہے۔

الغرض اسی قسم کے سوال و جواب بہ خورد و بزرگ ہر زمانہ میں کرتے چلے آئے ہیں اور ہر قوم اور ہر فرقہ نے اپنی قابلیت اور مبلغِ علم کے موافق اُن کے جواب دیے ہیں جن کا انفسِ مطلب قریب قریب ایک ہی ہے۔ اس مسئلہ پر سب متفق ہیں کہ صانعِ عالم، موجدِ قانونِ قدرت اور ہستی سے ہستی میں لانے والی کوئی بڑی برکتِ قوت ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ جذائبِ ترقی کر کے طبقہ اعلیٰ پہنچنے میں وہ اس قوت کو خالق اور قادرِ مطلق وحدہ لا شریک کہتے ہیں اور جو مذاہبِ جہالت کی تاریکی سے باہر نہیں ہوئے اور جنہوں نے رسالت کی روشنی سے نفع نہیں اٹھایا انہوں نے اس قوت کو مختلف خداؤں پر تقسیم اور دنیا اور کائنات کے وجود کو ان کی متفقہ قوتوں پر مبنی کیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو مختلف خداؤں کے کارناموں کے قصص اور افسانوں کا آغاز ان ہی عقائد کی بنا پر ہے اور ہر فرقہ و ملت نے اپنی فکر و مبلغِ علم کے موافق پیدائشِ عالم کے واقعات بیان کئے ہیں۔

اہلِ بابل کا اعتقاد آفرینشِ عالم کے متعلق عجب دلچسپ گولامینی ہے بہر حال اختصار کو مد نظر رکھ کر یہ مختصر نظر ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ملکِ بابل کے قدیم شہروں سے جو کتابے برآمد ہوئے ہیں اُن کی قدامت پر سب متفق

ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے اساتذہ کی کوشش سے شہر نیٹ، اگید، سپر، کوٹہا وغیرہ کے آثارِ قدیم سے علاوہ دیگر عجائبات کے نہایت قدیم زمانہ کے ہزار ہا کتابے برآمد ہوئے ہیں۔ بعض قدیم ترکتابوں کی نقول ہیں اور بعض ان میں سے چار ہزار سال قبل مسیح کے سمجھے جاتے ہیں۔

قدیم کتابے دستیاب ہونے سے پہلے بابل اور اہل بابل کے متعلق جو کچھ ہم کو علم تھا وہ پروسس بابلی پوجاری مندر بعل کی بدولت تھاتین سو برس قبل مسیح اس شخص نے مشرح تاریخ ملک بابل من ابتدائے آفریش تافع سکندر اعظم زبان یونانی میں تصنیف کر کے سکندر اعظم کی نذر کی تھی۔ افسوس ہے کہ تاریخ مذکور نابود ہو گئی۔ دیگر یونانی مصنفوں نے جن کے زمانہ تک اس تاریخ کا وجود تھا اپنی تصانیف میں اس کے حوالے دیئے ہیں۔

الگزینڈر پالی ہسٹرنے بحوالہ بروکس آفریش عالم کا حال قلمبند کیا ہے جس کی نقل یوسی میں نے اپنی کتاب کرونی کان کی پہلی جلد میں کی ہے۔ فی زمانہ بروکس کی تاریخ بابل کی چنداں پروا نہیں رہی کیونکہ مالک بابل اور اسیر باکے آثارِ قدیم سے ہزار ہا کتابے برآمد ہو کر لندن، پیرس امریکہ اور قسطنطنیہ پہنچ گئے ہیں نیز اہل بابل اور اولاد اشرد اسیرین اکی زبانوں پر کافی عبور ہو جانے سے قدیم حالاتِ بابل پر کافی روشنی پڑ گئی ہے۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے وسط میں شہر نہوہ میں آفریش عالم کا منظوم قصہ محفوظ تھا۔ بارہ باب پراس کو منقسم کیا گیا تھا۔ ہر باب ایک خشت سے متعلق تھا گویا بارہ باب بارہ اینٹوں پر کندہ تھے۔ کامل نظم ای نوما ایلش کے نام سے مشہور تھی۔ افسوس ہے کہ نظم مذکور کے بیت کے بیت اور مصرعے کے مصرعے، کتبوں کے شکست ہو جانے سے فنا ہو گئے تاہم دیگر کتابوں کی امداد سے قصہ کا سلسلہ ملتا ہے اور بروکس بابلی کے اقوال کی تائید ہوتی ہے۔

## آفریش عالم موافق اعتقادِ اولادِ سام

آفریش کے متعلق اولادِ سام کا عقیدہ ذیل کے مضمون سے جو حقیقتاً مختلف کتبوں کا ترجمہ ہے ظاہر ہوگا۔ ان کے اعتقاد کے موافق ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ آسمان و زمین ہستی میں آئے نہ تھے اور سوائے اپسود بھر، پیدا

۱۔ نہ پیر کو اب نذر کہتے ہیں۔

۲۔ اگید کو اب ابوبتا کہتے ہیں۔

۳۔ پراور اگید ایک ہی شہر کے دو حصے ہیں۔

۴۔ کوتا کو اب تل ابراہیم کہتے ہیں۔

کرنے والا ہرشے کا) اور تیامت دسمندر موجزن جس سے ہرشے پیدا ہوئی کسی چیز کا وجود نہ تھا۔ صرف انہی دونوں کی موجیں آپس میں مل کر ایک جان ہوتی تھیں۔ اُس وقت نہ زمین کا نشان نہ دلدل کا وجود اور نہ آسمان کا پتہ تھا۔ جتنی کہ دیوتا بھی پیدا نہیں ہوئے تھے نہ لوح محفوظ مرتب ہوئی تھی اور نہ مستقبل کا کچھ فیصلہ ہوا تھا۔ اس سبب یا ہیئتِ اولیٰ کے بعد جبیل القدر خداؤں کا وجود ہوا اور سب سے پہلے دو دیوتا عالمِ ہستی میں آئے جو لمحو اور لمحو کے ناموں سے منسوب ہوئے۔ پھر مدتِ مدید کے بعد انشار اور کشار کا وجود ہوا۔ ایک زمانہ کثیر کے بعد ان کی تین اولادیں ہوئیں۔ انو۔ انیل۔ نیا۔

نیا اور اس کی زوجہ دام کنیا سے بل مروح پیدا ہوا اور اُس کو صلنغ عالم و خلاق کہا گیا۔ بعد ازاں نو دم کا وجود ہوا جو مالک و حاکم تحت الشریٰ سمجھا گیا۔

ہر خدا نے اپنی ذاتِ پاک یا نفسِ قدسی یا جوہر سے ایک دیوی وضع کر کے اپنی زوجیت میں لی اور ان سے دیگر دیوتا مثلاً بن (قمر شمس آفتاب) رم من (ہوا) پیدا ہوئے۔ اس روز افزوں نسل سے تیامت کی حکومت صرف محدود ہی نہیں ہوئی بلکہ اُس کے مدعا کے خلاف اُس کی اولاد نے عالم کو قبضہ میں لاکر باقاعدہ کرنا چاہا۔ اس سو و ادبی کو دیکھ کر اپسو نے رگایا۔ اپنے خلف الرشید و شیر مو سے کہا کہ اے میرے محنت جگر میرے ہمراہ تیامت کے حضور میں حاضر ہو کر مخمو اور لمخمو کی اولاد کے ارادوں سے جو ندائے افلاک بن بیٹھے ہیں مطلع کر۔ چنانچہ دونوں حاضر ہو کر سر بسجود ہوئے اور اپسو نے عرض کیا کہ اے قادیر علی الماطلاق، ملا اعلیٰ کے ارادوں کی جب سے مجھے اطلاع ہوئی ہے شب کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا ہے۔ میں نے نپتہ کر لیا ہے کہ رخنہ اندازی کر کے ملا اعلیٰ کے منسوبوں کو تباہ اور آفت و مصیبت نازل کر کے پریشان و سرگرداں کر دوں گا۔

۱۰ انشار۔ بمعنی ساکنِ عرش۔

۱۱ کشار۔ بمعنی ساکنِ زمین۔

۱۲ انو۔ خدائے افلاک۔

۱۳ انیل کو ایل لا اور انیل بل بھی کہتے تھے اور وہ تمام خوبیوں کا خدا سمجھا جاتا تھا۔

۱۴ نیا کو آ بھی کہتے تھے اور وہ عقل و فہم کا خدا تصور ہوتا تھا نیز بانی کا خدا سمجھا جاتا تھا۔

۱۵ انو کی زوجہ انات۔ بل کی تعبیر۔ نیا کی دام کنیا۔

۱۶ یہ سب مرتبہ میں برابر تھے۔ ان کے بعد خود سیائے یا ملائک سیارگان کا شمار تھا۔

نیامت اس خبر بد کو سن کر غرائے اور تباہ کن طوفان اٹھانے لگی اور غصہ میں کو سنا شروع کیا۔ بعد ازاں اپسو سے دریافت کیا کہ ایسی کون سی تدبیر عمل میں لائی جائے جو جلیل القدر خداؤں کو ان کے ارادوں سے باز رکھے اور ہم بلا کسی مداخلت کے زندگی بسر کرتے رہیں۔ فتنہ انگیز مٹو بولا کہ گو ملاءِ اعلیٰ جلیل القدر اور ان کے ارادے بلند ہیں تاہم آپ ان کو زیر اور ان کے عزم کو پست کر سکتی ہیں۔ مٹو کی رائے سن کر اپسو شاد شاد ہوا لیکن خداؤں کے عزم کے خیال سے لرزاں تھا۔

یہاں خدا نے جو دانا و بینا ہے نیامت وغیرہ کے مشورہ سے واقف ہو کر منتر پڑھا جس کے اثر سے اپسو اور مٹو سحر یا مقید ہو گئے۔ کنگو نے جو آخر الذکر کا ہم خیال تھا نیامت سے عرض کیا کہ اپسو اور مٹو کے مفتوح ہو جانے سے ہم سب نہایت بے چین ہیں۔ اے قمار ان کا بدلہ لے۔ نیامت نے جواب دیا کہ اے میرے حامی تو بھروسہ کے قابل ہے اعلانِ جنگ کر۔ اولو العزم خداؤں کے معزول کرنے کی فکر میں بڑے پیمانہ پر انتظام شروع ہوا غضب و قہر کا دریا جوش میں آیا۔ قوتِ اسفل نے ہجوم کیا اور نیامت نے (جس کو اس موقع پر ام خوب یعنی مادرِ خوب سے خطاب کیا ہے) عجائب الخلق مخلوق پیدا کر کے خوفناک اسلحہ سے مسلح کیا۔ اور اس جبار لشکر کو کنگو کے زیرِ حکومت کر کے لوحِ محفوظ حوالے کی۔

انشار، نیامت اور اس کے تابعین کی سازش اور افلاک کے خداؤں کو تباہ کرنے کے ارادہ سے مطلع ہو کر نہایت چراغ پا ہوا۔ اپنے وزیر گاکا کو یاد کر کے فرمایا ”اے میرے روح افزا ذریعہ میرے والدین کی خدمت میں حاضر ہو کر میری طرف سے عرض کر کہ خداوند کے صاحبزادہ انشار نے بندہ کو خداوند کی حضور میں بھیج کر گزارش کیا ہے کہ ما نیامت ہم سے بلا وجہ ناراض ہو کر شب و روز غصہ میں پیچ و تاب کھاتی ہے۔ تمام دیوتا ہاں اس کے معاون و مددگار ہو گئے ہیں حتیٰ کہ وہ بھی جن کو خداوند نے پیدا کیا تھا۔ وہ برہمی و آشفتگی کی وجہ سے شب و روز ہم کو گزند و مضرت پہنچانے کی تدبیروں میں منہمک اور دل کا بخار بھانسنے کی فکر میں ہیں۔ نہایت جوش و خروش سے جنگ کی تیاری کی ہے اور لشکر جمع کر کے برسرِ پر خاش ہیں۔ اما خبر (نیامت) نے عجیب الخلق اور انواع و اقسام کی خوفناک مخلوق کو پیدا کر کے کاری اسلحہ سے مسلح کیا ہے مثلاً مارہمیت عفاریت کو تیز دانتوں اور بڑے بڑے ناخنوں سے مسلح کر کے بجائے خون کے ان کے جسم میں زہر بھرا ہے۔ عفریت جسم برق دم اڑوے جن کے پھونکاروں سے آگ کے شعلے بھٹکتے ہیں، غضب ناک کتے، کڑو دم نما اور ماہی صورت حیوان ہلڈ جیسے مانس (یعنی جسم ثور کا اور سر انسان کا) نیز ایسی مخلوق جس کا جسم گھوڑے کا اور ٹھونھنی بکتہ کی خشم ناک کتے

جن کے چار جسم آپس میں ملے ہوئے اور دم ایک وہ بھی پھیلی جیسی بعض کا جسم انسان کا اور منہ عقاب اور شکرے کی مثال، بعض کے دو منہ اور چار پیر ہیں، بعض کی ٹانگیں اور سینگ بکرے کے اور چہرہ آدمی کا سا اور بعض کا نیچے کا دھڑ گھوڑے کا اور اوپر کا جسم انسان کی طرح۔ قصہ مختصر ایسے گیارہ عفریت پیکر رکشس پیدا کئے ہیں اور جاہ و جلال عطا فرما کر فلک پر چڑھایا ہے۔ ان کی صورت دیکھتے ہی ہر تنفس کا دل دہل جاتا ہے آندھی اور طوفان کو وجود میں لا کر حشر بپا کیا ہے۔ کسی میں تاب مقاومت اور نافرمانی کی مجال نہیں ہے۔ کنگو کو اس ہیبت ناک اور جوار لشکر کی سپہ سالاری سے سرفراز فرما کر ہدایت کی ہے کہ کوچ کے وقت لشکر کے پیش پیش چل کر رہنمائی کرے۔ نواختنِ طبلِ جنگ کا حکم دے۔ سپاہ کا پر اباندہ کر اور صفیں آراستہ کر کے دشمن پر حملہ آور ہو نیز جنگ و پیکار میں شیرانِ اوژن و سپاہِ جنگجو کے شیرازہ کو منتشر نہ ہونے دے۔ نہایت گراں بہا پوشاک پہنا کر کنگو کو دیوتاؤں کی مجلس میں مسند نشین کیا اور منتر پڑھ کر فرمایا کہ تجھ کو ہم نے ربوبیت کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا کر تمام دیوتاؤں کو تیرے تابع فرمان کیا ہے۔ اے میرے پسندیدہ شوہر میری خواہش ہے کہ تیرا عروج، افتخار اور بول بالا ہمیشہ ہے لوحِ محفوظ حوالے کر کے فرمایا کہ تیری عدول علمی کی کسی کو مجال نہیں ہوگی۔ زبان سے لفظ نکلتے ہی تعمیل ہوگی۔ تیری صرف اب کشتائی سے آگ کا دیوتا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جس کو اپنی قدرت اور قوت پر زعم ہو وہ تجھ سے نبرد آزما ہو کر تماشا دیکھے۔ چنانچہ کنگو نے فلک پر پہنچ کر انو خدا کی قدرت حاصل کی اور نیاست نژاد دیوتاؤں کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگا ہے۔ تیامت اور اُس کے تابعین کی غذاری اور دغا بازی کا علم ہوتے ہی میں نے اپنے بہادر لڑکے انو کو اڑ دے کے پاس (تیامت نے خود اڑ دے کی صورت اختیار کر لی تھی) بھیجا تھا تاکہ سمجھا بھجا کر اُس کا غصہ فرو کرے اور صلح و آشتی سے اگر کام نکل آئے تو فہما در نہ بنفس نفیس مقابلہ کر کے زیر کرے لیکن جونہی اڑ دے پر آؤ کی نظر پڑی اور اُس نے پھینکاروں اور غزلنے کی آواز سنی بدحواس ہو کر باقاعدہ واپسی کو مقابلہ پر ترجیح دی۔ اُس کے بعد تو دم بد کو تجویز کیا گیا مگر وہ بھی اس ہولناک صورت کو دیکھتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ آخر کار مروخ نے تیامت کے زیر کرنے اور ہم سب خداؤں کو پناہ دینے پر کمر بستہ باندھی ہے۔ بشرطیکہ اس کی مندر بزیل معروضات کو قبولیت کا شرف بخشا جائے!

- (۱) سب جلیل القدر خدا مقامِ آپ شک کن نا کو (مقامِ کرسی) میں جمع ہوں،
- (۲) جلیل القدر خداؤں کی مجلس میں اس کو صدر نشین کر کے اعزاز کا اعلان کیا جائے،
- (۳) مستقل حکومت سے سرفراز فرمایا جائے،

(۴) مثل ہمارے وہ فہمستوں کا فیصلہ کرے،

(۵) اُس کے ہر فعل کو دوام حاصل ہو،

(۶) کن فیکون کی قدرت عطا ہو،

(۷) اُس کے احکام میں کوئی تغیر یا مداخلت نہ کی جائے۔

اے میرے وزیر گاکا جلد میرے والدین کی خدمت میں حاضر ہو کر میرا پیغام پہنچا اور دست بستہ عرض کر کہ قضا و قدر کی قدرت خداوند ہی کو حاصل ہے شفقت بزرگانہ سے جلد مروج کی معروضات کو منظور فرمایا جائے تاکہ وہ ہمارے دشمنوں کا مقابلہ شیر دل ہو کر کر سکے۔

گاکا لٹھو اور لٹھو کی حضور میں پہنچ کر آداب بجالایا۔ آستاناں بوس ہو کر دست بستہ کھڑا ہوا اور انشار کا پیغام نہایت مودبانہ پہنچایا۔ (تیا مت کی غذارمی اور جنگ کی تیاری کا حال بیان کیا) دونوں نے بخور سنا ایجکی (ملائک) اس واقعہ کو سن کر اشکبار کہتے تھے کہ آخر کس وجہ سے اس قدر خشونت پیدا ہو گئی۔ تیا مت کی حرکت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اس ولے ویلا کے بعد تمام جلیل القدر خدا جو فہمستوں کا فیصلہ کرنے والے تھے جمع ہو کر روانہ ہوئے اور یہ حجم بغیر انشار کے پاس پہنچا۔ اُس کی اقامت گاہ خداؤں سے بھر گئی۔ دعوت کی تیاری کی گئی۔ دسترخوان بچھا۔ خاصہ چنا گیا۔ خداؤں نے نان خطائی تناول کی اور خنک شہد کا شربت نوش فرمایا۔ شراب کبجہ کا دور چلا۔ آنکھوں میں سرسوں پھولی۔ اپنے آپے کا ہوش نہ رہا۔ ہاتھ پاؤں نے جواب دیا لیکن ہمت بلند ہو گئی اور انتقام لینے والے مروج کی شہمت کا فیصلہ کیا۔ مروج کے واسطے قصر شاہی تیار کر کے اُسے مشیر خاص کی جگہ بٹھایا اور مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے مروج تو تمام جلیل القدر خداؤں کا سردار ہے اور تیری قسمت لاشافی ہے۔ تیرا کلمہ وہی قوت رکھتا ہے جو انوکا۔ آج سے تیرا حکم رائیگاں نہیں جائے گا۔ عزت و ذلت دینا تیری قدرت میں ہے تیرے منہ سے نکلی بات کو استحکام دوامی ہوگا۔ تیری حکم عدولی کی کسی کو مجال نہیں ہوگی۔ کوئی خدا تیری قلمرو میں مداخلت نہیں کرے گا۔ نذر انوں کی افراط جو خداؤں کی دلی تمنا ہے تیری پناہ گاہ (مند رہیں ہوگی خواہ کتنی ہی قلت دیگر خداؤں کے مناد میں ہو۔ اے مروج تو منتقم حقیقی ہے۔ ہم نکل کائنات کی حکومت تیری نفوذ میں دیتے ہیں۔ تو عظمت و جلال سے دربار کرتیرا حکم بالاتر ہوگا۔ تیرے اسلمہ ہمیشہ کاری اور دشمن کو زیر کرنے والے ہوں گے۔ اے شاہنشاہ اُس کو تو اپنی پناہ میں لے جو تیرا معتقد ہو اور اُس خدا کو جس نے عذر کیا ہے نیست و نابود کر دے۔ اے نگہبان ہماری دلی خواہش ہے

کہ نیز مرتبہ سب خداؤں سے افضل اور بالاتر ہو۔ بہت و نیست کی طاقت اور کن فیکن کی قدرت کچھ کو عطا کی جاتی ہے اس کا ثبوت اس پوشاک پر کر جو تیرے سامنے ہے۔ تیرے حکم کے ساتھ غائب اور تیرے فرماتے ہی حاضر و موجود ہو جائے گی۔

خداؤں کے ارشاد کی تعمیل میں مروج نے نیست کما وہ صفوحہ ہستی سے مٹ گئی۔ اور بہت کہتے ہی دوبارہ عالم وجود میں آگئی۔ اس معجزہ کو دیکھتے ہی سب خدا مسرت سے ایک زبان ہو کر بولے ”مروج شاہنشاہ ہے“ سب آداب بجالائے اور تلج و تخت، خاتم و چتر شاہی اس کی نذر کئے گئے۔ نیز ایک کاری ہتھیار جس سے وہ دشمنوں کو مغلوب کر سکے عنایت کر کے فرمایا ”ہاؤ تیا مست کی حیات کا خاتمہ کرو اور اُس کے خون کو مخفی مقامات پر ہوا پہنچائے گی“ جب بزرگ خداؤں نے مروج کو مختلف قوتوں اور قدرتوں سے مسلح کر کے کامیابی و فیروز مندی کی شاہراہ پر کھڑا کیا تو اُس نے کمان اور نیزے کا اختراع کر کے نیزے کو نکل میں دبایا۔ گرز سیدھے ہاتھ میں لیا۔ نیز و کمان پہلو میں آویزاں کئے۔ آتش شعلہ زن اپنے جسم میں داخل کی اور اپنے جلو میں کبلی کو کووندنے کا حکم دیا۔ ایک جال بنایا نیز مشرقی، مغربی، شمالی اور جنوبی ہواؤں کو وجود میں لایا تاکہ تیا مست کے جسم کا کوئی حصہ بچ کر نہ جائے۔ بادِ ابار، آندھی، بے مثل گبولہ دگر دباد نیز چوبانی اور بادِ ہفت نہ و طوفان کو ہستی میں لا کر مشرقی، مغربی، شمالی و جنوبی ہواؤں کو اپنے بزرگ انوکھی عطا کردہ کند کے قریب استادہ کیا۔ اپنے مخترع جال کو چاروں سمت پھیلایا۔ بادِ ہفت اقسام کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا اور ابو بول (صاعقہ) سے مسلح ہو کر اپنی لاثانی خونناک جنگی چوڑی میں سوار ہوا جس میں بے نظیر بادِ رفتار چار گھوڑے بٹتے ہوئے تھے۔ اُن کے دانت ہم قاتل سے بچے ہوئے۔ وہ بھاگ دوڑ میں مشاق اور دشمن کو ٹاپوں سے روکنے میں ماہر تھے۔ الفصہ ان تیاریوں کے بعد اور اسلحہ سے مسلح ہو کر اپنے بزرگوں کے سایہ عافیت میں تیا مست کے مقابلہ کے واسطے روانہ ہوا جو ہنی مروج کی نظر تیا مست پر پڑی کچھ ہیبت طاری ہوئی مگر سنبھلا۔ لنگو پر نظر پڑی تو دیکھا کہ نہایت حقارت سے مروج کو گھور رہا ہے لیکن چار آنکھیں ہوتے ہی لنگو پر رعب غالب ہوا اُس کے ارادے پست ہو گئے اور انتظام میں خلل پڑا۔ اپنے ناخدا کی پریشانی دیکھ کر مددگار خداؤں کے قدم اکھڑ گئے مگر تیا مست قدم جائے اور سربلند کئے مروج اور دیگر خداؤں سے جو مروج کی پناہ میں کھڑے تھے طعنہ زنی کرنے لگی۔ مروج نے اس کی غداری پر لعنت ملاست کی اور کہا کہ اپنی فوج کو آراستہ اور اپنے اسلحہ کو درست کر۔ بہتر یہ ہے کہ میرا اور تیرا مقابلہ ہو۔ تیا مست ان الفاظ کو سنتے ہی غصہ سے بے خود ہو گئی۔ چینی اور چنگھاڑنے لگی یارا

بدن تھرانے لگا غم معمولی حرکات سے بھوت کے اثر کا شہ ہوتا تھا۔ بہر حال اپنے آپ کو سنبھال کر نیا ست مقرر پڑھنے اور عبادت کرنے لگی۔ خداؤں نے اپنے اپنے اسلحہ طلب کئے۔ جنگ و پیکار پر آمادہ ہوئے۔ مروج اور نیا ست ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھے۔ جو نئی نیا ست زوہیں آئی مروج نے اپنی کند بھینکی۔ باد و بار کو تہمت کے چہرہ پر چلنے کا حکم دیا۔ نیا ست کے منہ پھاڑتے ہی باد و بار نے اُس کے شکم میں داخل ہو کر اُس کی بہت بڑی جڑت کو سلب کر لیا اور ہچا پری کا منہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ مروج نے موقع پا کر نیزے کا ایسا کاری وار کیا کہ اُنی پیٹ میں گستی جگر کو چیرتی دل کے پار ہو گئی۔ ایک ہی وار میں نیا ست کا کام تمام ہوا اور نقشِ طبع کر مروج اُس پر کھڑا ہو گیا۔

تیا ست کے مرنے ہی اُس کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مددگار دیوتا جو اس کی کمک پر آئے تھے سمیت سے لرزے لگے۔ ہچا پے نعل انگندہ جان کے خوف سے سر پاؤں پر رکھ کر بھاگے لیکن بعض محصور ہو کر گرفتار اور بعض اسپر کند مروج ہوئے۔ اُن کے اسلحہ توڑے گئے اور قدرتیں سلب کی گئیں۔ گریہ و زاری سے مجبوس دیوتاؤں نے ایک عالم کو سر پر اٹھالیا تھا۔ گیارہ عجیب الخلق راکشس اور فوجِ عفاریت جن کو تیا ست نے مخصوص اس معرکہ کے لئے پیدا کیا تھا نیست و نابود کئے گئے۔ کنگو شوہر ثانی و سپہ سالار افواجِ تیا ست کو آسمان پر اٹھا کر اوگ (عزرائیل) کے حوالہ کیا گیا۔ مروج نے لوحِ محفوظ اُس کے قبضہ سے نکال کر درجِ حقیقت اُس کی ملکیت زہی اور اپنی مہر لیت کر کے اپنے سینہ میں رکھ لی۔ تمام قدرتیں جو تیا ست نے ضبط کر لی تھیں انشا کو واپس دی گئیں۔ اسی طرح مذم مد منہج ہوا۔

جب شجاع مروج اپنے دشمنوں کو غارت اور تباہ کر چکا تو تیا ست کی نقش کی طرف متوجہ ہوا اُس کے پاؤں کی طرف کھڑے ہو کر اپنے زبردست گرز سے اُس کی کھوپری پاش پاش کی۔ اُس کے جسم کی شریاں کو کاٹ کر

۱۵ زبور کی عبارت سے اژدہ پر قدرے روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو زبور باب ۴۴ آیات ۱۳ و ۱۴۔ تو نے اپنی قدرت سے دیا کو چیرا۔ تو نے پانیوں میں اژدہوں کے سر کیے۔ تو نے لوتیان (Leviathan) کے سر کے ٹکڑے کئے۔ ملاحظہ ہو یسعیاہ باب ۵۱۔ آیت ۹۔ کیا تو وہی نہیں جس نے رعب کو کاٹا اور اژدہ کو قتل کیا۔ ملاحظہ ہو یسعیاہ باب ۲۷ آیت ۱۔ اس دن خداوند اپنی سخت اور بڑی مضبوط تلوار سے لوتیان اس تیز رو سانپ کو اور لوتیان اس بیک سناپ کو اور دبیاتی اژدہ کو قتل کرے گا۔

۱۶ مرنے کی کھوپری پھوڑنے کی رسم ہندوستان کے ہندو میں اب بھی جاری ہے۔ نقش کے جلنے کے بعد قریب قریب رشتہ دار مردہ کو کھوپری کو بانس یا لٹ سے بیٹھاتا ہے۔



بادِ شمالی کو حکم دیا کہ غن کو غنی مقامات میں پوشیدہ کرے۔ مروج کے بزرگوں نے اس کارستانی سے شاد ہو کر تحفے تحائف پیش کئے۔

مخدوم مروج نے قدرے آرام کیا لیکن نعل کو بغور دیکھتا رہا اور عجیب منصوبہ گانٹھ کر اٹھا اور نعل کو گانٹھا پھلی کی طرح پہلو کی طرف سے چیرا۔ ایک حصہ سے افلاک کا گھٹا ٹوپ بنایا اور چٹنیوں سے مستحکم کر کے نگران مقرر کئے اور حکم دیا کہ پانی کو نیچے نہ اترنے دیں۔ خود مروج نے دورہ کر کے آسمانوں کا معائنہ کیا۔ ندم مد کی آرام گاہ تخت الشریٰ میں بنائی گئی۔ نیز محل اشارہ بنا کر انوار، بعل اور یاسین تقسیم کر دیا جو جدا گانہ آسمان زمین اور پانی کے حاکم تھے۔ اُس نے خداؤں کے قیام کے واسطے مختلف مقامات بنائے۔ دیوتا شمس کو روزانہ دورہ کرنے

۱۰ اہل بابل کے اعتقاد کے موافق زمین پر آسمان اس طرح قائم ہے جس طرح محراب یا قوس پاپوں پر اس قوس کو مروج نے جنوب کی طرف سواہل ٹھوس رکھا لیکن شمال کی طرف سے سزنگ لگا کر مشرق و مغرب کی طرف راستہ نکالا اور یہاں یعنی مشرق و مغرب میں ایک ایک دروازہ قائم کیا۔ آفتاب جس کو شمس دیوتا سے خطاب کیا ہے۔ مغربی دروازہ سے سزنگ میں داخل ہوتا ہے۔ شب کو محل کیرب شامی میں جو سزنگ کے وسط میں واقع ہے آرام کرتا ہے۔  
۱۱ تیامت کے وجود کو پانی تصور کیا گیا تھا۔ فلک الافلاک کے گھٹا ٹوپ بنانے سے مدعا ہے کہ پانی سب آسمانوں سے اوپر ہے۔ یہی اعتقاد یہود کا ہے۔

۱۲ ڈاکٹر جنسن کا قول ہے کہ یہاں اشارہ سے مدعا زمین سے ہے لہذا اس قول کے موافق مروج نے تیامت کے جسم سے قبہ فلک الافلاک اور کرۂ ارض بنایا اور پانی زیر زمین کو بھی قید کیا۔ لیکن دیگر اسانڈہ کا قول ہے کہ اشارہ بھی ایک آسمان یا اُس کے ایک حصہ کا نام ہے۔

۱۳ افلاک کلیہ نو ہیں اور مع افلاک جزئیہ ۲۴ ہیں۔ فلک کلی قمر کا چار افلاک پر مشتمل ہے (۱) مائل (۲) حامل (۳) تدویر (۴) جزو کہ نینوں پر محیط ہے۔ فلک عطارد کے بھی چار افلاک ہیں (۱) مثل (۲) دیر (۳) حامل (۴) تدویر۔ فلک شمس کے دو افلاک ہیں (۱) مثل (۲) خارج مرکز۔ تدویر نہیں ہے کیونکہ شمس شعلہ خارج مرکز میں خود بجائے تدویر مرکوز ہے اور افلاک جزئیہ علویات یعنی زحل، مشتری اور مریخ کے الفاظ بعینہ مثل افلاک زہرہ کے تین ہیں (۱) مثل (۲) حامل (۳) تدویر یہ سب ماکر ۲۲ افلاک ہوئے اور عرش و کرسی سمیت ۲۴ ہوئے۔ ان نو افلاک کلیہ میں سے پہلے فلک پر قمر دوسرے پر عطارد، تیسرے پر زہرہ، چوتھے پر آفتاب، پانچویں پر مریخ، چھٹے پر مشتری، ساتویں پر زحل ہے۔ ان ساتویں سیاروں کو سبع سیارہ کہتے ہیں۔ آٹھویں آسمان پر سیارگان ثابت ہیں اُس کو فلک البروج کہتے ہیں اور شمس

کا حکم دیا۔ کل کائنات کا وجود اور دار و مدار شمس کے روزانہ دورہ پر منحصر کیا۔ سال کا حساب معین کر کے دقیقوں پر تقسیم کر دیا اور بارہ ماہ کا سال تجویز کیا۔ ہر مہینے کے تین حصے کئے اور ہر حصے کو دس روز کی حکومت بخشی اور سال کے تمام دنوں کو اُس نے نبرۂ یعنی مشتری کی زیر نگرانی کیا تاکہ اُن میں سے کوئی منتشر ہو کر لاپتہ نہ ہو جائے۔ اُس نے قمر کو روشن کر کے شب کی حکومت عطا کی۔ یل و نہار میں تمیز کرنے کی غرض سے شب کا سیارہ بنایا۔ ہمیشہ ہر ماہ کے آغاز میں سر پر اکو رکھنے کا حکم دیا (تلج جو دو سیکنگوں سے آراستہ ہو یعنی ہلال، اور ہدایت کی کہ ہر ماہ کے شروع میں اپنے سیکنگوں کو شب افروز کرے تاکہ آسمان آنکھ سے اوجھل نہ ہو۔ ساتویں روز مجھے (مروخ) اپنا تلج دکھا اور چودھویں شب سبائو (بدر کی صورت) اے کرشمس کے مقابل میں کھڑا ہوتا ہے (کتبہ شکست ہو جانے سے پڑھا نہیں جاتا لیکن جہاں جہاں عبارت پڑھی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مروخ نے سن دیوتا (قمر) کو اور بھی ہدایات کی تھیں نیز اُس کے منازل اور ہر منزل پر شمس دیوتا سے اُس کے تعلقات کو بیان کیا ہے) اُس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۶) نے اُس کا نام کرسی رکھا ہے۔ نویں فلک پر کوئی ستارہ نہیں ہے۔ اُس کو فلک اعظم، فلک اطلس، فلک الافلاک، فلک محیط، فلک اعلیٰ، فلک انفسی اور معد الجہات کہتے ہیں۔ اور شائع نے اس کا نام عرش لکھا ہے۔ عرش کے اوپر نہ خلا ہے نہ ملامت بلکہ لامکان ہے۔

۱۰ حکمانے مشتری کو عمدۃ قاضی فلک، صاحب فتویٰ، وزیر صدر امین اور مجتہد کا عطا کیا ہے۔ یہ سیارہ الگ فلک ششم و عامل روز پنجشنبہ ہے۔ معزز اور افسر جملہ سیارگان سمجھا جاتا ہے۔ نہایت بلی السیر ہے۔ ایک سال میں ایک برج طے کرتا ہے۔ آری زچھی چال کی وجہ سے اہل بابل سمجھتے تھے کہ دیگر سیاروں اور ستاروں کو جمع کرتا پھرتا ہے اور منتشر نہیں ہونے دیتا۔ ۱۱ سبائو بمعنی تعطیل یا آرام۔ اسی لفظ سے یہود نے لفظ سبتہ (Sabbath) بنایا ہے جس کے معنی روزِ آرام کے ہیں۔ ۱۲ اس فقرے سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل بابل کو علم تھا کہ قرانی روشنی آفتاب سے حاصل کرتا ہے۔

۱۳ دافع ہو کہ حکمانے فلک ثوابت یعنی منطقۃ البروج کے ۳۶۰ درجے مقرر کئے ہیں۔ ان درجات کے ۱۲ حصے کر کے ان کا نام برج رکھا ہے۔ اگر ایک سیارہ دوسرے سے ۱۸۰ درجہ پر ہو تو مقابلہ کہتے ہیں اور یہ نظریں دشمنی کی ہے ۱۲۰ درجہ پر تثلیث نظر دوستی کی ہے، ۹۰ درجہ پر تریح نیم دشمنی کی ہے، ۶۰ درجہ پر تدبیس کہتے ہیں یہ نظریں دوستی کی ہے اگر دوسرے ایک برج میں ایک درجہ اور دقیقہ پر جمع ہوں تو زان کہتے ہیں اور اگر کوئی سیارہ آفتاب سے ۱۲۰ درجہ پر ہو تو چنچل بیڑین اور اگر آفتاب و قمر ۱۸۰ درجہ کے فاصلہ پر ہوں تو بدر کہتے ہیں۔ انتباہ ناظرین کے لئے نقشہ منازل سبہ سیارہ ذیل میں درج ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر دیکھئے)

سیاروں کے واسطے راستہ صاف کیا اور ان میں سے چار سیاروں کو چار دیوٹاؤں کے متعلق کیا اور پانچواں سیارہ نہرو (مشتري) اپنی ذات سے منسوب کر کے سماوی امت کا پیشوا اور محافظ مقرر کیا۔

دیوٹاؤں کی ہستی اور شبیہ کو ظاہر کرنے کے لئے مروجہ نے قبۃ فلک پر ستاروں کو اس طرح آراستہ کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۷)

### منازلِ سبعہ سیارہ

نام کوکب	زل	مشتري	مريخ	آفتاب	زہرہ	عطارد	قمر
نام منزل	ذراع	شرطین	ثریا	ہفتہ	بطین	زبانہ	ہفتہ
"	سماک	طرفہ	اکلیل	صرفہ	وبران	نخایم	نشرہ
"	بلدہ	مقدم	بیمہ	قلب	عجود	سعود	زہرہ
"	ذایج	شولہ	بلغ	مؤخر	اجبیہ	غفرہ	رشا

### منازلِ قمر

حمل			ثور			جوزا			سرطان			اسد			سنبلہ		
شرطین	بطین	ثریا	ثریا	وبران	ہفتہ	ہفتہ	ہفتہ	ذراعہ	نشرہ	طرفہ	جیہ	جیہ	زہرہ	صرفہ	صرفہ	عوا	سماک
۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳
میزان			عقرب			قوس			جدی			دلو			حوت		
غفرہ	زبانہ	اکلیل	اکلیل	قلب	شولہ	شولہ	نخایم	بلدہ	ذایج	بلغ	سعود	سعود	اجبیہ	مقدم	مقدم	مؤخر	رشا
۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۴	۹	۱۳	۴	۹	۱۳	۱۳

۱۔ زنگ یعنی زحل (سینچر) مقام فلک ہفتہ  
 زنگال یعنی مریخ (مگل) " پنجم  
 اضطر یعنی زہرہ (جمعہ) " سوم  
 نہو، عطارد (بدھ) " دوم  
 نہرو یا مروج، مشتري (پنجشنبہ) " ہشتم  
 بقول صاحب مخزن الادویہ روحانیہ کو سائن شرع میں ملائکہ کہتے ہیں مثلاً  
 روحانیہ زحل کو عزرائیل  
 " مشتري کو میکائیل  
 " مریخ کو اسرافیل  
 " شمس کو جبرائیل



نیاست کے نصف جسم سے زمین بنائی۔ کرہ ارض کو نیم دو ریشل الٹی ہوئی کُفّہ کے بنایا۔ کناروں کی طرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۹) شمال میں بروج سرطان، عقرب، حوت

جنوب " " ثور، سنبلہ، جدی،

حکماء فلسفہ نے بارہ برجوں کو عناصر اربعہ پر تقسیم کیا ہے۔

آتش :- حل، اسد، قوس

ہوا :- ثور، سنبلہ، جدی،

باد :- جوزا، میزان، دلو

آب :- سرطان، عقرب، حوت۔

حکماء نے دور فلک یعنی منطقة البروج کو ۲۸ برابر حصوں پر منقسم کیا ہے

پہلی سات منزل بروج ربع سے منسوب ہیں اور شمالی حاد ہیں۔ درمیان مغرب و شمال کے ہیں

دوسری " " " " " شمالی باطل " " شمال و مشرق " " "

تیسری " " " " " جنوبی باطل " " مغرب و جنوب " " "

چوتھی " " " " " جنوبی صاعد " " جنوب و مشرق " " "

بروج کے رنگ بھی قائم کئے ہیں مثلاً حل برنگ سرخ، ثور برنگ سفید، جوزا برنگ سبز، سرطان برنگ سرخ، مخطوطہ بسفیدی

اسد برنگ زرد و سفید آئینہ، سنبلہ برنگ گوناگوں یعنی چمکیرا، میزان برنگ سیاہ، عقرب برنگ سیاہ سرخی آئینہ، قوس

برنگ فاختہ، جدی برنگ سیاہ و سفید، دلو برنگ نیولا، حوت سفید اٹل، سرخی۔

نام کوکب	جنس	رنگ	مقام	حاکم روز	وقت	عنصر	مزاج	خطوط کوکب
زحل	مذکر	سیاہ	فلک مقیم	مشنبہ	نہادی	خاکی	جہل چنخور	۱
مشتری	"	زرد	ششم	مخشنبہ	"	آتش	بلغی	۵
مریخ	"	سرخ	پنجم	سہ شنبہ	یسی	"	حونی	+
شمس	"	طلاتی	چہارم	یک شنبہ	نہادی	"	صفردی	۵
زہرہ	مونث	سفید	سوم	جمعہ	یسی	بادی	بلغی	x
عطارد	خنثی	فیروزہ	دوم	چہار شنبہ	نہادی	"	صفردی بلغی	۱
قمر	مذکر یا مونث	سبز	اول	دو شنبہ	یسی	آبی	بلغی بادی	6

۱۲۵ برنگال یعنی برج کو بروج حل اور عقرب عطا کئے

اشطر " زہرہ " ثور اور میزان " "

نبو " عطارد " جوزا اور سنبلہ " "

رگ " زحل " جدی اور دلو " "

سن " قمر " سرطان " "

شمس " آفتاب " اسد " "

نور و رخ فخر و بہ مشتری " قوس و حوت لئے

۱۲۵ کُفّہ یعنی گرل کشتی بنیاد میں اب بھی اس قسم کی کشتیاں رائج ہیں۔ بڑے بڑے گرل بید کے ٹوکروں کو دبقیہ حاشیہ برصغہ آئندہ

سے زمین کو تدریج بلند کرتا چلا گیا جتنی کہ وسط میں پہنچ کر مثل پہاڑ کی چوٹی کے بلند کر دیا۔ اور اُس کو برف سڑھک کر دریائے فرات وہیں سے جاری کیا۔ کفنا کرۂ ارض کے کنارے اونچے لیکن یکساں بلند مثل دیوار کے زمین کے گرد اگر دہنائے تاکہ پانی زیر زمین اوپر نہ آ سکے۔ کنارے اونچے ہو جانے سے درمیانی حصہ میں خلا پیدا ہو گیا۔ اُس خلا کو پُر از آب کرنے سے ایک تنگ سمندر بن گیا جس کو دیوتاؤں کی اجازت بغیر کوئی فرد بشر پار نہیں کر سکتا تھا اور اس سمندر کو رازِ الہی سمجھا جاتا تھا۔

مروخ نے اپنی کمان اور کمنڈ آسمان پر محفوظ کیں۔ ہواؤں کو بھی مقتید کر کے اپنی اپنی جگہ پر قائم کیا۔ دیگر انتظاماتِ فلک و ارض کو بھی بیان کیا گیا تھا لیکن کتبہ کے حروف مٹ جانے کو کچھ پڑھانہیں ملتا، جب مروخ آسمان و زمین کی ساخت اور ترتیبِ عالم سے فارغ ہوا تو دیگر خداؤں کی امداد اور مجموعی کوشش سے وحوش و مویشی صحرائی اور حشرات الارض کو مہستی میں لایا۔ بعد ازاں مروخ نے تاریکی کو روک دیا، آسمان کو زمین سے جدا اور تمام عالم کو باقاعدہ کیا لیکن جاندار روشنی کی تاب نہ لا کر بے جان ہو گئے لہذا دوبارہ اس طرح پیدا کئے گئے کہ مروخ نے اپنے والدِ نیا کو ہدایت کی کہ اُس کے سر کو تن سے جدا کرے اور اُس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۰، چم سے منڈھ کر اور قیرا کو در کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس صورت اور ساخت کی کشتیاں کف نکلاتی ہیں۔ اس نیم دور کشتی کو زمین پر الٹا رکھ کر دیکھنے سے اہل بابل کا خیال زمین کی صورت کے متعلق سمجھ میں آجائے گا۔

۱۵ تورات کے باب ۱ سے اگر مقابلہ کیا جائے تو بہت کم فرق پایا جائے گا۔ تورات شاہد ہے کہ ابتدا میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ زمین ویران اور سنسان تھی اور خلا پر اندھیرا تھا۔ خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔ پہلا روز۔ خدا نے اجالا کیا اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کیا۔ اجالے کو دن اور اندھیرے کو رات کہا۔ دوسرا روز۔ خدا نے پانیوں کو پانیوں سے جدا کیا اور فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانیوں کو فضا کے اوپر کے پانیوں سے جدا کیا اور خدا نے فضا کو آسمان کہا۔

تیسرا روز۔ خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے پانی ایک جگہ جمع ہوں کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہو گیا۔ خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جمع شدہ پانی کو سمندر کہا اور خدا نے نباتات و جمادات اور مختلف میوہ دار درختوں کو اگایا۔

چوتھا روز۔ خدا نے کہا کہ آسمان کی فضا میں نیتر ہوں تاکہ دن اور رات میں فرق کریں اور زمانوں، دنوں اور سالوں کا شمار ہو لہذا خدا نے دو بڑے نیتر بنائے ایک نیترِ اعظم جو دن پر حکومت کرے اور نیترِ اصغر جو رات پر حکومت کرے اور تین

خون میں مٹی کو گوندھ کر اُس سے حیوان اور بشر بنائے جائیں تاکہ مقدس خون کی برکت سے جان دار ہوا اور روشنی کو برداشت کر سکیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سب زندہ رہے۔

ابو البشر کو عالم ہستی میں لانے کے بعد اُس کی رہنمائی کے لئے مروج نے مندرجہ ذیل ہدایات کیں :-

(۱) اپنے خدا کی طرف سے اپنے دل کو پاک رکھ کیونکہ یہی حمد پروردگار ہے۔

(۲) بندے تجھ کو لازم ہے کہ تو علی الصبح نماز پڑھے، دعا مانگے، گریہ و زاری کرے اور سجدہ اس طرح

کرے کہ تیری پیشانی زمین پر لگ جائے۔

(۳) خوفِ خدا رحم پیدا کرتا ہے۔

(رقبتہ حاشیہ صفحہ ۵۰۱) کو بھی بنایا اور خدا نے ان کو آسمان کی فضا میں رکھا کہ زمین کو روشنی بخشیں اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کر لیں

پانچواں روز۔ خدا نے دریائی جانوروں اور ہر قسم کے پرندوں کو پیدا کیا۔

چھٹا روز۔ خدا نے وحوش و مویشی صحرائی اور حشرات الارض کو بنایا۔ پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی

مانند بنائیں کہ وہ سب پر حکومت کرے۔

ساتواں روز۔ آرام کیا اور اُس کا نام سبتہ Sabbath رکھا۔

۱۰ چنہ کتبوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں منجملہ ان کے ایک میں پیدائش و وحوش اور مویشی صحرائی

نیز حشرات الارض کا ذکر ہے۔ اس ربڑہ کتبہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمام مروج کی نہیں بلکہ مختلف خداؤں کی مجموعی

کوشش سے اُن کو پیدا کیا گیا تھا اور ثیاد پر مروج نے سب سے اہم حصہ اس کام میں لیا تھا۔ ربڑہ مذکور کی عبارت

بھی اکثر جگہ سے مٹ گئی ہے لیکن ایک جگہ ن اگی آژگ درج ہے جو دیوتا ثیاد کا خطا ہے، اور جس کے معنی دانا و دنیا

کے ہیں۔ بعض الفاظ سے قیاس ہوتا ہے کہ پیدائش بشر کا حال درج تھا۔

ایک اور کتبہ کے ٹکڑے میں درج ہے کہ خدا ثیاد کے دل میں بشر کے پیدا کرنے کا خیال آیا۔ مروج نے علم غیب

سے دل کا حال دریافت کر کے اپنے خون سے بشر کو پیدا کیا تاکہ زمین پر آباد ہو کر دیوتاؤں کی پرستش اور مناد کی تعمیر کرے

اس کتبہ سے بروکس باہلی کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ مروج نے اپنے خون سے ابو البشر کو نیز مختلف حیوانات کو بنایا تھا۔

جارج دی سن سیلس اور یوسی ہیں موزوں کا بحوالہ بروکس بیان ہے کہ تمام دیوتاؤں کی مجموعی کوشش سے حیوانِ ناطق و مطلق و

حشرات الارض پیدا کئے گئے لیکن تاریکی کو روشنی سے جدا کرتے ہی تمام جان دار فنا ہو گئے لہذا مروج نے اپنے خون میں

مٹی کو گوندھ کر بشر اور دیگر حیوانات وغیرہ کو بنایا اور وہ سب روشنی میں زندہ رہے۔ اس قول کی کتبوں سے تائید ہوتی ہے

(۴) صدقہ زندگی کو بڑھاتا ہے۔

(۵) نماز گناہوں کو دھوتی ہے۔

(۶) وہ شخص جو خداؤں سے ڈرتا ہے کبھی غم میں مبتلا نہیں ہوتا۔

(۷) وہ شخص جو انونانکی (زمین کی ارواح یعنی ارواح جو زمین پر موجود ہیں) سے ڈرے گا بڑی عمر پائے گا۔

(۸) اپنے دوست اور ہمسایہ کی کبھی برائی نہ کر۔

(۹) غیب کا حال کبھی بیان نہ کر اور رحم سے کام لے۔

(۱۰) جب کبھی کسی چیز کے دینے کا وعدہ کرے تو ضرور دے اور کبھی ہاتھ نہ روکے۔

افسوس ہے کتبہ شکست ہو گیا اور باقی کی عبارت فنا ہو گئی۔

آخر میں مروج کے اکیاون نام درج ہیں۔ ان میں لفظ تو تو مروج کی شان میں آیا ہے جس کے معنی خالق و آفریدگار کے ہیں۔

اسی سلسلہ میں بشر کی پیدائش کے وجہ درج ہیں۔ کتبہ مذکور کی عبارت کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

سطر ۲۵- تو تو آگازاگا یعنی خالق، فخر تاج، تاج کو عظمت عطا کیجو۔

۲۶- مالک مجرب منتر کا، مردہ کو زندہ کرنے والا۔

۲۷- وہ ذات جس نے مفتوح دیوتاؤں پر رحم کیا۔

۲۸- (وہ ذات) جس نے مخالف دیوتاؤں کے کندھوں پر جو ابھاری کیا۔

۲۹- اور ان کی شفاعت کے واسطے بشر کو پیدا کیا۔

۳۰- وہ رحیم جس کی متابعت میں نجات ہے۔

اہل بابل کے اعتقاد کے موافق بشر کو دیوتاؤں کی پرستش اور پوجا کی غرض سے پیدا کیا گیا تھا نیز اس لئے کہ ان کی

بندگی و عبادت، نیکو کاری و راست بازی ذریعہ ان دیوتاؤں کی شفاعت کا ہو جو افلاک کے خداؤں سے منحرف ہو کر

عذاب میں گرفتار تھے۔ کتبہ مذکور شاہد ہے کہ تمام خداؤں نے اپنی مختلف قدرتیں مروج پر منتقل کر دی تھیں اس سے

قیاس ہوتا ہے کہ اہل بابل کا مذہب وحدانیت کا رنگ لئے ہوئے تھا۔

کتبہ مذکور کے آخر میں ہدایت درج ہے کہ عقلا ہمیشہ آفرینش کے واقعات پر غور کریں اور لازم ہے کہ پھر اپنے

پسر کو تعلیم دے، اور بادشاہ کو چاہئے کہ اس واقعہ کو سن کرے۔



# آخری دُعا

شرمِ عصیاں سے جھک گئی ہے گردن  
 اب، بندہ ترے حضور میں آیا ہے  
 اس موڑِ ضعیف کی صدا بھی سن لے  
 تو میری دعا کا مدعا ہو جائے  
 اس طولِ اہلِ کارِ شتہ کٹ کر رہ جائے  
 پیری سے بدل جائے جوانی میری  
 یہ خشک نہال بارور ہو جائے  
 دیکھوں جس سمت، ایک جلوہ نظر آئے  
 نقشِ کون و فسادِ فاسد ہو جائے  
 ہو جائے ادائے عجز جو ہر میرا  
 تلے ترے کمتی رہیں میری آنکھیں  
 سو جاؤں، تو تیرا ہاتھ ہو سر کے تلے  
 دنیا کے عل میں دین پیدا کر دے  
 سچے دل سے کروں عبادت تیری  
 یہ کہہ کے، بدن سے نکلے جانِ آگاہ  
 اللہمَّ ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا  
 عاصی، دربارِ نور میں آیا ہے  
 اس بندے کی آخری دُعا بھی سن لے  
 بیمارِ وجود کو شفا ہو جائے  
 پھیلی ہوئی زندگی سمٹ کر رہ جائے  
 وقفِ مُردن ہو زندگانی میری  
 ہر جزو بدن تا نظر ہو جائے  
 یہ آئینہ بال آکے، دو ہونے نہ پائے  
 محسوسِ حواسِ خمسہ واحد ہو جائے  
 قدموں میں ترے پڑا ہے سرِ میرا  
 ان چھوٹوں سے پھلتی رہیں میری آنکھیں  
 جب آنکھ کھلے تیرے نبسم میں کھلے  
 شکی دل میں یقین پیدا کر دے  
 واپس کر دوں تجھے امانت تیری  
 سمعی، بصری، دہری، عظامی، اللہ

میں ہوں کی صدا ہو منتی یا ہو پر  
 ہو خاتمہ لا الہ الا هو پر

# پھول والوں کی سیر

”اے ہے گرمی تو پہلے بھی ہوتی تھی مگر اب کے برس تو ایسی تڑاقت کی گرمی پڑی ہے کہ تو بہ بھلی ہے۔ پسینے کے مارے شرابور، پنکھا کسی وقت تو ہاتھ سے چھوٹتا نہیں۔ دم ہلکان ہوا جاتا ہے۔ ان دنوں میں پھول والوں کی سیر ہوئی۔ لوہوی اور تماشا دیکھو نہ ابر ہے نہ پھیاں پھیاں مینہ برس رہا ہے بلا سے پھول والوں کی سیر تو ہو گئی۔ اے سیر تو گئی بادشاہی وقت کے ساتھ اب تو نقل ہے کہ دو مبارک مہتابی پر بیٹھی متوازی زڑ لگا رہی تھیں۔ میں صبح سے اس فکر میں تھی کہ پھول والوں کی سیر کی اصلیت کیا ہے کسی سے معلوم کروں۔ اس وقت گرمی سے جودم بولا یا تو کوٹھے پر چڑھ گئی۔ دو مبارک کی یہ زڑ سن کر خیال آیا کہ ان سے ہی دریافت کروں۔ دو اگلے وقتوں کی آدمی اسی برس کے پٹھے میں ہیں۔ اب سے دو تین برس پہلے ان کے پان کھانے اور پیلانے کی نقل میں بھی اتار تھی۔“

دو مبارک اس عمر میں اس بلا کی شوقین طبیعت ہیں کہ آندھی جائے سینہ جائے مگر ان کی گنگھی چوٹی میں فرق نہیں آتا۔ کاجل اور وہ بھی خوب دھواں دھار دونوں وقت لگنا روزانہ سرگندھنا ان کا معمول ہے۔ پھر کیا مجال کہ ان کے پان دان یا صراحی کو کوئی ہاتھ لگائے تو حشر تک اُس کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ اگر کوئی پلنگ پر بھی بیٹھ جاتا ہے تو گھنٹوں بڑبڑاتی ہیں۔ مجھ پر تو خاص خنایت ہے کہ مجھ کو ان کی ہر چیز میں دغل ہے۔ باتوں کی ایسی شوقین ہیں کہ صبح سے شام کر دیں افسانہ ختم نہ ہو۔ میں نے دریافت کیا اچھی دوا پھول والوں کی سیر کیوں ہوتی ہے میرے اس سوال پر پہلے دوا نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس کھینچا اور پھر کھانسنے کا آواز صاف کی اور اس طرح سلسلہ کلام شروع کیا۔

”میری چاند جب بادشاہی وخت (وقت) تھا تو اس اجڑی دلی شاہجہان آباد میں سب کچھ تھا جب بادشاہ سلامت موجود تھے تلخ آباد تھے خدا بخشے بڑے نواب صاحب مہارے نانی اماں کے والد خدا ان کو کروٹ کروٹ حنت نصیب کرے ہم نے ان کے وخت میں ایسے عیش کر لئے کہ اب ان کے بچوں کو نصیب نہیں، یہ کہتے کہتے دو اکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کانپتے ہاتھوں سے دوا نے آنسو دوپٹے کے آچل سے پونچھے۔ کھنکار کر گلا صاف کیا، اور یوں گویا ہوئیں، ”ہاں تو بڑے نواب صاحب بھی بادشاہ سلامت کے ساتھ جاتے تھے ہاتھ کیسے کیسے گرجو ان منلیہ کے تھے۔ خدا بخشنے مہارے نانا تو چودہ پندرہ برس کے تھے مہارے نانی اماں ٹوپی اوڑھے پھرتی تھیں میں ان

سے ایک دو برس بڑی ہوں۔ اُن کے ہی ساتھ کھیلتی تھی۔ تمہاری قطب کی کوٹھی ایسی سچی ہوئی تھی کہ منہ سے بولتی تھی۔ سیر میں بیگیا تیں نہیں جاتی تھیں، کیونکہ امیر، رئیس، شہزادے سب ہوتے تھے، مگر تمہاری نانی اماں کا پردہ نہ تھا وہ نواب صاحب کے ساتھ جاتی تھیں۔ میں اور اُن کی اور اماؤں کی لڑکیاں ساتھ ہوتی تھیں۔ ہائے کیا دخت تھے۔ نہ گلوڑے یہ زمانے تھے کہ مولوں میں دم جاتا ہے۔ نہ یہ باتیں تھیں، جس کو دیکھو آپے سے باہر مردوں نے ڈاڑھیاں منڈوالیں، عورتوں نے چٹیاں کٹوالیں، کیسا سخت منہ لگتا ہے۔“

میں دوا کی اس تقریر بے ہنگام سے اکتا گئی تو دوبارہ کہا سیر کا بیان کرو۔ دوائے کہا ”بیٹی اُس کی صلیبت ہے ہے اکبر شاہ ثانی کو یہاں کی آب و ہوا پسند تھی، اس لئے یہاں آکر رہتے تھے جس زمانے میں مرزا جہانگیر اکبر شاہ کے چیتے بیٹے نظر بند الہ آباد میں ہوئے تو اُن کی والدہ نواب ممتاز محل نے سنت مانی تھی کہ مرزا جہانگیر چھٹ کر آئیں گے تو خواجہ صاحب کے مزار پر پھولوں کا غلاف اور چھپرکھٹ چڑھاؤں گی بیٹی اگلے زمانے بھولے تھے، اُن کی دعا قبول ہوئی، مرزا جہانگیر چھٹ آئے تو ممتاز محل نے بہت دھوم دھام سے پھولوں کا غلاف اور چھپرکھٹ چڑھایا۔ پھول والوں نے چھپرکھٹ میں ایک پنکھا بھی بنا کر لٹکا دیا۔ بہت سا کھانا نانا نواب ممتاز محل نے فقیروں کو بانٹا۔ بادشاہ کی خوشی سے قلعہ کے لوگ اور شہر کی سب خلعت جمع ہو گئی۔ ایک بڑا بھاری میلہ ہو گیا۔ بادشاہ کو یہ میلہ پسند آیا۔ ہر برس بھادوں کے مہینے میں مقرر کر دیا۔ بادشاہ ڈھائی سو روپیہ انعام پنکھے کی تیاری کے لئے جیب خاص سے مرحمت فرماتے تھے۔ ہر برس میلہ ہوتا تھا۔ مہینوں پہلے بادشاہ کے ہاں پنکھے کی تیاری ہوتی تھی۔ رنگ برنگ کے جوڑے طرح طرح کے مصالے ان پر لٹکے جاتے ہیں۔ فراش، سپاہی سب کا رخاؤں کے لوگ خواجہ صاحب روانہ ہوئے۔ دیوان خاص بادشاہی محل بھاڑ چھوڑ فرش فردش پردے لٹکا آراستہ کیا۔ ایک دن پہلے محل کا تاننا روانہ ہوا۔ خالصگی رنچوں میں توڑے داریں تفرنی میں سب کا رخاؤں والیاں کوئیں چاکریں لوندیاں باندیاں۔ دوسرے دن صبح کو بادشاہ سوار ہوئے بڑھی چڑھی بیگیا ت شہزادے خواجہ صاحب پہنچے۔ بادشاہی محل سے لے کر جھڑنا امریوں، ناظر کے باغ، ٹمسی تالاب تک لے کر پردہ ہی پردہ ہو گیا۔ سپاہی اور فوجوں کے پہرے لگ گئے۔ کیا مقدور کر غیر مرد کا پشتہ بھی دکھائی دے۔ محل کی جنگلی ڈیوڑھی سے بادشاہ ہوا دامن اور بادشاہ بیگم نام جھام میں اور سب ساتھ ساتھ جھوٹے پر آئے۔ بادشاہ اور ملکہ زمانی بارہ درسی میں بیٹھے۔ اور سب سیر کر رہے ہیں۔ کڑاھیاں چڑھ گئیں۔ کچوان ہونے لگے امریوں میں جھوٹے پر لگئے سوئے والیاں آٹھیں۔ ”جھولاکن ڈالوئے امریاں“ کی سر ملی تائیں گئے لگیں جھوم جھوم کے بادل آ رہے ہیں۔ مینہ کی جھانجھی مور کی جھانجھانے کی لٹکار عجب بہار دکھا رہی ہے۔ منہ سے رنگ کٹ کٹ کر رہا ہے، پکڑوں سے لالہ نافرمان کھل رہا ہے، آم کا پک لگ رہا ہے، جہانیں ٹپا ٹپ کر رہی ہیں، دوڑ دوڑ کر سب اُٹھا رہی ہیں۔ شام ہوئی جھولنی نے آواز دی خبردار بادشاہ سوار ہوئے۔

سب پھینک پھانک سواری کے ساتھ ہوئیں تو کر جا کر گھڑی مٹھری مٹھال لٹو پٹو کرتی دوڑیں۔ پندرہ دن اسی طرح چل پھل میں گزر گئے تین دن سیر کے باقی ہے پھول والوں نے بادشاہ کو عرضی دی، ڈھائی سو روپے اُن کو پنکھے کی تیاری کے لئے مل گئے، تاریخ ٹھیکر گئی۔ شہر میں نفی بج گئی جھرنے کا زمانہ موقوف ہوا۔ شہر کی خلقت آنی شروع ہوئی۔ امیر امر اپنے اپنے مکان میں آئے، کوٹھے والیوں نے کوٹھے سجائے۔ لواب پنکھے کا دن آ پہنچا۔ ساری مخلوق امنڈ آئی۔ تیسرا پہر ہوا ادھر شہزادوں کی سواری ادھر پنکھے کی تیاری مہنے لگی۔ شہر کے رئیس امیر غریب رنگ رنگ کے کپڑے پہن کے سج بن کے اپنے کوٹھوں پر چھجوں پر مہو بیٹھے۔ پہلے آتشباز فلعی گزر دوڑوں کے ہاں کے پنکھے نفیری بجتی ہوئی امیروں کے مکانات کے نیچے ٹھہرتے ٹھہرتے لیتے لواتے چلے گئے، پھول والوں کے پنکھے کس دھوم سے اُٹھے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ آگے آگے پھولوں کی چھڑیاں، ہزارے چھو پچھے شاہزادے ہاتھیوں پر سوار آگے سپاہیوں کی قطار تاشہ مرفہ بجاتے پیچھے خوہی میں مختار بیٹھے موچیل کرتے ہوئے نقیب چوہدار بکاتے صاحبِ عالم پناہ چلے کتے ہیں۔ ان کے پیچھے امیر امر کے ہاتھی چلے آتے ہیں مخلوق کے مائے کھوے سے کھوا جھلنا ہے۔ میٹھی میٹھی پھواریا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں نفیری کی جھینجھینی آواز قمر توڑ رہی ہے۔ آدمیوں کی بھڑ بھڑ، کیا کلزا ہے، اسی دھوم دھام سے پنکھے شاہی محلوں کے نیچے آئے۔ شاہزادہ ہاتھی پر سے اتر اپنے کمروں پر آ بیٹھے۔ اور سب پیدل ہوئے حضور چلوں میں آ بیٹھے۔ پنکھے درگاہ میں جا کر چڑھا دیئے گئے۔ حضور نے نفیری والوں کو انعام دلویا۔ اب تمام رات قوالی رہی صبح سب نے بار، انگوٹھیاں، پنکھیاں، ربڑی، تندوری پراٹھے، یہاں کی سوغاتیں لے لیاں شروع کیا شام تک میلہ بھول گیا بادشاہ ساری برسات خراجہ صاحب میں ہی گذارتے تھے۔ اپنے وہ بادشاہی خشت ہے نہ سیر رہی۔ نگوٹے فرنگیوں کے آتے ہی سب تلبیا ہو گیا۔ اب تو سیر رہ گئی ہے کہ کسے بس بعد اسکے بی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تو یہ ترانے کی گرمی کرتے پڑتے مصیبت بھگتے خواجہ صاحب گئے نگوٹے دھوپ میں جلتے ہے اور لالہ بلاکھانے سے ہوانا والے بیضہ بہتوں کو ہو گیا۔ جان سے ہاتھ دھوئے، اچھی سیر ہوئی۔ ایلو میر بھگتا گیا تھا وہ تو کو دھر کی پوری تھی ورنہ خالہ بندی میں کیا رکھا تھا نگوڑا تندوری پراٹھا نام کا پکا گندوڑا کھا کے پیٹ منہ چلنے لگا نگوڑی مینا پیٹ پکڑے میرے پاس آئی میرے نوٹن کے چھکے چھوٹ گئے۔ آخر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کسانا دلی گھول کر بلاؤ اُسی سے ذریعہ مل تو ٹھہرا۔ اللہ بھلا کرے ہمسائی کائیں بولانی بولانی پھر رہی تھیں انہوں نے کہا کہ لوکل شاہ درویش بہت اچھے ہیں، خدا نے شفا دی، اُن کے ہاتھ میں لکڑی ٹکیتی دہاں پہنچی۔ زبان جاؤں اُن کے کیسی نورانی صورت، جیسے فرشتہ، ایک تعویذ دیا جامانی پلا بھلا ہوگا سب وہ پلایا تو جین پڑا دھرا س کے ایک نے دست نے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا اُس کی دوا پلائی مگر سچ کہوں مجھے ان نگوڑی دواؤں کا اعتبار نہیں سب میں قہر قہر شراب ملی ہوتی ہے۔ ان نگوڑے فرنگیوں کی بدولت نہ دین رہا نہ ایمان — دوامبارک کا سلسلہ تقریر ابھی جاری تھا اور میں بھی محویت سے اُن کی باتوں کو سن رہی تھی کہ کر میں نے آکر کہا بیوی کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تب خیال آیا اور میں کو کو بولتا ہی چھوڑ نیچے آگئی۔

# مشاہدات و ارادات

(۱)

ختم سمجھا تو نے غافل شمع کا دورِ جیت      وہ ہوئی، مہربیں میں جذب ہو کر جلوہ گر  
طالب غور و تامل ہیں، اصول کا نشت      سطح کے جلووں میں ہو الجھی ہوئی تیرِ نظیر  
مستی ہر قطرہ دریا سے جدا ہوتی نہیں  
شمع بجھ جاتی تو ہے لیکن فنا ہوتی نہیں

(۲)

سرودِ خیر سے کم دل نشیں نہیں ہمد      نواٹے بربطِ شریا ترا نہ عصیاں  
عجیب مجمعِ اصدا ہیں اصولِ جیت      فضائے عیش کے سینہ میں جوئے غم ہے رول  
ملی ہوئی میں حدیں اس قدر کہ کیا کہئے      یہ ایک ساز کے نغمے ہیں دو لہتیں و گال  
اُسی طرح سے نظر آ رہا ہے ظلمتِ شب  
شعاعِ مہرِ بصارت چہیں طرح ہو گراں !!

(۳)

گر چہ ہے انسان، یوں بننے بگڑنے کے لئے      راستہ پر جس طرح بکھرے ہوئے آثارِ پا  
صبح دم یا شام کے قصے مہ پر یوں کے بعد      سطح گردوں جیسے بن جاتی ہو اک نیلی ردا  
ایک ہو کر گو نجی ہے اس فضا میں ہم نشین!      نالہ بیتاب یا شیریں تبسم کی صدا  
آہِ اس دنیا کا ہر جلوہ ہے کتنا نامم  
پھر بھی کی جاتی ہے ہم سے خواہشِ نقشِ دوم

سید علی اختر

# مصری کورٹ شپ

”میں نے جو پیرس سے لکھا تھا وہی اب بھی کتا ہوں کہ میں ہرگز ہرگز اس بات کے لئے تیار نہیں کہ بغیر دیکھے بھالے شادی کروں۔ اگر آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں تو مجھ کو اپنی منسوبہ بیوی کو نہ صرف دیکھ لینے دیجئے بلکہ اُس سے دو چار منٹ باتیں کر لینے دیجئے“

یہ وہ الفاظ تھے جو نوری نے اپنی بہن سے پُر زور لہجہ میں کہے۔

”مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر اس سے کیا فائدہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر لڑکی کی صورت شکل اچھی نہ ہوئی تو تم انکار کر دو گے؟ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا! جب سب معاملات طے ہو چکے ہیں اور شادی کرنا ہی ہے تو پھر تم کو دیکھنے سے کیا فائدہ؟“ بہن نے یہ تقریر ختم ہی کی تھی کہ ماں بھی آگئی اور اب نوری کو بجائے ایک کے دو سے بحث کرنا پڑی۔

”معلوم ہوتا ہے کہ تین سال فرانس میں رہ کر تم نے اپنی قومیت اور مذہب کو بھی خیر باد کہہ دیا“ یہ الفاظ ماں نے اُسی سلسلہ گفتگو میں کہے۔

”رجی نہیں یہ ناممکن ہے نہیں پکا مسلمان ہوں اور مصری ہوں نہ میں نے مذہب کو چھوڑا ہے اور نہ قومیت کو۔ میں تو اپنے حق پر لڑنا ہوں کہ جس سے میری شادی ہونے والی ہے اُس کو میں دیکھ لوں .....“

”اور اگر لڑکی ناپسند ہو تو شادی نہ کروں“ ماں نے گویا جملہ پورا کیا۔

نوری نے برجستہ جواب دیا ”اور کیا“

ماں نے تیز ہو کر کہا ”تم کو معلوم بھی ہے کہ تمہاری منسوبہ بیوی کس کی لڑکی ہے؟ وہ جامعہ ازہر کے نائب الشیخ کی لڑکی ہے اور شرافت امارت اور تمول میں وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ ذرا اُن لوگوں کو دیکھو اور اپنے کو دیکھو۔ گورنمنٹ کے روپیہ پر یورپ جاکر تعلیم حاصل کر کے آئے اور انجینئر ہو گئے تو اب تم کسی کو شمار ہی میں نہیں لاتے“

”یہ سب کچھ آپ صحیح کہتی ہیں جو مجھ کو لفظ بلفظ تسلیم ہے مگر اس کے یہ تو معنی نہیں ہو سکتے کہ میں محض ان وجوہ کی بنا پر اپنا پیدائشی حق کھو بیٹھوں“

”مگر میں تو شادی پختہ کر چکی ہوں اور شادی کے تمام ابتدائی مراحل طے ہو چکے ہیں اور اب میں یہ نسبت نہیں توڑ سکتی“ ماں نے نوری سے یہ الفاظ ایک مجبوری کا لہجہ لئے ہوئے کہے۔

”میں کب کتنا ہوں کہ آپ یہ نسبت توڑ دیں مجھ کو تو یہ رشتہ خود بسرو حشتم منظور ہے“

یہ الفاظ سنتے ہی بہن چمک کر بولی ”پھر آخر کیوں الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو۔ یہی تم نے پیرس سے لکھا تھا ورنہ ہم لوگ کیوں یہ غلطی کرتے“

غرض اسی قسم کی بحث بہت دیر تک ہوتی رہی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ماں نے بہت کوشش کی کہ نوری اپنی ضد سے باز آئے مگر بے سود اور اُدھر نوری نے بے حد کوشش کی کہ ماں اُس کی منسوبہ بیوی کے گھر کھلا بھیجے کہ لڑکا لڑکی سے ملنا چاہتا ہے مگر بے کار۔ ماں کو اپنی بات کا پاس تھا وہ اپنی ہچمشوں میں ذلیل ہونا گوارا نہ کر سکتی تھی۔ وہ پرانی رسموں کی قیود کو توڑنا نہیں چاہتی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ ایسا ناشائستہ پیغام لڑکی والوں کے یہاں کھلا بھیجے جس کو وہ ان لوگوں کی کھلی توہین خیال کرتی تھی۔ نتیجہ ماں بیٹے کی ضد کا یہ ہوا کہ ماں خفا ہو گئی گھنٹوں بیٹھ کر روئی۔ نوری نے بہت خوشامدی مگر بے کار۔ نوری کو ماں کو رنجیدہ کرنے کا بہت افسوس تھا مگر مجبور تھا۔ کھانے کا وقت آیا اور ماں نے کھانا نہ کھایا نوری نے بھی نہ کھایا مگر مصاحبت کی کوئی صورت نہ بن پڑی۔ بحث کا سلسلہ پھر چھڑ گیا اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ماں خوب روئی بیٹی مگر سنگ دل بیٹے نے اپنے اصول سے جنبش نہ کی۔ اب گھر گویا عکدہ بنا ہوا تھا۔ ماں نے کھانا نہ کھایا اور بیٹی اور بیٹے نے بھی کھانا نہ کھایا۔ یہی حالت دوسری شام تک ہی اور چوبیس گھنٹے سے زیادہ گزر گئے۔ نوری اپنے کمرے میں بیٹھا تھا ماں کی تکلیف کا خیال تھا۔ ماں کی سستی اگر وہ آخر کو کامیاب ہو گئی اور نوری نے ماں کی شرائط منظور کر لیں تاکہ ماں کھانا کھالے۔

(۲)

یہ بھی دراصل نوری کی چال تھی تاکہ ماں کھانا کھالے چنانچہ ماں کو اُس نے راضی کر لیا۔ لیکن وہ اب اس سوچ میں تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ صبح کا وقت تھا اور اس واقعہ کو دو روز گزر چکے تھے۔ نوری اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ اُس نے اخبار رکھ دیا اور اٹھ کر الماری سے اخبار اور احادیث کی دو کتابیں اُٹھالایا۔ ان کتابوں کا مطالعہ وہ پیشتر بھی کر چکا تھا اور اکثر تاربتا تھا۔

وہ اسی سوچ میں تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے کہ معاً اُس نے دل میں نئی بات ٹھان لی۔ نوکر کو حکم دیا کہ گاڑی لاؤ۔ پکڑے پہن کر تیار ہوا اور کہا کہ نائب الشیخ کے یہاں چلو۔

گھڑی ایک عالی شان مکان پر رکی۔ مکان کا ظاہری ٹھاٹھ کہہ رہا تھا کہ کسی امیر کبیر کا مکان ہے۔ ایک نوکر دوڑ کر گھڑی کے قریب آیا۔ نوری نے اپنا کارڈ دیا اور اطلاع کی گئی۔

نائب الشیخ اپنے منسوبہ داماد کی آمد کی خبر سن کر باہر استقبال کے لئے آئے۔ نوری نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور قابل احترام شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ شیخ نے نوری کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لا بٹھایا۔

کمرہ مغربی سامان آرائش سے سجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ خوبصورت کام ہو رہا تھا اور تمام فرنیچر اور دیگر سامان اعلیٰ قسم کا تھا۔ اس مال کے ایک حصہ میں بہترین رومی غالیچوں کا فرش بھی تھا اور مشرقی فیش کا بہترین سامان سجا ہوا تھا۔ نیچے نیچے زمین سے ملے ہوئے خوبصورت صوفے پڑے ہوئے تھے جن پر لوگ اطمینان سے پالٹی مارے تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ نائب الشیخ نے نوری کا اپنے ملنے والوں سے تعارف کرایا اور ملنے والوں نے شیخ کو داماد کے انتخاب پر مبارکباد دی۔ تھوڑی دیر بعد فتوہ کا دور چلنے لگا اور شیخ نوری سے بہ سلسلہ گفتگو فرانس کی باتیں پوچھتے رہے۔ فتوہ کا دور ختم ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد شیخ کے دوست اٹھ کر چلے گئے اور نوری اور شیخ رہ گئے۔ بڑی مشکل سے اور بڑی دیر کے سوچ کے بعد نوری نے شیخ سے نہایت مودبانہ طریقہ سے کہا:-

”میں جناب کی خدمت میں ایک خاص مقصد سے آیا تھا“

”وہ کیا؟“

”اگر جناب اجازت دیں تو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں؟“

”بسر و چشم بسم اللہ۔ کہو کیا کہتے ہو؟“

نوری نے کچھ تامل کیا اور شاید وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ اپنا مدعا کن مناسب الفاظ میں ادا کرے کہ شیخ

نے پھر کہا ”تم ضرور اپنے دل کی بات کہو کوئی وجہ نہیں کہ تامل کرو۔“

نوری نے ہمت کر کے نجی نظر کر کے دبی زبان سے کہا ”میں جناب سے اپنا حق مانگتا ہوں۔ کیا ممکن

ہے کہ میں اپنی منسوبہ سے پانچ منٹ کے لئے مل لوں؟“

نوری نے نظر اٹھا کر جو دیکھا تو نائب الشیخ کو ہٹکا بٹکا پایا۔ وہ اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے اور ان کی

خود داری کو کچھ اس سے ٹھیس سی لگی۔ شیخ نے اپنے کو عجیب شش و پنج میں پایا۔ وہ نوری کو بے حد پسند کرتے تھے

مگر اس کی اس بات سے وہ اس وقت حواس باختہ تھے۔ اپنے کو سنبھال کر شیخ نے کہا ”میں اس حق کی

اہمیت سمجھنے سے قاصر ہوں۔“



نکلیا جناب کو اس بائے میں کسی قسم کا خاص اعتراض ہے؟

”بے شک مجھ کو اعتراض ہے“

”مذہبی نقطہ نظر سے یا دنیاوی نقطہ نظر سے“

شیخ چونکہ پھر شیخ تھے وہ بولے ”مذہبی نقطہ نظر سے اور نیز دنیاوی نقطہ نظر سے کیونکہ ہمارا دین اور دنیا

الگ الگ نہیں“

نوری نے خوش ہو کر کہا مگر دین کو دنیا پر سبقت ہے۔ سب سے پہلے ہمارا مذہب ہے اور پھر دنیا“

”شیخ نے بھی خوش ہو کر کہا ”بیشک، بیشک تم صحیح کہتے ہو“

”پھر جب خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں کو مخاطب ہو کر قرآن پاک میں کہہ دیا کہ اُن عورتوں سے نکاح کرو

جو تم کو بھلی معلوم ہوتی ہوں تو پھر کون سا اعتراض رہ گیا؟ یہ کہتے ہوئے نوری نے آیت نکاح پڑھ کر سنائی۔

شیخ صاحب اس رنگ میں بحث کرنے کو خصوصاً نوری کے سے نہی تہذیب کے دلدادہ نوجوان نے قطعی

تیار نہ تھے اور نہ ہی اُن کو امید تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہیں مگر جواب دینے کے لئے کہا کہ ہاں یہ مذہباً جائز

تو ہو سکتا ہے مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا، اور خصوصاً آج کل کے زمانہ میں“

نوری نے فوراً شیخ کی کمزوری کو محسوس کیا اور کہا ”آپ کا کیا خیال ہے اگر آج کل ہم لوگ سنت رسول اللہ

کی پیروی کریں؟ کیا یہ مستحسن نہیں ہے؟“

شیخ نے فوراً کہا ”خدا ہم کو رسول اللہ کی پیروی کی توفیق دے“

نوری نے فوراً جیب میں سے ایک پرچہ نکال کر شیخ کے ہاتھ میں دے دیا۔ شیخ کی آنکھوں کے سامنے حسب

ذیل عبارت تھی:-

(۱) ”جابر سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے نکاح کا پیغام

کسی عورت کی طرف بھیجنا چاہے تو ہو سکے تو اُس کو دیکھ لے جس سے نکاح کا ارادہ ہو پھر نکاح کرے“

(ابن داؤد)

(۲) ”منیر بن شعبہ سے روایت ہے پیام کیا میں نے نکاح کا ایک عورت کے ساتھ زمانے میں رسول اللہ کے

آپ نے فرمایا کہ تو نے دیکھ بھی لیا ہے اُس کو؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ دیکھ لے اُس کو، اس سے الفت زیادہ ہوگی تم

(نسائی)

دونوں میں۔

(۳) ابوہریرہ سے روایت ہے پیغام بھیجا ایک آدمی نے مدینہ والوں کے یہاں۔ فرمایا اُس کو رسول اللہ نے تو نے اُس کو دیکھ بھی لیا ہے یا نہیں اُس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا اُس عورت کو دیکھ لے۔ یعنی بغیر دیکھے نکاح کرنا اچھا نہیں۔  
(نشانہ)

شیخ نے ان احادیث کو پڑھا۔ وہ ان احادیث کو کبھی پہلے بھی پڑھ چکے ہونگے مگر اُن کے لئے گویا اس وقت یہ بالکل نئی تھیں۔ وہ خاموش تھے اور کچھ بولنے میں ان کو تامل تھا کہ نوری نے اُن سے کہا کہ ”کیا آپ مجھ کو ان احادیث پر عمل نہ کرنے دیں گے؟ کیا واقعی ہم اس زمانہ میں رسول اللہ کی نصیحتوں سے بے نیاز ہیں اور وہ ہمارے لئے بے کار ہیں؟“

شیخ نے کہا ”ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔“ گفتہ رسول سر آنکھوں پر گریں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر تمہارا اس درخواست سے مطلب کیا ہے۔ اگر فرض کرو تمہاری منسوبی بیوی تم کو ناپسند ہوئی تو کیا تم اس نسبت کو توڑ دو گے اور نکاح نہ کرو گے؟“

نوری نے جواب دیا ”اس سے تو شاید آپ بھی اتفاق کریں گے کہ اُس صورت میں مجبوری ہوگی۔“  
”تو اس شرط پر تو تمہاری شادی صرف یورپ ہی میں ہو سکتی ہے“ شیخ نے کچھ ترش و مہو کر کہا۔ ”مجھ کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ میری لڑکی سے نسبت کرنے کے لئے لوگ گاہک بن کر آئیں اور ناپسند کر کے چلے جائیں۔ کیا تم نے میری عزت و آبرو کا اندازہ غلط لگایا ہے؟ کیا تم نہیں خیال کرتے کہ ناعب الشیخ کی توہین ہوگی۔ معاف کیجئے میں اس قسم کی گفتگو پسند نہیں کرتا جس میں میری عزت و آبرو کا سوال ہو۔“

نوری بھی پختہ ارادہ کر کے آیا تھا اور اُس نے بھی کچھ تیز ہو کر کہا ”بیشک آپ مصر میں وہ عزت رکھتے ہیں جو دوسروں کو نہیں مگر مجھ کو اجازت دیجئے کہ عرض کروں کہ پھر بھی آپ کو وہ عزت نہیں حاصل ہے جو امیر المومنین عمر ابن الخطاب کو مدینہ میں حاصل تھی اور آج ساری دنیا میں حاصل ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ حضرت عمر نے اپنی بیٹی ام المومنین حفصہ کو حضرت عثمان کے سامنے پیش کیا اور بھلح کی خواہش ظاہر کی اور جب حسب خواہش جواب نہ ملا تو پھر اُن کو حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش کیا اور وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ کیا اس سے اُن کی عزت میں خدا نخواستہ بڑھ لگ گیا؟“

شیخ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور وہ لا جواب ہو کر بولے کہ ”وہ دونوں حضرات تو اُن کے دوست تھے۔“  
”مگر میں بھی تو آپ کے عزیز ترین دوست مرحوم کی نشانی ہوں۔“

شیخ نے نظر نہی کر لی اور کچھ تامل کے بعد کہا ”مجھ کو کوئی انکار نہیں ہے“ یہ کہتے ہوئے شیخ گھر میں چلے گئے۔

(۳)

نوری کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریشمی سیاہ پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہوا۔ حالانکہ دن تھا مگر کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے بجلی کا لیپ روشن تھا۔ سامنے کرسی پر سیاہ گاؤن پہنے ایک سولہ یا سترہ سال کی نہایت ہی حسین لڑکی بیٹھی تھی۔ نوری کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوری نے سلام کیا کچھ جواب نہ ملا اُس نے دوبارہ سلام کیا تو لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ لڑکی کی نظریں نہی تھیں صرف داخل ہوتے وقت اُس نے ایک لمحے کے لئے نظر اٹھا کر نوری کو ضرور دیکھا تھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی اور اُس نے نوری سے بیٹھنے تک کو نہ کہا۔ نوری اجازت طلب کرتے ہوئے بیٹھ گیا مگر لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا اور کھڑی ہی رہی۔ نوری کھڑا ہو گیا اور کہا کہ بیٹھ جائیے۔ نوری نے اپنی کرسی قریب کر لی اور کہا ”مجھ کو خضر ہے کہ میں اس وقت اپنی منسوبی کی نازی خانم کے سامنے بیٹھا ہوں اور اُن سے کچھ گفتگو کرنے کا مجھ کو موقع ملا ہے۔ کیا مجھ کو اجازت ہے؟“

نازلی نے دبی زبان سے کہا ”فرمائیے“

”آپ میرے نام سے تو واقف ہی ہونگی کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہ مجوزہ رشتہ پسند ہے؟“ اس کا نازی نے کوئی جواب نہ دیا اُس کے چہرہ پر ایک خفیف سازنگ آیا اور چلا گیا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہی تھی اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی داہنے ہاتھ سے کرید رہی تھی۔

”انداز سے نوری نے معلوم کر کے کہا میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں“ اسی سلسلہ میں نوری نے پوچھا

”کیا آپ میری اس ملاقات کو ناپسند کرتی ہیں؟“

”جی نہیں“

”تو پھر آپ نے اپنے والد صاحب سے اس بارے میں غیر آمادگی کا اظہار کیوں کیا تھا؟“

نازلی کے لبوں پر کچھ مسکراہٹ آئی لیکن شرم کی وجہ سے شاید کچھ نہ کہہ سکی۔ نوری نے فوراً کہا ”آپ کو

اس بات کا جواب ضرور دینا پڑے گا اور میں بے پوچھے نہ مانوں گا“

نازلی نے کچھ تامل سے کہا ”میں نے یونہی کہہ دیا تھا“

نوری نے برجستہ کہا ”تو اس سے یہ مطلب میں نکال سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں“۔ نوری نے یہ

کہتے ہوئے نازی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر کہا ”سچ سچ بتائیے کیا آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں میں آپ کی

دل کی بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

نازلی کی نظریں نیچی تھیں اُس کے سرخ اونی شال پر کبلی کی روشنی چمک رہی تھی جس کا عکس اُس کے چہرہ پر پرکڑ سیاہ گاؤں کے ساتھ ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اُس نے ذرا تامل سے کہا ”میں آپ کو دیکھنا چاہتی تھی“

لےنے کا تو مجھ کو خیال بھی نہ آسکتا تھا۔“

دیکھا آپ مجھ کو بنا سکتی ہیں کہ آپ مجھ کو کیوں دیکھنا چاہتی تھیں، یہ سوال کرنے میں نوری کو خود ہنسی آگئی۔

نازلی نے بھی اب ہمت کر کے کہا ”پہلے آپ بتائیے کہ آپ آخر کیوں مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ جس لئے آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے اُسی لئے میں بھی چاہتی تھی کہ آپ کو دیکھ لوں۔“

نوری نے کہا کہ میں تو آپ کو اس لئے دیکھنا چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی میں نے اپنی بہن اور ماں سے آپ کے بارے میں سنا ہے اُس کی تصدیق کر لوں مگر یہ بتائیے کہ آپ کیوں مجھ کو دیکھنا چاہتی تھیں؟

نازلی نے اب نظریں اوپر کر لی تھیں اور وہ اب روبرو ہو کر باتیں سن رہی تھی۔ اُس کا ان سوالات پر کچھ منہ ہی سی بھی آ رہی تھی اور اُس نے جواب دیا کہ ”میں تو یونہی دیکھنا چاہتی تھی۔“

”مگر میں آپ سے بغیر اس کی وجہ پوچھے نہ مانوں گا۔“

”نازلی نے کہا ”مجھ کو معلوم ہی نہیں تو پھر بھلا آپ کو کیا بتاؤں۔“

نوری کو اس جواب سے اطمینان ہو گیا لیکن اُس نے اب دوسرا سوال پیش کر دیا۔

”میں جب پیرس میں بیمار پڑ گیا تھا تو آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے دو مرتبہ اپنے خطوط میں میری بہن کو لکھا تھا کہ تمہارے بھائی اب کیسے ہیں۔ یہ آخر آپ نے کیوں لکھا تھا؟“

نازلی کو اس بات پر ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگی ”معاف کیجئے گا آپ کیسے سوالات کر رہے ہیں۔ کیا کسی خیریت دریافت کرنا گناہ ہے؟“

نوری نے کہا ”اچھا آپ صرف یہ بتائیے کہ کیا آپ میری بیماری کا حال سن کر کچھ متفکر ہوئی تھیں اور کیا آپ کو میرا کچھ خیال آتا تھا؟“

نازلی نے سمجھ لیا تھا کہ ایسے سوالوں سے نوری کا کیا مطلب ہے اور اُس کو بھی ان سوالات میں دلچسپی آ رہی تھی اُس نے بجائے جواب دینے کے ہنستے ہوئے کہا ”اچھا پہلے آپ بتائیے کہ اگر اُسی زمانہ میں میں بیمار پڑتی اور آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ میری خیریت دریافت کرتے یا کچھ متفکر ہوتے یا آپ کو میرا کچھ خیال آتا؟“

نوری نے کچھ لا جواب ہو کر کہا ”میرا خیال ہے کہ ضرور مجھ کو بہت خیال آتا اور فکر بھی ہوتی اور میں خیریت بھی دریافت کر آتا“

نازلی کامیابی کی خوشی کے لمحہ میں نیزی سے بولی ”آخر کیوں، آخر کیوں۔ نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا اور نہ ہی آپ نے مجھ کو دیکھا تھا“

نوری اس مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ نازلی کا ہاتھ بدستور اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ اُس نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے دباتے ہوئے عجیب پیرایہ میں کہا ”میری جو باتیں خود کچھ میں نہیں آتی تھیں اُن کو میں دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کی طرف سے جو خیالات میرے دل میں تھے کیا ویسے ہی میری طرف سے آپ کے دل میں بھی ہیں“

”پھر آپ نے کیا پایا؟“

”آپ کی اور اپنی حالت کو یکساں پایا۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم دونوں میں محبت کی بنیاد دراصل اُس وقت سے ہی استوار ہو گئی جب ہم دونوں کو اس کا علم ہوا کہ یہ رشتہ قائم ہوگا“

اس کا جواب نازلی نے کچھ نہ دیا صرف اس کے نرم ہاتھ کو ایک جنبش سی ہوئی جو نوری کے ہاتھ میں تھا اور یہی جواب تھا جو اُس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا۔

نوری نے متاثر ہو کر کہا ”ایک سوال اور کروں گا اور اُس کا جواب خدا کے واسطے ضرور دینا۔ وہ یہ کہ آپ نے جو اپنے ہاتھ سے ایک جھگل کے سین کی رنگ برنگی تصویر بنا کر میری بہن کو بھیجی تھی وہ کیوں بھیجی تھی؟“

”وہ میں نے اس لئے بھیجی تھی کہ انہوں نے مجھ کو تصویروں کا ایک البم بھیجا تھا۔ تبادلہ تحفہ جات تو ایک پرانی رسم ہے“

نوری نے کچھ بیتاب ہو کر کہا ”خدا کے واسطے ذرا اپنے دل کو ٹٹولئے اور اچھی طرح ٹٹولئے۔ ہر معاملہ میں میرا اور آپ کا حال ایک سا ملتا ہے۔ بخدا مجھ کو تو ایسا معلوم ہوا کہ تصویر آپ نے میری بہن کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے بھیجی تھی۔ تاکہ میں دیکھوں اور خوش ہوں۔ اُس وقت جس وقت تصویر آئی تو میرے دل میں یہی خیال تھا اور اب بھی یہی خیال ہے۔ سچ سچ کہنے کا کہ جس وقت آپ تصویر بھیج رہی تھیں کیا آپ کے دل میں کچھ میرا خیال آیا تھا؟“

نازلی کچھ حیران سی رہ گئی کیونکہ اس وقت نوری نے اُس کے دل کی گہرائی کا اس طرح پتہ لگا لیا کہ اس

کو وہم و گمان بھی ہونا ناممکن تھا۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکی اور حیرت میں تھی۔ ساتھ ہی حقیقی جذبات بھی اُس کو بولنے نہ دیتے تھے۔ زوری نے اصل کیفیت کو سمجھ لیا اور اصرار کے ساتھ کہا ”اس بات کا میں آپ سے ضرور جواب لوں گا۔ یہ میرا آخری سوال ہے اور میں اس وقت آپ کے جواب، صحیح جواب کا بیٹا بننا انتظار کر رہا ہوں۔ بتائیے تو سہی کہ وہ تصویر آپ نے کس کے لئے بھیجی تھی؟“

”آپ کے لئے،“ یہ کہہ کر نازلی نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

زوری کی آنکھیں چمکنے لگیں اُس کا دل اس جواب کو سن کر دھڑکنے لگا۔ اُس نے زور سے نازلی کا ہاتھ گریلا علمی میں دبایا اور خوش ہو کر اُس کے منہ سے نکلا ”بخدا“

”بخدا“ نازلی کی بھی زبان سے نکلا۔

دونوں غھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ نازلی نیچی نظریں کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ زوری نے گھڑی دیکھی اور چاروں طرف دیکھ کر نازلی کا ہاتھ آہستہ سے چھوڑ دیا۔ اپنی جیب سے اُس نے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکالی جس کی دمک سے بجلی کی روشنی میں آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ نازلی نے آنکھ کے گوشہ سے انگوٹھی کو دیکھا تو اُس نے مسکرا کر کہا ”یہ آپ کے لئے ہے،“ ہاتھ پکڑ کر کہا ”کیا آپ اجازت دیتی ہیں“ اور یہ کہتے ہوئے نازلی کی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر اُس کے ہاتھوں کو بلوں سے لگا کر آہستہ سے چھوڑ دیا۔ ”خدا حافظ۔ خدا حافظ“ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک طویل مصافحہ کیا۔ اور پھر خدا حافظ کہہ کر اجازت چاہی ”خدا حافظ“ نازلی نے آہستہ سے کہا۔ چلتے چلتے دروازہ سے مڑ کر اُس نے نازلی کی طرف دیکھا جو خود اُس کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

## مرزا عظیم بیگ چغتائی

اگر تم کسی سے نہایت پاک نفسی اور اجتماعی سے محبت کرتے ہو تو عنقریب تم تمام نیک نوع انسان کو محبت کی نگاہ سے دیکھو گے۔ اس آسمان میں آسمان گرد آفتاب کی طرح دل بھی قطرہ شبنم سے لے کر سمندر تک ایک آئینہ کے سو کسی پر نظر نہیں کرتا۔ وہ آئینہ جسے یہ اپنی شعاعوں سے گرم کرتا اور زریں و سیسے بنا تلہ ہے۔ — پرچہ

# غزل

جہان جلوے سے تیرے اگر نہیں معمور  
 بنا دو تم مرے دل کو جلا کے وہ اکبر  
 یہ کم ہے کیا صلہ عشقِ ناصحِ مشفق  
 بنا دیا غم پنہاں کو برقِ ہستی ہو  
 نہ ہے کرامتِ صبر و زہے تم تسلِ عشق  
 ترے سبب سے ہمیں خللِ عشق حاصل ہے  
 میں اور موت کا طالب ہوں اے غمِ دور  
 مثالِ مردہ چل امواج کے اشاروں پر  
 صلائے عام ہے جو آرائیں اہلِ حبس  
 فروغِ گلشنِ ہستی فقط مت شاہ ہے  
 گل و گہر سے سجا نا انہیں نہیں منظور  
 تو ماہِ و انجم و خورشید میں ہے کس کا نور  
 کہ جس سے سائے زمانے کا ہو سکے غمِ دور  
 خیالِ راحتِ ہر دو جہاں ہے دل سے دُور  
 نثار ہوں ترے فیضِ کرم کے طبعِ غبور  
 وہ دل جو پہلے تھا پروانہ اب ہے شمعِ نور  
 تجھی کو ہم کہیں ظالم یہ عقل کا ہے فتور  
 حیاتِ عشق میں فردوس کیا نہیں مستور  
 جو بحرِ زلیست میں ہے تجھ کو عافیت منظور  
 کہ ہم سا کوئی نہیں بے زبان اور جبور  
 گل و گہر سے سجا نا انہیں نہیں منظور

جگر دیا تئیں نا کامیوں نے کچھ نہ سبق

ذرا امید نے چھیڑا کہ ہو گئے مبرو

جگر بریلوی

# میزبان نوازی

انصاف اس امر کا مقتضی ہے کہ نخر کر کرنے سے پہلے میں اپنی غلطی کا اعتراف کروں کہ میرا ہی تصور تھا..... محض میرا..... اپنا..... تصور! مجھ کو ہرگز یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ مجھ کو معلوم تھا۔ خوب معلوم تھا میں ہمیشہ سے جانتا ہوں کہ دوسرے لوگوں کے گھروں پر جانا اور وہاں رہنا سراسر دیوانگی ہے! تاہم مجھ سے دانستہ غلطی سرزد ہوئی۔۔۔۔۔ ایسی غلطی جس کا کفارہ تازیست ادا ہونا محال ہے۔ نہ معلوم مجھ پر کیا سودا سوار ہوا کہ یہاں چلا آیا۔ اب تو کوئی امید باقی نہیں۔ ۱۱ نمبر سے پہلے نجات ملنا مشکل ہے۔ مفر کا کوئی راستہ نہیں۔

یہ تحریر میں ایسی عافیت کی جگہ بیٹھا لکھ رہا ہوں جہاں انسانی آنکھ مجھ کو نہیں دیکھ سکتی میں ہمت فلی خاں کے باغ میں حوض کے کنارے بیٹھا ہوں۔ وہ لوگ اس کو تیرنے کا تالاب کہتے ہیں۔ صبح ہی صبح برف جیسے ٹھنڈے پانی میں مینڈک کی طرح اچھلتے ہیں۔ خدا ان کو سمجھے! صبح چھ بجے کا وقت ہے مشکل سے ایک گھنٹہ باقی ہے جو میں سکون کی زندگی گزار سکوں ورنہ دوسرا ذریعہ نجات میرے لئے موت کے سوا اور کوئی نہیں! کیونکہ ابھی ذرا دیر میں مس اسرائیل صاحبہ (آپ ایک یہود ہیں اور فلسطین سے تشریف لائی ہیں) اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر چلائی گی۔ ”آہا! کیسی زوردار صبح ہے! کیا سب لڑکے ابھی سو رہے ہیں! (ان لڑکوں میں سے دو ایک کے دائرہیاں بھی ہیں جن کی سیاہی پر سفیدی کا حملہ ہو چکا ہے) مس صاحبہ کا جواب جو شیلے نوجوان مرزا صاحب شبنم آلود جھاڑیوں میں سے فاختہ کی آواز میں دیں گے۔ کو۔۔۔۔۔ امی!“ اگر مسئلہ نناخ میں کوئی حقیقت ہے تو ضرور ایک دن وہ فاختہ کا جسم اختیار کر لیں گے۔ کچھ دیر بعد خان بہادر بہت فلی خاں صاحب خود منہ میں ڈیڑھ گز لمبا سا گار لگائے شافوں پر بڑے بڑے تولیے ڈالے باہر نکل آئیں گے اور چلائیں گے۔ ”ارے بھئی! کوئی صاحب ہیں تیار غوطہ لگانے کے لئے؟“ غور کیجئے عین طلوع آفتاب کے وقت ہمارا منہ غوطہ!!

خدا بچائے تمام مسلمانوں کو ہر ایسے عذاب سے! اٹائے ہائے! مجھ کو تو اس خیال سے ہی لرزہ چڑھتا ہے۔ اس پر طو پر کہ ناشتے کے لئے سب اس طرح جمع ہونگے جیسے مذبح پر چیلیں منڈلاتی ہیں۔ کوئی کھڑا کھڑا گرم چائے کے گھونٹ منہ کے ساتھ حلق سے اتار رہا ہے۔ کوئی کرسی کے ڈنڈے پر بیٹھا ہے۔ کوئی صاحب کسی کے سامنے سے روٹی



لے بھاگے۔ لطف یہ ہے کہ تمام اس قسم کے مہمان جن کے لئے ”مس صاحبہ“ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے آرام کو کر سکیں پر ڈٹ جائیں گے۔ بغیر اس بات کی پروا کئے ہوئے کہ باقی ماندہ معقول صورت اور معقول وضع اشخاص کو جگہ ملے گی یا نہ ملے گی! اُن کی بلا سے!

میں جانتا ہوں اس میں کسی دوسرے کا ذرا بھی قصور نہیں! اپنے ہی گناہ کی سزا عسکت رہا ہوں! خود کو راعی بنے نیست! میری زندگی کا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ میں نہ کسی کے یہاں مہمان کی حیثیت سے جاتا ہوں نہ کسی کو اپنے یہاں بلاتا ہوں۔ اگر مجھ کو کوئی اس قسم کی تخریر موصول ہوتی کہ ”موٹر اسٹیشن پر ملے گی وغیرہ وغیرہ“ تو میں لکھ بھیجتا ہوں ”کوئی وجہ نہیں کہ موٹر اسٹیشن پر ہو۔ اُس کے کھڑا کرنے کے لئے بہت جگہ ہے۔ بلکہ بہتر ہو اگر آپ اس کو اپنے مکان کی چھت پر رکھیں!“ اگر کسی فیشن ایبل خاتون نے اپنے گلاب کی راکھ سے بنے ہوئے کاغذ پر لکھا ”کیا آپ ۱۲ ستمبر کے ساڑھے تین بجے رہے ۱۴ کے چارنگ کا وقت دے سکتے ہیں“ تو میں نے لکھ بھیجا ”خاتون آپ ایک مہینہ لے لیجئے یا پورے سال لے لیجئے مگر مجھ کو یہاں ہی رہنے دیجئے“ اس قسم کے تمام اصول میں خاص طور پر فائدہ مند پاتا ہوں +

لیکن اس دفعہ میں نے خود اپنے پاؤں پر کلھاری ماری۔ واقعہ یہ ہے کہ کم نصیبی سے کسے یا شامت اعمال کے زور سے یا محض اتفاق سے ایک دن مجھ پر وہ دماغی کیفیت طاری ہو گئی جس کو لوگ جولانی طبع سے موسوم کرتے ہیں، جب دماغی عناصر سے گرائی دور ہو جاتی ہے اور انتشار کے بدلے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، جب انسان اپنے آپ کو اپنی حقیقی شخصیت سے مختلف پاتا ہے اور اپنے کو ملنسار، ظرافت پسند، خوش مزاج اور ہنسنے ہنسنے والا تصور کرنے لگتا ہے۔ ایسی کیفیت وقتاً فوقتاً ہم میں سے اکثر پر طاری ہو جاتی ہے بعض لوگ ایسی کیفیت کے لئے ایک عامیانا محاورہ ”مخمور ہو جانا“ استعمال کرتے ہیں! اس سے کیا بحث کہ وہ کیا کہتے ہیں یا کیا کہتے ہیں کہ بہر حال ایک دن میری حالت ایسی ہی تھی کہ اتفاق سے لکھنؤ کے کلب میں اپنے ایک پرانے واقف خان ہساد ہمت قلی خان سے ملاقات ہوئی۔ خوب ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں میں نے طرح طرح کے پُر لطف قصے اُن کو سنائے دیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ کو صرف چار قصے یاد ہیں، اور پانچواں ایسا ہی ادھر اس یاد ہے لیکن ایسی خاص کیفیت کے طاری ہو جانے کے بعد میں ان ہی قصوں کو مختلف طرح سے سنا دیتا ہوں۔ طرز بیان کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے جو عموماً ایسی حالت میں ہو جاتا ہے۔ شاید چلتے وقت میرے مصافحہ کرنے کی گرمجوشی دیکھ کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا یا کیا سبب تھا انہوں نے بہت اصرار سے کہا ”دراے بھٹی تم ضرور بالضرور اکتوبر میرے پاس آجیو“

گزارو۔ میں نے چند اور لوگوں کو بھی بلایا ہے، مگر تمہاری موجودگی سے بہت زیادہ لطف ہے گا۔ تم جیسا زندہ دل آدمی تو ہم جیسے سوتے ہوئے لوگوں کو جگا سکتا ہے! میں نے جہاں تک مجھ سے ہو سکا ایک قہقہے اور چخ کو ایک ساتھ ادا کرتے ہوئے کہا: ”واللہ! اچھی تجویز ہے! ضرور لیجئے! آؤں گا!“

لیکن ایک گھنٹہ بعد میں کفِ افسوس مل رہا تھا اور رہ کر اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا کہ کیوں وعدہ کیا کیوں از خود رفتہ ہو گیا! ..... سوتے ہوئے لوگوں کو جگا دوں! کیا کہا؟ میں اور ایسے فرائض؟ استغفر اللہ! .....!

میں نے سوچا ممکن ہے وہ بھول جائیں، لیکن نہیں صاحب! ستمبر کے آخری ہفتے میں میرے پاس بیگم ہمت قلی خاں کی مجبور کر دینے والی چٹھی آپہنچی کہ ”..... مہمانوں کی ایک چھوٹی سی پارٹی ہوگی۔ لیکن بغیر آپ کے کچھ لطف نہ ہے گا۔ ہم سب کو جگانے کے لئے آپ کی سخت ضرورت ہے!“ میرے خدا! میں کس قسم کی الارام گھڑی میں جو میری اتنی سخت ضرورت ہے!

جہاں زندگی کی اور مصیبتیں ہیں وہاں میرے لئے استقبال بھی ایک بڑی مصیبت ہے اگر کوئی میرا استقبال کرتا ہے تو مجھ سے عداوت خریدتا ہے۔ انتقام کی آگ سینے میں بھڑکا دیتا ہے۔ میں ڈیرہ دون کے اسٹیشن پر اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمت قلی خاں مع اپنی بیگم صاحبہ اور آٹھ دس مہمانوں کے موجود ہیں۔ میری روح فنا ہو گئی! یکا یک کسی نے مجھے اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ دیا۔ پھر کسی نے پوری طاقت سے چار پارچہ ہاتھ میری کمر پر رسید کئے۔ ایک صاحب اتنے تیز تھے کہ میری انگلیاں پکڑ کر اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ قریب تھا کہ میرا ہاتھ شانہ سے علیحدہ ہو جائے کہیں اس عالم بہ جواسی میں میرے منہ سے نکل گیا کہ ”خان بہادر مع آفت کے تشریف لائے ہیں!“ بس بیگم ہمت قلی کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ان کے ساتھ ہی سب لوگوں نے ایک ہیبت ناک منقہ لگایا۔ میرا دم اور خشک ہو گیا۔ یا سبب الاسباب! اس میں کون سی ہنسی کی بات تھی؟ بیگم ہمت قلی نے کہا ”جب ہی تو میں کہتی تھی کہ آپ کی سخت ضرورت ہے! ہمت قلی صاحبے سب لوگ یہاں نہیں آئے ہیں کئی ایک گھر پر ہی رہ گئے!“ گھر پہنچا تو پچھلک پر آٹھ دس مرد عورت لڑکی لڑکوں کا مجمع اور تھا۔ دور سے ہی کسی نے بندوق دکھائی کسی نے ٹینس کے بلبے سے دھمکیاں ایک جھماکے نے کتا ہی چھوڑ دیا۔ اور کتوں سے میرا دم فنا ہوتا ہے! ..... اسی کو بیگم ہمت قلی نے چھوٹی سی پارٹی لکھا تھا۔ مگر آپ کیا ہو سکتا تھا۔ میرا اپنا قصور تھا! نوشتہ تقدیر کو کس نے مٹایا ہے! سیرا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ تین چار

آدمی اور میری ہی طرح کے دبے پتلے، خاموش زندگی پسند کرنے والے، کم سخن، تنہائی پسند وہاں ہونگے، جن کے کبھی نہ بات کرنے کی نوبت آئے گی نہ اُن کے نام پوچھنے کی مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نکلا!

لیکن بہت جلد مجھ کو احساس ہونے لگا کہ میرے میزبان کو میری طرف سے سخت ایووسی اور ناامیدی تھی۔ انہوں نے کہا تو نہیں لیکن تب بھی میں جانتا تھا! مجھ کو اندازہ ہوا کہ میری حاصل کردہ تعلیم بالکل نامکمل اور ادھوری تھی۔ علم کے چند نہایت ضروری شعبوں سے مجھ کو بالکل بے بہرہ رکھا گیا تھا۔ مجھ کو ذرا بھی معلوم نہ تھا کہ اگر کوئی اپنا مکان اور اُس کے متعلق دوسری چیزیں دکھائے تو کن الفاظ کا استعمال مناسب اور موزوں ہوگا۔ میں نہ جانتا تھا کہ اگر کوئی اپنا مکان، زمین، درخت یا جھاڑیاں دکھائے تو کیا کہنا چاہئے۔ حالانکہ میں اسی قسم کی چیزیں تمام عمر دیکھتا رہا ہوں۔

ہمت قلی خاں نے کہا ”دیکھیے یہ ہمارا نیا بڑا پھانک ہے ہم نے اسی سال لگایا ہے!“ میں ”ہوں!“ بس میں نے اس سے زیادہ نہ کہا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ پھانک کو اس سال نہ لگاتے اور اگر انہوں نے نہ بھی لگایا ہوتا تو مجھ کو ذرا بُرا نہ لگتا! اور اگر وہ ایک ہزار برس پیشتر اس کو لگا چکے ہوتے تب بھی میرا کیا بگڑتا تھا!

”اس کے لگاتے وقت اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔ بالآخر یہی طے پایا کہ چونے کا پلاستر ہونا چاہئے“ میں یہ واقعی؟ اس سے زیادہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ کیونکہ مجھ کو یہ معلوم نہ تھا کہ کس کا جھگڑا کس سے ہوا اور کون کس پر غالب آیا یا کس نے کس کو ہرایا۔ ادھر خواہ چونے کا پلاستر ہو یا کتھے کا پلاستر ہو میرے لئے سب یکساں ہے۔

”یہ گھاس کا خطہ ہم نے اُس سال تیار کیا تھا جب ہم پہلے پہل یہاں آئے تھے۔“ میں چیپ رہا۔ انہوں نے چیمبتی ہونی نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی ایک خلوص کی نظر سے اُن کو دیکھا۔ کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ میں اُن کا یقین نہ کروں!

یہ کتا بے پر جو مٹر کے پھول لگے ہیں یہ تجربہ کے طور پر لگائے ہیں۔ ان کا بیج بلخ سے منگایا تھا۔ میں نے گہری نظر سے پھولوں کی طرف دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ بیج اگر بلخ سے آیا تھا تو بہت اچھا ہوا۔ میں کتا ہوں کہ اگر سرفند سے آتا تو کیا بُرا تھا۔ اور نہ آیا تو کیا نقصان ہوا؟ تجربہ کے لئے لگائے۔ خوب کیا! اگر مٹر نہ لگاتے اور آلو بخارا لگاتے تو میرا کون ہرج تھا! مجھ کو خیال ہوا کہ ہمت قلی صاحب مجھ سے بالکل بائوس ہو گئے ہیں۔ مجھ کو

اُن کی حالت پر اپنے دل میں ترس آ رہا تھا۔ مگر میں مجبور تھا۔ میرا ذرا قصور نہ تھا۔ کیونکہ میرے سرپرستوں نے مجھے معصیٰ اصلی اور ضروری تعلیم نہ دی تھی۔ مجھ کو کسی استاد نے نہ سکھایا تھا کہ ایسے مواقع پر کیا کہنا چاہئے۔

مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر دوسرے لوگ کس خوبی سے گفتگو کر لیتے ہیں۔ میرے دوست جوا مرزا میری ہی طرح معمولی قابلیت رکھتے ہیں، اُن میں کوئی خاص خصوصیت نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑے باتون ہیں اور خواہ مخواہ غل بچاتے ہیں۔ غرض کہ وہ مجھ سے ہر طرح کم ہیں لیکن مجھ کو ماننا پڑے گا کہ سفید فلالین کی پتلون اور نیلی فلالین کا کوٹ پہن کر اس خاص فن میں انہوں نے مجھ کو ہرا دیا ہے۔

ہمت قلی جب اُن کو مکان دکھانے لے چلے تو میں اُن کے ساتھ ہولیا۔ ہمت قلی نے کہا یہ بھانک ہم نے اس سال لگایا ہے۔ مرزا نے ایک مغرضانہ انداز سے اُس کی طرف دیکھا۔ آپ کو معلوم ہے یہ اگر میرا بھانک ہوتا تو میں کیا کرتا۔

وہ ”نہیں“

مرزا ”میں بہت چوڑا بناتا۔ اس میں تو نکلنے کی جگہ ہی نہیں۔ اور انہوں نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔

”اس کی تعمیر کے وقت بڑا جھگڑا ہوا مگر آخر ہم نے چوڑے کے پلاستر کا فیصلہ کیا“

مرزا ”افوہ! آپ نے کیسی غلطی کی“ یہ کہہ کر انہوں نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر زور زور سے پھانک کے ایک ستون پر مارنا شروع کیا جس سے پلاستر کے بڑے بڑے ٹکڑے ٹوٹ کر گرنے لگے۔ دو ایک اینٹیں بھی گریں ”دیکھئے گلتا کمزور ہے“ ہمت قلی نے کچھ نہ کہا۔ اُنہوں نے پھر اپنا گھاس کا خطہ دکھایا

مرزا ”اے صاحب! یہ تو بہت خراب لگا ہے۔ دیکھئے میں اس میں اپنی ایڑی سے گڑھے کھود سکتا ہوں!

یہ کہہ کر مرزا نے حیرت انگیز طاقت سے تین چار لائیں اس زور سے چلائیں کہ آس پاس کی سب گھاس غائب ہو گئی! ”دیکھا آپ نے!“

ہمت قلی ”یہ کنارے پورے جو گلے ہیں تجربہ کے طور پر لگائے گئے ہیں، بیج بلخ سے منگایا تھا“

مرزا ”مگر صاحب یہ تو آپ نے بالکل غلط لگائے ہیں۔ ان کا رخ سورج کی طرف سے زمین کی طرف

ہونا چاہئے تھا نہ کہ زمین کی طرف سے سورج کی طرف۔ ذرا ٹھیرے“ یہ کہہ کر انہوں نے قریب پڑا ہوا ایک پھاڑا

اٹھالیا اور دس بارہ پودے اکھاڑ ڈالے۔ آپ نے دیکھا میں ان کو کتنی آسانی سے اکھاڑ سکتا ہوں۔ بالکل غلط

لگے ہیں“

اب تو میں مطلوب سبق سیکھ چکا تھا۔ مجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ پہلے تو دوسرے کی چیزوں کو اپنا سمجھ لینا چاہئے اور پھر اُن کو توڑ دینا چاہئے۔ چنانچہ جب ہمت قلی اپنے ملاقات کے کمرے کی تصویریں دکھانے اور اُن کی خوبیاں بیان کرنے لگے تو میں نے کہا ”آپ کو معلوم ہے کہ اگر یہ تصویریں میری ہوتیں تو میں کیا کرتا؟“

وہ ”نہیں“

میں ”یکلخت ان سب کو توڑ ڈالتا اور پھاڑ ڈالتا“

یہ کہہ کر میں نے ارد گردِ کمرے یا ہتھوڑی کی تلاش میں دیکھا مگر باوہسی ہوئی۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ہمت قلی ایک عجیب انداز سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر میں اندازہ نہ کر سکا کہ یہ تجویز اُن کو پسند آئی یا نہیں۔

چائے کے وقت بیگم ہمت قلی اپنے لڑکوں کی باتوں اور تعلیم کا ذکر کرنے لگیں۔ بڑے لڑکے کے گیند پھینکنے کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا اور دوسرے سے گرم چائے سے بھری ہوئی آدھی چائے دانی میرے کوٹ کے کنارے اندر خالی کر دی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ کس طرح چھوٹے لڑکے نے جاتا میں چوہے کی قسموں پر سب سے عمدہ مضمون لکھ کر انعام حاصل کیا۔

وہ ”آپ چائے اور لیں گے“

میں ”جی نہیں۔ معاف کیجئے“ اور میں اُس کرسی سے اٹھ کر دوسری پر جا بیٹھا۔

اگلے دن صبح کی چائے اور ناشتا غائب! ارے بھئی یہ کیا! معلوم ہوا بیگم ہمت قلی کا نیا چینی کتا طلوعِ آفتاب سے بہت قبل اور سپیدہ نمودار ہونے سے بھی پہلے انتقال کر گیا! ناشتے کے بجائے سب بیگم صاحبہ سے نفرت کرنے لگے۔

ایک ”والدہ کیا صدمہ ہوا ہے! لیکن مشیتِ ایزدی میں کسی کا کیا چارہ!“

دوسرا ”ٹٹے ہائے! بہت خوبیاں تھیں مرنے والے میں“

”بس اب تو یہ دعا ہے کہ پس ماندگان کو صبر آجائے“

”میری تجویز ہے کہ سب لوگ سیاہ ریشم کا ایک ایک خوبصورت پھول پہنیں“

بہر حال دہر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگذرد، اب میں سمجھتا ہوں کہ جلد میری مصیبتوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ درحقیقت اس غیر مناسب وقت میرے یہاں آنے اور اس تنہائی کی جگہ بیٹھنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ میں بہت جلد اپنی تکلیف کا خاتمہ کر دوں۔ بس حد ہو چکی! رات کھانے کے بعد بہت قلی صاحب مجھ کو علیحدہ لے گئے اور کہنے لگے کہ ہم لوگ "سیر پرستان" کا ڈراما کرنے والے ہیں۔ میں نے سب سے آپ کے اُن پُر لطف قصوں کا حال کما تھا جو آپ نے لکھنؤ میں سنائے تھے اس پر سب لڑکیوں نے (جن میں بیگم بہت قلی بھی شامل تھیں) خوب تالیاں بجائیں۔ سب کا اصرار ہے کہ آپ بھی ڈرامے میں حصہ لیں۔ آپ کے لئے تجویز پایا ہے کہ آپ سیاہ دیو کا پارٹ کریں۔ تمام باتوں کو سوچتے ہوئے خیال ہے کہ اس پارٹ کو صرف آپ ہی نہایت خوبی سے کر سکتے ہیں! یہ کہہ کر وہ گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے +

رات مجھ کو مطلق نیند نہ آئی۔ میں تمام رات جاگتا رہا! میں سوچ رہا تھا کہ تمام زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا تھا جب میں نے پبلک کے سامنے کسی فنم کی تقریر کی تھی جب میرے کلب کے وائس چیرمین صاحب سیر یورپ کے عزم سے ہم سب کو خیر باد کہہ رہے تھے اور میں نے اُن کو سائیکل کی ایک ایسی لائٹین جس میں مٹی کا تیل آسانی سے جلا سکتا ہے تحفہ میں دی تھی۔ لیکن اس موقع پر بھی میں نے کئی رات جاگ جاگ کر یہ کہنے کی مشق کی تھی کہ "حضرات! یہ لائٹین عام قسم کی لائٹینوں سے بہت مختلف ہے اس میں مٹی کا تیل نہایت آسانی کے ساتھ جلایا جاسکتا ہے اور اس کو محض ایک معمولی قسم کی دیاسلائی کے شعلہ سے مشتعل کر سکتے ہیں!" اور اب یہاں یہ لوگ مجھ سے امید رکھتے ہیں کہ میں سیاہ دیو کا پارٹ کروں؟ لیکن کیا پروا ہے! اس کی نوبت ہرگز نہ آئے گی! اب جینے کی کوئی خواہش باقی نہیں! تھوڑی دیر بعد میرا مردہ جسم تیرنے کے تالاب میں تیر رہا ہوگا! ہائیں! یہ کیا بات! میں اپنی نظر کاغذ سے اٹھاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ مکان کی طرف سے ہمت قلی خاں لپکتے ہوئے چلے آ رہے ہیں! خیریت تو ہے؟ بہت قلی کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور وہ یوں ہی کسل پیٹے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ کیا کوئی قتل ہو گیا؟ یا کسی مہمان نے زہر کھا لیا؟ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ ممکن ہے ڈراما ملتوی ہو جائے۔ . . . .! شکر ہے!

ذیل کی چند سطور میں ڈیرہ اکسپریس کے ایک بہت عمدہ درجہ میں بیٹھا ٹھہر کر رہا ہوں جو مجھ کو نہایت تیزی کے ساتھ اور آرام سے لکھنؤ واپس لئے جا رہی ہے۔ رگاول، جھونپڑیاں، بارغ کھیت تیزی کے ساتھ اڑے

چلے جا رہے ہیں۔ اُڑنے دو! میں بھی تو امن و عافیت کی طرف اُڑا چلا جا رہا ہوں! بہت قلی نے اُس وقت کہا تھا کہ ”بھئی لکھنؤ سے ٹیلیفون پر خبر آتی ہے . . . . .“ اور یہ کہہ کر انہوں نے بہت شفقت کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میرا دل چاہتا تھا اُن کو گلے لگا لوں!

میں ”کیا؟“ اور میں نے ششدر نظر آنے کی کوشش کی۔

وہ ”بہت افسوسناک خبر ہے۔ دوست! لکھنؤ میں منہاسے دفتر میں آگ لگ گئی اور تمام ضروری کاغذات جل گئے . . . . . کل شام۔ شاکر — کیا ہمتارے منشی کا یہ ہی نام ہے نا؟ — موقع پر موجود تھے۔ اُن کے سر چہرے اور ہاتھوں کے بال جل گئے! مجھ کو افسوس ہے کہ تم کو اسی وقت جانا پڑے گا!“ میں یہ اسی وقت فوراً:

وہ ”میں جانتا تھا اسی لئے میں موٹر کے لئے کہہ آیا ہوں۔ تم ساڑھے سات والی گاڑی سے جاسکو گئے اندر چلو“

میں ”اچھی بات ہے“ میں نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا تاکہ وہ میرے چہرہ پر مسرت کے آثار نہ دیکھ سکیں۔ دفتر میں آگ لگ گئی؟ خدا کا شکر ہے! شاکر کے بال جل گئے! کیا مصائبہ ہے! تمام زندگی میں اتنی بڑی خوشی مجھے نہ حاصل ہوئی ہوگی۔ ایسی اندوہناک خبر سننے کے بعد میرا اس قدر بہت آمیز اور بہادرانہ برتاؤ دیکھ کر بہت قلی بخین اور آفرین کی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے!

موٹر تیار ہے؟ مرحبا! خدا حافظ دوست! صد مرحبا! اچھی بات ہے ضرور ٹیلیفون کروں گا۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اسٹیشن آگیا۔ قلی صرف یہی دو چیزیں ہیں اور یہ لو دور روپے ہنار الانام ہے! یہ قلی بھی کیسے خوش مزاج انسان ہوتے ہیں! میں لکھنؤ جا رہا ہوں! خدا کا کتنا شکر ادا کروں! واہ شاکر خوب کیا! میری ہدایت پر حرف بحرف عمل کیا۔ شاباش ہے۔ ٹھیک وقت پر ٹیلیفون کیا۔ میں نے یہاں آنے کے اگلے ہی دن خط لکھ بیجا تھا۔ مگر مجھے خوف تھا کہ کہیں بھول نہ گیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے شاکر کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا! ممکن ہے بہت قلی کو کسی قسم کا شبہ ہو اس لئے میرا ارادہ ہے کہ لکھنؤ پہنچتے ہی اپنے دفتر میں آگ لگا دوں گا اور شاکر کے سر اور چہرے کے بال بھی جلا دوں گا۔ کیا پروا ہے!!

سید شاہد حسین

# ہندی جذبات

جب سے تم پردیس سدھائے نیند مجھے کب آتی ہے  
 ساری رات آنکھوں میں تارے گن گن کر کٹ جاتی ہے  
 گھر کے بھری برسات میں جب متوالے بادل آتے ہیں  
 ایک اُمنگ اُٹھ اُٹھ کے جی میں آٹھ پہر ٹڑپاتی ہے  
 پیارا پیارا چاند سا مکھڑا آنکھوں میں پھر ترارہتا ہے  
 رات اکیلے میں جس سے باتیں کرتے کٹ جاتی ہے  
 ایک تمہارے کارن میں نے تج دیانک سکھ سے رہنا  
 چین کسی کل جب نہ پڑے، پھر بات کوئی کب بھاتی ہے  
 سارا گھر سنسان پڑا ہے ایک تمہارے نہ آنے سے  
 رات اندھیری مجھ کو اکیلا پا کر پھاڑے کھاتی ہے  
 تم ہو جی جم، چاندنی مجھ کو دھوپ دکھائی دیتی ہے  
 سچ بچھاتی ہوں پھولوں کی تو کانٹے بن جاتی ہے  
 سانس بھی لینا ہو گئی دو بھر منہ کو کلیجہ آتا ہے  
 تم کیا جانو کوئی تمہارے پیچھے یوں گھبراتی ہے  
 کان لگائے رہتی ہوں دن رات تمہاری آہٹ پر  
 اور تمہیں کچھ دھیان نہیں کیا چاہی کھلاتی ہے؟  
 اب تو اجیرن ہو گیا جینا میرے ہدف کب آؤ گے  
 سوچو تو کچھ چاہنے والی پر کیسا بیتی جاتی ہے

ہدف  
اجتادی



# سیاہ نقاب

اس واقعے کو جو میں آئندہ بیان کرنے والا ہوں آج پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ میں اُن دنوں جوان تھا لیکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی زندگی کے اس دور کا تعلق دلچسپ معاشقانہ واقعات سے ہو لیکن میرے شباب کو اگر کوئی خصوصیت اور اہمیت ہے تو وہ صرف ایک رات میں ہے۔ سیاہ اور بھیانک رات میں جوانی آئی اور گزر گئی۔ جذبات پیدا ہوئے اور طبابت اور ڈاکٹری کے بوجھ تلے، بغیر میری زندگی میں کوئی رنگینی پیدا کئے پس کم مر گئے۔ اس وقت میں زندگی کے اُس حصّہ کو جس میں حیاتِ انسانی کی تمام دلفریبیاں مستور ہوتی ہیں کہیں پیچھے چھوڑ چکا ہوں۔ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ”سیاہ نقاب“ میری زندگی میں داخل نہ ہوتا تو میں اپنی جوانی — اُس جوانی کو جس کے لئے دنیا ترستی ہے کبھی کا بھول چکا ہوتا، اور یاد کرنے کی بالکل کوشش نہ کرتا۔ اِن سطور کے پڑھنے والے مجھے مردہ تصور کریں گے اور کہیں گے کہ میں جذباتِ لطیف سے عاری ہوں۔ میں بغیر کسی رد و کد کے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں مردہ ہوں بے حس ہوں۔ مجھے میرے افکار نے، ڈاکٹری نے آپ دہانے کی تلاش نے اس قدر فرصت ہی نہیں دی کہ شباب کے لازماً یعنی عشق و محبت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکوں۔ چنانچہ اس واقعے کے پڑھنے والے ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ میں کسی رابطہ عشق کا ذکر کرنے والا ہوں۔ یہ ایک استثناء ہے المناک، جانگداز اور پُر درد۔

دسمبر ۱۹۱۵ء کی ایک گھپ اندھیری رات کا ذکر ہے۔ بارش ہو رہی تھی اور پانی کے قطرے زور زور سے شیشوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ تیز و تند ہوا دروازوں اور کھڑکیوں سے گویا دست و گریباں ہو رہی تھی۔ رات کے فوج چکے تھے۔ میرے کمرے میں ایک چھوٹا سا لمپ جل رہا تھا اور میں انکھیں شیشوں کے قریب ایک صوفے پر لیٹا ہوا باران کے شور کو سن رہا تھا۔ میری طبابت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں نے پریکٹس شروع کر رکھی تھی۔ میرا مطلب شہر کی ایک بارونق سڑک پر واقع تھا لیکن باوجود چند مہینے گزرنے کے میرا کاروبار بالکل ٹھنڈا تھا۔ بڑے بڑے جاذبِ نظر ہشتہارا، بازاروں میں لگائے گئے، اخباروں میں اپنے نام کے ساتھ افلاطونِ دوراں اور مسیحِ زماں لکھ لکھ کر سپاک کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی،

منادی اور لیکچروں کے ذریعہ سے اپنے نام کو فروغ دینا چاہا۔ مگر سب کوششیں اکارت گئیں۔ یہ تمام نالائشیں ایک مریض کو بھی میرے دروازے تک نہ لاسکیں۔ میں اُس وقت بہت حد تک مایوس ہو چکا تھا اور مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ آیا کمین ملازمت کر لی جائے یا چند ماہ اور اس کشمکش میں صرف کر دیئے جائیں۔ میری اس حالت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود اس امید و بیم کی حالت میں سے گزر چکے ہوں۔ والدین کی سالہا سال کی کمائی مجھ پر خرچ کر دی گئی تھی، اور پورے بیس سال کے بعد مجھے فارغ التحصیل دیکھ کر وہ میرے متعلق بلند ترین انداز لگا رہے تھے۔ دسمبر کا ابتدائی مہینہ تھا اور کرسمس میں میں وطن جا رہا تھا۔ مگر اپنی موجودہ حالت کو دیکھ کر خود ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔ اپنی بیوی کے سامنے جوابی سے میری چشم براہ تھی اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کا خیال مجھے مائے ڈالتا تھا میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ مجھے نیند آگئی۔

اسی حالت میں ابھی کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی میرے شانے کو دوبارہ ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ میرا ملازم چھوکر مجھے جگا رہا تھا۔ میری حالت مجھے اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ ایک کپاؤ بڈر رکھ سکوں، اس لئے میں نے ایک اٹھارہ سال کے لڑکے کو جسے دن بھر سوائے پیرمنٹ کی میٹھی گولیاں چوسنے کے کوئی کام نہ تھا ملازم رکھ لیا تھا۔

اُس نے آہستہ سے کانپتے ہوئے خوفزدہ آوازیں کہا: ”جناب ایک عورت آئی ہے“ میں حیران ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس طوفانی رات میں عورت کیا کسی مرد کی بھی توقع نہ ہو سکتی تھی۔

”کیسی عورت“ میں نے سوال کیا ”کہاں ہے؟“

”وہ“ اور لڑکے نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے برآمدے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دروازے کے شیشوں میں سے دیکھا۔ ایک بلند قامت عورت جس کے جسم کا اوپر کا حصہ ایک چادر میں لپیٹا ہوا تھا اور چہرہ ایک سیاہ نقاب نے چھپا رکھا تھا دروازے کے اس قدر قریب کھڑی تھی کہ اُس کا چہرہ دروازے کو چھو رہا تھا۔ رات کے اس غیر موزوں وقت میں اس عجیب عورت کی آمد نے میرے دل میں ایک ہلکا سا اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ میں آہستہ سے اٹھا اور دروازے کو ذرا سا کھولا۔ عورت کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ وہ بدستور بت کی مانند کھڑی رہی میں نے محسوس کیا کہ دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے نقاب کے پیچھے سے گھور رہی ہیں ”آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں“ میں نے کہا۔

عورت نے سر کی خفیف سی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔ میں دروازے میں سے ہٹ گیا ”تو آپ



عورت ایک سائے کی طرح کمرے میں داخل ہوئی کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر میرے ملازم کو موجود پا کر ذرا ٹھٹکی میں نے چھو کرے کو کہا ”دروازے بند کر دو۔“ پردے گرا دو اور تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔“ میں نے ایک آرام کرسی انگلیٹھی کے نزدیک کر دی اور اپنے مہمان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عورت چپ چاپ بیٹھ گئی۔ انگلیٹھی سے آگ کا ایک شعلہ ذرا بلند ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کا سیاہ لباس پانی میں شرابور ہو رہا ہے اور اس کا زیریں حصہ کچھ مٹے بھرا ہوا ہے۔ ”آپ بھیگ رہی ہیں“ میں نے کہا۔ ”جی ہاں“ عورت نے پہلی دفعہ جواب دیا۔ اُس کی آواز دبی ہوئی اور غمگین تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دیرینہ مرض میں مبتلا ہے جو اُس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے۔

”اور آپ بیمار ہیں“ میں نے جلدی سے کہا۔

”جی ہاں میں بیمار ہوں، سخت بیمار ہوں۔ میرا جسم بے آزار اور محفوظ ہے، مگر میری روح ایک خطرناک اذیت میں مبتلا ہے۔ میں آپ کے پاس اپنے لئے بلکہ ایک اور شخص کے لئے آئی ہوں۔ اگر میں خود مریض ہوتی تو اس وقت اس تیرہ و نادر دہشتناک رات میں جب کہ کائنات کی ہر جاندار شے کو لئے کھدروں میں دبی پڑی ہے۔ گھر سے باہر نہ نکلتی کاش کہ میں خود اس وقت بیماری کا شکار ہو جاتی۔ یقین جانئے کہ ایک حرف تک میری زبان پر نہ آتا اور میں نہایت خوشی اور سکون سے جان دے دیتی۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی امداد ایک دوسرے شخص کے لئے حاصل کرنے آئی ہوں۔ ممکن ہے کہ میرا تحمل دباؤ لگی پر محمول کیا جائے۔ واقعی میں دیوانی ہوں۔ ورنہ انتظار کی طویل نہ کٹنے والی راتوں میں نوہ و گریہ کی نگہ کرنے والی گھڑیوں میں یہ خیال ہمیشہ میرے دماغ میں رہا اور اگرچہ میں جانتی ہوں کہ انسانی امداد میں معاملے میں کس قدر بے سود اور لا حاصل ہے لیکن اُس کو اس کے بغیر سپردِ فاک کر دینے کا خیال میرا خون خشک کئے دیتا ہے!“

عورت نے تقریر ختم کی تو اس کے تمام جسم میں ایک ایسا لرزہ دوڑ گیا جو تصنع سے کوسوں دور تھا۔

میں ابھی نوجوان تھا۔ انسانی مصائب افلاس اور فلاکت کے روزمرہ مشاہدوں نے مجھے ابھی تک بالکل بے حس نہ کر دیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور ٹوپی سر پر رکھ کر کہا ”اگر مریض کی حالت اس قدر تشویشناک ہے تو ہم کو ایک لمحہ بھی صانع نہ کرنا چاہئے۔ آپ نے اس سے پہلے کہیوں نہ طبی امداد حاصل کی؟“

عورت بدستور بیٹھی رہی ”اس لئے کہ اس سے پیشتر امداد حاصل کرنا بے سود تھا۔ آہ! اس سے کہ اب بھی

ایسا کرنا بے سود ہے، اُس نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ کس قدر بے معنی اور عجیب جواب تھا میں نے حیران ہو کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر وہاں سیاہ نقاب نے سب کچھ چھپا رکھا تھا۔

”آپ بیمار ہیں“ میں نے نرمی سے کہا، ”اگرچہ آپ کو معلوم نہیں لیکن بنجار جس کی شدت نے آپ کو کان محسوس نہیں کرنے دی آپ کو اندر ہی اندر جلا رہا ہے“ اور ایک پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا ”یہ پانی لیجئے اور تھوڑا عرصہ آرام کرنے کے بعد تسلی اور اطمینان سے مرض کے متعلق بتائیے، جب مجھے سب کچھ معلوم ہو جائے گا تو میں ہر طرح آپ کی امداد کروں گا۔

عورت نے بغیر نقاب اٹھائے گلاس لبوں تک اٹھایا اور پھر من چھوئے رکھ دیا۔

”میں جانتی ہوں“ اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا ”کہ یہ سب کچھ بنجار کا ہڈیان معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس سے پہلے کہیں زیادہ سختی سے بتایا جا چکا ہے۔ میں عمر رسیدہ ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ جب انسان اپنی عمر کے اختتام کے قریب پر پہنچتا ہے تو اس کی زندگی کا یہ قلیل عرصہ، خواہ دوسروں کی نظروں میں، وہ ناکارہ ہی کیوں نہ ہو گزشتہ سالوں سے جن کا تعلق زندگی کے بہترین واقعات سے ہوتا ہے کمبیں زیادہ عزیز اور پیارا ہوتا ہے۔ چنانچہ مجھے یہ باقی ماند سال قدرتی طور پر عزیز ہونے چاہئیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یقین جانتے کہ میں خوشی سے ان کو قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں اگر۔۔۔۔۔ اگر جو کچھ میں بیان کر رہی ہوں صرف ہڈیان اور مہوم ہو۔ میں جانتی ہوں گو اس یقین کرنے سے خوف کھاتی ہوں کہ کل صبح وہ جس کا میں ذکر کر رہی ہوں انسانی مدد سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہوگا لیکن اس وقت اگرچہ وہ موت کے منہ میں ہے۔ آپ اُس کو نہیں دیکھ سکتے۔ اُس کا علاج نہیں کر سکتے۔“

میری پریشانی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ مگر میں نے اس کو چھپاتے ہوئے کہا: ”میں آپ کے بیان پر شک نہیں کر کے یا ان حالات کو جو آپ اراداً مجھ سے چھپا رہی ہیں کرید کرید کر پوچھنے سے آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا لیکن آپ کی اس حکایت غم میں ایک ایسی بے ربطی ہے جسے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ شخص مر رہا ہے اور میں جو شاید اس وقت کچھ مدد کر سکوں اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ باوجودیکہ آپ کو معلوم ہے کہ کل صبح کسی قسم کی امداد حاصل ہوگی۔ آپ مجھے اُس کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اگر مریض آپ کو واقعی اس قدر عزیز ہے تو آپ کو قبل اس کے مرض کا علاج ہو جائے اُس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔“

سیاہ پوش عورت نے اختیار ہو کر رونے لگی ”آہ“ اُس نے ایک ٹھنڈا ماساں لیا ”جس چیز پر مجھے خود یقین نہیں اُس کو دوسرے لوگ کیونکر باور کریں گے“ اور پھر دفعۃً اٹھ کھڑی ہوئی ”نو ڈاکٹر صاحب آپ اُس شخص کو

جس کی زندگی کے صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں نہیں دیکھیں گے؟

”میں نے یہ کب کہا ہے“ میں نے جواب دیا ”میرا مطلب تو یہ تھا کہ اگر آپ اس طرح تاخیر کرتی رہیں اور مریض خدا نخواستہ جان بحق ہو گیا تو اُس کی موت کی بدست حد تک آپ ذمہ دار ہو گئی“

”میں اُن ذمہ دار یوں کا جو مجھ پر عائد ہیں ہر وقت جواب دینے کے لئے تیار ہوں“

میں نے کہا ”چونکہ آپ کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے سے مجھ پر کوئی اخلاقی یا قانونی گرفت نہیں آسکتی میں کل مریض کو دیکھوں گا بشرطیکہ آپ پتہ بتا جائیں۔ میں کل کس وقت مریض کو دیکھ سکتا ہوں؟“

”نوبت“ عورت نے جواب دیا۔

میں نے ایک دفعہ پھر کوشش کی ”مجھے بار بار اس افسوسناک موضوع پر گفتگو کرنے سے معاف فرمائیے مگر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ مریض اس وقت آپ کی زیر نگرانی ہے؟“

”نہیں“ جواب ملا۔

”تو اگر میں کچھ ہدایات عرض کروں تو اُن پر عمل کرنا آپ کے لئے ناممکن ہے؟“

در قطعاً! اور عورت بے اختیار ہنسنے لگی۔

بدقسمت عورت نے اس وقت تک انتہائی کوشش سے اپنے جذبات کو ضبط کئے رکھا تھا مگر اب اُن میں طوفان آ گیا تھا۔ وہ اہل رہے تھے اور عورت کے سکون اور ضبط کو بہائے لئے جارہے تھے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ مزید دریافت فضول ہوگی اور عورت کے احساسات مجروح ہو جائیں گے۔ میں نے فردا کی ملاقات کا وعدہ کر کے پُر اسرار عورت کو رخصت کیا جو شہر کے ایک بیرونی محلے کا پتہ دے کر سیاہ رات میں گم ہو گئی۔

عورت تو چلی گئی مگر میری نیند اور آرام بھی ساتھ لیتی گئی۔ میں پریشان تھا میرے حواس معطل تھے۔ عورت ایک ہمتا تھی جس کو میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ ایک مسئلہ تھا جس کا حل مجھ سے کوسوں دور تھا۔ میں نے اکثر ایسے واقعات سنے تھے جس میں ایک شخص کو اپنی موت کے صحیح وقت اور دن کا غیر معلوم طریق پر احساس ہو گیا تھا، مگر یہاں پُر تو ایک دوسرے شخص کی موت کا ذکر تھا۔ یہ کہنا کہ عورت کسی واسطے اور تصور کا شکار ہو رہی تھی فضول تھا کیونکہ اُس کی گفتگو کے زبردست وثوق اور یقین کی موجودگی میں اس قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میرے دل میں ایک اور خیال پیدا ہوا کہ عورت قتل کے خوفناک جرم میں شریک ہے۔ عہد و پیمان اُس کو افشائے راز کی اجازت نہیں دیتے لیکن طبیعت کی کمزوری کے باعث وہ پشیمان ہے۔ اب وہ از کتاب جرم کو تو نہیں روک سکتی لیکن

اس بات کے درپے ہے کہ کسی صورت اُس شخص کو بچا لیا جائے۔ لیکن شہر کی گنجان آبادی میں ایسا ہونا بعید از عقل معلوم ہوتا تھا۔ میرے دماغ میں یکے بعد دیگرے کئی خیالات آئے مگر عقل نے سب کو رد کر دیا۔ اور آخر کار وہی ابتدائی اندازہ کہ عورت کا توازن دماغ بگڑ گیا ہے میرے دل میں مضبوط ہو گیا۔ اگرچہ میں اس میں کئی نقائص پاتا تھا مگر چونکہ اس الجھن میں سے بچنے کا صرف یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا اس لئے میں نے زبردستی یقین کر لیا کہ عورت دیوانی ہے۔ میں نے سونے کی ہزار کوشش کی لیکن سیاہ نقاب کا عکس ایک منٹ کے لئے بھی آکھ بند کرنے سے روکتا تھا۔

اگلی صبح ابھی نو نہیں بجے تھے کہ میں اُس محلے میں جس کا پتہ مجھے رات کو بتایا گیا تھا پہنچ چکا تھا۔ محلہ غیر آباد تھا۔ بہت کم لوگ پھرتے نظر آتے تھے۔ مکانات کی ساخت اور یکینوں کے لباس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس محلے میں افلاس اور غربت کی حکومت ہے۔ ایک مدت سرگرداں رہنے کے بعد اور جگہ جگہ سے اپنی منزل مقصود کا پتہ پوچھنے کے بعد میں ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچا جس کی ظاہری حالت دیگر مکانات سے قدرے اچھی تھی۔ دروازے کے قریب گیا مگر زنجیر ہلانے کی جرات نہ ہوئی۔ اس محلہ کی فضا میں سے مجھے گناہ کی بو آرہی تھی میں ہمت کر کے ایک دفعہ پھر بڑھا لیکن پھر ناکام رہا۔ تیسری مرتبہ گذشتہ رات کے واقعات اور مظلوم عورت کی قابلِ رحم حالت مجھے کھینچتی ہوئی دروازے تک لے گئی، اور میں نے زور سے زنجیر کو ہلایا۔ چند منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ دروازے کی دوسری طرف ذرا فاصلے پر دو شخص سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد بھاری بھر کم بوٹوں کی آواز آئی۔ زنجیر آہستہ سے اتاری گئی اور ایک دروازہ قامت پتلے دبلے شخص نے جس کے چہرے سے بے رونقی اور وحشت ٹپک رہی تھی دروازہ کھولا۔

”اندز شریف لے آئیے“ اُس نے کہا۔

عورت کی دردناک کیفیت اور اس شخص کی اندوگین حالت میں اس قدر نمایاں تعلق پایا جاتا تھا کہ میں بغیر دریافت کئے کہ کس مکان میں جا رہا ہوں اندر داخل ہو گیا۔ وہ شخص مجھے ایک کمرے کے دروازے تک لے گیا۔

”میں دیر سے تو نہیں پہنچا؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل نہیں جناب“ اُس نے دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا ”اگر آپ اس کمرے میں تشریف رکھیں تو

آپ کو پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

میں کمرے میں داخل ہو گیا اور وہ شخص چپ چاپ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ فرش پر ایک بوسیدہ چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک پلنگ رکھا تھا۔ دوسری طرف ایک شکستہ کرسی رکھی تھی۔ کونے میں دو ایک صندوق پڑے تھے۔ ہر چیز پر گرد پڑی ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرے کو مدت سے صاف نہیں کیا گیا۔ چاروں طرف قبر کی سی خاموشی تھی۔ مکان بالکل سناں معلوم ہوتا تھا۔ مکان کے اندر یا باہر کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے ایک کرسی صاف کی اور بیٹھ کر اپنی سب سے پہلی طبی مہم کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگ گیا۔ مجھ کو اس طرح بیٹھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ سڑک پر ایک گاڑی چلنے کی آواز سنائی دی گاڑی مکان کے سامنے رک گئی۔ دروازہ کھلا۔ آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی اور اس کے بعد پھر سنا ہوا گیا چند منٹ کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دو یا تین آدمی کسی بھاری اور وزنی چیز کو اٹھائے بیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ ٹھوڑی دیر کے بعد بیڑھیاں اترنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ دروازہ ایک دفعہ کھل کر بند ہو گیا۔ اور فضا میں دہی اداسی اور پردہشت سکون مستولی ہو گیا۔

پانچ منٹ اور گزر گئے اور عین اُس وقت جب میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ خود باہر جا کر اس سب سے کوئل کروں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور گزشتہ رات والی پراسرار عورت اسی لباس میں اسی طرح چہرے کو نقاب میں چھپائے داخل ہوئی اور اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ عورت کے غیر معمولی قد و قامت اور اُس کی مسلسل خاموشی نے ایک لمحے کے لئے میرے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اس لباس میں عورت نہیں بلکہ کوئی مرد چھپا ہے۔ لیکن سسکیوں کی آواز سے جو نقاب کے نیچے سے آرہی تھی اور اس کی مجنونانہ حرکات نے فوراً اس خیال کو مٹا دیا۔

میں عورت کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ہم بیڑھیوں سے اور ایک برآمدے میں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے تک پہنچے جہاں عورت دروازہ کھول کر ذرا رگ گئی تاکہ میں پہلے داخل ہو سکوں۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس میں سے اتنی ناکافی روشنی کمرے میں آرہی تھی کہ میں اُس چیز کو جو میرے سامنے کمرے کے وسط میں پڑی تھی اُس وقت تک نہ دیکھ سکا جب تک کہ عورت ایک چیخ کے ساتھ میرے پاس سے ہوتی ہوئی دیوانہ وار اُس کے قریب نہ جا گری۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ ایک چارپائی پر سفید چادر میں جس پر گرم کبل پھیلا ہوا تھا ایک شخص لیٹا پڑا تھا۔ بے حس اور بے حرکت چہرے پر سر کے اوپر سے اور ٹھوڑی

کے نیچے سے ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دایاں ہاتھ پہلو کے ساتھ پڑا تھا اور بایاں ہاتھ عورت کے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے آہستہ سے عورت کو ایک طرف ہٹایا اور اُس شخص کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہاتھ سرد تھا اور نبض نکل۔

”اٹا لے“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”یہ شخص تو مر چکا ہے“

عورت تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی ”خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب ایسا نہ کہئے مجھ میں تاب نہیں کہ اس کو برباد کر سکوں۔ بسا اوقات ایسے لوگ جن کی جانب سے دنیا ناامید ہو چکی تھی دوبارہ زندہ کر دیئے گئے اور ایسے لوگ جو آسانی سے معیاب ہو سکتے تھے صرف بے توجہی اور بے پروائی کی بدولت قبر کی آغوش میں پھینک دیئے گئے ڈاکٹر صاحب! اس کو بغیر علاج کے، بغیر کسی جدوجہد کے یوں کس مہر سی کی حالت میں نہ مرنے دیجئے۔ شاید اس وقت اس لمحے اسی لحظہ جسم میں سے جان نکل رہی ہو۔ لحد کو شش کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب اس کو مرنے نہ دیجئے اور یہ کہتے ہوئے اُس نے لاش کے ہاتھ پاؤں اور سینے کو ملنا شروع کر دیا۔

”یہ سب کچھ بے سود ہے“ میں نے اپنا ہاتھ سینے پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ مگر آنکھوں کی حالت دیکھ کر مجھ میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔

”ٹھہرو“ میں نے کہا ”کھڑکیاں کھول دو“

ان الفاظ نے عورت پر کبلی کا سا اثر کیا۔ اس طرح گویا اس کو تیرا لگا ہے۔

”کیوں“ اُس نے دفعۃً چونک کر کہا

”میں کہتا ہوں کھڑکیاں کھول دو“ میں نے پہلے سے ذرا زیادہ سخت آواز میں کہا۔

عورت روتی ہوئی میرے پاؤں پر گر پڑی میں نے اراداً کمرہ تاریک کیا تھا ”اُس نے کہا“ ڈاکٹر صاحب مجھ پر رحم کیجئے۔ اگر وہ واقعی مر چکا ہے اور اس کو زندہ کرنے کی کوشش فصول ہے تو خدا اس شرمناک اور دلخراش منظر کو جسے اب تک میری آنکھیں دیکھ سکی ہیں دوسری آنکھوں کو دیکھنے کی اجازت نہ دیجئے“

”اس شخص کی موت طبعی بواعث سے واقع نہیں ہوئی“ میں نے کہا ”میں لاش کو ضرور دیکھوں گا“ اور یہ کہہ کر ایک ہی جست کے ساتھ پیشتر اس کے کہ عورت کو معلوم ہوتا میں کھڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے نوٹ لکھ لیا دئیے اور پھر لاش کے قریب آگیا۔ لاش کے چہرہ کانٹیلوں رنگ، آنکھیں ابھری ہوئی صاف بتا رہی تھیں کہ تو کا باعث تشدد ہے۔

”اُس پر تشدد کیا گیا ہے“ میں نے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور عورت کے چہرے کی طرف جس



سے اب نقاب ہٹ چکا تھا دیکھتے ہوئے کہا -

عورت نے پریشانی میں نقاب اتار دیا تھا اور اب حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ خدو خال سے اُس کی عمر ۲۵ سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ غم و اندوہ نے اُس کے چہرہ پر ایک دردناک کیفیت پیدا کر دی تھی۔ مسلسل رونے سے اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو صرف دیوانگی ہی پیدا کر سکتی ہے۔

”اُس پر تشدد کیا گیا ہے“ میں نے پھر کہا۔

”جی ہاں“

”یہ شخص قتل کیا گیا ہے“

”خدا گواہ ہے“ عورت نے جواب دیا ”کس سفاکانہ اور خوفناک طریق پر قتل کیا گیا ہے؟“

میں نے اضطرابی طور پر عورت کا بازو پکڑ لیا اور اُس کو دباتے ہوئے کہا ”کس نے قتل کیا ہے؟“

”یہ دیکھو“ عورت نے لاش کے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں لاش پر جھک گیا۔ گلا متورم تھا اور اس کے گرد ایک نیلگوں حلقے کا نشان تھا۔

تمام واقعات ایک لمحے میں میرے دماغ میں پھر گئے اور حقیقت بجلی کی طرح میری آنکھوں کے آگے

کوند گئی۔ اس شخص کو آج صبح پھانسی دی گئی ہے، میں نے جلدی سے کہا۔

”جی ہاں“ عورت نے خلا میں بے معنی طور پر دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہتے ہوئے آنسو اب منجمد ہو

گئے تھے۔ انتہائی غم نے اُس کے احساسات کو شل کر دیا تھا۔

”یہ کون تھا“ میں نے پوچھا۔

”میرا خلیفہ جگر۔ میرا بیٹا“ یہ کہا اور عورت بے ہوش ہو کر میرے پاؤں میں گر گئی۔

یہ صبح تھا۔ اس قدر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد واقعات کا اعادہ فضول اور محض درد انگیز ہو گا۔ یہ قیمت

شخص اس بیوہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بد نصیب عورت نے اپنا تمام اندوختہ حیات اُس کی پرورش پر صرف کر دیا،

مگر جب وہ جوان ہوا تو گناہ کی رنگینیاں اُس کو اپنی سرکش موجوں میں بہا لے گئیں۔ بد بخت ماں نے خوشامدوں

سے التجاؤں سے اُس کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر نو جوان بغیر سنے بغیر دیکھے بغیر سوچے ذلت کے عمیق ترین

گرمھوں میں گر گیا۔ نیچے — نیچے — اور نیچے یہاں تک کہ قانون نے ایک سنگین جرم میں اُسے سزا

موت کا حکم سنایا۔ ایک شریک مجرم بوجہ عدم ثبوت رہا ہو گیا اور یہ جاننا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔  
یہ سب کچھ ہوا مگر ماں کی بے پایاں محبت نے اُس کو یہ یقین نہ کرنے دیا کہ اُس کا بیٹا بھی مر سکتا ہے۔  
اس خیال سے کہ شاید پھانسی پر لٹک جانے کے بعد بھی اُس میں زندگی کا کوئی شائبہ رہ جائے، یا شاید وہ کمنہ  
مشق ڈاکٹر جو اس بات کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ کوئی شخص پھانسی کے تختے سے زندہ نہ جائے دھوکا کھا جائیں  
وہ تاریک اور سرد رات میں بھیگتی ہوئی میرے دروازے تک آئی اور اس دلخراش حقیقت کو چھپاتے ہوئے  
مجھے قدرت کے اُس اٹل قانون ”موت کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے مردہ بیٹے کے بستر تک لے گئی۔“  
آہ ابد نصیب فریب خوردہ محبت ماں ! ..

## خادم بٹالوی

## محبت

ہماری حیات مستعار کا پاکیزہ ترین وہ لمحہ ہے جب ہم نے پہلے پہل محبت کو محسوس کیا، جب گوشِ دل سے اُس کے  
ریشمیں پردوں کی پھر پھر اٹھ سنی، جب ہم نے سنی بڑھتی ہوئی سانس اور صدا اُس ہولے تیز کی جو ہماری روح پر تسلط  
کرنے کو تھی، اُس کو پاکیزہ بنانے کے لئے یا تباہ و برباد کرنے کے لئے — لانگ فیلو  
محبت کے مسرور اثر کی قوت سے ہم طعن و تشنیع اور زجر و توبیخ کے دلخراش حملات سہار سکتے ہیں خواہشات  
کی گرم جولانی کو روک سکتے ہیں، جامِ مصائب کے کڑے گھونٹ کو شیریں بنا سکتے ہیں اور اُن راحت کے لطیف وحسین  
ترین پھولوں کو جو ہماری زندگی کی کٹھن اور کانٹوں بھری راہوں پر بکھرے پڑے ہیں جن سے ہمیں — زمزمین  
محبت دل کو پرگندہ اور آلودہ خیالات سے خالی کرتے ہوئے پُر تقدیس و پُر نور بناتی ہے، الماحیات کو قوتِ شرف  
بخشتی ہے، زندگی کی ہر ہر حرکت کو عالی مہتی اور شرافت و نجابت سے درخشاں کرتی ہے، ہر عورت اور مرد پر احترام جرات  
اور قوت کے پھول نثار کرتی ہے! وہ بہترین تحفہ جس سے بنی نوع انسان مشرف ہو اصدقِ دل اور جان نثاری سے محبت  
کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں! محبت مقدس آگ ہے اسے بتوں کے سامنے روشن کرنا اس کی تعمیر کرنا ہے! —  
مس جیو سیری

# تجلیات

عشق و جنوں پرست ہوں بادہ کش الست ہوں  
میکدہ ازل کا ایک رند سیاہ مست ہوں  
سجدے کے واسطے مرے گردن آسمان ہے خم  
تیری رونما میں ایک گدائے پست ہوں  
زاہد کم نظم نہ کچھ اس کے سوا سمجھ سکا  
کافرو بت پرست ہوں جام و بوبدست ہوں  
تجھ کو خیال حور ہے مجھ کو خیال طور ہے  
ہاں! تو خدا پرستے! ہاں! میں صنم پرست ہوں

چشمِ نجوم میں اثر کوئی نہیں ہے امتیاز  
میں ہی اسیر حلقہ، دامِ بلند و پست ہوں

اثرِ صہبائی

# کشتِ لالہ و گل

یہ داغنائے جگر میں کہ کشتِ لالہ و گل  
کھلا ہے دامنِ دل پر بہشتِ لالہ و گل  
ہر ایک غنچہ و گل چاک درگریاں ہے  
خرابِ دستِ جنوں ہے سرشتِ لالہ و گل  
نہ محو خونِ شہیدان کی یاد ہو جائے  
لگا دو گورِ شہیدانِ پختِ لالہ و گل  
مرادِ جو ہے اسرارِ دینِ فطرتِ حسن  
میری نظر میں ہے زیبا و زشتِ لالہ و گل

فسانہٴ دلِ خوں گشتِ جہنما ہے ظفر  
سرِ صحیفہٴ قدرت، نوشتِ لالہ و گل

سراج الدین ظفر

# کولمبس سے پہلے امریکہ میں عربیت

یہ حقیقت تاریخ کی بالکل واضح حقیقت ہے کہ داخلہ کولمبس سے پہلے امریکہ میں انسانوں کی باقاعدہ آبادی تھی۔ حتیٰ کہ ان میں متعدد فرمانروا بھی تھے، جو اپنی اپنی حدود مملکت میں مستقل طور پر فرمانروائی کرتے تھے۔ اور ان کا عمران و تمدن بھی زمانہ کے لحاظ سے بہترین تمدن تھا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کولمبس سے پہلے عربی لوگ بھی امریکہ میں پہنچے تھے یا نہیں البتہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کی عقدہ کشائی میں بہتر سے ناخن فکوبے کا رہ چکے ہیں۔ ”جامعہ ہارورڈ“ کے مشہور عالم یونیورسٹی نے صرف انسا ثابت کیا ہے کہ ہنود امریکہ (جو وہاں کے قدیمی باشندے ہیں) کی زبان میں بعض عربی کلمات پائے جاتے ہیں۔

علامہ موصوف ۲۶ زبانوں کے ماہر ہیں، آپ نے کئی برسوں میں ان سچی مبلغوں کی کتابوں سے جو اسپین کے مشہور قائد اعظم کو رٹز فاتح کمبیک کے زمانہ میں وہاں مصروف تبلیغ تھے، ہنود امریکہ کی زبان سیکھی، اور اس کا دوش کا منشا صرف یہ تھا کہ ان زبان کے ان کلمات و تعبیر کا پتہ لگایا جائے جو ازمنہ غائرہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کے ساتھ اجنبی اقوام کے مل جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ تحقیقات کے بعد موصوف کو معلوم ہوا کہ امریکہ کی زبان میں انگریزی اور سپینی فرانسیسی اور پرتگالی زبان کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ لیکن مزید تفصیل کے بعد یہ حقیقت بھی عالم آشکارا ہوئی کہ ان تمام زبانوں کے علاوہ امریکہ کی اصلی زبان عربی کی بھی بہت کچھ ممنون احسان ہے۔ اور سب سے پہلے عربی زبان نے ہی لغت امریکہ کو الفاظ کا قرض دیا تھا۔ موصوف کا خیال ہے کہ اس زبان میں عربی کلمات ۱۲۹ء میں یعنی کولمبس کی آمد سے دو صدی پہلے داخل ہو چکے تھے اور جن لوگوں کی وساطت سے یہ کلمات وہاں تک پہنچے وہ دو صدی اور پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔

علماء فن نے سبالات قدیمہ کے متعلق جو جدید بحثیں کی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانوں میں تجارت کے تجارت کی غرض سے اوقیانوس اٹلنٹک میں بھی برابر جاتے تھے۔ لیکن ان کی یہ آمد و رفت غیروں سے بالکل پوشیدہ اور مخفی ہوتی تھی۔ اسی انداز پر فرانس کے مشہور مقام دیب وردان والے تاجر بھی اپنے اپنے جہاز افریقہ کے مغربی ساحل غانہ پر کولمبس سے ۱۰۰ برس پہلے تک بھیجا کرتے تھے، جو وہاں سے محفی طور پر سونا، ماتھی، دانت، خوشبوئیں، اور قیمتی پتھر وغیرہ لاتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہیں کے تاجر اپنے اپنے جہازوں کو جنوبی امریکہ میں بھی بھیجتے تھے۔

”دیب“ کے متعلق علماء آثار کی کوششوں سے محقق طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ شہر ولادت کولمبس سے چند صدی پہلے بھی اسی قسم کی مخفی تجارت کا مرکز تھا۔ اور دیب کی یہ چال ۱۶۹۰ء تک جاری رہی۔ لیکن اسی سن میں جب فرانس

اور اٹھلینڈ کے درمیان جنگ چھڑ گئی، تو انگریزوں نے ”ذیب“ پر توپوں کے اتنے گولے برسائے کہ ساری دیباہوں کے تمام مکانات اُن کی ساری کائنات کے ساتھ بھسم ہو گئی۔

مذکورات کو لمبس میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کو لمبس اکتشاف امریکہ کی ہم سر کرنے کے لئے جا رہا تھا تو اثنائے راہ میں اسپین کے نامور بہادر نبروں سے ملاقات ہو گئی، جس کو کو لمبس نے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنا رفیق سفر بکد رہنما بنالیا۔ لیکن آگے چل کر دونوں تعین سمت میں مختلف ہو گئے۔ نبروں جنوب کی سمت چلنا چاہتا تھا اور کو لمبس اس کے خلاف تھا۔ ناچار نبروں نے کو لمبس کا ساتھ چھوڑ دیا اور خود تین تنہا جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ تین ہفتے کے بعد جنوبی ساحل کو پار دفعتہ دونوں سیاحوں کی ملاقات ہو گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبروں کو لمبس سے پہلے امریکہ جا چکا تھا، اور کو لمبس بھی اس کو اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ اسی لئے اُس نے نبروں کو اپنے ہمراہ ایک مرشد اور رہنما کی حیثیت سے لیا بھی تھا۔

کو لمبس اپنے تیسرے سفر سے پلٹنے کے بعد بیان کرتا ہے کہ میں نے امریکہ کے شہروں میں بہت سے زنگی دیکھے اور جن ہنود (سکال امریکہ) سے میں پہلے سفر میں ملا تھا۔ انہوں نے مجھ کو ”جو انین“ کا ہدیہ بھی دیا تھا (جو انین) اس زمانہ میں تانبا ملے ہوئے سونے کو کہتے تھے جو افریقہ سے لایا جاتا تھا، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کو لمبس نے امریکہ میں افریقی سونا اور زنگیوں کو دیکھا تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہاں پہلے کچھ لوگ ایسے گئے ہوں جن کے ساتھ زنگی زادے اور افریقہ کا خاص سونا بھی رہا ہو۔ کو لمبس اپنے ساتھ ترجمانی کے لئے بہت سے ایسے افریقی زنگیوں کو لے گیا تھا جو امریکہ کی زبان سے خوب واقف تھے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ افریقہ کے زنگی کو لمبس کے پہلے امریکہ کو جانتے تھے۔ مزید برآں بعض ہشین فن کا یہ بھی خیال ہے کہ ازدوایہ ”کا قدیم تمدن خاص عربی تمدن تھا۔ اور خود ازدوایہ عربی مستعرات تھے، عربی تمدن نویں صدی عیسوی کے اندر افریقہ میں پورے طور سے پھیل چکا تھا۔ اور مغربی افریقہ سے ہوتا ہوا خلیج مکیک کے کناروں پر ”مشواکان“ وغیرہ میں بھی اس کا گہرا اثر پڑ چکا تھا۔ اس لئے امریکہ کی قدیم زبان میں جو عربی آثار موجود ہیں، وہ ان تمام مقامات کو واضح طور سے بیان کرتے ہیں۔ ماہرین فن کے خیال میں امریکہ کے اندر عربی کلمات پہنچانے والے بربّر کے باشندے یا عربی دان افریقی ہیں۔

ابن بطوطہ مشہور اسلامی سیاح ۳۲۴ھ مطابق ۱۳۲۵ء کے سفر میں لکھتا ہے کہ میں نے سارے افریقہ میں عام طور سے عربی زبان کو رائج دیکھا، ابن بطوطہ کا یہ سفر کو لمبس کے پہلے سفر سے ۵۰ برس قبل کا ہے۔ ان تمام واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں کو لمبس کے بہت پہلے سے عربیت موجود تھی۔

# مسلم خاتون کی حالتِ زار

کیا چین ملازم جہاں میں میں آ کے  
 سب پر کبھی آیا ہی نہیں حرفِ تمنا  
 تو جان سے اپنی گئی لے پیکرِ الفت  
 سینے میں لگی کھانا پکانے میں لگی تو  
 گھر بھر کی مصیبت کبھی بیمار کی پریش  
 کس شوق کو کھاتی ہے تو پسِ خور وہ بے کا  
 جاہل بھی ہے کم عقل بھی ہے مرد کے نزدیک  
 اک جانِ حزیں پر تری دنیا کے مصائب  
 اک بیوہ کم عمر کی دیکھو گے جو حالت  
 مستی ہے نہ سرمہ ہے نہ زیور ہے نہ کپڑا  
 یہ طرفہ متا شاہے کہ فسرِ زند بھی زن بھی  
 پر صاحبِ خانہ کی حیثیت کو تو دیکھو  
 اسلاف کی عظمت تو ہوئی ایک فسانہ  
 اقوامِ جہاں میں یگرے سب کی ہنگمہ سے  
 عورت بھی وہ عورت کہ جو پیکرِ عصمت  
 اب خواب سے بیدار ہوئے مسلمہ اللہ  
 کب تک ہدفِ تیر ملامت تو رہے گی  
 لے مردِ مسلمان ہے اگر دل میں تھے درد

بس ہم تو ہدف ہو گئے مردوں کی جفا کے  
 بے عقل ہے واقعی حتیٰ اپنے گنوا کے  
 قاتل نہ ہوئے مرد مگر تیر مریٰ وفا کے  
 فرصت جو بزرگوں کے ملی پاؤں دبا کے  
 کیا چین تو لائی ہے مقدّمین لکھا کے  
 بچ جائے مقدّم سے جو گھر بھر کو کھلا کے  
 کب اس کو پسند آتے ہیں آئیں جیا کے  
 تو اس پر بجالاتی ہے سو شکر خدا کے  
 دل تھام کے رہ جاؤ گے رُدن کو جھکا کے  
 یہ عمر تو قابل نہ تھی اس سخت سزا کے  
 دنیا میں جئیں گے تو جئیں اشکِ بہا کے  
 فرعون بنے بیٹھے ہیں بندے یہ خدا کے  
 محبوب ہوئے یہ نہ شرافت کو گنوا کے  
 کیا مرتبہ پائیں گے یہ عورت کو ستا کے  
 چلتی ہے ہوا سے بھی جو دامن کو بچا کے  
 اور چاروں طرف دیکھ ذرا آنکھ اٹھا کے  
 کہ حضرتِ باری میں دعا مانگھ اٹھا کے  
 سن لے مرے نالے کہ یہ نالے ہیں بلا کے

میدانِ ترقی میں نکل اپنی جگہ لے

ہو تیغِ بکف جو ہر اسلام دکھا کے

فاطمہ بیگم

# مہاں نوازی

”جے رام جی کی، جے رام جی کی، بھائی صاحب کیسے آنا ہوا؟ کہاں اترے ہو؟ کتنے دن قیام ہے گا؟“  
 ”بھائی صاحب آڑھت کا حساب کرنا ہے۔ دیکھئے کتنے دن گئے ہیں۔ آپ کے ہاں ٹکوں گا۔ اگر گنجائش ہو تو آدمی کو کہہ دیں کہ اسباب ٹانگے سے اتار لے۔“

کیا کیفیت میزبان پر گدڑی کون جان سکتا ہے۔ چہرے تو نمایاں نہ تھی ظرف بڑا تھا دل کی اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ خندہ پیشانی سے کہا۔ ارے بدھو (ملازم) لالہ جی کا اسباب اتار پاس واسے کوٹھے میں رکھ دے۔ اندر کہہ دینا کہ ایک پراہونا آیا ہے۔ کھانے کا انتظام کریں۔ ایک دو چیرا درپچالیں۔ تو بازار سے انہ خر بوز۔ لے آئیو مگر یاد رکھنا، منگی دوکان سے نہ لانا۔ مارکبٹے جانا خبردار۔ پیسے منیم جی سے لے لینا۔ آٹھ آنے سے زیادہ کا مال نہ ہو۔

مہمان نے اشنان دھیان کیا۔ دھیان لچھی کا تھا۔ سرستی کی اپاسا اُن کا شیوہ نہیں تھا۔ تھالی میں کھانا آیا سبزی ترکاریاں سوادوار بنی ہوئی، اجوائن اور ادک کی آمیزش تھی۔ دہی میٹھا اور نمکین، دال تلی اور کرٹھی دو قسم کی، پوری کچوری نمکین، چاول آچار مرہ مرغض مکلف ویشنو غذا پروسی گئی۔ مہمان نے ذوق سے کھانا کھایا۔ یاد کیا کہ جب میزبان ہمارے ہاں اتر اٹھا، یہی چیزیں ہمارے ہاں بھی اُس کو ملی تھیں۔ موسم کا میوہ البتہ زیادہ، مہمان کھانا کھا کر بازار نشریف لے لئے۔ حساب کتاب ہوتا رہا۔ اب سنئے کہ میزبان کے ہاں ایک دن سے اس خیال سے زیادہ نہ ٹھہرے کہ جب وہ اتفاق سے پھر اُن کے ہاں آئے گا تو دو دن رہ کر ایک دن کے عوض میں حساب پورا کرے گا۔

ایک اور لالہ صاحب اُن کے واقف اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک دن اُن کے ہاں قیام کیا کیونکہ وہ اُن کے شہر میں ایک دن اُن کے ہاں کھانا کھا گئے تھے۔ گویا انہوں نے اس طریق سے حساب بیدار کر لیا۔ مہاں نوازی کی یہی تاریخ ہے۔ دیہات میں تو کہاں، بڑے بڑے شہروں میں بھی انگریزوں کے آنے سے قبل ہوٹل نہ ہوتے تھے۔ شہروں میں سرائیں ہوتی تھیں۔ ان میں مسلمانوں کے لئے تونان بائی ہوا کرتے تھے۔ ہندوؤں کو بازار سے پوری کھانی ہوتی تھی یا کماروں کے تنور ہوتے تھے مگر وہاں کا کھانا اعلیٰ ذات

کے لوگ نہیں کھاتے تھے اس لئے مہماں نوازی شرفا کے واسطے ضروری ہو گئی تھی۔ البتہ کشمیر میں اب تک بھی رواج ہے کہ کشمیری پنڈت جس گاؤں میں چلا جائے نسکار کر کے جس کشمیری پنڈت کے گھر ٹھہرنا چاہے خواہ واقف ہو یا نہ ہو اُس کو کھانا اور بسیرا مل جائے گا۔ مسلمانوں میں بسم اللہ کہنے اور دسترخوان پر بیٹھ جائے محض مومن ہونا کافی ہے۔

بعض ہندو قوموں میں مہماں نوازی بھی حساب کے قاعدہ پر ہے۔ میزبان اور مہماں بعض اوقات اصل کے ساتھ سود وصول کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہے لین دین کی میباقی کے مانند دعوت کی میباقی بھی ہوتی رہتی ہے۔

انگریز لوگ مہماں نوازی ۲۴ گھنٹے تک تو روا رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ گھر میں کمرہ خالی نہ ہو۔ مفہوم ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے بعد مہماں کو کسی اور جگہ قیام اور طعام کا انتظام کرنا ہوگا۔ اب انگریزی زمانہ میں ہندوستان میں جگہ جگہ ہوٹل بن گئے ہیں۔ لفظ ہوٹل کی پوری ماہیت سے ابھی دیسی لوگ واقف نہیں۔ اکثر نام کے ہوٹل ہیں۔ جب جاسیے تو قیام کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ صرف آپ کو بج پر بٹھا کر کبابی یا تھالی میں کھانا مل جائے گا ہم کو حیدر آباد میں ایک دفعہ ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ ہوٹل کے لفظ سے ہم گمراہ ہو گئے تھے۔ حال میں کہیں کہیں ہندو اور مسلم ہوٹل بھی کھلے ہیں، جن میں شب باشی کا انتظام ہوا ہے۔ مگر ہم اُن کے تجربہ کی بھی سفارش نہ کریں گے۔ امید رکھنی چاہئے کہ انگریزی ہوٹلوں کی کبھی نہ کبھی پوری تقلید ہوگی اور عوام کو شکایت نہیں رہے گی ضروریاتِ زمانہ خود سکھا دیں گے۔ روز بروز تجارتی کاروبار بڑھتے جاتے ہیں۔ ہوٹلوں کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ مہماں نوازی کی ضرورت کم ہو رہی ہے۔

شیم



# غزلیات

جفائیں دیکھ لیں زلیبا دکن کی  
فلک کیا بڑھ سکے گا اس سے

زلیبا

ردولوی

(۳)

جو نہی سرمدین سے جدا ہو گیا حق بندگی بھی ادا ہو گیا  
فلک کا ستم یہ کیا ہو گیا میں پابند جو روح جفا ہو گیا  
دوائے دل درد منداں فلک کرے کیا جو ان کا کہا ہو گیا  
پرستش ہے دراصل و کمال پرستش سے بت بھی خدا ہو گیا  
تبسم میں پنہاں ہے راز بقا  
ہنسی گل کو آئی فنا ہو گیا

صوفیہ

(۴)

آپ کی پردہ داریاں نگین میری اسید واریاں نگینیں  
اُس کے اداک کی تمنا عقل کی ہرزہ کا بیاں نگینیں  
دل مجروح کو محبت میں! چھوڑ کر دل فگاریاں نگینیں  
چھین لوں گا میں چارہ گر کاڑا جو مری بے قراریاں نگینیں  
شب غم ہو گئی و دواع مگر درو کی غمگساریاں نگینیں  
میرے ماتم میں صبح عشرت تک رات کی سوگواریاں نگینیں

کوششیں کیں ہزار محسراتی  
تھیں جو قسمت میں خاریاں نگینیں

(۱)

اک جلوہ حق ناکو دیکھا تم کو دیکھا خدا کو دیکھا  
محشر کی بھی راہ دیکھ لیں گے تجھ سے صبر آزا کو دیکھا  
ہستی عدم نما کے مددے چھپتے ہوئے برلا کو دیکھا  
دام اٹھے زکیمیلے دل کے اس جنس گراں ہا کو دیکھا  
ہم نے بھی خلا سے موت مانگی ہم نے بھی ہی جفا کو دیکھا  
ہستی میں بھی شانِ نیستی ہے موجود عدم نما کو دیکھا  
تیری وہی سرگراںیاں ہیں ہم نے اپنی ناکو دیکھا  
ہم نے بھی فراق دل بچا کے  
اُس ناکو بے خطا کو دیکھا

فراق  
گوکھ پوری

(۲)

ہم آغوشی کو ابھرے ہیں نہیں سے تے نقش قدم میری جبین سے  
ٹپکتا ہے محبت کی بدولت ہمارا خون ہماری آستین سے  
تروپڑ جتنی گئی قلب جبین کی شکن مٹتی گئی اُن کی جبین سے  
دیارِ عشق میں ہے ہو کا عالم بڑی رونق تھی اکے نصرت سے  
ذرا سا لفظ کہہ دیتے تو کیا تھا یہ گنتے جی نہ اٹھتے آفریں سے  
وہیں سے کوچہ قاتل کی حد ہے فناں جوتی ہی پیدا نہیں سے  
اب اُس لیلے نے بے عمل کاہوہ بدل جا لیلیٰ تحمل نشیں سے

# محفل ادب

## پشتو ادب

جیسا کہ داستانے وغیرہ نے اطالیہ کی ادبیات کو جب کہ وہ ملک معرض زوال میں تھا چار چاند لگا دیے تھے افغانوں کے شعرو سخن نے مغلوں کے زمانے میں بڑی آب و تاب دکھائی۔ واضح رہے کہ عینی قوت مغلوں کی جنوبی عبارات میں صرف ہوئی اُس سے زیادہ شمال میں کام آئی۔ صرف اکبر کے عہد میں زین خاں اور ٹوڈرل کے سمیت میں ہزار سپاہ کو افغانوں نے تلف کیا۔ اورنگ زیب کے وقت افغان بائے ہائے گویا آرام سے بیٹھے کہ فعل سے قوت اور قول کی طرف راغب ہوں۔

ارسطو نے نفس میں پرندوں کی نغمہ سرائی کو ٹکٹینی پر مبنی سمجھا جیسا عام خیال تھا اور اس دلیل پر اس کی تردید کی کہ اگر مرغ کے زخم لگا ہو تو چھمانے سے قاصر ہوتا ہے۔ ابن عربی نے عذاب الیم کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ بندگانِ فاضل کو مصیبت میں ایک عذوبت یعنی شیرینی حاصل ہوتی ہے جس میں درد ہوتا ہے اور وہ ایک لذت لئے ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دہقان نے کہا کہ مزہ جب ہے کہ آدمی کھیت میں بیٹھا ہو نم نہ مینہ برستا ہو اور نرم نرم تپ بھی چڑھی ہو۔ مجدد الف ثانی محی الدین عربی کی ذات کو مقبول اور اُن کے کلام کو مردود کہتے ہیں اگر کوئی اس دہقان کی بات کو فضول سمجھے تو تعجب نہیں ع فکر ہر کس بقدر بہت دوست۔

عاشق کو فراق میں رنج کے ساتھ البتہ ایک لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور جدائی کا غم تو لازماً شاعری ہو جو چل پیا بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ایک افغان کہتا ہے :-

دو صال پہ چینی مرمہ وچی شندی

دو صال کے چشمے پر خشک لب مر رہا ہوں

ایک افغان فارسی میں کہتا ہے :-

ماتم و سوز جہاں بس کہ ہم آمیز ست

خندہ مقہم ہم اشک ندامت ریز است

موج البحرین ہذا عذب فہرات و ہذا ملح اجاج و نینہما بوزخ دو بحر میٹھے اور تازہ اور کھاری اور کڑے مل رہے ہیں اور اُن کے درمیان فاصلہ ہے۔ اس کی ایک تفسیر یہی دکھ اور سکھ ہے بلکہ الکر کے حروف مقطع بھی الم کی

تائید و تشدید میں شاید علیحدہ علیحدہ پڑھے جاتے ہوں۔ غرض یہ ہے کہ جیسے فنسار نے غم و ہم کے محرم میں میٹھے کہہ کر نابغہ کا مقابلہ کیا بعض قومیں بھی آزادی کھو کر اس کی تعزیت میں سرور سے گاتی ہیں۔

ہندوستان کے افغانوں نے بہت سے دیوان پشتو میں لکھے۔ عجائب اللغات ہمیں تالیف ہوئی جو پشتو کی بڑی ضخیم کتاب ہے۔ سرحد میں تفسیرِ محال کا ترجمہ ہوا یہاں تک کہ انجیل بھی پشتو میں منتقل ہوئی۔ مغلوں کی سلطنت میں رشید الدین وغیرہ فقہ کی کتابیں لکھی گئیں جو پشتون عورتیں تک پڑھتی ہیں اور بڑے بڑے افغانی شعرا تو تقریباً سب اسی عہد میں ہوئے۔ خوشحال خاں جو خشک افغانوں کا سردار تھا ایک عمدہ گھوڑا اور نگ زیب کو نہ دینے کی وجہ سے قید میں ڈال دیا گیا، جہاں اس کو اذیت پہنچائی گئی مگر اُس نے گھوڑا دینا منظور نہ کیا آخر ایک تند خو اور کج طبع آدمی کو اس کا رفیق قید بنایا تو ناچار ہو کر بادشاہی خواہش کو پورا کیا۔ اس مصیبت میں اس نے ایک قصیدہ لکھا جس میں اپنے مختلف خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

ماوچہ دمخل پہ نوکری کس رکیبونہ کوزم دسرو دسپینو نال  
ناحق زنجیر ونہ را پہ پینو کزل واہ واہ ہسے نوازش ہسے آمال  
دیں نے کہا کہ مغل کی نوکری میں رکا میں سونے کی اور غلیں چاندی کی بناؤں گا۔ ناحق زنجیریں میرے پاؤں میں ڈال دیں۔ واہ واہ ایسی نوازش اور ایسی امیدیں پھر اپنی قوم کو مغلوں سے استغنا برتنے کی ہدایت کرتا ہے۔  
پشتانہ لڑہ شرنئی اندیری سوئی نہ غواڑو و مغلو مجوری شال  
دافغانوں کے لئے اُن کے اپنے دیسی کپڑے کافی میں مغلوں کی مجری شال ہم نہیں چاہتے، پھر اپنے رنج کے خلعے کی دلیل پیدا کرتا ہے۔

پس لہ زمی داڑی پشکال  
(جاڑوں کے بعد بہار آتی ہے) اپنے وطن میں پہنچ کر ہمیشہ افغانوں کو مستد کرنے کی کوشش کرنے، ہننا مغلوں سے آزاد رہنے کی ترغیب دیتا رہا۔

تو منصب پورے خوشحال خٹک نوکرو چہ منصب ور عنے لاؤشہ اُس بادشاہی  
(منصب ملک خوشحال خٹک نوکرتھا جب منصب اُس سے جاتا رہا تو اب بادشاہ ہے)  
چہ تنخواہ مد مغل خوریو ملک وم چہ تنخواہ اُس نشہ ملک ایم  
(جب مغل کی تنخواہ کھاتا تھا تو ایک ملک تھا، جب تنخواہ نہیں ہے تو اب ملک ہوں)

خوشحال خاں نے مختلف اقسام کی نظموں کے علاوہ نثر میں بھی فضیلت دکھائی ہے۔ تاریخ مرصع میں جو پشتو کی ایک عمدہ تصنیف ہے ایسے واقعات درج ہیں جو معاصر فارسی اور انگریزی کتابوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس کی اولاد میں مدتوں شعر ہوتے رہے جن میں سے ایک شید ہے جو اقارب کے عقارب ہونے کی ضرب الشل کو پول بیان کرتا ہے۔

ددریاب لہ سرد جوشی دجباب زہ چو شید اقطع د امید بویہ لہ خیلو  
(ددریاب کی سرد جوشی سے جباب کا دل پھٹا جاتا ہے۔ شید اپنوں سے قطع امید کر لینی چاہئے) اس کی ایک دوہیں لکھی جاتی ہیں جو مجھے یاد رہ گئیں کیونکہ سب مضمون حافظے ہی کی مدد سے تحریر کر رہا ہوں۔ ورنہ اس سے بہتر مثالیں موجود ہیں:-

ستاپہ سپین تندے لے جانان اشین خال دئی یاد سکو اذان تہ ولا ز بلال دئی  
(تیری سفید پیشانی پر لے جانال یہ سبز خال ہے یا فجر کی اذان کے لئے بلال کھڑا ہے؟)  
کہ چاپہ دنیا کنس جنت نہ وی لیدے بلا تشبیہ دایو خوند ستاد وصال دئی  
اگر دنیا میں کسی نے بہشت نہیں دیکھا بلا تشبیہ یہ تیرے وصال کا ایک مزہ ہے)  
خوشحال خاں کو بجا طور پر پشتو کا شیکسپیر رحمن کو حافظ اور حمید کو سعدی کہتے ہیں اور تینوں فی الحقیقت بہت بلند رتبہ رکھتے ہیں حمید نے گلستان، بوستان اور انوار سیلی وغیرہ کا پشتو میں نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں ترجمہ کیا اس کا دیوان بھی اخلاقی نضاح اور نفائس سے ملبوس ہے ایک جگہ کہتا ہے۔

نازولے زوے نہ اخلی ادب اود سورے نخل نہ نیسی طب  
(نازنین بچہ ادب حاصل نہیں کرتا اور سائے کی کھجور میں پھل نہیں لگتا)  
رحمن روحانی امور کے علاوہ اپنے زمانے کے وقائع کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے:-  
اورنگ زیب ہم یو فقیر و یو تو پی لے و وپہ سر

(اورنگ زیب بھی ایک فقیر تھا جس کے سر پر ٹوپی تھی) چلے لاس لے ود (سیدہ خواب کز د خورم قول تبرجب ہاتھ پہنچا تو خورم کا سارا گھرانہ برباد کر دیا) باوجود اس کے عالمگیر کی وفات کو غروب آفتاب سے تشبیہ دے کر اندیشہ ظاہر کرتا ہے کہ اس اندھیرے میں دیکھئے کیا حوادث پیش آتے ہیں۔ حافظ کے دیوان کی طرح افغان اس میں نال دیکھتے ہیں۔ جب کابل کے محبس میں پڑا تو ایک معزز آدمی کسی خاندانی لڑائی کے سبب قیدی

آیا۔ جب امیر صیب اللہ مقتول نے اسے دربار میں بلایا تو جانے سے پہلے اُس نے مجھ سے دیوانِ رحمن سے فال دیکھنے کی فرمائش کی جو عجیب بر محل نکلی۔

فال بہ خہ گورے رحمن دھرستے اعمال خیل فال شی  
رحمن فال کیا دیکھتے ہو ہر شخص کے اعمال اُس کی فال ہونگے، چنانچہ اس کے کردار کے مطابق فیصلہ ہوا۔  
یہ تو محلِ حال بے کابل اور پشاور کے درمیان کے شعرا کا۔ قندھار میں بھی لطیف الطبع شاعر اور ادیب  
گزرے ہیں۔ ایک ہندو آفند بڑا عالم تھا جس نے اصولِ فقہ پر کتاب لکھی اور مقاماتِ حریری کی شرح تالیف کی۔ شیخ  
پوتے پر مہمّا کما ہے۔

کہ لاس پورے ہنخ بد گلبدن کنس لہ غیوت خال پر یوزی پہ سمن کنس  
اگر گلبدن کے منہ پر ہاتھ پھیریں تو غیرت سے خال دامن میں گر پڑے، افغان بچوں کے منہ پر خال سرے  
سے بناتے تھے جو سیاہی کا نقطہ معلوم ہوتا تھا رخ منہ کو کہتے ہیں اگر اس کو ہاتھ یعنی ید لگایا جائے تو مخید ہو جاتا،  
اگر خال مینی نقطہ دامن میں نیچے آپڑے تو مجید ہو جاتا ہے جو اس کا نام تھا  
امیر عبدالرحمن خاں کا سپہ سالار سدو خاں تو تک کہتا ہے:-

دعاشقی پہ کو دکنس لبرخہ دسترس لرم چہ جان پہ خیل جانان قربان کوم دھفہ و س لرم  
(عاشقی کے گھر میں تھوڑی سی دسترس رکھتا ہوں کہ جان اپنے جانال پر قربان کر دے یہ میرے بس ہیں ہے)  
تین ابرو کو کس طرح بنا ہا ہے:-

ستاد سترگی او بہ داہسے ندی چہ غیلہ سر پہ سر لری حباب  
(نیری آنکھوں کا پانی ایسا نہیں ہے کہ سر کے سوا اس کے سر پر یعنی سطح پر اور کوئی حباب ہو)  
شرقی قدیم کی بلندئ مضمون ملاحظہ ہو۔

ستاد مع مگرم لرنہ دی ناجور چہ مسیحی و علاج تہ سفری ولار  
(تیرے منہ کی وجہ سے کہیں سورج بیمار تو نہیں کہ مسیحا علاج کے لئے سفر پر گیا ہے)

چہ تائے لہ تاسوہ دیوسف حسن تراز و پسے و اسمان تہ مشتری ملار  
(تاکہ تیرے ساتھ یوسف کے حسن کو تولے ترازو کے پیچھے آسمان پر مشتری کیا ہے)  
افغانوں کے ملی اشعار جنہیں بدلی یا لنڈی کہتے ہیں یعنی چوٹی ابیات اکثر جو انوں کو ہزاروں یاد ہوتے ہیں۔

اور ایسی آواز سے گاتے ہیں جو اونچے پہاڑوں سے نکل کر دور تک گونجتی ہے۔

پہ تو رتوپل دشتکے شاہیے دنا مردی احوال دھرازہ مسینہ  
دسیاہ بندوق کو تیرا مارا جانا بہتر ہے اے محبوب نیری نامردی کی خبر مجھے نہ پہنچے  
جبت طرازی بھی اکثر پائی جاتی ہے۔

ستوگی دڈ کے تپا لچے دی غریب سوری پہ لا رتلم و دوشتمہ  
نیری آنکھیں بھرے پستول ہیں۔ مجھ غریب آدمی کو راء جاتے مار دیا

دکا فرگل پہد شان کا بڑہ سوے چہ را سبیزے روزبہ نیمہ تیروی نہ  
دکا فرگل کی شان پر ٹیڑھی ہو گئی ہو۔ جب سیدھی ہوگی تو آدھا دن گذرا ہوگا، شان مانند کو بھی کہتے ہیں  
اور آدھا دن گذرا پستو میں آدمی عمر بسر ہونے کے مساوی ہے۔ کافر گل سورج کبھی کو کہتے ہیں کیونکہ ایک  
بڑی چیز کو قلب مومنوع سے کافر سے تغیر کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک نیک شخص دعا کرتا ہے کہ خدا مجھے اتنا  
مال و اختیار دے کہ ایک کافر مسجد بناؤں اور ایک کافر ملا کو وہاں رکھوں۔ اسی طرح محاورہ ہے دشت یا بد شہ  
سوہ دئی۔ زشت یا بد اچھا آدمی ہے یعنی نہایت خوب آدمی ہے۔ یہ انگریزی کے آفل وغیرہ الفاظ سے مشابہ ہے  
تجنیس کے علاوہ اس فرد میں عالی و ماغی قابل داد ہے

سرخشا سو کو ذی نہ منی د تاج بارے تاج دی خما و سروتہ محتاج  
میرا سرتاج کی سرتگونی کو نہیں مانتا بے تلج میرے سرو کا محتاج ہے  
تاج پہننے کے وقت جو سر جھکتا ہے یا اُس کو پہن کر جو سر خم رکھنا پڑتا ہے میرا سرا سے قبول نہیں کرتا۔  
میرے سرو قد کا خود تلج محتاج ہے۔

”ارو“

### مجنوں کا نعرہ مستانہ

محبت کی فنسوں کاری سے کلیاں مسکراتی ہیں فضا میں جگمگاتی ہیں ہوا میں گیت گاتی ہیں  
محبت دامن کسار کو گلشن بناتی ہے محبت پتھروں سے دودھ کے دریا بہاتی ہے  
پہ شعلہ موجزن ہے میرے دل میں آرزو بن کر رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے یہ صبا لبون کر

مری فریاد سے پھول اور غنچے تھر تھرتے ہیں  
مرے تھے دلوں میں شمع بن کر جگمگاتے ہیں  
چلے آتے ہیں وحشی جانور آرام گاہوں سے  
پلنگ و شیر و آہو جمع ہیں باغِ محبت میں  
جہاں میں ہوں وہاں قانونِ نظرت ٹوٹ جاتا ہے  
یہاں دُڑوں میں روحِ زندگی بیدار ہوتی ہے

”ادبی دنیا“

یہاں ہر چیز کی کیفیتِ عشق سے سرشار ہوتی ہے

عابد

### بیوہ کا گیت

کچھ میری تنھوڑی ہی تھی، میری!

پھر بٹھا کیا میرا؟ میری، میرا؟

کیا میرا سوگ تک مانگے کا نہ تھا،

قسمت کا دیا قرض؟

تقدیر نصیب ہی نہیں لیتی

دل کا رنج اور جگر کے نالے تک لوٹ لیتی ہے۔

اور پھر ابڑے کھنڈل کو گڈڑی کے داموں خرید لیتی ہے۔

ہاں! تقدیر آئی اور ایک نہیں کے بڑے سب کچھ لے گئی

میرے بہرے کی ہر بہات،

میری چال، ڈھال،

سب،

جیسے روز کے روز کا نیلام،

اور جب کچھ نہ رہا تب اپنے حالوں چھوڑ دیا.....

خالی ہاتھ کھڑی ہوں۔

”جامعہ“

شروع شروع زندگی میں ایک مزد تھا،

ایک امنگ تھی، ایک ڈھارس تھی۔

یہ کہ جوانی میں یونہی ہوتا ہے۔

ان دنوں کیا معلوم ہوتا۔

نہ معلوم تھا کہ زندگی کیا چیز ہے،

اور دفعتاً زندگی یہ ہو گئی۔

کہ سال آیا اور سال گیا۔

نہ اس میں مزار، نہ تغیر نہ تحیر،

جیسے کوئی بیج سے دو ٹکڑے کر دے۔

اس میں نہ اُس کی خطا تھی نہ میری،

ہم دونوں صابر تھے اور صبر بھی کرتے رہے،

لیکن موت کو صبر نہیں۔

میں نے اُس کو اتے دیکھا کہ کیا ہی برا آنا تھا اُس کا آنا،

اور میں اُس کو نکستی رہی اور وہ سمیٹتی گئی، سمیٹتی گئی

# نئی کتابیں

مصطفائی کمال مولفہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دہلوی ضلع علی گڑھ۔ اس میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے سہمہ ہجری تک کے حالات میں سے ایسے واقعات کی خوشہ چینی کی گئی ہے جن کا تعلق ان کی مذہبی اخلاقی اور انتظامی اصلاح سے ہے اور آپ کے ایسے بعض اقوال اور افعال پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اسلامی خلافت کی جھلک نمودار ہو جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کے احکام کس درجہ مکمل اور مستحکم ہیں۔ حجم ۵۰ صفحات سے زائد، کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یادگار عشق۔ حضرت شاہ رکن الدین صاحب عشق دہلوی ابو العلامی عظیم آبادی کے حالات زندگی خصوصاً شاعری اور انتخاب کلام کا ایک دنو از مجموعہ ہے جسے مولوی سید حسن رضا صاحب ثاقب عظیم آبادی نے مرتب کیا ہے۔ عشق گزشتہ صدی کے ایک بلند پایہ نغمہ گو شاعر اور درویش تھے اور ان کا کلام خواجہ میر درد کی طرح تصوف اور معرفت سے پُر ہے۔ حجم ۱۶۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ پتہ، مولوی سید حسن رضا صاحب مدرس عربی، پٹنہ سٹی سکول، پٹنہ

تابش خیال۔ حضرت افسر صدیقی امروہوی کی ان غزلیات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک لکھیں۔ ابتدا میں مولوی اسرار احمد صاحب کرپوی فاضل ادب والیات کا مفصل و مبسوط مقدمہ ہے۔ جناب افسر کے کلام کے متعلق ہمیں صاحب مقدمہ کی رائے سے اتفاق ہے کہ وہ دلکش سادہ تصنع اور آورد سے بری اور ایک حد تک قدیم ایشیائی شاعری کا نمونہ ہے۔ حجم ۱۲۴ صفحات۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ۔ جناب مصنف سے رام سوامی، کراچی کے پتہ سے منگائیے۔

شہریت۔ مصنف شیخ عطاء اللہ صاحب پروفیسر مرے کالج، سیالکوٹ۔ یہ کتاب شہریوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کے متعلق لکھی گئی ہے، اور اس میں حکومت کے نظام اور اس کے طریق کار کو نہایت آسان اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کو اچھے شہری پیدا کرنے کے لئے ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے اور ہمارا خیال ہے کہ شہریت سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر کتاب اب تک اردو میں شائع نہیں ہوئی۔ حجم ۲۱۶ صفحات قیمت درج نہیں۔ میسر عطر چند کپور اینڈ سنز تاجران کتب انارکلی لاہور سے طلب فرمائیے۔



ریل ایگزسٹنس۔ مصنف ایس ایم پونس صاحب ہر عظیم آبادی۔ چالیس صفحے کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ایک سو فیاض نظم کوئل اور اس کا انگریزی ترجمہ دیا ہے اور دوسرے حصے میں فاضل مصنف کے ۳۷ اقوال درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ مقرر کی ہے۔ ایم کے جعفری صاحب، لینکوتج بیورو، نمبر بجلی روڈ، اٹالی، کلکتہ سے طلب فرمائیے۔

الجمعة السائرہ۔ یہ عروض کی عربی کتاب محیط الدائرہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب کی عربی عبارت بھی ساتھ دی گئی ہے۔ ترجمہ بہت اچھا ہے حجم ۸۴ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ پتہ۔ انجمن موبد الاسلام، مدرستہ الواعظین لکھنؤ۔

سلطانہ ڈائری۔ خواتین کے لئے حساب خانہ داری کی کتاب ہے جس میں ریل اور ڈاک کے معلومات، اوزان، پیمائشوں کے نفع، اور خانہ داری کے متعلق مفید اور کارآمد باتیں بھی درج ہیں قیمت مجلد چھ روپے۔ جلد دوم روپے۔ ملنے کا پتہ سلطانہ بیگم صاحبہ مالکہ خاتون دہلی بی سٹورز، چاندنی چوک، نزد فتح پوری، دہلی۔

محمود اور فردوسی۔ مصنف قاضی خورشید الحسن صاحب ناظم۔ اس میں شاہنامہ کے متعلق محمود اور فردوسی کے مشہور معاملے کی تردید کی گئی ہے حجم ۴۰ صفحے، قیمت چار آنے۔ پتہ، مولوی فیض الدین صاحب دکیل محلہ عابد شاہ جید آباد دکن، اردو انقلابی قاعدہ، مرتبہ منشی اکبر علی صاحب بی اے، بی ٹی سابق ایجوکیشنل سیکرٹری ریاست منگرول قیمت چھ پیسے پتہ، نمبر ۴۲ لیک سکوائر، نئی دہلی۔

اسلامی محمدی تقویم۔ بڑی تقویم کے ۸۰ صفحات پر ۱۲۲۹ ہجری کی جنتری ہے جو بہت سے مفید معلومات سے پر ہے نہایت خوبصورت چھپی ہے۔ پتہ، علی بھائی و شرف علی صاحبان تاجران کتب بھنڈی بازار، بمبئی نمبر ۹

”خیالستان“ یہ ماہوار رسالہ حضرت اختر شیرانی اور جناب لطیف بی اے کی ادارت میں ماہ اپریل سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا دوسرا نمبر ہے جو ظاہری و معنوی محاسن سے مالا مال ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ہے، کاغذ انٹیک استعمال کیا گیا ہے تصویریں سات ہیں اور مضامین ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ”خیالستان“ کی بزم میں ہندوستان کے بڑے ادباء جمع نظر آتے ہیں۔ پروفیسر محمد اقبال صاحب لیم اے، پی ایچ ڈی کا مضمون ”تاریخ زرمیات ایران“، سید غلام بھیک صاحب نیونگ کی نظم ”نازنین مغرب“ سید سلطان حیدر صاحب جوش کا افسانہ ”خوبصورت دھوکا“ اور اختر صاحب کے تقریباً تمام مضامین نظم و نشر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ لاہور سے ایک ایسے اچھے پرپے کا اجرا اعلیٰ میں آیا، اور ہم قابل مدیروں کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ سالانہ چندہ پانچ روپے ہے۔ پتہ، دفتر خیالستان، ۱۸ فلیٹنگ روڈ، لاہور





